پاکستان نمبر

شمارۂ خصوصی

جو "نگار" کی پچھلی ۲۶ سال کی خدمات کی یاد میں

جوبلی نمبر

کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے

"نگار" کا سالانہ چندہ اب چھ روپیہ ہو گیا ہے
ملاحظہ ہو اعلان صفحہ ۸

مدیر خصوصی:- نیاز فتحپوری

جلد- ۵۳	جنوری و فروری ۱۹۴۸ء	شمار- ۱ و ۲

پاکستان کے مسلمانوں کے نام

سالِ نو کا پیغام

آسایشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف ست

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

نگار ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا تھا اس لئے ۱۹۴۶ء کے اختتام پر اس کی عمر ۲۵ سال کی ہو چکی تھی اور ۱۹۴۷ء کا پہلا پرچہ جوبلی نمبر کی حیثیت سے شایع ہونا چاہئے تھا، لیکن اب میں کیا کہوں اور کیونکر کہوں کہ ۱۹۴۶ء میرے لئے کس درد و کرب کا سال تھا۔

جنوری ۱۹۴۶ء کی ۲۴ تاریخ تھی جب مجھے معلوم ہوا کہ میری رفیقۂ حیات ایک ایسے مرض[1] میں مبتلا ہیں جس کا علاج اسوقت تک دریافت نہیں ہو سکا اور میرے لئے یہ بتانا بہت مشکل ہوگا کہ اس خبر کو سنکر مجھ پر کیا گزر گئی۔ دُنیا میں موت تکلیف کی چیز نہیں بلکہ در اصل اس کا خیال تکلیف دہ ہوتا ہے، ایک قاتل کی سزا قطعِ سر نہیں ہوا کرتی بلکہ اصل سزا حکم قصاص ہے، اور رات کی وہ چند گھڑیاں جو اس خیال میں بسر کرنا پڑتی ہیں کہ صبح کو رشتۂ حیات ہمیشہ کے لئے قطع ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں تو حالت اس سے زیادہ سخت تھی کیونکہ موت یقینی تھی اور انتظارِ موت کی کوئی میعاد معین نہ تھی، میں شب و روز کے ہر ہر لمحہ میں موت کے چنگل کو آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا دیکھ رہا تھا اس حال میں کہ نہ میں مریضہ کو اس سے بچا سکتا تھا اور نہ قضا اس کھیل کو جلد ختم کر دینے پر آمادہ تھی۔

امیدیں قطع ہوتی جا رہی تھیں، دُنیا کے تمام سہارے ختم ہو رہے تھے اور میری حالت ایسی تھی جیسے کوئی طوفانی موج سامنے سے آ رہی ہو اور اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ ہو۔ پھر یہ موج آ کر رہی اور میری تنہا متاعِ حیات کو چھین کر لے ہی گئی۔

اس لئے اندازہ کیجئے کہ جس شخص کی رگیں مسلسل آٹھ ماہ اسی طرح آہستہ آہستہ ٹوٹتی رہی ہوں، اس کا کیا عالم ہوگا اور اس سے کیا توقع ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے دل و دماغ پر قابو رکھ سکے گا۔ تاہم میں نے نگار کو جاری رکھا اور ایک بار بھی اپنا درد دُکھ قارئین نگار کے سامنے پیش نہیں کیا۔ لیکن یہ میرے لئے کسی طرح ممکن نہ تھا کہ پورا ۱۹۴۶ء اس عالمِ سکرات میں گزرنے کے بعد ۱۹۴۷ء کے آغاز میں جوبلی نمبر شایع کر سکتا، پھر بھی اشاعت سالنامہ کی رسم میں نے قائم رکھی اور ماجد ولین کا المناک افسانہ خصوصیت کے ساتھ اسی لئے منتخب کیا گیا کہ وہ میری ماتم زدگی کی صحیح تصویر تھا اور میں اپنے آنسوؤں کے ساتھ قارئین نگار کے بھی کچھ آنسو شامل کرنا چاہتا تھا۔

۱۹۴۷ء میں یقیناً میرے کرب و اضطراب کی نوعیت بدلی لیکن اس سے زیادہ کچھ فرق نہ ہوا کہ جو آنسو پہلے گرم نکلتے تھے،

---

[1] اس مرض کو طبی اصطلاح میں دم ابیض یا Leukaemia کہتے ہیں، جس میں خون کے سرخ ذرات ختم ہونے لگتے ہیں اور سفید ذرات بڑھتے بڑھتے انسان ہلاک ہو جاتا ہے۔

اب وہ سرد ہیں، جن زخموں سے پہلے خون جاری تھا وہ اب ناسور ہیں پہلے درد و کرب کسی کروٹ چین نہ لینے دیتا تھا، اب یاس و مجبوری میں کروٹ لینے کی بھی ہمت نہیں۔ پہلے دل میں آگ تھی اور میں اس آگ سے اپنے آپ کو جلتے ہوئے محسوس کرتا تھا لیکن اب

می سوزم واز سوختن خود خبرم نیست

دُنیا میرے لئے اب محض "نقش و نگارِ طاقِ نسیاں" ہے اور زندگی کا مفہوم موت کے انتظار کے سوا کچھ نہیں —— ظاہر ہے کہ ان حالات میں اب یا کبھی میں جوبلی نمبر کی اشاعت کا خیال دل میں نہ لا سکتا تھا جو تقریب مسرت کی چیز ہے، لیکن چونکہ مسلسل، ۲۶ سال سے وقت مقررہ پر ایک کام کرنے کی عادت پڑ گئی ہے اس لئے اس دوران میں بلا ارادہ نگار کے معمولی پرچے بھی شایع ہوتے رہے، بلکہ نہ کچھ میں لکھتا بھی رہا اور اب سالنامہ بھی پیش کر رہا ہوں، جس کو آپ اس کا جوبلی نمبر کہہ سکتے ہیں۔

۱۹۴۷ء ہندوستان کے لئے بڑا عجیب و غریب سال تھا، اور مشکل سے تاریخ عالم میں ایسی کوئی مثال مل سکے گی جس میں سعادت و نحوست دونوں ایک ہی وقت میں اس شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے دست و گریباں دیکھنے میں آئی ہوں۔ خوش بختی و سعادت تو یہ کہ صدیوں کی پڑی ہوئی زنجیرِ غلامی قطع ہوئی اور بدبختی و نحوست یہ کہ ہندوستان کے دو ٹکڑے ہو گئے اور خونریزی کے وہ مناظر سامنے آئے کہ ہلاکو و چنگیز کا عہد بھی فراموش ہو گیا۔

ہندوستان و پاکستان میں اکثر مقامات پر ہر فرد اپنی جگہ پریشان حال و مضطرب ہو گیا، اور سماج کے وہ تمام روابط، جو ملک کی تمدنی زندگی کے لئے ضروری ہیں پارہ پارہ ہو گئے، ظاہر ہے کہ ان حالات میں نگار کو بھی متاثر ہونا تھا اور وہ ہوا، لیکن پھر بھی میں نے مناسب نہ سمجھا کہ جس شمارۂ خصوصی کی اشاعت کا وعدہ کیا گیا تھا اُسے کسی اور وقت پر ملتوی کیا جائے۔ اور میں نے پاکستان نمبر کا اعلان کر دیا، اس کے دو سبب تھے، ایک یہ کہ اول تو میں یوں بھی دوسروں سے التجائے تحریر کرتے شرماتا ہوں اور اگر میں ایسا کرتا بھی تو اس پریشانی کے دور میں کون توجہ کرتا، اس لئے پورا پرچہ مجھ کو اپنے ہی مضامین سے پُر کرنا تھا اور یہ موضوع ایسا تھا جس پر میں آسانی کے ساتھ اپنے مقالات پیش کر سکتا تھا، دوسرے یہ کہ موجودہ دورِ ابتلا میں کسی ادبی موضوع کے لئے کسی اشاعت کو مخصوص کر دینا یوں بھی بے محل تھا، بنا بریں میں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی قایم کی ہوئی نئی حکومت "پاکستان" ہی کو مخاطب کیا جائے۔

پھر اس خطاب کی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں، ایک یہ کہ میں حصولِ پاکستان کی جد و جہد پر روشنی ڈالتا اور اسکے جواز یا عدم جواز پر بحث کرتا، دوسری یہ کہ میں پاکستان کے مستقبل کو سامنے رکھ کر کوئی ایسی چیز پیش کرتا، جو اس نوزائیدہ حکومتِ اسلامی کے لئے دلیلِ راہ ہو سکے اور اس کے سامنے دورِ ماضی کی اسلامی حکومتوں کے ان واقعات و حالات کو پیش کیا جائے جن سے مسلمانوں کی بلند نظری، کشادہ دلی، بے تعصبی، علوئے اخلاق اور دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ اگر دولتِ پاکستان ترقی کر سکتی ہے (جو ہماری انتہائی تمنا ہے) تو انھیں اصول کو سامنے رکھ کر جو پیشرو اسلامی حکومتوں نے متعین کئے تھے اور جن کو سامنے رکھ کر بادیہ نشینانِ عرب نے بھی سیاست و ملک گیری، علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت میں وہ غیر معمولی ترقی کی جسکے

نقوش ابھی تک محو نہیں ہو سکے۔

چونکہ حکومت پاکستان کا مرکز بھی سندھ ہے، جہاں سب سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں نے اپنی حکومت قایم کی تھی، اس لئے ابتدا میں اسی سرزمین کے حالات سے بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی حکومت کن رواداریوں پر قایم تھی اور غیر مسلم آبادی کے ساتھ انھوں نے کس بلند نظری کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے بعد غزنوی عہد کو لیا گیا ہے جس کا تعلق زیادہ تر پنجاب سے تھا اور بتایا گیا ہے کہ اس عہد کے مسلمان فرمانرواؤں کی سیاست ملکی کتنی بلند تھی اور انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ کتنی فیاضی سے کام لیا۔ اسی سلسلہ میں بہت سے ان مسلم بادشاہوں کی خصوصیات کو پیش کیا گیا ہے جنھوں نے صدیوں تک ہندوستان میں حکومت کی اور جو اپنے عدل و انصاف، پاکیزہ نظم و نسق اور مذہبی رواداریوں کے غیر فانی نقوش اپنے بعد چھوڑ گئے۔

پھر چونکہ حکومت و سیاست کے ساتھ ساتھ حکومتِ اسلامی کے تمدنی و ثقافتی نقطۂ نظر کو بھی پیش کرنا ضروری تھا اسلئے اس شمارہ میں وہ مقالات بھی نظر آئیں گے جن سے اسلامی حکومتوں کے آداب و معاشرت، علوم و فنون کی ترقی اور مخترعانہ ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح یہ شمارہ گویا ایک تاریخی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا مقصود تمدن اسلامی کی تاریخ کو پیش کرکے پاکستان و ارکانِ دولتِ پاکستان سے اپیل کرنا ہے کہ وہ سخت سے سخت حالات میں بھی قدیم روایات اسلام کو فراموش نہ کریں اور بلا لحاظ اس کے کہ ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے وہ اپنے قلمرو میں غیر مسلموں کے ساتھ وہی سلوک کریں جو ان کے اسلاف نے کیا تھا اور اپنے عدل و انصاف اور اپنی بلند نظری سے سرزمین پاکستان کو واقعی جنت ارضی بنا دیں۔

چونکہ میں مذہبی اختلاف و نزاع کا ہمیشہ سے مخالف رہا ہوں اور میرا دعویٰ ہے کہ مذہب اسلام سے زیادہ امن پسند مذہب کوئی نہیں، اس لئے میرا فرض تھا کہ موجودہ حالات میں جب کہ ہندو مسلم نزاع نے نہایت مکروہ صورت اختیار کرلی ہے، جرید کا یہ نمبر بھی خالص اصلاحی موضوع کے لئے وقف کردوں اور اگر میں ہندوؤں سے کہنے کا کوئی حق نہیں رکھتا تو اپنی آواز کم از کم اس جماعت تک تو ضرور پہونچا دوں جس کے ایک فرد ہونے کا فخر مجھے بھی حاصل ہے۔

اس لئے میں یہ اشاعت، پاکستان کے ساتھ منسوب کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ وہاں کے رہنے والے، وہاں کے ارباب قلم اور ارکانِ حکومت موجودہ سیاسی و مذہبی اختلافات کی تنگ دُنیا سے بلند ہو کر محض اخلاقی تاریخی و علمی نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ کریں گے اور اگر اس طرح میں کسی ایک دل میں بھی کوئی حقیقی جذبہ امن پسندی کا پیدا کر سکا تو میں سمجھوں گا کہ میرا مقصود پورا ہو گیا اور میری محنت بیکار نہیں گئی۔

ہم جانتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان میں مہاسبھائیوں کی جماعت مسلمانوں کی سخت دشمن ہے اور وہ چاہتی ہے کہ پاکستان کے تمام ہندو یہاں چلے آئیں اور ہندوستان کے تمام مسلمان پاکستان چلے جائیں، لیکن اگر ان کی یہ کوشش کامیاب ہو گئی تو یہ ایسی ذلت ہو گی جسے ہندوستان برداشت کرے تو کرے لیکن پاکستان کو کبھی نہ برداشت کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ طریق عمل نہ صرف یہ کہ اسلامی روایات کے منافی ہو گا بلکہ سیاسی و اقتصادی مصالح بھی اس کی اجازت نہ دیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ دونوں حکومتوں کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے جارہے ہیں اور اب کشمیر کے مسئلہ نے تو اس کشیدگی کو زیادہ خطرناک اور تشویش انگیز حد تک پہونچا دیا ہے، لیکن اس کشیدگی کو دور کرنے کی جو تدبیر اختیار کی گئی ہے وہ نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے لئے باعث توہین ہے بلکہ خطرناک بھی ہے۔ "مجلس اقوام" جس کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا ہے، کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جسکی دیانت غیر مشتبہ ہو۔ اس کو ایشیا و ہندوستان کسی سے ہمدردی نہیں ہے اور ان کے ہر فیصلہ کا رجحان زیادہ تر امریکہ و برطانیہ ہی کے مفاد کی طرف ہوتا ہے، اور چونکہ پاکستان و ہندوستان کا اتحاد ان کے اغراض کے لئے مفید نہیں ہو سکتا، اس لئے ان سے یہ توقع رکھنا بیکار ہے کہ وہ کشمیر کے باب میں بھی کوئی ایسا فیصلہ کریں گے جو ہندوستان و پاکستان کی موجودہ کشیدگی کو دور کرسکے۔

برطانیہ، ہندوستان کے متعلق پہلے ہی سے پورا نقشہ طیار کرچکا ہے اور اسی کو سامنے رکھ کر وہ بساط سیاست پر اپنی مہروں کو حرکت دے رہا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم اس کی پہلی چال تھی اور صوبوں کی حد بندی دوسری چال، اب کشمیر کے مسئلہ میں جو وہ تیسری چال چلے گا وہ بھی اس کے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ اسی چال پر یہ بازی ختم ہو جائے، اور ہندوستان و پاکستان دونوں آپس میں لڑ کر تباہ ہو جائیں — اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو پھر کیا ہوگا، یقیناً معاملہ اسی حد تک پہونچکر ختم نہ ہو جائے گا بلکہ دُنیا میں ایک اور ہولناک جنگ شروع ہوگی جس میں ایک فریق روس ہوگا، دوسرا امریکہ و برطانیہ اور پھر انھیں میں سے کسی کا طوقِ غلامی ہندوستان کو اپنے گلے میں ڈالنا پڑے گا۔

یہ تو ہیں وہ خطرات جنکے پیش آنے کا قوی امکان ہے لیکن انھیں تاریک بادلوں میں ہمیں روشنی کی بھی ایک جھلک نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان و پاکستان دونوں اپنی اپنی جگہ جنگ کے نتائج سے بے خبر نہیں ہیں اور وہ ہر امکان کوشش اس بات کی کریں گے کہ نہ صرف مسئلہ کشمیر بلکہ تمام نزاعی مسایل سلجھ جائیں اور لڑائی کی نوبت نہ آئے۔ "مجلس اقوام" کی طرف سے اسوقت تک جتنے بیانات شایع ہوئے ہیں، ان کا رجحان بھی قریب قریب امن و صلح پسندی کی طرف ہے، لیکن ہم کو "مجلس اقوام" کے اقوال پر زیادہ اعتماد نہ کرنا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ وہ فیصلہ کی کوئی ایسی شرط قرار دے جس سے یہاں زیادہ اُلجھنیں پیدا ہو جائیں اور ان سے فائدہ اُٹھا کر وہ ہندوستان و پاکستان کے باہمی تعلقات کو اور زیادہ خراب کردے۔ اس لئے ہندوستان و پاکستان اگر اپنے جھگڑوں کو مجلس اقوام کے ذریعہ سے طے کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنی جگہ اس بات کا بھی فیصلہ کر لینا چاہئے کہ اگر اسکی طرف سے کوئی ایسی بات پیدا کی جائے جس سے اُلجھنوں کے اور زیادہ بڑھنے کا اندیشہ ہو، تو وہ اس دام فریب میں نہ پھنسیں گے اور اس حقیقت کو فراموش نہ کریں گے کہ ہندوستان و پاکستان دونوں کی سلامتی اسی میں ہے کہ ان کے تعلقات دوستانہ رہیں اور ملکی سیاست کو وہ مذہبی تفریق و نزاع سے مطلق متاثر نہ ہونے دیں۔

نیاز

ایک نہایت ضروری اعلان

ہم نے دورانِ جنگ میں بھی "نگار" کی قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا لیکن اب کاغذ کی گرانی و کمیابی، طباعت کی دشواری اور مصارف عملہ کی غیر معمولی زیادتی سے مجبور ہو کر نگار کے سالانہ چندہ میں ایک روپیہ کا اضافہ کیا جاتا ہے اور آیندہ جو صاحب نگار کا وی پی طلب فرمائیں گے ان کو چھ روپیہ چار آنے کا وی پی بھیجا جائے گا۔ لیکن جو حضرات جوبلی نمبر سے اپنی خریداری شروع کریں گے ان سے چندہ صرف پانچ روپیہ لیا جائے گا، البتہ جوبلی نمبر کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ان کو زیادہ دینی پڑے گی۔

منیجر "نگار"

تہذیب ہند کی قدامت

اگر تہذیب و مدنیت کی دُنیا میں، افریقہ دریائے نیل کی وادیوں پر، اور مشرقِ ادنیٰ دجلہ و فرات سے سیراب ہونے والی زمین پر فخر کر سکتا ہے، تو مشرقِ بعید بھی مقرد بابل کے دوش بدوش، ہندوستان کے اُن میدانوں اور کوہستانوں کو پیش کر سکتا ہے، جہاں (عہدِ قدیم کے اُس دور میں، جب یونان و روما کی تہذیب، مستقبلِ بعید کی تاریکی میں معدوم تھی، جب طرائیؔ اور مسنا کی بنیاد کو بھی زمین نے قبول نہ کیا تھا، جب داؤد کے نغموں سے دنیا نا آشنا تھی، جب ہومر کے گیتوں سے زمانہ آگاہ نہ تھا، جب کہ مسیح کے پیدا ہونے کو پورے چار ہزار برس باقی تھے، جبکہ ابراہیم خلیل اللہ کسی بتکدہ کو توڑ کر دینِ حنیف کی بنیاد ڈالنے کے لئے دُنیا میں نہ آئے تھے) اگر آریہ قوم کے مرد ایک لوائے فتح و نصرت بلند کئے ہوئے تھے تو دوسری طرف ان کی عورتیں اپنے بچّوں کو وہ لوریاں سنایا کرتی تھیں، جو بعد کو روما و یونان کے عہدِ زریں میں اُن کے علم الاصنام کے لئے بیش بہا سرمایہ ثابت ہوئیں۔

تاریخ ہند کے ساتھ اہلِ مغرب کا سلوک

ظاہر ہے کہ جو ملک اپنی تاریخی حیثیت سے اس قدر قدیم ہوگا، جس کی آبادی اپنی تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے اس درجہ پیش رَو ہوگی اس کی تاریخ کا سراغ آج جبکہ تقریباً چھ ہزار برس کا زمانہ گزر گیا ہے، کیا کچھ دلچسپ نہ ہوگا اور اُس کی داستان اپنے اندر کیا کیا عجائب و غرائب نہ رکھتی ہوگی۔ لیکن دُنیا کا کیسا افسوسناک واقعہ ہے کہ مغرب جسے عہدِ حاضر میں اپنی ترقی علم و حکمت پر ہزاروں نازہیں اور جو اپنی تحقیق و تنقید کے زعم پر ہر غیر معلوم شے کو احاطۂ علم میں لے آنے کا مدعی ہے، اس وقت تک ہندوستان کو اس سے زیادہ نہ سمجھ سکا کہ وہ "ایک معمہ ہے ناقابلِ فہم" اور "ایک راز ہے سربستہ"۔

حقیقت یہ ہے کہ مسایلِ شرقیہ میں مغرب کی تحقیق جستجو ہے، مادہ کی روحانیت کی دُنیا میں، اور اس لئے اس دورِ مادہ پرستی میں، یورپ شاید وہ نگاہِ حقیقت شناس جس سے دُنیا کے صحیح اخلاق دیکھے جا سکتے ہیں، پیدا نہیں کر سکتا اور اسی لئے مغرب کے نزدیک نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام مشرق جہل و تاریکی کی دُنیا ہے، اور اُسے یہاں اجوبہ پرستی کے

ہوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

یورپ کے اکثر مورخین نے، جو حالت و صورت مشرق اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان بادشاہوں کی پیش کی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ایک خونخوار ہستی جس کا دل جذبات سفاکی و بیرحمی سے لبریز ہے، سریر آرائے سلطنت ہے چاروں طرف خوشامد کرنے والے اس کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، رعایا کو تباہ کر کر کے خزانہ بھرا جا رہا ہے، لہو و لعب، سیر و تفریح یا حرم کی اندرونی زندگی پر بے دریغ دولت صرف کی جا رہی ہے، درباریوں نے اپنی زمین بوسی اور جبہ سائیوں سے اس کے آستانہ کو بارگاہ خداوندی سے ملا دیا ہے، اور وہ اگر کبھی شراب کے نشہ سے چونک پڑتا ہے تو سوائے جور و ظلم کے اس سے اور کوئی حرکت سرزد نہیں ہوتی نہ اس کے پاس دماغ ہے نہ دل، نہ وہ سوچ سکتا ہے نہ محسوس کر سکتا ہے، روحانیت سے اسے سروکار نہیں، ارتقاءِ ذہنی سے اُسے واسطہ نہیں، نہ اُسے علوم و فنون کی ترقی کی طرف توجہ ہے نہ ملک کی فلاح و بہبودی کا خیال۔ الغرض وہ جہل و غرور بیدردی و بیرحمی، خونخواری و سفاکی کا ایسا زبردست مجسمہ ہے جس کی نظیر دُنیا کا کوئی ملک پیش نہیں کر سکتا۔

لیکن کیا وہ شخص جس نے مشرق کی تاریخ کا غایر مطالعہ کیا ہے، اس بیان میں صداقت کا کوئی شائبہ پا سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔

تاریخ ہندوستان کے تین دَور

بہ لحاظِ تاریخ اس وقت تک ہندوستان پر تین دَور گزر چکے ہیں۔ پہلا دَور وہ جس میں دو قومیں بہ حیثیت قوم ہونے کے باہم متصادم ہوئیں۔ دوسرا دَور وہ جب دو مذہب ایک دوسرے سے ٹکرائے اور تیسرا دَور وہ جب ہندوستان نے اپنے کو ایک اجنبی قوم کی حکومت میں دیدیا۔

دَورِ اول، جب آریہ قوم نے ہندوستان کی قدیم آبادی کو مفتوح کیا اور دورِ ثالث، جب مغرب کا اقتدار قائم ہوا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ دورِ ثانی یعنی مسلمانوں کا دورِ حکومت ہمارا موضوع ہے اور اسی عہد کی نمایاں خصوصیات اس وقت پیش کی جاتی ہیں۔

مسلمان فرمانرواؤں کا طرزِ حکومت

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کے حملہ نے نہ صرف یہاں کی معاشرتی و سیاسی فضا کو بدل دیا، بلکہ ذوقِ علم و تہذیب میں بھی زبردست انقلاب پیدا کر دیا جس کے نشانات سرزمینِ ہند پر ہر جگہ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

لیکن ہم نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر اسلام کی تعلیمات سے سرِمو انحراف نہیں کیا، ہم اس کے بھی قائل نہیں کہ یہاں کا ہر مسلمان فرمانروا اپنے عہد کا جنید و شبلی تھا، اس نے کبھی کوئی ظلم و ستم نہیں کیا، مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ جو کچھ مسلمان فرمانرواؤں نے ہند اور اہلِ ہند کے ساتھ کیا، جس حد تک انھوں نے ہندوستان کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیا اور جس قدر اسباب ترقی باشندگانِ ہند کے لئے اُنھوں نے فراہم کئے، وہ دوسری حکمراں قوموں کے لئے ہر طرح قابلِ تقلید ہیں۔

تسلّط سے قبل مسلمانوں کی سختی ضروری تھی

یقیناً جب ہمالیہ کی طرف سے مسلمانوں کے حملے شروع ہوئے تو ہندوستان کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا اور اہلِ ہند کے

جذبات کو بھی شدید صدمہ پہونچا۔ ان کے قدیم مدارس و معابد تباہ ہوئے، ان کے اسلاف کی بہت سی یادگاریں فنا ہو گئیں، ان کا امن و سکون تباہ ہوا۔ لیکن اس کا سبب یہ تھا کہ اُس وقت تک مسلمانوں کی مستقل حکومت ہندوستان میں قائم نہ ہوئی تھی اور وہ زمانہ جو حملہ اور قیام سلطنت کے درمیان بسر ہوتا ہے، ہمیشہ اسی نوع کی تکالیف و مصائب کا ہوا کرتا ہے۔

مسلمان ہندوستان کو فتح کرنا چاہتے تھے۔ اہلِ ہند مقابلہ کر رہے تھے۔ مسلمان جو ہندوؤں کے مذہب سے بالکل مختلف مذہب رکھتے تھے بالکل جدید خیالات و اعتقادات کو روشناس کرنا چاہتے تھے اور ہندو ان سے سخت متنفر تھے۔ پھر ظاہر ہے کہ دو مختلف عناصر کے تصادم میں ہمیشہ شور و ہنگامہ ہی کرتا ہے اور اس کا علاج مسلمانوں کے پاس کچھ نہ تھا۔

مرہٹے سرزمین مہاراشٹر سے خروج کر کے صرف دکن تک پہونچتے ہیں اور وہ سب کچھ کر دکھاتے ہیں جو دنیا میں ایک ظالم ترین قوم کی طرف سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ لیکن محمود کی بت شکنی آج یورپ کی بدولت ہر بچہ کی زبان پر ہے اور مسلمان عورتوں کی وہ آبرو ریزیاں جن کی یاد تقریباً دکن کی ہر مقدس مسجد کی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہے کسی کو نہیں معلوم۔

قیامِ سلطنت کے بعد مسلمانوں کی رواداری

وہ شخص جس نے تاریخ ہند کا مطالعہ کیا ہے سمجھ سکتا ہے کہ جب ڈیڑھ دو صدی کے بعد مسلمانوں کا تسلط اچھی طرح قائم ہو گیا، جب حقیقی معنی میں اسلامی سلطنت کی بنیاد ہندوستان میں مستحکم ہو گئی تو پھر پھیلا امن و سکون عود کر آیا اور ہندوؤں کو تمام وہ مراعات دی گئیں جو ایک غیر متعصب فرمانروا کی طرف سے دی جا سکتی ہیں۔ ان کے معابد محفوظ رکھے گئے۔ انکی جاگیریں بحال کی گئیں، ان کے مدارس کو سرکاری امداد دی گئی، نظام حکومت میں انھیں نمایاں حصہ دیا گیا، ان کے جذبات مذہبی کا خاص لحاظ رکھا گیا اور میدانِ ترقی میں فاتح و مفتوح، حاکم و محکوم کے درمیان کوئی امتیاز پیدا نہیں کیا گیا۔ جس کی متعدد مثالیں آپ آیندہ صفحات میں پائیں گے۔

تاریخ سندھ کے اہم واقعات

(۱۰۰۰ قبل مسیح سے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک)

سندھ نام اس قطعۂ زمین کا ہے جو دریائے سندھ (قدیم سندھو) کے ڈیلٹا اور اس کی نچلی وادی پر مشتمل ہے۔

۱۰۰۰ قبل مسیح سے لیکر ۵۰۰ قبل مسیح تک یہاں آریہ قوم آباد تھی اور انھیں کی حکومت تھی۔ لیکن جب دارا نے اس کو فتح کیا تو یہ فارس کی حکومت میں شامل ہو گیا۔ یہاں تک کہ سکندر اعظم نے ۳۲۵ قبل مسیح میں حملہ کر کے فارس کی حکومت کو ختم کر دیا۔ سکندر کی روانگی کے بعد سندھ پہلے سلطنت mauriyan میں شامل ہو گیا اور پھر Baetrian یونانیوں کی حکومت میں۔

پہلی صدی قبل مسیح سے لیکر ساتویں صدی عیسوی تک وسط ایشیا کی مختلف جنگجو قوموں نے تاخت کی اور آخر کار انھیں میں سے ایک قوم جسے Ephthalites یا White Huns کہتے ہیں یہاں مستقل طور پر آباد ہو گئی اور اس نے اپنی حکومت قائم کر لی جسے رائے خاندان کی حکومت کہتے ہیں۔

اس خاندان کو چچ برہمن نے ختم کیا جو رائے حکومت میں وزیر کی حیثیت رکھتا تھا اور جب محمد بن قاسم ثقفی نے (اموی خلیفہ ولید کے زمانہ میں) ۷۱۲ء میں سندھ پر حملہ کیا تو چچ کا بیٹا داہر یہاں حکمراں تھا۔

محمد بن قاسم نے دو سال کے اندر بندرگاہ دیبل (کراچی)، نراکوٹ (حیدرآباد)، الور (پایۂ تخت) اور ملتان کو تسخیر کر لیا۔ لیکن وہ اس مفتوحہ علاقہ کا ٹھیک انتظام نہ کر چکا تھا کہ ولید کے بعد سلیمان خلیفہ ہوئے اور انھوں نے محمد بن قاسم کو واپس بلا لیا۔ کیونکہ یہ حجاج کے آدمی تھے اور حجاج سے سلیمان سخت برہم تھے۔ اسکے بعد متعدد مسلمان گورنر یہاں رہے لیکن اموی خلافت کا اثر یہاں روز بروز ضعیف ہوتا گیا یہاں تک کہ ۸۷۱ء میں بالکل ختم ہو گیا اور دو عرب سرداروں نے ملتان اور منصورہ میں اپنی مستقل حکومتیں قائم کر لیں۔ جب محمود غزنوی نے حملہ کیا تو ابوالفتح داؤد، سندھ اور ملتان کا گورنر تھا، لیکن چونکہ یہ قرامطہ[1] کی جماعت سے تعلق

---

[1] ۲۷۸ھ میں زنج کی لڑائی کے بعد عربوں کی جن جماعتوں نے زیریں حصۂ عراق میں مستبدانہ حکومت کے خلاف سر اٹھایا تھا انھیں قرامطہ کہتے ہیں ان کی تحریک ایک قسم کی اشتراکی تحریک تھی جو نویں صدی ہجری سے لیکر بارھویں صدی تک بغداد و خراسان وغیرہ تمام اسلامی دنیا میں پھیل گئی اور سلطنت اسلام کی بنیاد متزلزل کر گئی۔

رکھتا تھا، اس لئے محمود نے اسے معزول کر کے اپنا گورنر مقرر کیا۔

۱۰۵۳ء میں ایک راجپوت قوم سُمرا نے زیریں وادی میں اپنی حکومت قایم کرلی لیکن بالائی حصہ بدستور غزنویوں کے پاس رہا۔ جسے بعد کو معزالدین بن سام نے فتح کر کے غوری حکومت میں شامل کرلیا۔ لیکن اس کے نائب ناصرالدین قباچہ نے قطب الدین ایبک فرمانروائے دہلی کی اطاعت قبول کرلی۔ جب قطب الدین ایبک کے بعد شمس الدین التمش تخت نشین ہوا تو قباچہ نے اطاعت کرنے سے انکار کر دیا، لیکن التمش نے اس کو زیر کرلیا۔

چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں علاؤالدین خلجی کی فوجوں نے حملہ کر کے سُمرا خاندان کو بھی ختم کر دیا لیکن ۱۳۳۳ء میں ایک اور راجپوت قوم سَما جو مسلمان ہو گئی تھی یہاں کی حکمراں بن گئی اور جام کا لقب دے کر اس نے اپنے سردار کو یہاں کا فرماں روا بنا دیا۔

۱۳۵۱ء میں جب سندھ میں بغاوت ہوئی تو محمد بن تغلق نے چڑھائی کر دی لیکن اسکی عمر نے وفا نہ کی اس کے بعد اس کے جانشین فیروز تغلق نے سَما خاندان کی حکومت کو ختم کر دیا۔

بعد کو جب دہلی کی حکومت میں ضعف پیدا ہوا تو سَما خاندان کو پھر عروج ہوا، جس میں جام نندا یا نظام الدین نے (۱۵۰۹ء تک) ۴۶ سال حکومت کی۔

۱۵۲۰ء میں شاہ بیگ ارغون نے (جسے بابر نے قندھار سے نکال دیا تھا) سندھ پہونچکر سَما خاندان کے آخری فرمانروا جام فیروز کو گجرات کی طرف بھگا دیا اور اپنی حکومت قایم کرلی — ہمایوں نے دو بار سندھ کو فتح کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔

شاہ حسین کی وفات پر (۱۵۵۴ء) جو ارغون خاندان کا آخری بادشاہ تھا، ایک دوسرا خاندان ترخان یہاں کا حکمراں ہو گیا، لیکن ۱۵۹۲ء میں اکبر نے اس کے آخری حکمراں مرزا جانی بیگ ترخان کو شکست دیکر اس حصۂ زمین کو صوبۂ ملتان میں شامل کر دیا۔

زیریں حصۂ سندھ میں سترھویں صدی تک داؤد پوتر خاندان برسر اقتدار رہا لیکن ۱۷۰۱ء میں کلہوڑا خاندان نے اس کو شکارپور سے نکال دیا اور اورنگ زیب سے بہت بڑی جاگیر معافی کی حاصل کرلی۔ اس کے بعد ۴۰ سال تک ان کی قوت بڑھتی رہی لیکن ۱۷۴۰ء میں نور محمد کلہوڑا سے نادر شاہ خفا ہو گیا اور دریائے سندھ کے مغربی ساحل کا علاقہ مع شکارپور اور سیبی کے چھین لیا۔ ۱۷۵۴ء میں احمد شاہ ابدالی نے نور محمد کو جیسلمیر کی طرف بھگا دیا۔ لیکن اس کے بیٹے محمد مراد یار خاں نے احمد شاہ کو راضی کر کے پھر اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لے لیا۔

۱۷۶۸ء میں اس کے بھائی غلام شاہ نے نیرنکوٹ کے کھنڈروں پر حیدرآباد کی بنیاد قایم کی۔ ۱۷۸۳ء کے بعد بلوچیوں کے ایک قبیلہ تالپور نے بغاوت کی اور کلہوڑا خاندان کے فرمانروا نے اس قبیلہ کا ایک شخص اپنا وزیر مقرر کر کے فتنہ کو دبا

دیا۔ لیکن ۱۷۸۱ء میں یہ قتل ہوگیا تو اس کے بیٹے عبداللہ خاں نے، عبدالنبی کو جو کلہوڑا خاندان کا آخری فرمانروا تھا، قلات کی طرف بھگا دیا۔ اس کے بعد جب عبدالنبی نے پھر اپنا کھویا ہوا تخت واپس لیا تو عبداللہ خاں کو قتل کرا دیا۔ لیکن اس کے ایک عزیز میر فتح علی نے عبدالنبی کو شکست دیکر جودھپور کی طرف بھگا دیا اور ۱۷۸۳ء میں اپنی حکومت قائم کرلی جو بعد کو خاندان کے مختلف افراد میں تقسیم ہوکر حیدرآباد ۔ میرپور اور خیرپور تین جگہ بٹ گئی۔

۱۸۳۸ء میں جب پہلی افغان لڑائی ہوئی تو سندھ کی اول الذکر دو حکومتوں نے انگریزی فوج کا مقابلہ کرکے آگے بڑھنے سے روکنا چاہا، لیکن ۱۸۴۳ء میں سرچارلس نپیر نے انھیں شکست دی اور ان کا علاقہ انگریزی حکومت میں شامل کرلیا۔ میر علی مراد خیرپور کا فرمانروا انگریزوں کا وفادار رہا اس لئے اس کا علاقہ بحال رکھا گیا۔

اس کے بعد سے سندھ برطانوی حکومت میں شامل رہا اور اب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پورے ایک سو چار سال کے بعد پاکستان کی مسلم حکومت میں شامل ہوگیا۔

سندھ میں مسلمانوں کی سب سے پہلی حکومت

اہل عرب مغربی ہند کے سواحل سے بے خبر نہ تھے کیونکہ زمانۂ قدیم سے عرب کے تاجروں کی آمد و رفت یہاں پائی جاتی تھی اور یہ لوگ خلیج فارس کو عبور کر کے دریائے سندھ کے دہانہ تک اور وہاں سے تیپر اور کمبایت (Cambay) اور کبھی کبھی کالی کٹ (Calicut) و ساحلِ مالابار کی دیگر بندرگاہوں تک پہونچ جاتے تھے، لیکن فوجی مہم سب سے پہلے سنہ ۱۵ھ میں ساحلِ ہند پر روانہ کی گئی جو (بمبئی کے قریب) تھانہ پر قابض ہو کر بھر وچ تک پہونچ گئی اور اس کے بعد خلیج فارس کے عربوں نے متعدد بار ساحلِ ہند پر اپنی فوجیں پھیلا دیں، لیکن ان سب کا شمار "فوجی تاخت" میں تھا۔ باقاعدہ جنگ سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا۔

عربوں کا سب سے پہلا باقاعدہ حملہ ہندوستان پر مکران کی طرف سے ہوا جو انتہائے مشرق میں خلافت کا ایک دور دراز صوبہ تھا اور چونکہ سرحدِ ہند پر کوئی قدرتی مانع موجود نہ تھا، اس لئے مکران کے گورنروں نے متعدد بار حملے کئے لیکن ان حملوں نے بھی ہندوستان میں کسی سلطنت کی بنیاد نہیں ڈالی اور نہ عرب سپاہ اندرون ملک میں اقتدار حاصل کر سکی۔

آخر کار خلافت بنی امیہ میں حجاج نے اس جانب توجہ کی اور اس نے ایک طرف حدود تاتار میں قتیبہ کو نامزد کیا اور دوسری طرف محمد قاسم کو ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔

محمد قاسم کے حملۂ سندھ کا افسانہ حقیقتاً ایک تاریخی رومان (Romance) ہے۔ ہندوستان کی حالت یہ تھی کہ اسوقت تک عربوں کا یہاں گزر نہیں ہوا تھا، آبادی سخت جنگجو تھی اور اس کے اخلاق و اطوار مذہبی عقاید اور معاشرتی خصایل عربوں کے عادات و معتقدات سے بالکل مختلف تھے۔ مرکزِ خلافت اور اس کے درمیان کوہستانوں، دریاؤں، اور صحراؤں کا غیر متناہی سلسلہ حایل تھا۔ لیکن اس کی کچھ پروا نہیں کی گئی اور ایک نوجوان عرب جس کی عمر صرف سترہ سال کی تھی اور جس کو نبرد آزمائی کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا، اس اہم خدمت پر مامور کر دیا گیا اور وہ صرف چند ہزار سواروں کے ساتھ ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہو گیا۔

جس وقت محمد قاسم، مکران ہوتا ہوا ساحلِ فارس پر پہونچا تو وہاں کا گورنر بھی اپنی سپاہ لیکر شریک ہو گیا اور منجنیقیں بھی محاصرہ کے لئے دریا کے راستہ سے دیبل پہونچ گئیں۔

فتح دیبل

۹۳ھ / ۷۱۲ء کے موسم بہار میں محمد قاسم نے خندقیں کھود کر منجنیقیں نصب کیں اور دیبل[1] کا محاصرہ کرلیا۔

فتح دیبل کے بعد محمد قاسم نے چار ہزار سپاہی دیبل میں چھوڑے اور خود بقیہ سپاہ کے ساتھ دریائے سندھ کے داہنے ساحل پر دشمن کی مرکزی فوج کی فکر میں روانہ ہوا۔ آگے بڑھ کر معلوم ہوا کہ دشمن کی چوکیاں دوسری طرف ہیں۔ اس لئے اس نے بہت سی کشتیاں ایک دوسرے سے باندھ کر پل سا طیار کرایا اور ان میں تیر اندازوں کو بٹھا کر دوسری طرف پہونچایا۔ دشمن نے کوشش کی کہ اسلامی فوج ساحل پر نہ اُتر سکے لیکن کامیابی نہیں ہوئی اور اسے مجبوراً آورتک پسپا ہو جانا پڑا، جہاں سب سے پہلے عربوں نے ہندو سرداروں کی کثیر جماعت (جو آہن پوش ہاتھیوں پر سوار تھی) مقابلہ کے لئے آمادہ دیکھی، داہر راجہ ان سب کا سردار تھا۔ محمد قاسم نے حکم دیا کہ پتھروں کے ذریعہ سے روغن نفط ہاتھیوں پر پھینکا جائے۔ اس ترکیب سے ہاتھی ڈر کر بھاگے، ہودوں میں آگ لگ گئی اور راجہ داہر مارا گیا۔

برہمن آباد اور ملتان کی فتح

اس کے بعد دوسری فتح برہمن آباد[2] میں ہوئی اور اب ملتان کا راستہ صاف ہو گیا، جہاں محاصرہ کرکے اس کو بھی مفتوح کرلیا۔ چونکہ ملتان فتح ہو جانے سے دریائے سندھ کی وادی پر پورا اقتدار مسلمانوں کا قائم ہو چکا تھا اور ہندو فرمانرواؤں نے

---

[1] دیبل، کراچی، ٹھٹھہ، لاہوری بندر۔ میر معصوم نے دیبل، ٹھٹھہ اور لاہوری بندر، کو ایک ہی مقام قرار دیا ہے۔ اسی طرح فرشتہ نے بھی لکھا ہے کہ قدیم دیبل موجودہ ٹھٹھہ ہے۔ موجودہ عہد کے مورخین بھی اس طرف گئے ہیں، چنانچہ ایرانی بھی ٹھٹھہ کے شمال کو "شالی دیبل" کہتے ہیں۔ بلاذری نے بھی خلیج دیبل کا ذکر کرتے ہوئے جہازوں کا یہاں آنا بیان کیا ہے۔ اسی طرح ابن حوقل نے بیان کیا ہے کہ دیبل سمندر کے ساحل پر ایک بڑا بندر ہے۔ صاحب مراصد الاطلاع نے بھی تحریر کیا ہے کہ دیبل ساحلِ بحرِ ہند کا مشہور بندر اور بڑی تجارت گاہ ہے۔ اس سے یہ امر بالکل صاف ہو گیا کہ دیبل ساحل پر واقع تھا اور موجودہ کراچی کے سوا کوئی دوسرا مقام نہیں ہو سکتا۔

[2] برہمن آباد، منصورہ، محفوظہ۔ فتوحاتِ عرب سے قبل زیریں حصہ سندھ کا دارالحکومت برہمن آباد تھا۔ اس مقام کا قدیم نام حسب روایت بیرونی بہمنی یا بہمنوا تھا۔ اشکال البلاد میں "بامی وان" لکھا ہے ابن حوقل "تامی راوان" اور "مامی وان" لکھتا ہے۔ ادریسی نے "میران"، مصنف چچ نامہ نے "بہن واد" اور مصنف تاریخ طاہری نے "بہن واہ" تحریر کیا ہے۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ برہمن آباد سے مراد کالا کوٹ ہے مگر چچ نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دریائے سندھ کے مشرقی جانب آباد تھا اس لئے حسب تحقیق مسٹر الیٹ، کالا کوٹ اور ٹھٹھہ کا قیاس غلط ہے بلکہ برہمن آباد وہیں یا اس کے قریب کسی جگہ پر واقع تھا جہاں اب حیدر آباد ہے۔

بلاذری کا بیان ہے کہ منصورہ، برہمن آباد سے دو فرسنگ کے فاصلہ پر واقع تھا، اور محمد قاسم کے عہد میں برہمن آباد مٹ کر جنگل ہو گیا تھا، اس لئے گمان غالب ہے کہ منصورہ میں برہمن آباد کے کھنڈروں کا ایک حصہ ضرور شامل ہو گیا ہوگا چونکہ حیدر آباد ۵۰ فٹ مرتفع سطح کی پہاڑی پر واقع ہے اور اس سے زیادہ نمایاں مقام تعمیر دارالحکومت کے لئے اور کوئی نہ ہو سکتا تھا، اس لئے یہ ظن یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ برہمن آباد، منصورہ اور موجودہ حیدر آباد (سندھ) ایک ہی چیز ہیں۔ یا یہ کہ ایک ہی قطعہ زمین میں یہ تینوں شہر تعمیر ہوئے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۰ پر ملاحظہ ہو)

وہاں کے لوگوں پر بہت مظالم کر رکھے تھے اس لئے جاٹ[1]، میدؔ اور دوسری قومیں اظہار اطاعت میں ڈھول اور گھنٹیاں بجاتی ہوئی حاضر آئیں اور مطیع ہو گئیں۔ محمد قاسم نے ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری لی اور ان کے تمام معابد بھی ستور باقی رکھے گئے علاوہ اس کے برہمنوں کو بڑے بڑے عہدے دئے گئے۔

محمد قاسم نے اپنے تمام افسروں کو نہایت سختی سے حکم دیا کہ راعی و رعایا کے درمیان پوری ایمانداری کا طرز عمل اختیار کیا جائے جو جس کا حصہ ہے دیانت سے دیا جائے، محصول اتنا مقرر نہ کیا جائے جو لوگوں کے لئے بار ہو، اور نہ کسی کو کوئی تکلیف پہونچائی جائے۔ اسی زمانہ میں حجاج کا انتقال ہو گیا اور خلافتہ بھی بدل گئی جو حجاج کی مخالف تھی، اسی لئے محمد قاسم کو واپس جانا پڑا۔

اس میں شک نہیں کہ عربوں کا سندھ فتح کر لینا تاریخ ہند کے اہم واقعات میں سے ہے، لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا کیونکہ خود مرکز خلافتہ میں اختلاف باہمی کی وجہ سے ضعف پیدا ہو گیا تھا اور محمد قاسم کے بعد کوئی مہم اس طرف روانہ نہیں کی گئی، جو فتوحات کے سلسلہ کو سندھ کے ریگستانوں سے آگے بڑھا دیتی۔ بالآخر جو جماعتہ مسلمانوں کی یہاں رہ گئی تھی اس میں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۶) خال ہی حیدرآباد سے ۴۷ میل شمال مشرق کی طرف ایک کھنڈر زمین سے برآمد ہوا ہے جس کی نسبت آثاریین کا خیال ہے کہ یہ برہمن آباد کے کھنڈر ہیں یہاں بہت سے سکے بھی منصور، عبدالرحمن، محمد، عبداللہ اور عمر کے عہد کے دستیاب ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ کوئی ہندوؤں کا سکہ برآمد نہیں ہوا ہے اس لئے اس کو برہمن آباد یقین کرنے میں تامل ہو سکتا ہے۔

محفوظہ کا صحیح مقام نہیں معلوم ہو سکا سوائے اس کے کہ ابن حوقل اور بیرونی اس کے جائے وقوع کو دریائے سندھ کی مشرقی دلدل سے اور منصورہ کو مغربی دلدل سے متعلق کرتے ہیں۔ سلطان فیروز شاہ کے عہد میں امیر ناصر نے ایک شہر ناصر پور کے نام سے سندھ میں تعمیر کرایا تھا اور خیال کیا جاتا ہے کہ ناصر پور یا تو محفوظہ ہی کا دوسرا نام ہے یا اسی جگہ دوسرا شہر تعمیر کرا کے اس کا نام ناصر پور رکھ دیا گیا۔

[1] جب مسلمان اول اول سندھ میں آئے تو یہاں دو قومیں کثرت سے آباد تھیں، جاٹ اور میدؔ اور ان دونوں میں سخت اختلاف تھا۔ میدوں کا اصلی مسکن پنجاب تھا اور جاٹوں کا سندھ (ہر چند اب جاٹ پنجاب کے ہر حصہ میں پائے جاتے ہیں اور تقریباً اکثر مسلمان ہیں)

میدوں کا ذکر عرب مورخین نے اکثر جگہ کیا ہے۔ مجمل التواریخ میں جاٹ اور میدؔ قوموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ حام بن نوح کی اولاد میں سے شمار کئے جاتے تھے اور دریائے سندھ کے ساحل پر آباد تھے میدیوں اور جاٹوں میں اکثر لڑائی رہا کرتی تھی مجبوراً رفع فساد کی غرض سے ان دونوں نے اتحاد کر کے دریودھن بادشاہ ہستناپور کے پاس ایک وفد روانہ کیا کہ کوئی حکمراں ان پر مقرر کرے چنانچہ اس نے اپنی بہن دسالا کو وہاں حکومت کرنے کے لئے متعین کیا۔ اسی سلسلہ میں تیس ہزار برہمن بھی ہندوستان سے منتقل ہو کر سندھ میں آباد ہو گئے۔

بھی اس قدر ضعف پیدا ہوگیا کہ بیس سال بعد انھیں خود اپنی حفاظت و پناہ کے لئے ایک خاص شہر محفوظہ کے نام سے بنانا پڑا اور خلفاء بغداد نے سندھ کے قبضہ کو غیر مفید سمجھ کر اس طرف توجہ نہ کی۔

بعد کو مستعمرین عرب نے یہاں ملتان اور منصورہ میں علٰحدہ علٰحدہ خود مختار حکومتیں قایم کرلیں۔ اور جب چوتھی صدی ہجری کے ابتدا میں مسعودی[1] یہاں آیا ہے تو قبیلۂ قریش کا ایک خاندان اس جگہ حکمراں تھا۔ اس کے چند دن بعد ایک اور سیاح ابن حوقل[2] سندھ میں آیا اس نے لکھا ہے کہ "اس وقت سندھ میں عربی اور سندھی زبان بولی جاتی تھی اور ہندو مسلمانوں کے درمیان برادرانہ تعلق پایا جاتا تھا۔"

اس کے بعد جب مصر میں خلفاء کا عروج ہوا تو قرامطہ وہاں سے بھاگ کر یہاں آئے اور ملتان میں پناہ گزیں ہوئے لیکن محمود غزنوی کے حملہ نے ان کی قوۃ کو بھی گھٹا دیا۔

یہ تھا اجمالی بیان مسلمانوں کے حملۂ سندھ کا۔ اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ بتائیں گے کہ حملہ کی ابتدا سے یہاں کون کون سے گورنر خلافت کی طرف سے متعین کئے گئے، یہاں کی حکومت اسلام میں کیونکر آہستہ آہستہ زوال شروع ہوا اور اسکے اسباب کیا تھے۔

---

[1] مروج الذہب (مسعودی) کے مصنف کا نام ابوالحسن ہے اور مسعودی کے نام سے اس لئے مشہور ہے کہ اسکے مورث اعلیٰ کا نام مسعود تھا (وہی مسعود جن کے لڑکے عبداللہ نے آنحضرت کے ساتھ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی تھی) مسعودی کی زندگی زیادہ تر سیر و سیاحت میں بسر ہوئی۔ قریب قریب تمام وہ مقامات جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی اس نے جاکر دیکھے۔ وہ خود بیان کرتا ہے کہ اسنے مغرب (مراکش و ہسپانیہ) کا سفر اس قدر کیا کہ مشرق کو بھول گیا اور مشرق (چین) میں اتنی سیاحت کی کہ مغرب فراموش ہوگیا۔ یہ فطرتاً نہایت غایر مطالعہ کرنے والا سیاح تھا۔ اسی کی سیاحت کا نتیجہ "مروج الذہب" ہے۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ "مسعودی نے مشرق و مغرب کے ان اقوام و ممالک کے حالات لکھے ہیں جو اس کے زمانہ (یعنی سنہ ۳۳۲ھ میں پائے جاتے تھے) اسنے اقوام کے مراسم، ممالک کا جغرافیہ، وہاں کے پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں، سلطنتوں اور مشہور خاندانوں کے حالات لکھے ہیں۔ اور تمام مورخین مابعد اس کا تتبع کرتے ہیں۔"

[2] اشکال البلاد یا کتاب المسالک والممالک (ابن حوقل)۔ ابن حوقل کا اصلی نام محمد ابوالقاسم تھا۔ یہ بغداد کا رہنے والا تھا۔ اس کے کم سنی ہی زمانہ میں خلافت بغداد ختم ہوکر ترکوں کے قبضہ میں جاچکی تھی۔ جب یہ جوان ہوا تو اس نے معلوم کیا کہ اسکی تمام جائداد ضایع ہوچکی ہے اس لئے اس نے سیاحت و تجارت کو اپنا کسب معاش کا ذریعہ قرار دیا۔ اس نے ۳۳۱ھ/۹۴۲ء میں بغداد کو خیرباد کہا اور بہت سی مسلمان حکومتوں کی سیاحت کرکے ۳۵۷ھ/۹۶۸ء میں اپنے وطن واپس گیا۔ اس کے دوسرے سال وہ افریقہ گیا اور ۳۶۶ھ/۹۷۶ء میں اس نے اپنی تصنیف مکمل کی۔ اس نے بھی اپنی کتاب کا وہی نام رکھا جو اصطخری نے رکھا تھا، ابن حوقل لکھتا ہے کہ "اصطخری کی تصنیف ہر جگہ میرے ساتھ رہی ہے۔"

(۲)

جب خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق (۱۳-۲۳ھ / ۶۳۴-۶۴۴ء) نے عثمان ابن ابی العاص ثقفی کو بحرین و عمان کا حاکم مقرر کیا تو انھوں نے اپنے بھائی حکم (ثقفی) کو بحرین کی حکومت سپرد کر کے حکم دیا کہ ساحل ہند پر حملہ کریں چنانچہ انھوں نے کشتیوں کے ذریعہ سے دریائی سفر کی سخت و صعب منزلیں طے کر کے سب سے پہلے ۱۵ھ / ۶۳۶ء میں تھانہ[1] پر حملہ کیا اور اس کے بعد بھروچ[2] پر جو اس زمانہ میں نیل اور لاکھ کی تجارت کی وجہ سے ہندوستان کا سب سے پُر رونق بندر تھا۔ تاخت کے علاوہ اس نے اپنے بھائی مغیرہ کو دیبل کی طرف روانہ کیا جو سندھ کا مشہور مقام تھا۔ یہ تینوں حملے ۱۵ھ اور ۱۶ھ کے درمیان ہوئے۔

صاحب "فتوح البلدان"[3] کا بیان ہے کہ: "ان حملوں میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی"۔۔۔۔۔

---

[1] فتوح البلدان (بلاذری) میں اس کو تانہ لکھا ہے اب تھانہ مضافات بمبئی کا مشہور مقام ہے لیکن اس وقت بمبئی کا وجود کہیں نہ تھا، تھانہ (تانہ) ہی بارونق و آباد بندر تھا۔۔۔ [2] معجم البلدان (حموی) اور دوسری عربی کتابوں میں بھروچ کو بروج اور بروص لکھا ہے۔

[3] فتوح البلدان کے مصنف کا نام احمد بن یحییٰ بن جابر تھا۔ اس کی عرفیت ابو جعفر اور ابو الحسن تھی لیکن عام طور سے بلاذری کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تیسری صدی ہجری میں عباسی خلیفۂ المتوکل کے دربار سے متعلق تھا اور شاہزادگان کی خدمت اتالیقی اس کے سپرد تھی۔۔۔ اس کا انتقال ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء میں ہوا۔ ابو المحاسن کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہد خلیفہ المعتمد میں بھی بغداد میں رہتا تھا۔ اس کتاب میں (جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے) عربوں کی وہ فتوحات درج ہیں جو شام و عراق، مصر و ایران، آرمینیا و ماوراء النہر، افریقہ و ہسپانیہ و سندھ میں انھیں حاصل ہوئیں۔ یہ کتاب عربی کی قدیم ترین تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے، تاریخ طبری اس کے بعد بغداد ہی میں تحریر ہوئی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ طبری اس سے واقف نہیں تھا کیونکہ بہت کچھ بلاذری میں درج ہے، "تاریخ طبری" میں نظر نہیں آتا۔۔۔ علاوہ بلاذری کے واقدی نے بھی ان فتوحات کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جو اب تاریخ واقدی کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن واقدی کی فتوح السندھ البتہ کمیاب ہے، بلاذری نے واقدی کا حوالہ کہیں کہیں دیا ہے۔

بلاذری خود سندھ نہیں آیا، بلکہ یہاں کے حالات اس نے دیگر معتبر مصنفین کی کتابوں سے حاصل کئے اور کچھ زبانی روایات سے۔ جنھیں لوگوں میں سے ایک شخص ابو الحسن علی بن محمد المدائنی تھا جس سے خود بلاذری نے مل کر گفتگو کی تھی۔ بلاذری نے منصور ابن حاتم اور اسکی تاریخ سندھ کا بھی ذکر کیا ہے اور ابن الکلبی کی تاریخ کا بھی حوالہ دیا ہے۔۔۔ علاوہ فتوح البلدان کے بلاذری نے کتاب البلدان بھی لکھی اور اقوام عرب کے سلسلۂ نسب پر بھی ایک کتاب تصنیف کی اور علاوہ ان کے متعدد کتابیں فارسی سے بھی ترجمہ کیں۔ بلاذری شاعر بھی تھا۔ ابن حوقل و مسعودی وغیرہ (قدیم ماہرین جغرافیہ عرب) نے بحیثیت شاعر ہونے کے اس کا ذکر کیا ہے، لیکن اُس کی تاریخ کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ البتہ ابن اثیر نے ۹۰ھ اور ۹۵ھ کے واقعات درج کرتے ہوئے بلاذری کی تاریخ کا ذکر کیا ہے۔ اس کو بلاذری اسلئے کہتے ہیں کہ وہ بلاذر (ایک نشی چیز) کا عادی تھا۔

چچ نامہ[1] میں لکھا ہے کہ "مغیرہ شہید ہوئے" (یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کی دوسری تاریخیں

---

[1] چچ نامہ، عام طور سے اس کتاب کو کہتے ہیں، جس میں چچ برہمن کی حکومت اور عربوں کی فتوحات سندھ کا حال درج ہے۔ اصل کتاب کی ابتداء و اخیر میں اس مجموعہ کو فتح نامہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مسٹر الفنسٹن نے اپنی تاریخ میں اس کا نام تاریخ ہند و سندھ رکھ لیا ہے اور نور الحق مصنف زبدۃ التواریخ اور نظام الدین احمد مصنف طبقات اکبری، اسے منہاج المسالک کہتے ہیں۔

اصل کتاب عربی میں تھی جسے محمد علی بن حامد بن ابوبکر کوفی نے ناصر الدین قباچہ کے عہد میں فارسی زبان میں منتقل کیا۔

مترجم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصائب زمانہ سے گھبرا کر اپنے وطن چھوڑنے اور اوچ آنے پر مجبور ہوا۔ ۶۱۳ھ میں اس کی عمر ۵۸ سال کی تھی اور صرف چند کتابیں اس کی انیس تھیں۔ اسی خلوت نشینی کے زمانہ میں اُسے محمد قاسم کی فتوحات سندھ پر ایک کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور آلور و بھکر گیا۔ یہاں پہونچکر یہ اسماعیل بن علی سے ملا جو عثمان ثقفی کی اولاد میں سے تھے۔ یہ اپنے عہد کے بڑے فاضل شخص تھے انھوں نے کہا کہ میرے پاس ایک کتاب فتوحات عرب کے متعلق عربی زبان میں موجود ہے جو میرے کسی بزرگ کی لکھی ہوئی ہے۔ چونکہ یہ کتاب معلومات سے لبریز تھی اس لئے محمد بن حامد بہت خوش ہوا اور اس کا ترجمہ فارسی میں کر کے قباچہ کے وزیر کے نام منسوب کیا جس کا نام وہ پورے خطابات اور مناقب کے ساتھ "صدر جہان، دستور صاحبقران، عین الملک حسین ابن ابوبکر بن محمد الاشعری" لکھتا ہے چونکہ اسی وزیر کے اجداد میں ابو موسیٰ اشعری فاتح خراسان و عجم بھی تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ عین الملک سے زیادہ موزوں اور کوئی شخص اس انتساب کے لئے نہ ہوسکتا تھا۔ محمد عوفی نے اپنی کتاب لباب الالباب کو بھی اسی وزیر (عین الملک) نام سے منسوب کیا ہے۔

افسوس ہے کہ مترجم نے اپنے ترجمہ میں جن مقامات کا ذکر کیا ہے اُن کی کوئی تشریح نہیں کی جس سے ان کا جائے وقوع معلوم ہو سکے اس نے اوچ، آلور، اور بھکر وغیرہ میں اپنا جانا بیان کیا ہے جو غالباً دریائے سندھ کے زیریں حصہ کے شہر تھے لیکن اب اُن کی جگہ متعین کرنا بہت دشوار ہے۔

اصل عربی کتاب کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس زمانہ میں مرتب کی گئی تھی لیکن تاریخ کے لحاظ سے اس کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ کتاب قاضی اسماعیل کے پاس سے دستیاب ہوئی تھی جن کا سلسلۂ نسب عثمان ثقفی سے ملتا ہے اور فاتح سندھ بھی اسی قبیلہ سے متعلق تھا (قبیلۂ ثقیف، طائف کا نہایت مشہور قبیلہ تھا) چونکہ اس کتاب میں شہر منصورہ کا کوئی ذکر نہیں ہے جو خلیفہ منصور کے عہد میں (سنہ ۱۳۶ھ) میں تعمیر کیا گیا تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ یہ تصنیف سنہ ۱۳۶ھ سے قبل ہوئی ہوگی۔

اس کتاب میں فتوحات محمد قاسم کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور کثرت سے اس عہد کے مختلف شہروں کے نام دئے گئے ہیں جو ماہرین جغرافیہ کے لئے کافی اسباب جستجو رکھتے ہیں۔

نظام الدین احمد، نور الحق، فرشتہ، میر معصوم وغیرہ نے فتوحات سندھ کے متعلق اس سے بہت مدد لی ہے۔

مثلاً تحفۃ الکرام[۱]، تاریخ معصومی[۲]، تاریخ طاہری[۳]، بیگ لرنامہ[۴]، ترخان نامہ[۵] (ارغون نامہ) چونکہ اکثر و بیشتر چچ نامہ سے

---

[۱] تحفۃ الکرام (مصنفہ علی شیر قانع) کی تین جلدیں ہیں۔ اول جلد کے پہلے حصہ میں انبیاء و ملوک کے علاوہ عہد نبوی کے علماء و حکماء کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں عہد نبوی و خلفاء راشدین کے حالات سے بحث کی گئی ہے اور تیسرے حصہ میں خلفاء بنی امیہ و بنی عباس کا بیان ہے۔ دوسری جلد میں ایک عمومی بحث تمام امراء و ملوک، وزراء و علماء وغیرہ سے کی ہے تیسری جلد میں سندھ کی تاریخ لکھی ہے۔

ہر چند ابتدائی تاریخ سندھ کے متعلق اس میں میر معصوم کی تاریخ سندھ کی طرح مفصل طور سے بحث نہیں کی گئی ہے لیکن پھر بھی بہت سی ایسی باتیں اس میں ملتی ہیں جو تاریخ معصومی میں نہیں ہیں۔

تحفۃ الکرام میں تاریخ سندھ کی ابتداء اُن برہمنوں کے حالات سے کی گئی ہے جو قبل فتوحات عرب وہاں پائے جاتے تھے اس کے بعد فتوحات کا ذکر کیا ہے جو بالکل چچ نامہ سے ماخوذ ہے، اس کے بعد اُن سمرا اور سما خاندان کے گورنروں کا حال ہے جو فرمانروایان دہلی کی طرف سے یہاں مامور تھے، پھر قبائل ترخان اور ارغون کی تاریخ درج کی ہے اور اس کے بعد گورنران تیموریہ و خاندان کلہوڑہ کا حال لکھ کر نصف جلد میں تاریخ سندھ کو ختم کر دیا ہے۔ باقی نصف حصہ میں اس عہد کے مشائخ و سادات، اولیاء و علماء کا ذکر ہے۔

تاریخ اختتام تصنیف ایک جگہ ۱۱۸۱ھ درج کی گئی ہے اور دوسری جگہ ۱۱۸۸ھ اور یہی صحیح ہے کیونکہ اس سنہ کے حالات اس میں پائے جاتے ہیں۔

مصنف تحفۃ الکرام نے جواہر الاولیاء، حدیقۃ الاولیاء، معلومات الآفاق، کا حوالہ دیا ہے، ایک کتاب اسی نام کی جلال الدین سیوطی کی بھی ہے جو اس سے بالکل جدا تصنیف ہے۔

[۲] (تاریخ معصومی) ۔ سندھ کی تمام تاریخوں میں تاریخ معصومی سب سے زیادہ مفصل تاریخ سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس میں نہ صرف فتوحات اہل عرب کا حال درج ہے بلکہ عہد اکبری تک کی تاریخ سندھ اس میں پائی جاتی ہے۔ اس کتاب کے چار طبقے ہیں۔ طبقۂ اول میں راجہ داہر کی ہلاکت تک کا حال درج ہے دوسرے طبقہ میں سندھ کی تاریخ زیر حکومت شاہان دہلی لکھی ہے۔ ہارون الرشید اور محمود غزنوی کے درمیان جو دو صدی کا زمانہ گزرا ہے اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا کہ سندھ کا کیا حال تھا۔ اسی طبقہ میں حملۂ تیمور کے بعد سمرا اور سما خاندانوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ تیسرے طبقہ میں ارغون خاندان کی تاریخ درج ہے اور ہمایوں جب آگرہ سے بھاگ کر سندھ پہونچا تھا، اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ چوتھے طبقہ میں وہ حالات لکھے ہیں جن کی بناء پر سندھ، اکبر کے قبضہ میں آیا۔ اسی طبقہ میں اُس نے اپنی اور اکبر کی ملاقات اور ضلع بھکر میں عطائے جاگیر کا بھی ذکر کیا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۳ - ۴ - ۵ - صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ ہوں)

ماخوذ ہیں اس لئے ان سب کا بیان وہی سمجھنا چاہئے جو چچ نامہ کا ہے۔) یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ میں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۱)

محمد معصوم المتخلص بہ نامی، بھکر میں پیدا ہوا جو سندھ کا ایک شہر تھا۔ اس کا باپ صفائی حسینی باشندۂ کرمان تھا۔ یہ نہایت قابل شخص تھا اور عہد اکبر و جہانگیر میں اس نے کچھ امتیاز بھی حاصل کر لیا تھا۔ اپنے عہد کا اچھا تاریخ داں اور مشہور خوشنویس تھا۔

محمد معصوم نے تاریخ سندھ، سنہ ۱۰۰۹ھ میں مرتب کی اور فتوحاتِ اعراب کے متعلق صرف چچ نامہ کو اپنا ماخذ قرار دیا۔ بعد کو مورخین (مثلاً بدایونی، حیدر رازی، صاحب ماثر الامرا، تحفۃ الکرام، باغ مانی و مرآۃ دولت عباسی نے) تاریخ معصومی سے استفادہ کیا ہے۔

سے تاریخ طاہری کا مصنف میر طاہر محمد نسیانی ابن سید حسین ساکن ٹھٹھا تھا، مصنف کا خاندان ارغون اور ترخان خاندانوں سے سلسلۂ ملازمت رکھتا تھا۔ چنانچہ طاہر محمد نے اپنی کتاب کو شاہ محمد بیگ عادل خاں کے نام سے منسوب کیا ہے جو شاہ بیگ عادل خاں ارغون گورنر قندھار کا بیٹا تھا (صاحب تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ شاہ بیگ ارغون نہیں تھا بلکہ ترخانی تھا اور اسی کے نام سے تاریخ طاہری منسوب کی گئی تھی)

مصنف نے جو دیباچہ میں اپنے اور اپنے خاندانوں کے حالات لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۰۱۰ھ ۱۶۰۱ء میں جب قندھار پر فاسیوں نے حملہ کیا تو طاہر محمد اپنی تعلیم پوری کرنے کے لئے ٹھٹھا آیا (اس وقت اس کی عمر ۲۵ سال کی تھی) اور مولانا اسحاق کا شاگرد ہو گیا جو اس وقت کے مشہور عالم و صوفی تھے۔

جب ہمایوں، شیر شاہ سے شکست کھا کر بھاگا تو اس کے نانا عمر شاہ اور ماموں داؤد سہٹا نے جو دو ربیلا میں رہتے تھے، ہمایوں کو بہت مدد دی اور ہمایوں نے خوش ہو کر ایک پروانہ لکھا کہ اگر میں کامیاب ہو کر پھر تخت نشین ہوا تو دو ربیلا ان کی جاگیر میں دیدیا جائیگا لیکن افسوس ہے کہ محمود خاں گورنر بھکر کے اشارہ سے عمر شاہ ایک کھال کے اندر بند کر کے دریا میں ڈال دیا گیا اور داؤد بھی قتل کیا گیا۔ اس خاندان کے بقیہ افراد ڈر کے مارے احمد آباد بھاگ گئے اور یہ پروانہ ضایع ہو گیا۔

طاہر محمد نے شکایت کی ہے کہ جس عہد کی وہ تاریخ لکھنا چاہتا تھا اس کے ابتدائی حالات کے متعلق اسے کوئی کتاب باوجود تلاش کے دستیاب نہیں ہوئی۔ لیکن بعد کے حالات اس نے تفصیل سے لکھے ہیں جو اسے اپنے باپ کے ذریعہ سے معلوم ہوئے۔

تاریخ طاہری ۱۰۳۰ھ ۱۶۲۱ء میں ختم ہوئی جبکہ مصنف کی عمر چالیس سال کی تھی، بیان کیا جاتا ہے کہ وہ دس طبقات میں تمام ہوئی ہے۔ لیکن صرف سات طبقات کا اس وقت تک پتہ چلا ہے۔ طبقۂ اول جو صرف ۱۲ صفحات کا ہے سمرا خاندان سے متعلق ہے۔ دوسرا دس صفحات کا سما خاندان سے، تیسرا تیس صفحات کا ارغون خاندان سے اور باقی طبقات میں ترخان خاندان کے حالات اس وقت تک کے درج ہیں جب مرزا غازی بیگ کو سنہ ۱۰۲۱ھ میں بمقام قندھار زہر دیکر مار ڈالا گیا اور ترخانیوں کی حیثیت صرف جاگیرداروں کی سی رہ گئی۔ سندھ میں عرب حکومت کا کوئی حال اس کتاب میں درج نہیں ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۴ - ۵ - صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

چچ برہمن حکمراں تھا اس کے چند دن بعد ابو موسیٰ اشعری جو صحابۂ رسول میں سے تھے، گورنر عراق (بصرہ) مقرر ہوئے

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۴ - ۵ - صفحہ ۲۱ - ۲۲)

ٹ (بیگ لرنامہ) شاہ قاسم خاں ولد امیر سید قاسم بیگ کے نام سے منسوب ہے اسی لئے اس کو بیگ لرنامہ کہتے ہیں۔ یہ بالکل نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کا مصنف کون تھا، سوائے اس کے کہ وہ اپنے مربی، بیگ لر کا ملازم تھا۔ بیگ لر شاہ قاسم خاں کے خاندان کا موروثی لقب تھا۔ اس لئے ترکی اور فارس کا [illegible] خاندان بیگ لربیگ جس کے اکثر افراد اس وقت گورنری کے عہدوں پر ممتاز تھے، دوسرا تھا ——— خاندان بیگ لر کئی پشتوں تک ترمز میں رہا، وہاں سے سمرقند آیا اور پھر یہاں سے سندھ آ گیا۔ اس خاندان کا سلسلۂ نسب حضرت علی مرتضیٰ سے ملتا ہے چونکہ بیگ لر خاندان کے بعض افراد کا قیام اتفاق سے ایک ہی جگہ ہو گیا تھا۔ اس لئے ان دونوں خاندانوں میں ارتباط قایم ہو گیا۔

امیر سید قاسم بیگ، شاہ حسین ارغون کے عہد میں، سمرقند سے سندھ آیا اور راتا امرکوٹ کی بھتیجی سے شادی کر لی۔ اس عورت سے شاہ قاسم پیدا ہوا اور اسی کے نام یہ کتاب منسوب کی گئی۔

بیگ لرنامہ میں پہلے مختصر بیان عربوں کی فتوحاتِ سندھ کا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ارغون خاندان کے حالات مختصر بیان کئے گئے ہیں اور پھر امیر قاسم بیگ کے مفصل حالات سے بحث کی ہے۔ عہد امیر قاسم میں جو لڑائیاں ہوئی ہیں اور جو جو واقعات پیش آئے اُن کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے، صحیح تاریخ تصنیف کی کوئی معلوم نہیں ہو سکی۔

ھ ترخان نامہ کو ارغون نامہ بھی کہتے ہیں اس کا مصنف سید جمال ابن میر جلال الدین حسین شیرازی تھا، یہ کتاب ۱۰۶۵ھ / ۱۶۵۴ء میں لکھی گئی۔ اس تصنیف میں ارغون اور ترخان (مغل خاندانوں) کے حالات سے بحث کی گئی ہے اور مرزا محمد صالح کے نام سے منسوب ہے جو ترخان خاندان سے متعلق تھا۔

مرزا محمد صالح چاہتا تھا کہ مغل خاندانوں سے واقف ہو جائے اور خصوصیت کے ساتھ اپنے خاندان کے حالات معلوم کرے، اس لئے اس نے سید جمال سے کہا کہ ترخان نامہ مہیا کرنا چاہئے (معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل اس نام کی کوئی کتاب مرتب ہو چکی تھی) لیکن باوجود تلاش کے ایسی کوئی کتاب نہیں ملی اور سید جمال نے یہ کتاب مرتب کی جس میں طبری، روضۃ الصفا، ظفرنامہ، تاریخ ہمایوں، اکبرنامہ، نگارستان، تاریخ طاہری، منتخبات بے بدل یوسفی، تاریخ گزیدہ اور مجمع الانساب وغیرہ سے مدد لی گئی ہے اور تاریخ معصومی کو خاص طور سے ماخذ بنایا گیا ہے۔

مرزا محمد صالح، مرزا عیسیٰ ترخاں کا بیٹا تھا (مرزا عیسیٰ ترخاں کا پوتا تھا اس کا جو ترخاں خاندان سندھ کا مورثِ اعلیٰ تھا) مرزا عیسیٰ [illegible] میں اکبر کے سامنے پیش کیا گیا اور اس کی بہت عزت کی گئی۔ جب شاہجہاں کا عہد آیا تو اس کو ایک لاکھ روپیہ کی رقم مع نوبت کے جو نشان اعزاز ہے مرحمت ہوئی۔ بعد کو گجرات کا صوبہ دار بنا دیا گیا اور ۱۰۲۱ھ / ۱۶۱۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۵ و نمبر ا صفحہ ۲۴ پر دیکھئے)

اور خلیفۂ دوم نے ان سے ہندوستان کے حالات دریافت کئے اُنھوں نے کوئی امید افزا جواب نہیں دیا۔ اور

(بقیہ فٹ نوٹ نمبر ۵ و نمبر ا صفحہ ۲۳)

مرزا محمد صالح کو بھی اس کے بعد اپنے باپ کی عزت کا کچھ حصہ ملا اور اس خاندان کے اور لوگوں کی بھی جاگیر مقرر ہوگئی۔

ترخان نامہ میں سب سے پہلے محمد صالح کا شجرۂ نسب درج ہے جو نوح تک پہونچتا ہے اس کے بعد خواتین ترکستان اور چنگیز خاں کے مختصر تاریخ درج کرکے ارغون اور ترخان خاندان کے حالات مرزا عیسیٰ ترخاں کی وفات تک درج کئے گئے ہیں۔

سلہ چچ ایک معمولی برہمن تھا جو ساہ سی فرمانروائے سندھ کے دربار میں ملازم ہوگیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا اقتدار بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ساہ سی کے مرنے پر اس نے ساہ سی کی بیوی سے شادی کرلی اور سندھ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ چونکہ فرمانروائے بج پور (یا چتور) ساہ سی کا عزیز تھا اس لئے اس نے چچ کے خلاف لشکر کشی کی۔ مگر چچ نے مکر و فریب سے کام لیکر کامیابی حاصل کرلی اور بدستور سندھ کا حکمراں رہا۔

تحقیق طلب یہ ہے کہ چچ کس زمانہ میں تھا۔ ایک جگہ چچ نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۲ھ کے قریب (چچ کی تخت نشینی کے چوتھے سال) چچ نے یہ معلوم کرکے کہ فارس پر ایک عورت حکمراں ہے کرمان کی طرف فوج کشی کی تھی۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ جب مغیرہ نے سنہ ۱۳ھ اور سنہ ۱۵ھ کے درمیان حملہ کیا تو چچ کی حکومت کو ۳۵ سال ہو چکے تھے اور جب چچ ۴۰ سال تک حکومت کرچکا تو اس کا بھائی چندر حکمراں ہوا جو صرف آٹھ سال کے بعد مرگیا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا داہر تخت نشین ہوا جو سنہ ۹۳ھ میں محمد قاسم (مشہور فاتح سندھ) کے مقابلہ میں مارا گیا۔

تحفۃ الکرام لکھتا ہے کہ (۱) چچ، راجہ چتور کو قتل کرنے کے بعد سنہ ۱ھ میں تخت نشین ہوا اور کل چالیس سال تک اس نے حکومت کی (۲) اس کے بعد چندر حکمراں ہوا اور اپنی حکومت کے آٹھویں سال مرگیا۔ (۳) اس کے بعد داہر حکمراں ہوا جو ۳۳ سال حکومت کرنے کے بعد سنہ ۹۳ھ میں مارا گیا۔ (۴) اس برہمن خاندان نے سندھ میں ۹۲ سال تک حکومت کی۔ اس بیان کی غلطی ظاہر ہے کیونکہ حساب سے صرف ۸۱ سال ہوتے ہیں۔

اس غلطی کا ازالہ صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ چچ نامہ میں جو یہ لکھا ہے کہ "مغیرہ کے حملہ کے وقت چچ کی حکومت کو ۳۵ سال ہو چکے تھے" اس میں بجائے ۳۵ کے ۲۵ یا ۱۵ پڑھا جائے اور چچ کے حملۂ کرمان کے وقت جو سنہ درج کیا گیا ہے وہ بجائے دو کے دس (۱۰) قرار دیا جائے اس امر کا ثبوت کہ یہاں سنہ ۲ھ کے بجائے سنہ ۱۰ھ صحیح ہے اس سے بھی ملتا ہے کہ سنہ ۱۰ھ میں تخت ایران پر کوئی عورت حکمراں نہ تھی خود چچ نامہ میں لکھا ہے کہ یہ ملکہ کسریٰ بن ہرمز (یعنی خسرو پرویز) کی جانشین تھی اور یہ صحیح ہے کہ خسرو کے بعد اس کی دو بیٹیوں (دخت زمان و توران دخت) نے دو تین سال تک حکومت کی۔ لیکن طبری نے دخت زمان کا عہد حکومت سنہ ۱۳ھ اور صاحب روضۃ الصفا نے توران دخت کا زمانۂ حکمرانی سنہ ۱۲ھ لکھا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۵ پر ملاحظہ ہو)

حضرت عمرؓ نے نہ صرف ہندوستان کی طرف پیشقدمی کی ممانعت کردی بلکہ تمام بحری تاختوں کو ممنوع قرار دیا[1]۔

جب حضرت عثمانؓ (۲۳-۳۵ھ / ۶۴۴-۶۵۵ء) خلیفہ ہوئے اور بجائے ابو موسیٰ اشعری کے عبد اللہ بن عامر گورنر بصرہ مقرر کئے گئے تو اُنھوں نے خلیفہ سے اجازت لے کر حاکم بن جبلہ کو ملک ہندو سندھ کا حال دریافت کرنے کے لئے مامور کیا لیکن اُنھوں نے بھی واپسی میں مایوس کن حالات بیان کئے اور اس طرف بڑھنے کا خیال ترک کر دیا گیا[2]۔

خلافت حضرت علیؓ (۳۵-۴۰ھ / ۶۵۵-۶۶۰ء) میں البتہ تاغر بن داعر[3] کی سرکردگی میں ایک مہم (آخر سنہ ۳۸ھ میں) روانہ کی گئی جو بہرج، لاکوہ پایہ، کوہ قیقان یا قیقانان[4] پہونچی دشمنوں نے بیس ہزار کی جمعیت سے مقابلہ کیا لیکن حارث بن مرہ نے جو لشکر اسلام کا ایک بڑا جوانمرد افسر تھا، دشمنوں کو شکست دی[5]۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۴)

اس لئے ظاہر ہے کہ جب چچ نے کرمان پر حملہ کیا ہوگا تو ان دونوں عورتوں میں سے کسی کا زمانہ حکومت رہا ہوگا۔ اس لئے تاریخ وار حسب ذیل نقشہ کو صحیح سمجھنا چاہئے:۔

چچ کی تخت نشینی سندھ میں	سنہ ۱ھ	چچ کی وفات (۴۰ سال حکومت کرنے کے بعد) سنہ ۴۱ھ
کرمان پر حملہ	سنہ ۱۲ھ	چندر کی وفات (تخت نشینی کے آٹھویں سال) سنہ ۴۹ھ
مغیرہ کا حملہ	سنہ ۱۵ھ	داہر کی وفات (۴۳ سال حکومت کرنے کے بعد) سنہ ۹۳ھ

[1] چچ نامہ صفحہ ۲۰۔ [2] تحفۃ الکرام صفحہ ۹ و بلاذری - ۱ - ۱۱۶ -

[3] بلاذری نے بھی اسی مہم کا ذکر کیا ہے لیکن افسر فوج حارث بن مرہ کو قرار دیا ہے۔

[4] قیقانان، قیقان، کیکانان - چچ نامہ میں درج ہے کہ رائے خاندان کی حکومت چچ برہمن سے پہلے، سندھ میں قردان اور قیقانان کے پہاڑوں تک وسیع تھی۔ اس کے بعد سنہ ۳۸ھ میں بہرج اور کوہ پایہ ہوتے ہوئے عربوں کا قیقانان تک پہونچنا ظاہر کیا گیا ہے جہاں انھیں شکست ہوئی۔ بلاذری لکھتا ہے کہ قیقان، خراسان کی طرف سندھ کا ایک حصہ ہے دوسری جگہ قیقان کو ترکوں کا مستقر ظاہر کرتے ہوئے ملتان اور کابل کے درمیان واقع ہونا ظاہر کرتا ہے۔ ابن حوقل وغیرہ کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیقان ضلع توران کا ایک شہر تھا، جس میں قصدان کا گورنر رہا کرتا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیقان شہر بھی تھا اور ایک صوبہ کا بھی نام تھا۔ بعض چینی سیاحوں کے بیان سے واضح ہے کہ قیقان، کابل کے جنوب میں واقع تھا۔ ان تمام بیانات سے یہ امر ثابت ہے کہ وہ مشرق میں حدود ملتان تک وسیع تھا اور دوسری طرف اس کا سلسلہ کوہ سلیمان تک پہونچتا تھا۔

[5] بلاذری نے بھی اس فتح کا حال لکھا ہے لیکن آخر میں لکھتا ہے کہ سنہ ۴۲ھ میں تمام مسلح افواج کوہ قیقان کے قریب کام آئی۔

اسی وقت حضرت علی کی شہادت وقوع میں آئی اور امیر معاویہ کا دور حکومت شروع ہوا[1]۔

بنو امیہ میں سب سے پہلے حکمراں امیر معاویہ ہوئے ہیں (۴۱-۶۰ھ / ۶۶۱-۶۸۰ء) ان کے زمانہ میں سلطنتِ اسلام بہت وسیع ہوئی اور سندھ پر زیادہ اثر قائم ہو گیا۔ چنانچہ سب سے پہلے (۴۴ھ / ۶۶۴ء) میں مہلب نے سندھ پر حملہ کیا اور بنا اور الاہور تک بڑھتے چلے گئے جو ملتان و کابل کے درمیان واقع تھے لیکن یہ قتل ہو گئے[2]، اس کے بعد سنہ ۴۶ھ میں عبداللہ بن سوار اور بعض روایت کے مطابق عبداللہ ابن عامر مامور کئے گئے۔ قیقان میں ان کو فتح حاصل ہوئی اور جب پھر واپس آئے تو ترکوں نے ان کو قتل کر دیا اس کے بعد متعدد فوجیں مختلف اوقات میں اس طرف روانہ کی گئیں اور مکران پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

یزید اول (۶۰-۶۴ھ / ۶۸۰-۶۸۳ء) اور معاویہ ثانی (۶۴ھ / ۶۸۳ء) کے عہد میں بھی مسلسل کئی بار حدودِ ہند پر تاخت کی گئی، مروان اول کے زمانہ میں (۶۴-۶۵ھ / ۶۸۳-۶۸۴ء) مسلمانوں نے راجپوتانہ پر سندھ کے راستہ سے حملہ کیا اور مانک رائے راجہ اجمیر مع اپنے اکلوتے بیٹے کے مارا گیا[3]۔ جب مروان کے بعد عبدالملک (۶۵-۸۶ھ / ۶۸۵-۷۰۵ء) تخت نشین ہوا تو عراق کی گورنری اس نے حجاج ابن یوسف کے سپرد کی۔ حجاج نے مکران کی حکومت سعید بن اسلم کلبی کو تفویض کی۔ لیکن علافیوں نے اُسے مار ڈالا۔ حجاج نے عبدالرحمٰن بن اشعث کو مامور کیا مگر یہ بھی علافیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کے بعد مجاع بن سعید مامور ہوا اس نے سرحدی اضلاع پر کامیابی سے تاخت کی۔ لیکن یہ اسی سال مر گیا اور محمد بن ہارون متعین کیا گیا۔

جب ولید اول (۸۶-۹۶ھ / ۷۰۵-۷۱۵ء) میں تخت نشین ہوا تو محمد بن ہارون کو حکم دیا گیا کہ وہ علافیوں کو تلاش کر کے قتل کرے۔ چنانچہ وہ پانچ سال تک مسلسل مختلف شہروں پر تاخت کرتا رہا اور ایک علافی کا سر بھی اس نے حجاج کے پاس بھیجا۔ حجاج بڑے عزم و جرأت کا گورنر تھا وہ چاہتا تھا کہ مشرق میں فتوحاتِ اسلامی کو بہت وسیع کرے، چنانچہ اس نے ایک لشکر قتیبہ کی سرکردگی میں روانہ کر کے خوارزم، بخارا، خجند، سمرقند، فرغانہ کو فتح کیا اور ایک لشکر کابل کے راجہ سے مقابلہ کرنے کے لئے روانہ کیا اتفاق سے اس زمانہ میں راجہ سراندیپ (لنکا) نے حجاج کے پاس آٹھ جہازوں میں بہت سے تحایف روانہ کئے[4] ان میں لونڈی غلام

---

[1] کرنل ٹاڈ نے اپنی کتاب راجستھان میں یہی لکھا ہے کہ خلافتِ علی میں مسلمانوں کا سلسلۂ فتوحات سندھ میں شروع ہو گیا تھا جو وفاتِ حضرت علی کے بعد منقطع ہو گیا — [2] بلاذری ۱-۱۱۶ و ۱۱۷ - تحفۃ الکرام - ۹ - چچ نامہ ۷۲ - ۸۰ — [3] راجستھان کرنل ٹاڈ - جلد دوم صفحہ ۴۴۴ — [4] یہ بیان فتوح البلدان، چچ نامہ اور فرشتہ کا ہے لیکن میر معصوم نے اپنی تاریخ سندھ میں اس سے اختلاف کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ خلیفہ عبدالملک نے کچھ لوگ یہاں لونڈیاں و دیگر اشیاء خریدنے کے لئے روانہ کئے تھے یہی لوگ جہازوں میں واپس آ رہے تھے کہ ساحل دیبل پر قزاقوں نے لوٹ لیا - ان جہازوں پر چند شامی تجار بھی بیٹھے ہوئے تھے جو لنکا سے اپنے وطن کو واپس جا رہے تھے۔

بھی تھے اور کچھ مسلمان ایسے بھی تھے جو حج کے ارادہ سے سوار ہو گئے تھے۔ راستہ میں باد مخالف نے ان جہازوں کو ساحل دیبل پر پہونچا دیا اور یہاں بحری قزاقوں نے ان کو لوٹ لیا[1]۔

حجاج نے داہر کو لکھا کہ "وہ گرفتار شدہ مردوں اور عورتوں کو فوراً آزاد کر دے"۔ داہر نے جواب دیا کہ "یہ حرکت قزاقوں کی ہے اور مجھ کو ان پر مطلق اقتدار حاصل نہیں"۔

حجاج نے خلیفہ سے بدقت تمام اجازت حاصل کر کے عبید اللہ کو ایک فوج دے کر دیبل روانہ کیا لیکن یہ کامیاب نہیں ہوا اور مارا گیا۔

اس کے بعد حجاج نے حاکم عمان کو ہدایت کی کہ مکران کے راستہ سے سندھ پر حملہ کرے اور عبداللہ بن قحطان کو حکم دیا گیا کہ وہ بھی عمان جا کر شامل ہو جائے چنانچہ نیرون کے مقام پر دونوں مل گئے اور راجہ داہر کی فوج سے مقابلہ ہوا، مسلمانوں کو شکست ہوئی اور بہت سے آدمی گرفتار ہو گئے۔

تحفۃ الکرام اور فتوح البلدان کا بیان ہے کہ یہ جنگ نیرون[2] میں نہیں بلکہ دیبل میں ہوئی تھی۔ بہرحال جہاں کہیں ہوئی ہو مسلمان ناکامیاب رہے۔ جب مسلمانوں کو شکست ہوئی تو اہل نیرون ڈرے کہ کہیں حجاج ہم سے بدلہ نہ لے، چنانچہ یہاں کے حاکم نے جو بودھ مذہب کا تھا داہر سے چھپا کر اپنے معتمدوں کو حجاج کے پاس روانہ کیا اور اپنی بے قصوری ظاہر کرتے ہوئے آیندہ سے خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ حجاج نے نیرون والوں کے لئے نامۂ امان لکھ دیا اور اب سندھ پر حملہ کرنے کیلئے محمد قاسم کا انتخاب عمل میں آیا۔ جو حجاج کا بھتیجا تھا۔

تمام فارسی مورخین اسے محمد قاسم لکھتے ہیں۔ بلاذری "محمد بن قاسم ثقفی" اور ابو الفداء "محمد بن القاسم" تحریر کرتا ہے اس وقت محمد قاسم کی عمر صرف سترہ سال کی تھی۔

---

[1] یہ قزاق کس قوم کے تھے اس کے متعلق مورخین کا اختلاف ہے فتوح البلدان میں ان کا نام تمید لکھا ہے، چچ نامہ میں تنکامرا، تحفۃ الکرام میں کہیں تنکامرا اور کہیں ناکامرا تحریر ہے عبداللہ ابن عیسیٰ شارح دیوان جریر نے انھیں کرک کے نام سے تحریر کیا ہے، ابن اثیر نے بھی ۱۵۱ھ کے واقعات بیان کرتے ہوئے کرک قوم کا ذکر کیا ہے جن کی نسبت خیال کیا ہے کہ شاید وہ کرگ (مشرقی بنگور) کی رہنے والی ہو۔

[2] نیرون۔ جب رائے خاندان کی حکومت تھی تو یہ مقام سلطنۂ برہمن آباد میں شامل تھا۔ جب عربوں نے سندھ پر حملہ کیا تو یہاں کے باشندوں نے امن چاہی تھی اور دیبل فتح کرنے کے بعد محمد قاسم نے اپنے حملہ کا رُخ اسی طرف کیا تھا اور دیبل سے چل کر ساتویں دن یہاں پہونچا تھا۔

اصطخری اور ابن حوقل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نیرون مابین دیبل و منصورہ واقع تھا لیکن منصورہ سے قریب تھا اور وہاں تک پہونچنے کے لئے دریائے سندھ کا عبور کرنا ضروری تھا۔ ابو الفداء نے اس کا فاصلہ منصورہ سے ۱۵ فرسنگ قرار دیا ہے اور بیرونی کی مشہور کتاب قانون مسعودی کی سند سے اس کا عرض جلد و طول البلد ۲۶ - اور - ۴۰ - تحریر کیا ہے۔

محمد قاسم نے جس عزم و حسنِ انتظام کے ساتھ سندھ کی تمام وادی کو فتح کیا، وہ محمد قاسم کی کمسنی کو دیکھتے ہوئے حقیقتاً تاریخ کا عجیب و غریب افسانہ ہے۔ فتوح البلدان، چچ نامہ، اور تحفۃ الکرام وغیرہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ اسکے جزئیات درج کئے گئے ہیں اور مختصر ابتدائی صفحات میں ہم نے بھی اس کا حال درج کر دیا ہے اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد قاسم نے نہایت غیر معمولی طریقہ سے اپنی ہمت و شجاعت اور اپنے عزم و فراست کا سکہ ایک ایک کے دل میں قائم کرا دیا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت محمد قاسم، سندھ کی وادیوں کو اپنی نبرد آزمائیوں اور فتوحات کا مرکز بنائے ہوئے تھا اسی وقت طارق اسپین فتح کرتا ہوا فرانس کی طرف بڑھ رہا تھا اور دوسری طرف ایشیا میں خوارزم اسلام زیرنگیں آنے والا تھا۔

فرشتہ کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے عام طور سے یہی یقین کیا جاتا ہے کہ صرف چھ ہزار سپاہیوں کی مدد سے سندھ فتح کیا گیا۔ لیکن مورخین عرب کا بیان اس باب میں زیادہ قابل وثوق ہے۔ یہ لکھتے ہیں کہ علاوہ اس فوج کے جو بطور مقدمۃ الجیش کے ابوالاسود کی سرکردگی میں حدود سندھ پر محمد قاسم سے مل گئی تھی، ۶ ہزار سوار شام و عراق کے اور ۶ ہزار مسلح شتر سوار بھی تھے علاوہ ان کے تین ہزار اونٹ بار برداری کے تھے جن کے بجائے میر معصوم تین ہزار پیادہ فوج ظاہر کرتا ہے۔

مکران میں محمد ہارون بھی اپنی کمکی فوج کے ساتھ شریک ہو گیا تھا اور پانچ منجنیق مع دیگر ضروری سامان کے جہازوں کے ذریعہ سے دیبل تک پہونچائی گئی تھیں۔ ایک ایک منجنیق اتنی بڑی تھی کہ اس کے چلانے کے لئے ۵۰۰ آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ کم از کم ڈھائی ہزار سپاہی جہازوں کے ذریعہ سے منجنیقوں کے ہمراہ آئے ہوں گے اس طرح کل جمعیتہ تقریباً ۱۵ ہزار تھی جس کی مدد سے محمد قاسم نے سندھ کو فتح کیا۔

جب محمد قاسم کی کامیابی کی خبر دمشق میں پہونچی تو اور تازہ فوج روانہ کی گئی اس لئے جب وہ ملتان سے، دیبل پور کی طرف چلا ہے تو پچاس ہزار سپاہ اس کے پرچم کے ساتھ تھی اور وہ جمعیتہ اس کے علاوہ تھی جو سندھ کے مفتوحہ قلعوں میں چھوڑ دی گئی تھی تاریخ فتح سندھ ابن قتیبہ سنہ ۹۳ھ ظاہر کرتا ہے۔ طبری کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ "سنہ ۹۰ھ (غالباً کتابت کی غلطی ہے) میں محمد قاسم نے سندھ کے بادشاہ دس ابن سسا کو قتل کیا، سنہ ۹۴ھ میں سندھ فتح کیا اور سنہ ۹۵ھ میں ہندوستان کا اور زیادہ مشرقی حصہ مسخر کر لیا۔

اگرچہ محمد قاسم نے شیراز سنہ ۹۲ھ میں چھوڑ دیا تھا لیکن دیبل پہونچنا سنہ ۹۳ھ کی ابتدا میں معلوم ہوتا ہے فتح دیبل کی کوئی صحیح تاریخ معین نہیں ہو سکتی، لیکن حجاج نے اس فتح کا اعلان ۲۰ رجب سنہ ۹۳ھ (یکم مئی سنہ ۷۱۲ء) کو کیا تھا۔ اور سندھ سے پایۂ خلافت تک سات دن میں خبر پہونچتی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ دیبل شروع رجب سنہ ۹۳ھ میں فتح ہوا ہوگا۔

اس کے بعد رمضان میں الور فتح ہوا یہاں سے پھر مورخین نے اختلاف کیا ہے۔ فتوح البلدان کا بیان ہے کہ:
"محمد قاسم، ملتان سے آگے نہ بڑھا تھا کہ حجاج کی موت کی خبر پہونچی اور وہ واپس چلا گیا" لیکن چچ نامہ ظاہر کرتا ہے کہ محمد قاسم

حدود کشمیر میں اس جگہ تک پہونچ گیا تھا جہاں دریائے جہلم پہاڑوں سے نکل کر زمین کو بہت سے چھوٹے چھوٹے جزائر میں تقسیم کرتا ہوا متعدد چشموں کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے[1]۔ چچ نامہ میں اس خطۂ زمین کا نام "پنج مائیات" یعنی (پنجاب) بتایا ہے اور یہی چچ کی سلطنت کی آخری حد تھی۔

حجاج کے چھ ماہ بعد خلیفہ ولید کا بھی انتقال ہو گیا (جمادی الاول ۹۶ھ - جنوری ۷۱۵ء) اور محمد قاسم واپس بلا لیا گیا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ محمد قاسم، سندھ و پنجاب میں سوا تین سال سے زائد نہ رہ سکا۔

محمد قاسم کے اسباب قتل کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ چچ نامہ اور اس کے تمام متبع مورخین کا بیان ہے کہ ولید ہی نے اس کو قتل کرایا تھا[2]۔ فتوح البلدان کا بیان ہے کہ خلیفہ سلیمان کے حکم سے محمد قاسم قتل کیا گیا اور اسکی داستان اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ خلیفہ ولید کے بعد خلافت سلیمان میں تمام پچھلے انتظامات منسوخ کئے جا رہے تھے اور خلیفہ سلیمان، حجاج کے تمام ساتھیوں کو چن چن کر قتل کر رہا تھا اس لئے اس نے محمد قاسم کو بھی طلب کیا اور ہلاک کر ڈالا۔ کہا جاتا ہے کہ محمد قاسم ہندوستان میں ایسا ہر دلعزیز تھا کہ جب وہ واپس بلایا گیا ہے تو یہاں کے لوگ روتے تھے اور یہ محبت و عظمت اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ کیرج میں اس کا بت طیار کر کے لوگ اس کی پرستش کرنے لگے۔

خلیفہ سلیمان کے عہد میں (۹۶-۹۹ھ / ۷۱۵-۷۱۷ء) محمد قاسم کے بعد یزید، حاکم سندھ مقرر کیا گیا۔ لیکن یہاں پہونچنے کے ۱۸ دن کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حبیب ابن مہلب متعین کیا گیا، تاکہ جن راجاؤں نے محمد قاسم کے قتل سے فائدہ اٹھا کر سرکشی اختیار کی تھی ان کو زیر کرے[3]۔ حبیب نے ساحل دریائے سندھ پر دشمنوں کی ایک جماعت کو شکست دی اور الور کے

---

[1] "کوننگھم" نے اس جگہ کا ذکر کرتے ہوئے جہاں سکندر نے راجہ پورس کے مقابلہ میں فتح حاصل کی تھی بالکل یہی نقشہ کھینچا ہے۔

[2] اس قتل کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب داہر کی دو لڑکیاں خلیفہ ولید کے پاس پہونچیں اور خلیفہ نے ان کو خلوت میں بلایا تو انھوں نے محمد قاسم کی شکایت کی کہ وہ ان کی عصمت خراب کر چکا ہے۔ خلیفہ بہت برہم ہوا کہ محمد قاسم جہاں ہو فوراً ایک گائے کے چمڑے میں بند کر کے سی دیا جائے اور اسی حال میں یہاں لایا جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی جب محمد قاسم کی لاش لڑکیوں کے سامنے پہونچی (جن میں سے ایک کا نام سورج دیوی اور دوسری کا پرمل دیوی تھا) تو انھوں نے بیان کیا کہ ہم نے تو صرف محمد قاسم سے اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لئے ایسا کہا تھا۔ تو یہ سن کر ولید بہت برہم ہوا اور لڑکیوں کو گھوڑے کی دم سے بندھوا کر ہلاک کرا دیا اور لاشیں دجلہ میں پھنکوا دیں۔ میر معصوم نے بھی یہی لکھا ہے۔ لیکن چچ نامہ اور میر معصوم کا یہ بیان بالکل غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ کھال کے اندر بند کر کے ہلاک کرنے کا طریقہ صرف تاتاریوں میں رائج تھا اور عرب اس سے واقف نہ تھے علاوہ اس کے یوں بھی خلیفہ ولید اپنے اخلاق کے لحاظ سے ایسا نہ تھا کہ وہ اتنے بڑے جنرل کو ایسی معمولی سی بات پر ایسی سخت سزا دیکر فتوحات اسلام کے سلسلہ کو دفعتاً روک دیتا۔

[3] مورخین سندھ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد قاسم کے بعد دو سال کے اندر ہندوستان کے راجاؤں نے بغاوت کر کے اپنا ملک بہت کچھ واپس لے لیا۔ چنانچہ جیسیا داہر کے بیٹے نے بھی برہمن آباد پر قبضہ کر لیا تھا۔

باشندوں کو مطیع کر لیا۔ عہد سلیمان میں ایک گورنر عامر بن عبداللہ کا بھی یہاں آنا بیان کیا جاتا ہے[۱]، خلیفہ سلیمان کے بعد عمر بن عبدالعزیز کا عہد شروع ہوا (۹۹-۱۰۱ھ / ۷۱۷-۷۲۰ء) انھوں نے ہندوستان کے تمام سلاطین و امراء کو خطوط لکھے کہ اسلام لے آؤ تاکہ تم کو بھی وہی حقوق ملیں جو اور مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ تم ہمارے ساتھ متحد ہو جاؤ تاکہ ہم بھی تمہاری حفاظت کے ذمہ دار ہو جائیں"۔ چنانچہ داہر کا بیٹا جیسیا مع دیگر امراء کے مسلمان ہو گیا۔ عمرو بن مسلم یہاں کی سرحد پر نائب خلیفہ تھا اس نے بھی ہندوؤں کے متعدد صوبوں پر مختلف حملے کئے اور فتح حاصل کی[۲]۔ لیکن خلیفہ یزید (۱۰۱-۱۰۵ھ / ۷۲۰-۷۲۴ء) کے عہد میں جنید بن عبدالرحمٰن المری سرحد ہند[۳] کا حاکم مقرر ہوا۔ اور خلیفہ ہشام بن عبدالملک (۱۰۵-۱۲۵ھ / ۷۲۴-۷۴۳ء) کے عہد میں بھی یہ بحال رہا۔ جنید نے تمام باغی سلاطین ہند کے خلاف فوج روانہ کی اور مختلف مقامات فتح کئے (مثلاً کیراج، مرماد، مندل، دہنج، بروس (بھڑوچ) اُزین (اُجین) مالیا (مالوہ) وغیرہ) ان فتوحات کا ثبوت ہندو اور چینی تاریخوں سے بھی ملتا ہے[۴]۔

سنہ ۱۱۰ھ میں جنید کے بعد تمیم بن زید العتبی یہاں کا حاکم مقرر ہوا۔ یہ ایک کمزور دل و دماغ کا شخص تھا لیکن بے انتہا سخی تھا۔ اس نے ایک کروڑ اسی لاکھ تاتاری درہم جو خزانۂ سندھ میں جمع تھے لوگوں کو تقسیم کر دئے۔

تمیم کے بعد خالد، گورنر عراق نے سندھ کی حکومت حکم الکلبی کے سپرد کی اب اہل ہند نے پھر بُت پرستی شروع کر دی تھی حکم نے محفوظہ شہر تعمیر کرایا اور عمرو بن قاسم کی سرکردگی میں متعدد فتوحات حاصل ہوئیں۔ جب حکم کے بعد عمرو یہاں کا حاکم ہوا تو اس نے منصورہ تعمیر کرایا[۵]۔

اس کے بعد اور بھی چند گورنر آئے لیکن بلاذری نے ان کا نام نہیں بتایا ــــ تحفۃ الکرام میں اس آخری عہد کی بابت لکھا ہے کہ "سلیمان ابن خلیفہ ہشام بھی سندھ کا حاکم مقرر کیا گیا تھا، جس نے یہاں نہ صرف بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان (۱۲۷-۱۳۲ھ / ۷۴۴-۷۵۰ء) کے عہد تک کامیابی کے ساتھ حکومت کی، بلکہ عباسیہ خاندان کے خلیفۂ اول (ابو العباس سفاح)

---

[۱] تاریخ سندھ ۳۰۔ تحفۃ الکرام ۔۱۸ ــ [۲] تحفۃ الکرام ۱۸ ــ [۳] "سرحد ہند" کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد قاسم کے بعد عربوں کا تسلط اندرون ملک پر قائم نہ ہو سکا تھا۔ وہ امراء جو مسلمان ہو چکے تھے عربوں کو آگے بڑھنے سے روکتے تھے۔ چنانچہ جب جنید دیبل کی طرف بڑھا تو داہر کے بیٹے نے جو وہاں حکمراں تھا اور مسلمان ہو چکا تھا کہلا بھیجا کہ ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ہمیں یہاں کا فرمانروا تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن جنید نہیں مانا اور جنگ کر کے اس کو قتل کر ڈالا اس کے بعد اس کا بھائی سسّہ، عراق کی طرف چلا کہ اس بے عنوانی کی شکایت وہاں کے حاکم سے کرے لیکن یہ بھی جنید کے اشارہ سے راستہ میں قتل کر دیا گیا۔

[۴] راجستھان (کرنل ٹاڈ) جلد اول صفحہ ۲۳۱، ۲۴۲، ۲۵۰، ۲۸۱ ــ [۵] بلاذری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے زمانہ میں گورنران سندھ کا صدر مقام یہی تھا۔

کے عہد میں بھی کچھ زمانہ تک یہاں کا فرمانروا رہا۔ تحفۃ الکرام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مروان نے ایک شخص ابو الخطاب[۱] کو بھی سندھ کا حاکم مقرر کیا۔ آخری گورنر (بنو امیہ کی طرف سے) یہاں منصور تھا[۲]۔

جب ابو العباس سفاح خلیفہ مقرر ہوا (۱۳۲-۱۳۶ھ / ۷۴۹-۷۵۴ء) تو ابو مسلم خراسانی نے سندھ کی حکومت پر عبد الرحمٰن کو مامور کیا عبد الرحمٰن اور منصور (آخری گورنر عہد بنی امیہ) سے لڑائی ہوئی جس میں عبد الرحمٰن کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد ابو مسلم نے موسیٰ بن کعب التمیمی کو مامور کیا۔ منصور نے اس سے بھی مقابلہ کیا لیکن آخر میں اس کو شکست ہوئی اس کا ایک بھائی مارا گیا اور وہ خود بھی صحرا میں شدت تشنگی سے مر گیا۔

موسیٰ نے فتح حاصل کرنے کے بعد منصورہ کی مرمت کرائی، مسجد کو وسیع کیا اور ہندوؤں کے مقابلہ میں کئی بار فتح حاصل کی۔ تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ عہد بنی امیہ کے آخری گورنر کو داؤد ابن علی کے لشکر نے شکست دی تھی۔

سفاح کے بعد خلیفہ منصور کے عہد میں (۱۳۶-۱۵۸ھ / ۷۵۴-۷۷۵ء) ہشام، سندھ کا گورنر مقرر ہوا اور اس نے تمام ان شہروں کو فتح کیا جو اس وقت تک مسلمانوں کے اقدام میں حائل تھے اس نے عمرو بن جمل کو ایک بیڑہ بوارج[۳] (جنگی جہازوں) کا سپرد کر کے بردہ[۴] روانہ کیا اور ایک فوج مملکت ہند کی طرف روانہ کی جو کشمیر[۵] تک پہونچ گئی اور بہت سے قیدی اس کے ہاتھ آئے اور تمام صوبۂ ملتان پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور قندابیل سے ایک جماعت کو (جن پر علویین ہونے کا شبہ تھا) باہر نکال دیا[۶]۔ اس زمانہ میں سندھی اعراب نے قندابار[۷] کو بھی فتح کیا اور بت خانہ مسمار کر کے ایک مسجد تعمیر کرائی ہشام کے

---

۱ ممکن ہے یہ وہی ابو الخطاب ہو جو عہد مروان میں اسپین کا گورنر تھا۔ ۲ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ منصور کو سفاح نے مقرر کیا تھا لیکن یہ صحیح نہیں ہے برہمن آباد کے کھنڈر میں سے جو سکے برآمد ہوئے ہیں ان میں بعض سکے منصور کے بھی ہیں اور انکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان کی طرف سے وہاں مامور تھا۔ ۳ جمع ہے بارجہ کی، بلاذری نے اس لفظ کا استعمال جنگی جہازوں کے لئے کیا ہے وہ جہاز جو جزیرۂ سراندیپ سے حجاج کے پاس روانہ ہوئے تھے اور ساحل دیبل پر لوٹے گئے تھے ان کو بھی بلاذری نے بوارج لکھا ہے اس کی ایک صدی بعد بیرونی نے بھی کچھ اور سومنات میں بوارج کے لنگر انداز ہونے کا حال بیان کیا ہے۔ قاموس میں لکھا ہے کہ بارجہ ایک بڑے جنگی جہاز کو کہتے ہیں۔ انگریزی کا لفظ ([illegible]) اسی سے ماخوذ ہے۔

۴ بارند، بارید بھی اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ غالباً اس سے مراد بھیتوار ہے جو ساحل گجرات پر واقع ہے بیرونی نے اسکو بردہ بارند لکھا ہے۔ ابن اثیر اور طبری سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۰ھ میں خلیفہ مہدی نے بھی ایک فوج اس جگہ روانہ کی تھی یہ شہر فتح تو ہو گیا لیکن فوج میں بیماری پھیل جانے سے بہت نقصان ہوا اور جو فوج بچ رہی تھی وہ واپسی میں ساحل فارس کے قریب غرق ہو گئی۔ ۵ اس سے مراد شہر کشمیر نہیں ہے بلکہ پہلے پنجاب بھی سلطنت کشمیر میں شامل تھا اس لئے سلطنت کشمیر کی حدود میں کسی جگہ یہ فتح حاصل ہوئی ہوگی۔ ۶ ابو الفداء ۲-۲۰۔
۷ بعض مستشرقین نے خلیج کمبایت ([illegible] Cambay) کے قریب اس شہر کا واقع ہونا ظاہر کیا ہے بعض کا خیال ہے کہ اس سے مراد گندابار (بالائی حصۂ سندھ کا ایک شہر) ہے مسٹر الیٹ کہتے ہیں کہ اس کا نام گندھادار ہے جو جزیرہ نمائے کاٹھیاوار کا ایک مقام ہے۔

بعد عمرو بن حفص بن عثمان گورنر مقرر ہوا[1] یہ تقرری ۱۵۱ھ سے پہلے ہوئی۔ کیونکہ ۱۵۱ھ میں عمرو بن حفص حکومت افریقہ پر تبدیل کیا گیا اور ۱۵۴ھ میں وہیں وہ مارا گیا۔

عمرو بن حفص کے بعد افریقہ کا حاکم یزید بن حاتم مقرر ہوا اور سندھ میں یزید کا بھائی روح متعین کیا گیا۔

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں (۱۷۰-۱۹۳ھ / ۷۸۶-۸۰۹ء) افریقہ و سندھ کے گورنروں میں بہت تبدیلی وقوع میں آئی اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ وہ ایک جگہ زیادہ دن رہنے سے خود سر ہو جائیں گے اور ملک پران کا اقتدار قایم ہو کر خلافت کا اثر ضعیف ہو جائے گا۔ ہارون کے زمانہ میں داؤد بن یزید مہلبی ۱۸۴ھ کے قریب سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا لیکن وہ جلد مر گیا۔ سندھ کی مقامی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد سے قبل حاجی ترابی یا ابو تراب گورنر مقرر کیا گیا تھا اس نے ضلع ساکورہ میں قلعہ ٹھٹھ[1] اور مغربی سندھ میں بلاد بگر، اور بھم پور کو فتح کیا اس کا مقبرہ جس پر ۱۷۱ھ منقوش ہے، ٹھٹھ سے آٹھ میل شمالی مغرب کی طرف مابین گوجا و گوری زیارت گاہ عوام ہے[2]۔ ہارون الرشید کے عہد میں ایک گورنر ابو العباس بھی ہوا ہے جو مدت تک سندھ پر حکومت کرتا رہا۔

مامون الرشید کے زمانہ میں (۱۹۸-۲۱۸ھ / ۸۱۳-۸۳۳ء) بشر بن داؤد سندھ کے حاکم اعلیٰ نے بغاوت اختیار کی اور خراج بھیجنا بند کر دیا۔ غسان بن عباد کوفی جو خلیفہ کا عزیز بھی تھا ۲۱۳ھ میں اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا گیا۔ بشر نے ہتھیار ڈال دئے اور غسان اسے بغداد لے گیا لیکن خلیفہ نے اس کا قصور معاف کر دیا[3]۔

غسان بغداد جاتے وقت موسیٰ بن یحییٰ برمکی کو جو فضل اور جعفر برمکی کا چھوٹا بھائی تھا، سندھ کی حکومت سپرد کر گیا۔ (تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ موسیٰ بن یحییٰ برمکی، ہارون الرشید کے زمانہ میں سندھ کا حاکم مقرر ہوا تھا لیکن اس نے زر خراج صرف کر ڈالا اس لئے علٰحدہ کر دیا گیا اور اس کے بعد علی بن عیسیٰ ہامان مقرر ہوا)[4] موسیٰ عرصہ دراز تک سندھ کا حاکم رہا جب ۲۲۱ھ میں اس کا انتقال ہوا تو عہد معتصم باللہ میں اس کا بیٹا عمران گورنر مقرر ہوا اس نے قیقان کو فتح کیا جو جاٹوں کے قبضہ میں تھا اور شہر "البیضا"، کی بنیاد ڈال کر اسے ایک فوجی مرکز قرار دیا۔ اس کے بعد وہ منصورہ واپس آیا اور پھر قندابیل پہنچا[5]۔

---

[1] طبری و ابو الفداء کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہشام عمرو بن حفص کے بعد گورنر سندھ مقرر ہوا۔ [2] تحفۃ الکرام ۱۹-۳۲-۲۔ [3] ابو الفداء ۲-۱۵۰۔
[4] تحفۃ الکرام -۱۸۔ [5] قندابیل۔ تاریخ سندھ میں قندابیل کا نام اکثر آتا ہے۔ چچ نامہ میں قندابیل کو قندھار بھی بتایا ہے، لیکن یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ بلاذری جو اس باب میں زیادہ قابل اعتبار ہے، ان دونوں مقامات کو الگ الگ ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح ابن حوقل، اصطخری اور صاحب اشکال البلاد، قندابیل کو بجائے وقوع صحرا کے اندر منصورہ سے ۸ منزل کے فاصلہ پر (قندھار سے علٰحدہ) ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ دونوں مقامات الگ الگ واقع تھے علاوہ اس کے یوں بھی اب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہونچ گئی ہے کہ قندابیل وہیں تھا جہاں اب گنڈاوہ (صوبہ کچھ کا صدر مقام) پایا جاتا ہے گنڈاوہ کے چاروں طرف اب بھی فصیل پائی جاتی ہے اور اب بھی قلات و شکارپور کے درمیان وہ بہت مشہور مانا جاتا ہے۔

یہاں محمد بن خلیل فرمانروا تھا۔ شہر پر قبضہ کرکے یہاں کے خاص خاص لوگوں کو "قصدار" لے گیا۔ اس کے بعد اس نے میدیوں کو مغلوب کرکے ایک بندہ یہاں تعمیر کرایا۔ اس کے بعد دریائے اُرل پر خیمہ زن ہوکر جاٹوں سے جزیہ وصول کیا۔

خلافت عباسیہ کا زوال المستعصم باللہ کے عہد سے شروع ہوگیا تھا اور ترکی سپاہ خود مختار ہوتی جاتی تھی اسلئے المعتمد (۲۵۶-۲۷۹ھ / ۸۷۰-۸۹۲ء) اور المقتدر (۲۹۵-۳۲۰ھ / ۹۰۸-۹۳۲ء) کے عہد میں شیرازہ اور زیادہ پراگندہ ہوگیا۔ المعتمد نے یعقوب بن لیث صفاری کو حکومت سندھ سپرد کردی تھی یعقوب نے سنہ ۲۶۵ھ میں انتقال کیا اور اس کے بعد ملتان اور منصورہ میں دو مستقل سلطنتیں قایم ہوگئیں۔

مسعودی سنہ ۳۰۳ و ۳۰۴ھ / ۹۱۵ء میں یہاں آیا تھا۔ اس نے ان دونوں سلطنتوں کا حال اپنی کتاب "مروج الذہب" میں لکھا ہے کہ:۔ "ملتان کی سلطنت خراسان تک وسیع تھی۔ قریش خاندان کا ایک امیر یہاں حکمراں تھا اور قنوج بھی اسی سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ ملتان میں ایک سورج کا مندر تھا۔ اس کی آمدنی کا بڑا حصہ اسی مندر سے حاصل ہوتا تھا کیونکہ زائرین دور دور سے آتے تھے اور قیمتی تحایف مندر پر چڑھاتے تھے۔ منصورہ میں بھی ایک قریشی نسل کا سردار ابوالمنذر بن عبداللہ حکمراں تھا۔ ریاست منصورہ سمندر سے الور تک وسیع تھی۔ اس میں تین لاکھ گاؤں تھے اور امیر منصور کے پاس ۸۰ صرف مسلح ہاتھی تھے۔"

خلیفہ المطیع باللہ (۳۳۴-۳۶۳ھ / ۹۴۶-۹۷۴ء) اور خلیفہ القادر باللہ (۳۸۱-۴۲۲ھ / ۹۹۱-۱۰۳۱ء) کے عہد میں ابن حوقل، ہندوستان آیا تھا اس نے بھی چشم دید حالات یہاں کے بیان کئے ہیں وہ لکھتا ہے کہ "ملتان، منصورہ سے چھوٹا شہر ہے، امیر ملتان شہر سے باہر رہتا ہے، صرف جمعہ کے روز ہاتھی پر سوار ہوکر جامع مسجد میں نماز کے لئے جاتا ہے۔ یہاں کا کوئی خاص سکہ نہیں ہے۔ تاتاری اور قندھاری درہم کا رواج ہے۔ مسلمانوں اور بت پرستوں کے لباس میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں ڈھیلے کپڑے پہنتے ہیں۔ ملتان اور منصورہ دونوں آزاد سلطنتیں ہیں اور خلیفۂ بغداد کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرتے ہیں۔ الور[1] جو ہندؤں کا قدیم دارالسلطنت تھا اس کی فصیل دوہری ہے اور حکومت منصورہ میں شامل ہے۔ سندھ میں سوائے ان دو اسلامی سلطنتوں کے چھوٹی چھوٹی اور ریاستیں بھی ہیں۔ ایک ریاست توران ہے جس کا حاکم ابوالقاسم باشندۂ بصرہ ہے، دوسری

---

[1] الور۔ اس کا نام مختلف طریقوں سے لکھا گیا تھا۔ مسعودی نے "الرقد" لکھا ہے۔ ابن خورداذبہ نے "الدور" ظاہر کیا ہے۔ اصطخری نے "الروز" لکھتا ہے اور ادریسی "دور"۔ اس شہر کے کھنڈر "بھکر" اور "خیرپور" کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ اور "اَلور" کے نام سے مشہور ہیں۔ لفٹنٹ میکلاگن لکھتے ہیں کہ اسے "ارور" بھی کہتے ہیں۔ اور وہ "بندھ" جسے عمران گورنر نے تعمیر کرایا تھا اسکے آثار ایک محراب وادیل کی صورت میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصل نام اس مقام کا اَور تھا اور "ال" عربی کا زاید ہے۔ اب بھی انھیں کھنڈروں کے متصل ایک قصبہ "اوری" کے نام سے موجود ہے جسے اُسی قدیم "الرور" یا رُور کی یادگار سمجھنا چاہئے۔

ریاست قصدار اس کا حاکم ایک عرب نژاد معین بن احمد ہے، تیسری ریاست مکران ہے اور اس کا دارالریاست قیز ہے جو آبادی میں ملتان سے نصف ہے۔ اس کا حاکم عیسیٰ بن معدان ہے۔ چوتھی ریاست مشکی، مکران کی سرحد پر ہے۔ منصورہ، ملتان اور دیگر اضلاع میں عربی و سندھی زبانیں بولی جاتی ہیں، مکران میں مکرانی اور فارسی زبان۔"

ابن حوقل نے قرامطہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اثر سندھ میں بعد کو قایم ہوا۔ ابوالفداء کا بیان ہے کہ قرامطہ کو سنہ ۳۶۰ھ و سنہ ۳۶۳ھ میں مصر کے اندر سخت شکست حاصل ہوئی۔ قیاس کہتا ہے کہ اس شکست کے بعد ہی انھوں نے سندھ کی طرف قسمت آزمائی کی ہوگی اور چونکہ سارا سندھ منتشر حالت میں تھا اس لئے انھوں نے منصورہ و ملتان پر قبضہ کر لیا ہوگا جہاں سے ان کو محمود غزنوی نے نکالا۔

ابن اثیر اور دیگر تواریخ سندھ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود نے بھی سندھ میں سلسلۂ فتوحات قایم کیا تھا۔ اگرچہ عام طور سے مورخین اس کا ذکر نہیں کرتے لیکن ایسا ہونا یقینی ہے کیونکہ جب قصدار اور ملتان اس کے قبضہ میں آگیا تھا تو پھر کوئی چیز اسکی پیشقدمی کے لئے مانع نہ تھی۔ چونکہ یہ امر بالکل یقینی ہے کہ سومنات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد چند روز تک اس نے دریائے سندھ کے کنارے کنارے کوچ کیا اس لئے ابن اثیر کا یہ بیان کہ "سنہ ۴۱۶ھ میں محمود نے منصورہ پر قبضہ کیا اور وہاں ایک مسلمان شہزادہ کو تخت نشین کیا" بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے اور اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس سے قبل جو فرمانروا وہاں کا تھا مسلمان نہ تھا بلکہ قرامطہ میں سے تھا جنھوں نے تین صدی کی حکومت کو سندھ سے بالکل نیست و نابود کر دیا تھا۔

"نگار" کے پرانے پرچے

سنہ ۲۶ء جنوری =۱۲/ — سنہ ۳۰ء مئی = عہ / — سنہ ۳۱ء جولائی، اگست فی پرچہ ۸/ — اکتوبر تا دسمبر فی پرچہ ۸/ — سنہ ۳۲ء فروری، مارچ فی پرچہ ۱۲/ — مئی، جون، جولائی فی پرچہ ۸/ — ستمبر و نومبر فی پرچہ ۸/ — سنہ ۳۴ء فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر فی پرچہ عہ / — سنہ ۳۶ء دسمبر عہ / — سنہ ۳۷ء فروری تا جولائی فی پرچہ ۸/، اکتوبر، نومبر فی پرچہ ۱۲/ — سنہ ۴۰ء فروری تا دسمبر (جون، جولائی، اگست نہیں ہے) فی پرچہ ۸/ — سنہ ۴۱ء مارچ تا دسمبر (ستمبر نہیں ہے) = للعہ — سنہ ۴۲ء مارچ تا مئی فی پرچہ ۸/، اگست، ستمبر، اکتوبر و نومبر ۸/ — سنہ ۴۳ء مئی ۱۲/، ستمبر تا دسمبر فی پرچہ ۱۲/ — سنہ ۴۴ء مئی تا دسمبر مسلسل ۱۲/ فی پرچہ — سنہ ۴۵ء اپریل ۸/ — مئی عہ /، جون، جولائی ۱۴/ فی پرچہ۔ اگست تا دسمبر فی پرچہ ۸/ — سنہ ۴۶ء اپریل تا اگست فی پرچہ ۸/ — ستمبر تا دسمبر فی پرچہ ۱۲/ (مکمل فایل سنہ ۴۶ء = عـ۸ـہ/)

منیجر نگار لکھنؤ

مسلم فرمانرواؤں کا حسنِ انتظام

اور ان کی رواداریاں

بجز اس امر کے کہ صحرا و ریگستان ہونے کے لحاظ سے سندھ و عرب میں ایک اشتراکِ آب و ہوا توفی الجملہ ضرور پایا جاتا ہے اور کوئی بات ایسی نہ تھی جو ان دونوں جگہ کے باشندوں کو ایک دوسرے سے ملا دیتی۔ اگر اور کوئی اختلاف نہ ہوتا تو بھی اختلافِ مذہب ایک ایسا زبردست پردہ تھا جو سندھیوں اور عربوں کے درمیان پڑا ہوا تھا لیکن باوجود اس اختلافِ مذہب و طبایع، اس تباینِ تہذیب و اخلاق کے فاتحین عرب نے سندھ والوں کے اُن حقوق کا بہت لحاظ کیا جو فطری طور سے حاکم و محکوم، راعی و رعایا کے درمیان قایم ہوتے ہیں۔ ممکن تھا کہ عربوں کی فتحمند جماعت سندھیوں کو بالکل بے دست و پا کر کے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیتی۔ لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ ملک کا سارا انتظام جو اُن کے حملہ سے قبل پایا جاتا تھا علیٰ حالہ قایم رہنے دیا اور ایک سندھی کو بھی اس کی جگہ سے نہیں ہٹایا۔

جب داہر قتل ہوا تو محمد قاسم نے اس کے وزیر کو بدستور بحال رکھا تاکہ جو حقوق رعایا کے پہلے سے قایم تھے ان کی حفاظت کرے اور ٹیکس وصول کرنے کے لئے صرف سندھ کے برہمنوں کو مامور کیا اور ایک عرب کو بھی یہ خدمت سپرد نہیں کی گئی۔

مسلمان جب کسی شہر پر حملہ کرنے والے ہوتے تھے تو پہلے وہاں کے باشندوں کے سامنے اسلام پیش کرتے اگر وہ اسلام قبول کر لیتے تو خیر ورنہ پھر جزیہ طلب کرتے۔ اگر اس سے بھی انکار ہوتا تو پھر حملہ کرتے۔ اسلام لانے کی صورت میں سارے امتیازات اُٹھ جاتے اور مساوات قایم ہو جاتی۔ اگر وہ جزیہ ادا کرتے تو ملک اُنھیں کے قبضہ میں رہتا۔ حملہ کے وقت بھی اس کا خاص لحاظ رکھا جاتا کہ صرف مسلح سپاہیوں سے مقابلہ کیا جائے، کاشتکاروں اور تاجروں سے مطلق کوئی تعرض نہیں کیا جاتا تھا۔

مفتوحہ ممالک میں مالگذاری پیداوار پر قایم کی گئی، اُس زمین میں جہاں نہروں کے ذریعہ سے آبپاشی ہوتی، جو اور گیہوں پر ⅖ حصہ متعین کیا گیا اور اُس زمین میں جس کا ذریعۂ آبپاشی نہر نہ تھا (بلکہ کنوئیں یا جھیل وغیرہ سے چرخی لگا کر پانی دیا جاتا) ³⁄₁₀ حصہ مقرر کیا گیا۔ ایسی زمین پر جس کی پیداوار صرف بارش پر منحصر تھی ¼ حصہ مالگذاری میں لیا جاتا اگر قابلِ کاشت زمین

غیر مزروعہ رہتی تو قابض سے فی جریب ایک درہم معاوضہ وصول کیا جاتا۔ باغوں کی پیداوار میں یا حصہ سلطنت کا مقرر تھا اور دیگر ذرائع آمدنی پر (مثلاً مچھلی کا شکار، موتیوں کا نکالنا) عام طور سے ایک خمس لیا جاتا۔ پیشہ و حرفہ پر بھی اسی طرح کا ٹیکس قایم تھا۔ سرزمین کے رقبہ کا اندازہ مسلمان خود نہیں کرتے، بلکہ مالکان دیہ کے بیان پر اعتماد کر لیتے تھے۔ اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ یہ اندازہ کتنا صحیح ہوتا ہوگا اور مسلمانوں کو کیا آمدنی ہوتی ہوگی۔

تجارت کے متعلق بھی عربوں نے بہت وسعتِ نظر سے کام لیا۔ سندھ اس سے قبل بھی تجارتی ملک تھا لیکن عربوں کی حکومت نے تجارت کو بہت ترقی دی۔ خراسان اور سندھ کے درمیان کابل کے راستہ سے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی اور غزنی اور قندھار کی راہ سے زابلستان[1] و سجستان تک سندھی تجار پہونچنے لگے۔ یہ راستہ خشکی کا تھا لیکن بحری راستہ سے بھی تجارت جاری تھی اور چین و سراندیپ وغیرہ کا اسباب تجارت سندھ ہو کر اسی ذریعہ سے قسطنطنیہ تک جاتا تھا۔ عرب سے گھوڑے وغیرہ بھی سندھ تک دریا کے راستہ سے آتے تھے۔

مذہبی معاملات میں بھی عربوں نے سندھیوں کے ساتھ حد درجہ نرمی کا طرز عمل اختیار کیا۔ یہاں کے لوگوں کو عام اجازت دی گئی کہ وہ اپنے مندروں کی مرمت کرائیں۔ آزادی سے پرستش کریں اور ملک کی آمدنی میں سے ۳ فی صدی کے حساب جو حقوق پجاریوں کے مقرر تھے وہ بھی بحال رکھے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ دیبل، نیرون، ملتان وغیرہ میں بعض مندر مسمار بھی کئے گئے۔ مساجد بھی تعمیر ہوئیں لیکن یہ اس وقت ہوا جب حملہ جاری تھا اور پوری طرح تسلط قایم نہ ہوا تھا۔ قیام سلطنت و حکومت کے بعد کوئی زیادتی نہیں کی گئی اور تمام رعایا کے ساتھ اسی رواداری کا اظہار کیا گیا جو اسلام کا مخصوص شیوہ رہا ہے۔ ملتان میں سورج دیوتا کا ایک طلائی بُت تھا۔ محمد قاسم کو اس کے سرداروں نے بہت مجبور کیا کہ اسے توڑ ڈالے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور جب تک عربوں کی حکومت ملتان میں قایم رہی یہ بُت بھی بدستور اپنی جگہ نصب رہا۔

مسلمانوں کے حملہ سے قبل سندھ میں بعض ایسے قوانین جاری تھے کہ انھوں نے قوموں میں امتیاز پیدا کر دیا تھا بعض جماعتوں کے لئے گھوڑے کی سواری، نفیس کپڑوں کا استعمال ممنوع تھا اور ان کے لئے لازم تھا کہ جب قافلے ان آبادیوں کی طرف گزریں تو رہنمائی کے لئے اپنے آدمی مقرر کریں۔ مسلمانوں نے ان قوانین کو بدستور قایم رکھا اور کوئی تغیر نہیں کیا۔

Biog Dictionary L. N. K. V Almamum al

[1] مسعودی، زابلستان کا حال بیان کرتا ہے کہ اس میں بڑے بڑے قلعے پائے جاتے تھے۔ یہاں آبادی مختلف قوموں کی تھی۔ سجستان کے متعلق لکھتا ہے کہ وہاں دریائے ہندمند کے دونوں طرف ساحل پر کثرت سے باغات اور کھیت پائے جاتے تھے اور دریا کے اندر کثرت سے کشتیاں پائی جاتی تھیں اور آب پاشی زیادہ تر ہوائی چرخیوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔

جب کوئی جماعت کسی ملک میں فاتحانہ طریقہ سے داخل ہوتی ہے، تو فطرتاً اس میں جذبۂ تفوق و برتری پیدا ہو جاتے ہیں اور ان جذبات کے زیر اثر وہ مفتوح جماعتوں کے ساتھ سرکشی کرنے لگتی ہے جو کہ اسلام میں ممنوع ہے، اس لئے سرداران عرب نے کبھی اس کی اجازت نہیں دی کہ مسلمان فوجیں شہروں کے اندر رہیں کیونکہ اس صورت میں ضرور رعایا کو تکلیف پہنچتی، بلکہ ان کے قیام کے لئے الگ نو آبادیاں بنائیں جن کو جنود و امصار کہتے تھے اور سخت تاکید تھی کہ وہ عام رعایا سے تعلقات قائم نہ کریں (منصورہ، قندابیل، بیضاء، محفوظہ اور ملتان وغیرہ انھیں امصار عسکری میں سے تھے)

ہر چند سندھ میں بھی اسلامی قانون رائج کیا گیا اور قاضی مقرر کئے گئے کہ وہ شرع کے مطابق معاملات کو طے کریں مگر ہندو مجبور نہیں کئے گئے کہ وہ بھی اس قانون کو تسلیم کریں چنانچہ وہ اپنے تمام معاملات و نزاعات جن کا تعلق حکومت سے نہ ہو پنچایت کے ذریعہ طے کرنے کے مجاز تھے۔

فوج میں اہل سندھ کو بھی آزادی کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس سے ایک فایدہ تو یہ ہوا کہ یہاں کا جنگ آزمودہ طبقہ ان کا طرفدار ہو گیا اور دوسرے یہ کہ جب کبھی عربوں نے سرکشی کی تو ان سے کام لے کر اُن کو دبایا گیا۔ علاوہ اس کے سندھی افواج کو ملک سے باہر بھی دور دراز مقامات میں روانہ کیا گیا، چنانچہ جب ۱۰۸ھ میں سلطنت بازنطائن پر مسلمانوں نے حملہ کیا تو افواجِ شام میں سندھی دستے بھی موجود تھے۔

عربوں نے جس شان کے ساتھ سندھ پر حملہ کیا اور جیسی نمایاں کامیابی حاصل کی، اس کا اقتضاء یہ تھا کہ مسلمانوں کی پیشقدمی اور زیادہ جاری رہتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ صرف سندھ کے اندر ان کی حکومت قائم ہوئی اور وہ بھی تین صدی کے اندر ہی اندر رفتہ رفتہ کمزور ہو کر نیست و نابود ہو گئی اس کے اسباب پر جس قدر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسکا بڑا سبب وہ نفاق تھا جو قبایل عرب میں باہم پیدا ہو گیا تھا۔ اگر خلیفۂ اوّل یا دوّم کے زمانہ میں سندھ فتح ہو گیا ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ آج ہندوستان کی تاریخ کسی اور نہج سے مرتب کی جاتی، لیکن افسوس ہے کہ سندھ بنو امیہ کے عہد میں مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، جب عرب دو جماعتوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور تمام وہ اندرونی سازشیں جو ایک ملک کو تباہ کر دیتی ہیں آہستہ آہستہ مستحکم ہوتی جا رہی تھیں۔ اگر محمد قاسم اس قبیلہ پرستی کی بناء پر سندھ سے بلا کر قتل نہ کر دیا جاتا تو یہ بالکل یقینی ہے کہ اس کا سلسلۂ فتوحات چین تک پہونچ جاتا جیسا کہ حجاج ابن یوسف کا خیال تھا۔ پھر دقت یہ تھی کہ ہر نئے خلیفہ کے اصول حکومت اپنے پیش رو سے بالکل جدا ہوتے تھے، اور ہر جدید حکمران کے ساتھ ساری دنیا نئی ہو جاتی تھی اس لئے کبھی کوئی گورنر اطمینان و سکون کے ساتھ نہ سندھ میں حکومت کر سکا اور نہ سلسلۂ فتوحات کو بڑھا سکا۔ اگر کسی نے اصلاحات شروع کیں اور آگے بڑھنے کے اسباب فراہم کئے تو بد قسمتی سے خلافت بدل گئی اور اس غریب کو بھی معزول ہو جانا پڑا۔ اس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ گورنروں سندھ کا مرکزِ خیال بدل گیا اور پایۂ تخت سے ہمدردی اُٹھ جانے کی وجہ سے خود مختاری و خود سری کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ پھر چونکہ سندھ میں عرب کے مختلف قبایل کے لوگ آکر آباد ہو گئے تھے، اس لئے جب عرب میں قبایل کے درمیان

کوئی اختلاف پیدا ہوتا تھا تو یہاں کے قبایل بھی ایک دوسرے کے مخالف ہو جاتے تھے۔

عہدِ بنی عباس میں بعض خلفاء ایسے ہوئے کہ یہ اختلافِ قبایل چند دن کے لئے انھوں نے مٹا دیا اور اُن کے زمانہ میں سندھ کی حالت بھی بہتر ہو گئی لیکن خلیفہ المعتصم کے زمانہ میں یمنی و نزاری نزاع شروع ہو گئی اور سندھ بھی اسی اختلاف کا شکار ہوا۔

چونکہ عہدِ عباسیہ میں ہارون الرشید کے وقت سے عجمیوں کا اقتدار قایم ہو گیا تھا جو رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اس لئے تمام اُن مقامات میں جہاں خالص عرب حکومتوں کا تعلق تھا، ضعف پیدا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا، جب خوارج و قرامطہ ملاحدہ اور روافض وغیرہ نے ساری سلطنت کے شیرازہ کو درہم وبرہم کر دیا، اور ہر جگہ حکومت کی عمارت متزلزل ہو گئی چونکہ سندھ پایۂ تخت سے بہت دور واقع تھا اور تمام شورش پسند جماعتوں کے لئے ایک اچھی جائے پناہ بن سکتا تھا۔ اسلئے یہاں خوارج و زنادقہ، ملاحدہ و علویین نے کافی قوت حاصل کر لی اور تمام مکران و سندھ میں پھیل کر سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا۔ چنانچہ اب تک بہت سے خاندان سیدوں کے سندھ میں ایسے باقی ہیں جو انھیں علویین کی اولاد میں سے ہیں جنھوں نے نہ صرف سندھ کے اندر اپنے مستقل شہر قایم کئے بلکہ مشرقی ہندوستان تک بڑھ آئے۔ چنانچہ اکثر موجودہ خاندان سادات انھیں علوئیین کی ذریات میں سے ہیں جو کسی وقت وادیِ سندھ میں آکر ٹھٹہ اور بھکر پر مستولی ہو گئے تھے۔

عربوں کے وقت سندھ کا مذہب

یہ بالکل یقینی ہے کہ جب عربوں نے سندھ پر حملہ کیا، اس وقت یہاں بودھ مذہب عام طور سے رائج تھا۔ بلاذری نے ملتان میں سورج کے مندر کا ذکر کرتے ہوئے اس کا نام بُد لکھا ہے جس سے مراد غالباً بت نہیں بلکہ بودھ ہے دیبل میں جو مندر تھا وہ بھی بودھ ہی کا تھا۔ اس کے متعلق تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ اس کی بلندی ۱۲۰ فٹ تھی اور اس کے اوپر ایک قبہ یا گنبد بنا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ بودھ کا ٹوپ رہا ہو۔ جیسا کہ سانچی وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔

اگرچہ چچ جس نے دیبل میں قبضہ کر لیا تھا برہمن تھا، لیکن بُت پرستی کے لحاظ سے برہمن قوم ایسی نہیں ہے جو بودھ کی پرستش کو منع کرتی یا خود اس طرف مائل نہ ہو جاتی، اس لئے بالکل ممکن ہے کہ چچ اور داہر، بودھ کے اس مندر کو عظمت کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں اور فی الجملہ بودھ ہو گئے ہوں۔

اس امر کا ثبوت کہ اسوقت بودھ مذہب کا رواج تھا، نہ صرف چینی سیاحوں اور ابن خورداذبہ[1] کے بیانات سے

---

[1] کتاب المسالک والممالک، کا مصنف ابوالقاسم عبیداللہ بن عبداللہ بن خورداذبہ، تھا جو عام طور سے "ابن خورداذبہ" کے نام سے مشہور ہے۔ "خورداذبہ" کا جد اعلیٰ مذہباً آتش پرست تھا جو بعد کو مسلمان ہو گیا۔ ابن خورداذبہ (ابوالقاسم) نے خلفائے عباسیہ کے وقت میں بہت عزت حاصل کی اور مختلف ممالک کی جغرافی تحقیقات کرنے کے بعد یہ کتاب تصنیف کی۔ سنہ ۳۰۰ھ / ۹۱۲ء میں اسنے انتقال کیا۔

کچھ زمانہ قبل ابن خورداذبہ کا تشخص مابہ النزاع امر تھا بعض کہتے تھے کہ ابواسحاق اصطخری اور یہ دونوں ایک ہی شخص ہیں لیکن جب سے اصطخری کی کتاب جداگانہ شایع ہو گئی ہے، اس وقت سے یہ امر صاف ہو گیا ہے کہ یہ دونوں ہستیاں الگ الگ تھیں۔

معلوم ہوتا ہے بلکہ خود عربوں کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے مثلاً بلاذری کا بیان ہے کہ "مندر کے پجاریوں کو سمنی کہتے تھے"۔ سمنی سنسکرت لفظ شرمن سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں مذہبی بھکاری، اور مذہبی بھکاری خصوصیت کے ساتھ بودھ مذہب ہی میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح چچ نامہ میں لکھا ہے کہ جب محمد قاسم نے دیبل فتح کیا تو وہاں کے ایک ہزار برہمنوں نے استدعا کی کہ انھیں اپنے مراسم قدیم پر قایم رہنے کی اجازت دی جائے۔ ان کی یہ استدعا قبول کی گئی اور وہ بدستور ہر صبح اُٹھ کر ہاتھوں میں کاسۂ گدائی لئے ہوئے بھیک مانگا کرتے تھے اور یہ طریقہ بودھ مذہب والوں ہی کا ہے۔ اسکے ساتھ اگر اس امر پر غور کیا جائے کہ اسوقت تاریخوں میں کہیں گائے کی پوجا یا ستی وغیرہ کا ذکر نہیں ہے (جو ہندوؤں کے ساتھ مخصوص ہے) تو یہ امر اور زیادہ محقق ہو جاتا ہے کہ اس وقت سندھ میں بودھ مذہب ہی رائج تھا۔

خلافتِ عباسیہ کے آخری زمانہ میں سندھ، غزنی حکومت سے متعلق ہو گیا اور محمود جب حملۂ سومنات کے بعد منصورہ میں اپنا نائب مقرر کر کے غزنی واپس گیا ہے، تو علی الترتیب سمرا، سما، ارغون و ترخان خاندانوں[1] کی حکومتیں مختلف اقطاعِ سندھ

---

[1] سمرا خاندان کے ابتدائی حالات بہت کچھ پردۂ خفا میں ہیں۔ میر معصوم کا بیان ہے کہ عبد الرشید سلطان مسعود کے عہد میں (۴۴۳ھ، ۱۰۵۱ء) سمرا قوم نے غزنوی حکومت سے بغاوت کی اور سندھ کے تخت پر ایک شخص سمرا نامی کو بٹھا دیا۔ ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں صرف اس قدر لکھا ہے کہ سمرا خاندان کے ۳۶ فرمانرواؤں نے ۵۰۰ سال تک حکومت کی۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ محمد قاسم کی وفات کے بعد ایک قبیلۂ عرب نے جسکا تعلق انصاریوں سے تھا اپنی حکومت سندھ میں قایم کی اور اس کے بعد ۵۰۰ سال تک سمرا زمینداروں نے سلطنت کی (جنکا حال معلوم نہیں ہو سکا) اس کے بعد سما خاندان آیا جس نے جام کا لقب اختیار کیا۔ ان خاندانوں کے زمانہ میں شاہانِ غزنی و غور و سلاطین دہلی، سندھ پر حملہ کرتے رہے اور بہت سے شہروں پر قبضہ کر کے اپنے گورنر مقرر کر دئے۔

تاریخ طاہری میں لکھا ہے کہ سمرا ایک ہندو خاندان تھا جس نے ۷۰۰ھ سے ۸۴۳ھ تک حکومت کی۔ بیگ لر نامہ نے بھی وہی لکھا ہے جو فرشتہ نے بیان کیا ہے۔ محمد یوسف نے منتخب التواریخ میں میر معصوم کے بیان کا تتبع کرتے ہوئے سمرا خاندان کے ۱۹ بادشاہوں کا نام لکھا ہے جن میں سے اول سمرا اور آخری بھونگر ثالث ہے۔ ان میں بعض نام ایسے ہیں جن سے ان کے مسلمان ہونے کا قیاس ہوتا ہے مثلاً محمد طور، عمر سمرا، تحفۃ الکرام کا بیان ہے کہ سمرا قوم اعرابِ سامرہ سے پیدا ہوئی جو دوسری صدی ہجری میں سندھ آئے تھے جب خاندان غزنی و غور کا اثر حکومتِ سندھ میں قایم ہونے لگا اور ان خاندانوں کے گورنر بھی متعین ہوئے اُسوقت سمرا خاندان کے افراد سندھ کے بعض حصوں میں خود مختار فرمانروا تھے۔ دوسری جگہ سمرا خاندان کا ذکر کرتے ہوئے صاحب تحفۃ الکرام نے لکھا ہے کہ جب غازی ملک ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء) میں ملتان اور سندھ کی افواج مجتمع کر کے دہلی روانہ ہوا اور خسرو خاں کو شکست دیکر غیاث الدین تغلق شاہ کا لقب اختیار کیا تو سمرا قوم نے سندھ میں ایک شخص سمرا نامی کو اپنی ہی قوم میں سے منتخب کر کے اپنا حکمران بنا لیا اور پھر اس کی اولاد عرصہ تک حکمران رہی، حتے کہ ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) میں سما قوم نے خروج کیا اور سمرا خاندان کے آخری فرمانروا ارمیل کو ہلاک کر کے حکومت سندھ چھین لی۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ ہو)

میں قائم ہوئیں۔ یہاں تک کہ شہنشاہ اکبر نے اس طوائف الملوکی کو مٹا کر سندھ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۹)

الغرض سمرہ خاندان کے صحیح حالات پردۂ خفا میں ہیں اور اس وقت تک یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ کس خاندان سے تھے اور کب سے کب تک انھوں نے سندھ میں حکومت کی۔ یورپین محققین میں بھی سخت اختلاف ہے۔ مسٹر الفنسٹن انھیں مسلمان راجپوت بتاتے ہیں اور ڈاکٹر برگز ابو لہب کی اولاد ظاہر کرتے ہیں۔

سما خاندان کی حکومت سندھ میں سمرہ کے بعد قائم ہوئی۔ اس کا زمانۂ حکومت [illegible] تک رہا یہاں تک کہ ارغون خاندان نے ان کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ بیگ ترخان نامہ، سما خاندان کی حکومت کا اختتام [illegible] میں ظاہر کرتا ہے۔ تاریخ طاہری میں [illegible] درج ہے اور تحفۃ الکرام میں [illegible] تحریر ہے۔ اس لئے اس خاندان کی حکومت کم از کم ۱۴۴ سال اور زیادہ سے زیادہ ۱۹۳ سال تک قائم رہی لیکن تحفۃ الکرام کا بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے جس کی تصدیق مسٹر ہیگ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

اس خاندان کے فرمانروا جام کے لقب سے مشہور ہیں اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ جمشید کی اولاد میں سے تھے۔ بعض کا بیان ہے کہ ان کا سلسلہ ابو جہل سے ملتا تھا اور بعض سام بن نوح سے متعلق کرتے ہیں۔ چچ نامہ میں درج ہے کہ جس وقت محمد قاسم نے حملہ کیا ہے تو دریائے سندھ کے ساحل کے قریب تک کے باشندوں نے اطاعت اختیار کی۔ اس جماعت کا سردار ایک شخص سما تھا جو چچ کی طرف سے دیبل کا گورنر بھی تھا۔ یہ لوگ ہندو تھے اور کرشن جی کے بیٹے سما سے ان کا سلسلۂ نسب ملتا تھا اور ساحلِ دریائے سندھ پر سما نگر ان کا دارالحکومت تھا۔ یہ لوگ غالباً [illegible] میں مسلمان ہوئے۔ چچ نامہ کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ سما خاندان یہی تھا جو پہلے راجپوت تھا اور بعد کو مسلمان ہو گیا۔

خاندان ارغون۔ ہلاکو (چنگیز خاں کا پوتا) کے پوتے کا نام ارغون خاں ترخان تھا۔ اور یہ خاندان اس کی نسل سے ہے۔ اس خاندان کی حکومت [illegible] یعنی ۴۱ سال تک قائم رہی اور [illegible] میں ختم ہو گئی۔ آخری حکمران شاہ حسین تھا جس نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

خاندان ترخان۔ اس خاندان کے متعلق بعض کا بیان ہے کہ چنگیز خاں نے ایک نوجوان شخص کو اس کی بعض خدمات کے معاوضہ میں ترخان کا لقب دیا تھا اور یہ خاندان اُسی کی اولاد میں سے تھا بعض اس واقعہ کو تیمور سے متعلق کرتے ہیں۔ لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ ایغون کا کی اولاد میں سے تھے۔ یہ خاندان صرف ۳۸ سال تک سندھ کا حکمراں رہا۔ اس کے آخری فرمانروا مرزا جانی بیگ نے [illegible] میں اپنی خود مختاری اکبر کے جنرل خان خاناں کے سپرد کر دی۔ تاریخ طاہری نے [illegible] تک اس خاندان کا زمانۂ حکومت تحریر کیا ہے، کیونکہ غازی بیگ ترخان اسی سال تک زندہ رہا تھا لیکن چونکہ غازی بیگ کی حیثیت صرف ایک جاگیردار کی سی تھی، اس لئے اس خاندان کی حکومت کا اختتام درحقیقت [illegible] میں ہو گیا تھا اور سندھ اسی وقت تیموریہ سلطنت میں شامل ہو گیا تھا۔

غزنوی عہد پر تبصرہ

جنھوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اُن سے پوشیدہ نہیں کہ محمود کے زمانہ میں غزنی (پایۂ تخت) کا کیا عالم تھا، اسوقت غزنی، علوم و فنون کا مخزن بنا ہوا تھا اور ہر چار طرف سے علماء و فضلا اُمنڈے چلے آرہے تھے۔

مصنف تاریخ گزیدہ[1] کا بیان ہے کہ ہر سال چار لاکھ دینار وہ شعراء اور علماء پر صرف کیا کرتا تھا پھر اُس نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ متعدد مدارس بھی جاری کئے اور (حسب بیان فرشتہ[2]) غزنی کی اس مشہور مسجد کے جوار میں جو سنگ مرمر اور سنگ خام کی حسین ساخت اور بے مثل آرائش کی وجہ سے "عروس ملک" کہی جاتی تھی، ایک یونیورسٹی قایم کی اور اسی کے ساتھ اس نے

---

[1] تاریخ گزیدہ، سنہ ۷۳۰ھ (سنہ ۱۳۲۹ء) میں مرتب ہوئی اس کا مؤلف حمد اللہ بن ابوبکر بن حمد بن نصر مستوفی قزوینی تھا۔ حمد اللہ، رشید الدین کے بیٹے غیاث الدین (وزیر) کا سکریٹری تھا اور اسی کے نام یہ کتاب معنون کی گئی ہے۔

تاریخ گزیدہ، مشرق کی بہترین تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یورپ کے مشہور مصنف و مورخ ہیمر پرگشتال (Hammer Purgstall) نے اس تاریخ کو اس عہد کی بہترین تصنیف قرار دیا ہے۔

جب حمد اللہ اس تاریخ کو مرتب کر چکا تو اس کے گیارہ سال بعد اس نے جغرافیہ اور تاریخ طبعی میں ایک بے مثل کتاب نزہت القلوب لکھی۔

تاریخ گزیدہ کے خاص خاص ماخذ حسب ذیل ہیں:۔ تاریخ طبری۔ تاریخ کامل ابن اثیر۔ نظام التواریخ بیضاوی، زبدۃ التواریخ جمال الدین کاشی۔ جہاں کشا جوینی۔

[2] تاریخ فرشتہ عام طور سے ہندوستان کی بہترین تاریخ تسلیم کی جاتی ہے اس کا مصنف محمد قاسم ہندو شاہ (فرشتہ) بمقام استرآباد سنہ ۱۵۵۰ء میں اور بعض مورخین کی تحقیق سے سنہ ۱۵۷۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ (غلام علی ہندو شاہ) نے ہندوستان کا سفر اسوقت اختیار کیا جب کہ اس کا بیٹا محمد قاسم بہت کم سن تھا وہ مرتضیٰ نظام شاہ کے عہد میں احمد نگر (دکن) پہونچا اور میران حسین ولی عہد کی تعلیم کے لئے مامور ہوا۔ اتفاق سے غلام علی ہندو شاہ جلد مرگیا۔ اور محمد قاسم یتیم ہوگیا۔ لیکن چونکہ غلام علی کا اقتدار دربار دکن میں بہت قایم ہو چکا تھا اس لئے وہی عنایات محمد قاسم پر بھی مبذول ہوئیں اور رفتہ رفتہ یہ بادشاہ کا مشیر خاص ہوگیا۔ جب شہزادۂ میران حسین نے اپنے باپ مرتضیٰ نظام شاہ کو تخت سے علیٰحدہ کیا، اُسوقت محمد قاسم کی عمر ۱۶، ۱۷ سال کی تھی۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ کیجئے)

مختلف زبانوں کی کتابوں کا بے نظیر اور بہت بڑا ذخیرہ فراہم کیا اور ایک عجائب خانہ بھی تعمیر کرایا جس میں بہت سے نوادر[له] پائے جاتے تھے۔

محمود نے اس یونیورسٹی کی تکمیل میں جس قدر روپیہ صرف کیا وہ اُس مستقل امداد سے علحدہ تھا، جو اُس نے جاگیروں کی صورت میں یونیورسٹی کے سالانہ مصارف اور طلباء و مدرسین کے وظائف و مشاہرہ کے لئے وقف کردی تھیں[ته]۔

اس یونیورسٹی کے قیام اور محمود کی عام علم پروری کا یہ اثر ہوا کہ تھوڑے دنوں میں شعراء ادباء اور حکماء مختلف مقامات سے کھنچکر آنے لگے اور غزنی جو اپنی بے نظیر عمارات و محلات و باغات اور بے شمار چشموں، حوضوں اور فواروں کی وجہ سے عروس البلاد بنا ہوا تھا، علم و حکمت کا مرکز بھی بن گیا اور اس طرح حُسن صورت و سیرت کا امتزاج تکمیل کے ساتھ وہاں نظر آنے لگا۔ اُن مشاہیر میں سے جو محمود کی نگاہوں میں خاص عزت رکھتے تھے، ایک شخص عتبی تھا جس نے اولادِ سبکتگین کے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۱)

ایک سال بعد جب میران حسین قتل کیا گیا تو محمد قاسم سنہ ۱۵۸۹ء میں بیجاپور چلا گیا۔ یہاں دلاور خاں وزیر نے ابراہیم عادل شاہ کی خدمت میں جو اس وقت وہاں کا حکمراں تھا اُسے پیش کیا لیکن کوئی خاص عزت اس کی نہیں کی گئی۔ جب دلاور خاں معزول ہوکر بھاگ گیا اور سنہ ۱۵۹۳ء میں عنایت خاں شیرازی وزیر ہوا تو اس نے پھر محمد قاسم کو پیش کیا اور ابراہیم عادل شاہ نے نہایت عزت سے اس کی پذیرائی کرکے تاریخ دکن لکھنے کی ہدایت کی جو تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہے۔ سنہ ۱۶۰۶ء میں اس نے یہ تاریخ مکمل کرکے عادل شاہ کے سامنے پیش کی لیکن اسکے بعد بھی وہ ہمیشہ اس کی صحت و ترمیم، حذف و اضافہ میں لگا رہا۔

برگس Briggs کا خیال ہے کہ سنہ ۱۶۱۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔ جب کہ اس کی عمر صرف ۴۱ سال کی تھی لیکن ام جے محل (M. J. Mohl) کی تحقیق یہ ہے کہ اس نے سنہ ۱۶۲۳ء تک اپنی تاریخ میں واقعات کا اضافہ کیا ہے اس لئے وفات کے وقت اس کی عمر ۵۲ سال سے کم نہ تھی۔

چونکہ ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں یہ تاریخ مرتب ہوئی تھی اس لئے مصنف نے اس کا نام گلشن ابراہیمی یا تاریخ ابراہیمی رکھا اور بعد کو جب ابراہیم نے نیا پایۂ تخت نورس تعمیر کرایا تو اس کی یادگار میں دوسرا نام نورس نامہ بھی قرار پایا۔

یہ تاریخ، دکن کی بہترین تاریخ ہے لیکن چونکہ اس کا مصنف شیعی مذہب رکھتا تھا اس لئے عصبیت کی جھلک کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔

[له] انھیں نوادر میں سے ایک طائر تھا قمری کی صورت کا۔ جب مجلس میں زہر آلود کھانا اس کے سامنے لایا جاتا تو وہ مضطرب ہوجاتا اور آنسو اس کی آنکھوں سے جاری ہوجاتے۔ ایک پتھر کا ٹکڑا بھی تھا جو مومیائی اثر رکھتا تھا کیسا ہی زخم ہو اس کے گھِس کر لگانے سے فوراً اچھا ہوجاتا تھا۔

[ته] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۲ (نولکشور)

حالات میں تاریخ یمینی[۴۱] لکھی ہے۔ دوسرا غضائری رازی ایران کا رہنے والا تھا۔ ایک بار اس نے ایک مختصر سا قصیدہ محمود کے سامنے پیش کیا اور چودہ ہزار درہم انعام میں حاصل کئے۔ تیسرا اسدی طوسی باشندۂ خراسان تھا۔ یہ بھی نہایت مشہور شاعر تھا اور محمود نے اُسے بارہا تصنیف شاہنامہ پر مجبور کیا، لیکن وہ ہمیشہ اپنی ضعیفی کا عذر پیش کر دیا کرتا تھا۔ اسی طرح منوچہر جو بلخ[۴۲] کا رئیس اور اپنی شاعری و ذہانت کی وجہ سے بہت مشہور تھا دربار محمود کا ایک جوہر تابندہ تھا۔

عنصری جو اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر، حکیم، زباندان اور فیلسوف تھا غزنی یونیورسٹی کا پروفیسر تھا اور کوئی نظم محمود کے سامنے پیش نہ ہو سکتی تھی، جب تک عنصری اس کو نہ دیکھ لیتا۔

انھیں شعراء کے زمرہ میں فردوسی بھی تھا جسے محمود نے شاہنامہ لکھنے پر مامور کیا۔ سامانی فرمانروا دقیقی سے جو امیر نوح سامانی کا معاصر تھا، شاہنامہ کا سنگ بنیاد پہلے ہی رکھوا چکا تھا اور وہ تین ہزار شعر بھی لکھ چکا تھا لیکن اس کی ناوقت موت سے یہ کام پورا نہ ہو سکا اور آخرکار محمود کے عہد میں قرعۂ فال فردوسی کے نام نکلا۔

محمود کی علم پروری اور ذوقِ ادب کے ثبوت میں جہاں اور بہت سی مثالیں پیش کی جاتی ہیں وہیں ایک نمایاں مثال وہ بھی ہے جو صاحب طبقات اکبری[۴۳] نے بیان کی ہے۔

---

[۴۱] تاریخ یمینی کے مصنف کا نام ابوالنصر محمد ابن محمد الجبار العتبی تھا۔ یہ اس خاندان عتبہ سے تعلق رکھتا تھا جو سامانی بادشاہوں کے عہد میں بہت ممتاز سمجھا جاتا تھا ابوالنصر عتبی سلطان محمود کا سکریٹری تھا۔ تاریخ یمینی میں اس نے ناصرالدین سبکتگین کے پورے حالات اور محمود کے حالات [illegible] تک درج کئے ہیں۔

تاریخ یمینی ادب کے لحاظ سے بھی عربی کی مشکل کتاب خیال کی جاتی ہے اور فارسی میں بھی اس کے متعدد ترجمے کئے گئے ہیں۔ ان ترجموں میں سب سے قدیم ترجمہ ابوالشرف کا ہے جو ۵۸۲ھ میں کیا گیا تھا۔ یہ ترجمہ اب نایاب ہے البتہ اس کو انگریزی ملبوس میں ریورینڈ جے رینالڈس Rev J. Renolds نے ۱۸۵۸ء میں شایع کیا تھا۔ دوسرا ترجمہ محمد کرامت علی دہلوی کا ہے جو مختلف کتب خانوں میں نظر آجاتا ہے۔ تاریخ یمینی کی شرحیں اور فرہنگیں بھی متعدد لکھی گئی ہیں جن میں سے اب صرف ایک آدھ کہیں نظر آجاتی ہے۔

[۴۲] تاریخ گزیدہ صفحہ ۴۱۸

[۴۳] طبقات اکبری کا صحیح نام طبقات اکبر شاہی اور اسم مصنف کی رعایت سے تاریخ نظامی بھی کہتے ہیں۔ یہ تصنیف ہندوستان کی مشہور ترین تاریخوں میں سے ہے اور غالباً سب سے پہلی تاریخ یہی ہے جس میں جدید اصول پر صرف ہندوستان کے حالات سے بحث کی گئی۔ تمام بعد کے مورخین نے اس کو اپنا ماخذ قرار دیا۔ یہاں تک کہ ملا عبدالقادر بدایونی مصنف منتخب التواریخ تو اپنی تصنیف کو صرف طبقات اکبری ہی کا خلاصہ ظاہر کرتا ہے اور ۱۰۰۲ھ تک کے تمام واقعات اس سے اخذ کرتا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمایئے)

جب ۴۱۳ھ/۱۰۲۱ء میں محمود نے گوالیار کا محاصرہ کر کے وہاں کے راجہ کو مطیع کر لیا تو کالنجر[1] کی طرف بڑھا جو اُس وقت اپنی مضبوطی کے لحاظ سے ایک بے مثل قلعہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ جب یہاں کے راجہ نندا نے دیکھا کہ وہ محمود کے محاصرہ کی تاب نہیں لا سکتا تو اُس نے تین سو ہاتھی پیش کرتے ہوئے صلح کی درخواست کی۔ چونکہ ان ہاتھیوں پر کوئی مہاوت نہ تھا، اس لئے محمود نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ انھیں پکڑ کر سوار ہو جائیں۔ نندا یہ دیکھ کر بہت متعجب ہوا اور محمود کی تعریف میں ایک شعر یا چند اشعار ہندی زبان میں پیش کئے، محمود نے اس کو پڑھوا کر سُنا اور سمجھا۔ یہ اشعار اپنے معانی کے لحاظ سے اس قدر بے مثل تھے کہ محمود اپنے صحیح مقصود کو بھی بھول گیا اور اس نے بے اختیار ہو کر نندا کو پندرہ قلعوں کی حکومت تفویض کر کے (جن میں کالنجر بھی شامل تھا) اور بھی تحائف و ہدایا دئے جانے کا حکم دیا۔ فرشتہ نے بھی اس کو انھیں الفاظ میں بیان کیا ہے[2]۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمود اپنی فطرت کے لحاظ سے کیسا ہنر شناس تھا اور اپنے ذوقِ علم کی بنا پر بسا اوقات اپنے خیالِ ملک گیری کو بھی ترک کر دیتا تھا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۲)

صاحب مآثر الامرا نے بھی اس تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محمد قاسم فرشتہ نے بھی اس سے بہت مدد لی ہے البتہ ابو الفضل کے اکبر نامہ سے کہیں کہیں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس کا فیصلہ ہر شخص کر سکتا ہے کہ اکبر نامہ زیادہ صحیح ہو سکتا ہے یا طبقات اکبری۔ یوروپین مصنفین بھی اس تاریخ کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اس کا مصنف خواجہ نظام الدین احمد خواجہ مقیم ہروی کا بیٹا تھا۔ یہ خواجہ مقیم وہی ہے جو بابر کا ندیم و مصاحب تھا اور بعد کو اس کے خانگی انتظام کا مہتمم ہو گیا تھا۔ بابر نے اپنی تصنیف تزک بابری میں اس کا ذکر کیا ہے۔ بابر کی وفات پر جب ہمایوں نے گجرات فتح کر کے صوبۂ احمد آباد مرزا عسکری کے سپرد کی تو ساتھ ہی ساتھ خواجہ مقیم کو مرزا عسکری کا وزیر بھی مقرر کیا۔ جب ہمایوں کو چوسنہ کے مقام پر شیر شاہ نے شکست دی اور وہ آگرہ کی طرف بھاگا تو مقیم خاں ساتھ ساتھ تھا۔

خواجہ نظام الدین اس مقیم خاں کا بیٹا تھا اور عہد اکبری کے ممتاز ترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ صوبۂ گجرات میں وہ بخشی گری کے عہدہ پر متمکن تھا اور اس نے مختلف جنگوں میں نمایاں حصہ بھی لیا۔

جب ۳۴ سال جلوس (۹۹۸ھ) میں حکومتِ گجرات، خان اعظم صوبہ دار مالوہ کے سپرد کی گئی تو خواجہ نظام الدین کو اکبر نے اپنے حضور میں طلب کیا۔ وقت بہت کم تھا اور تاریخ سالگرہ قریب تھی اس لئے خواجہ نے ۶۰۰ کوس کا سفر بارہ دن میں طے کیا اور عین تاریخ جلوس پر پہونچ گیا۔ اکبر نے اس کی بہت عزت کی۔ ۳۹ سال (۱۰۰۳ھ) میں جبکہ بادشاہ باہر شکار میں مصروف تھا خواجہ تپ میں مبتلا ہوا اور لاہور پہونچتے پہونچتے ساحل راوی پر انتقال کیا۔ بعد کو جہانگیر کے عہد میں خواجہ کی بعض اولاد نے کافی ترقیاں کیں۔

[1] اب یہ ایک گاؤں ہے ضلع باندہ کا۔ یہاں ابتک قلعہ شکستہ حالت میں موجود ہے۔ — [2] فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۲۔

صاحب نگارستان[1] نے احمد حسن میمندی کی ذہانت کے متعلق جو محمود کے عنفوان شباب کا ساتھی اور اس کا نہایت معتمد علیہ خادم تھا، جو واقعات درج کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس ذہن و دماغ کے لوگوں کی صحبت پسند کرتا تھا۔

غضائری رازی اپنے وطن ہی سے قصیدہ لکھ کر محمود کے دربار میں بھیجا کرتا تھا اور ہر قصیدہ کے عوض میں مقررہ انعام ایک ہزار اشرفیوں کا اُسے ملا کرتا تھا۔ ایک بار وہ دربار میں خود آیا اور ایک رباعی پیش کی تو اشرفیوں کے دو توڑے اور زاید دئے گئے چنانچہ وہ خود کہتا ہے :۔

بلے دو بدرۂ دینار یافتم بہ تمام　　حلال و پاک تراز شیر دایۂ اطفال[2]

بعض مورخین نے ظاہر کیا ہے کہ محمود خود بھی شاعر تھا اور اس کے ثبوت میں حسب ذیل قطعہ پیش کرتے ہیں :

بزخم تیغ جہانگیر و گرز قلعہ کشائے　　جہاں مسخر من شد چو تن مسخر رائے
بسے بلاد گرفتم بیک اشارتِ دست　　بسے قلاع گرفتم بیک فشردن پائے
چو مرگ تاختن آورد ہیچ سود نبود　　بقا، بقائے خداوند و ملک، ملکِ خدائے

لیکن صاحب تاریخ گزیدہ نے سلطان محمد بن ملک شاہ سلجوقی کی طرف ان اشعار کو منسوب کیا ہے[3]۔

نپولین اعظم کی ممتاز ترین صفت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس نے جن جن ممالک کو مغلوب کیا وہاں کے بہترین صناعات اپنے ملک میں لایا اور اس طرح پیرس کی آرائش میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اُٹھا رکھا۔ لیکن محمود نے اپنے پایۂ تخت غزنیں کی ترقی میں نپولین سے زیادہ کام کیا کیونکہ وہ مفتوحہ ممالک کی صناعات کے ساتھ ہی خود وہاں کے صناع، شعراء، علماء اور فضلاء کو بھی غزنیں لے آیا اور اپنے دربار کو ان تابندہ جواہرات سے جگمگا دیا۔

ماوراء النہر کے سواحل بحر خضر، ایران، خراسان میں کوئی ایسا مقام نہ تھا جس نے اپنے بہترین فرزندوں کو محمود کی خدمت کے لئے پیش نہ کر دیا ہو۔

سامانی خاندان، جو علم و ادب کا بڑا قدر شناس تھا تباہ ہو چکا تھا اور اب علماء و شعراء وغیرہ کے لئے غزنیں سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی جہاں سلطان محمود اہلِ کمال کی قدر دانی کے لئے کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔

---

[1] نگارستان ایک مجموعہ ہے مختلف حکمران خاندانوں کے متعلق مختلف قصص و حکایات کا۔ اس کا مصنف احمد بن محمد بن غفور الغفاری القزوینی تھا جو عام طور سے قاضی احمد الغفاری کے نام سے مشہور ہے۔ نگارستان اس کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۹۵۹ھ / ۱۵۵۲ء میں لکھی گئی ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ اس نے ۲۸ معتبر کتب تواریخ سے مواد فراہم کیا ہے۔

[2] شعرالعجم جلد ۴ - صفحہ ۱۵ —— [3] تاریخ گزیدہ صفحہ ۴۰۷۔

محمود پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ طامع تھا، بخیل و خسیس تھا لیکن کیا وہ شخص جو چار لاکھ اشرفی سالانہ مستقلاً شعراء و علماء پر صرف کرے، جو دار العلوم اور اُس کے مصارف کے لئے ایک زبردست جایداد وقف کردے، جو طلبہ اور شایقین علم کی ہمت افزائی میں ہمیشہ اپنے خزانہ کا منھ کھلا رکھے، جو حوضوں اور فواروں، پلوں، محلوں، مسجدوں، خانقاہوں کی تعمیر میں دولتِ خطیر صرف کرنے سے گریز نہ کرے، جو ایک ایک شعر پر تین تین بار ایک شاعر کا مُنھ جواہرات سے بھر دے، جو ایک معمولی سی اور وہ بھی غیر زبان کی نظم پر اپنی فتوحات سے فایدہ نہ اُٹھا کر ایک غیر مذہب والے مفتوح شخص کو پندرہ پندرہ قلعے تفویض کر دے، جس کا دربار دُنیا کے حکما، اور علماء کا مخزن رہا ہو، کیا اس کی نسبت کوئی دانشمند شخص کہہ سکتا ہے کہ وہ طامع و بخیل تھا؟

محمود کو تمام مورخین نے متفقہ طور سے سلیم الطبع، شجاع، مستقل مزاج، حلیم و بردبار اور علم دوست تسلیم کیا ہے۔ یقیناً اس کا ایک سبب تو خود اس کی فطری صلاحیت تھی جو قدرت نے اس میں ودیعت کی تھی اور دوسرا سبب یہ تھا کہ اس کا باپ سبکتگین خود بے مثل صفات کا فرمانروا تھا اور اس نے محمود کی تربیت میں کوئی دقیقہ کوشش کا اُٹھا نہ رکھا تھا۔ محمود نے اپنی کم سنی میں ایک باغ نہایت محنت سے طیار کرایا اور اس کے وسط میں ایک عالی شان عمارت بھی قایم کرائی جس میں اپنے باپ اور ملک کے امراءِ نامدار کو بھی دعوت دی۔ جب سبکتگین آیا تو اُس نے محمود سے کہا کہ "اے جانِ پدر ایسے باغ اور محلات تو معمولی امیر بھی طیار کرا سکتا ہے میں تو تجھ سے ایسی عمارت کی توقع رکھتا ہوں جس کی نظیر کہیں نہ ملے"۔

محمود نے دریافت کیا کہ وہ عمارت کیسی ہے سبکتگین نے جواب دیا کہ وہ "تعمیر ہے اہل فضل و کمال کے دلوں کی جو قایم رہنے والی ہے اور جس پر کسی نہال کا نصب کرنا ہمیشہ بار آور ثابت ہوتا ہے[1]"۔ پھر جنھوں نے محمود کی سیرت کا غائر مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ باپ کی نصیحت پر اس نے کس حد تک عمل کیا اور اس باب میں وہ کس قدر کامیاب ثابت ہوا۔ اسی تربیت کا اثر تھا کہ جوان ہو کر محمود نے سارے عالم کو اپنی شہرت سے معمور کر دیا۔

محمود حقیقتاً ایک مجتہدانہ فطرت رکھتا تھا اور سخت سے سخت وقت میں بھی وہ عزم و استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا چنانچہ صاحب جامع الحکایات[2] راوی ہے کہ جب محمود، سومناتھ سے واپس آنے لگا تو دو ہندو آئے اور انھوں نے رہبری کی خدمات پیش کیں، چونکہ محمود ہندوستان کی راہوں سے واقف نہ تھا اس لئے ان کو رہبر بننے کی اجازت دی گئی۔ تین دن

---

[1] فرشتہ بحوالہ مآثر الملوک جلد اول صفحہ ۱۲ (نولکشور) — [2] اس کتاب کا پورا نام "جوامع الحکایات و لوامع الروایات" ہے اس کا مصنف مولانا نور الدین محمد عوفی تھا جو شمس الدین التمش کے عہد میں پایا جاتا تھا۔ یہ کتاب نظام الملک محمد (ابو سعید جنیدی کے بیٹے) کے نام سے منسوب ہے جو التمش کا وزیر تھا۔ مصنف نے لکھا ہے کہ اس نے بخارا میں تعلیم پائی تھی اور رکن الدین امام اس کے اُستاد تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بخارا ہی کے قرب و جوار میں کہیں پیدا ہوا تھا۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۸ پر ملاحظہ ہو)

کے بعد سارا لشکر ایک بے آب وگیاہ صحرا میں پہونچا۔ محمود نے رہبروں سے دریافت کیا کہ یہ کیسا راستہ ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ یہ راستہ نہیں ہے بلکہ صحرا ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے راجہ کے حکم سے یہاں پہونچا دیا ہے اور اپنے فرض کو اچھی طرح ادا کر دیا ہے۔ اب یہ صحرا تمھارے سامنے ہے اور افواج ہند تمھارے عقب میں اس لئے تمھارا جانبر ہونا محال ہے۔" محمود اس کو سُنکر ذرا مضطرب ہوا لیکن اتفاق سے اُسی وقت اُسے ایک مُرغابی اُڑتی نظر آئی۔ محمود نے کہا کہ یقیناً یہاں کسی جگہ شیریں پانی ملنا چاہئے اور مُرغابی کے پیچھے پیچھے اس نے گھوڑا ڈال دیا۔ بہت دور چلکر اُسے ایک بڑا دریا ملا جس کا پانی بہت شور تھا، لیکن یہاں پھر اُسے ایک مُرغابی اُڑتی ہوئی ملی اور اس کے تعاقب سے وہ ایک گاؤں میں پہونچا جہاں شیریں پانی دستیاب ہوا۔ اب محمود کے سامنے بڑا مرحلہ اس دریا کو عبور کرنا تھا اور باوجود دریافت وتلاش کے کوئی حصّہ دریا کا ایسا نہ ملتا تھا جو پایاب یا قابلِ عبور ہو۔ آخر کار محمود نے اپنے فطری عزم اور بے نظیر شجاعت سے کام لیکر گھوڑا دریا میں ڈال دیا اور فوج کو حکم دیا کہ اُس کی تقلید کریں[1]۔

انتظامی معاملات میں محمود حد درجہ ذی فہم تھا اور کسی حال میں انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ ایک بار کوئی دادخواہ حاضر ہوا اور کہا کہ خلوت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ محمود فوراً اُسے کونہ میں لے گیا اور حال دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ "آپکا بھانجہ روزانہ رات کو میرے مکان میں آتا ہے اور مجھے گھر سے باہر نکال دیتا ہے، میں نے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ اگر آپ انصاف کرتے ہوں تو کیجئے ورنہ میں معاملہ کو منصفِ حقیقی پر چھوڑ دوں۔" محمود یہ سُن کر آبدیدہ ہوگیا اور بولا کہ "آیندہ جسوقت وہ شخص تیرے گھر میں آئے مجھے فوراً مطلع کر۔" چنانچہ تیسرے روز وہ پھر آیا اور کہا کہ "اس وقت وہ شخص موجود ہے۔" محمود نے

انتظامی معاملات میں محمود کی ذکاوت

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۶)

اس نے کھمبایت Cambay اور خوارزم کا بھی ذکر کیا ہے اور اس سے ثابت ہے کہ وہ سیاحانہ زندگی بسر کرتا تھا۔
اس نے نظام الملک جنیدی اور ناصر الدین قباچہ کی جنگ کا بھی ذکر کیا ہے اور ناصر الدین کے ساتھ قلعۂ بھکر میں اپنے قید ہونے کا بھی حال لکھا ہے۔ مصنف نے جامع الحکایات میں صرف ان تاریخی حکایتوں کو فراہم کیا ہے جن سے ملوک اسلام کے اخلاق وعادات وغیرہ پر روشنی پڑے۔ یقیناً اس میں ایسی حکایات بھی مندرج ہیں جو پایۂ تحقیق سے گری ہوئی ہیں۔ لیکن انھیں کے ساتھ ایسے قصص بھی پائے جاتے ہیں جن سے تاریخی مواد فراہم ہو سکتا ہے۔

مصنف نے جن کتابوں سے مدد لیکر یہ کتاب مرتب کی ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔ تاریخ یمینی، تاریخ ناصری، تاریخ ملوک عجم، تاریخ العباس، مجمع الامثال، عیون الاخبار، شرف النبی، فرج بعد الشدت، خلق الانسان، اخبار برامکہ وغیرہ۔

اس کے مصنف نے علاوہ اس کے ایک تذکرہ شعراء فارس، لباب الالباب کے نام سے بھی لکھا ہے جو مشہور کتاب ہے، اور مسٹر براؤن نے اس کا بہترین اڈیشن شایع کیا ہے۔ — [1] جامع الحکایات قسم اول۔ باب ۱۲۔ حکایت ۱۲

یہ سنتے ہی تلوار ہاتھ میں لی اور اس کے ساتھ ہولیا، جب وہاں پہونچا تو دیکھا کہ ایک مرد اور عورت پلنگ پر سو رہے ہیں فوراً چراغ گل کر کے تلوار سے مرد کا سر قطع کر دیا اور پھر روشن کر کے مقتول کا چہرہ دیکھا اور خدا کا شکر ادا کر کے پانی پینے کو مانگا اور پانی پی کر اپنے گھر واپس آیا۔ اس آدمی نے چراغ گل کرنے اور پانی پینے کا سبب دریافت کیا۔ محمود نے کہا کہ چراغ گل کرنے سے صرف یہ مقصود تھا کہ کہیں اس کی صورت دیکھ کر مجھے رحم نہ آجائے اور پانی پینے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک میں اس ظلم کا انسداد نہ کرلوں گا پانی نہ پیوں گا۔ چنانچہ تین دن کا پیاسا تھا اور اسی لئے زیادہ انتظار رفع تشنگی نہ کر سکا۔[1]

ایک بار محمود نے فرمانروائے کرمان کے پاس کچھ قیمتی تحایف روانہ کئے۔ راستہ میں قزاقوں نے سارا مال لوٹ لیا اور سفارت کے چند آدمی قتل بھی کر دیئے۔ اس گروہ کے متعلق عرصہ سے شکایت پائی جاتی تھی اور بہت نقصان لوگوں کو پہونچ چکا تھا۔ سلطان براہ بست، غزنیں سے خوارزم کی طرف جا رہا تھا کہ اُسے اس کی اطلاع ملی۔ جب محمود، بست میں پہونچا تو مسعود اس کا بیٹا ہرات سے ملنے آیا لیکن محمود نے ملنے سے انکار کر دیا۔ وجہ دریافت کرنے پر محمود نے ملنے سے انکار کر دیا۔ وجہ دریافت کرنے پر محمود نے کہا کہ میں کیونکر تمہاری صورت دیکھ سکتا ہوں جبکہ تمہارے جوار میں ظلم و بے امنی کا یہ حال ہے۔ میں اُسوقت تک تم سے نہیں ملسکتا جب تک اس کا انسداد نہ ہو جائے۔ چنانچہ مسعود گیا اور ایک سخت مقابلہ کے بعد اس گروہ کو گرفتار کر کے پیش کیا۔[2]

اسی طرح عراق کی اُس بڑھیا کا واقعہ نہایت مشہور ہے جس نے اپنا قافلہ لُٹ جانے کے بعد محمود کو تنبیہ کی تھی کہ وہ دور دراز مقامات کا انتظام نہیں کر سکتا تو کیوں اپنے ملک کو اس قدر وسیع کر لیا ہے۔

الغرض محمود کی یہی انصاف پسندی تھی جس نے فردوسی کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیا کہ:۔

جہاندار محمود شاہ بزرگ　　　بہ آبے خوراندہمی میش و گرگ
چو کودک لب از شیر مادر بشست　　　بہ گہوارہ محمود گوید نخست

محمود، معاملات کی حقیقت سمجھنے میں حد درجہ کوشش کرتا اور جب تک وہ خود انتہائی غور و تامل کے بعد مطمئن نہ ہو جاتا معتبر سے معتبر آدمی کی شکایت یا سفارش قبول نہ کرتا۔

صاحب زینت المجالس[3] نے بحوالہ تاریخ ناصری لکھا ہے کہ جب محمود، ہرات آیا تو عبدالرحمٰن خاں، جو مجلس وزراء کا ممبر تھا

---

[1] فرشتہ، جلد اول صفحہ ۳۲ ۔ (نولکشور) ——— [2] جامع الحکایات ۔ باب (۱۳) حکایت (۲۰)

[3] زینت المجالس بھی نگارستان کی طرح مختلف قصص و حکایات کا مجموعہ ہے اس کا مصنف مجدالدین محمد الحسنی تھا جو عام طور سے مجدی کے نام سے مشہور ہے۔ مصنف اپنے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ اس نے متعدد کتب تاریخ سے استفادہ کیا اور جامع الحکایات سے لیکر نگارستان تک کوئی کتاب اس نے نہیں چھوڑی اس کی تاریخ تالیف ۱۰۰۴ھ ہے۔

ایک نہایت عمدہ اور وسیع مکان میں مقیم تھا۔ یہ مکان ایک نہایت مشہور فاضل اور بزرگ شخص کا تھا۔ ایک دن عبدالرحمن نے محمود سے کہا کہ "جس مکان میں میرا قیام ہے وہ ایک ضعیف شخص کا ہے جس کی عقل و ذہانت کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ اس کی زندگی زیادہ تر ایک خلوت کدہ میں بسر ہوا کرتی ہے، جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اس کی عبادت گاہ ہے۔ ایک دن میں دفعتہً اس کی خلوت میں چلا گیا۔ دیکھا کہ ایک برتن شراب سے لبریز ہے اور اس کے سامنے ایک برنجی بُت رکھا ہوا ہے۔ اس شخص نے شراب پی اور پھر اُس بُت کے سامنے سرنگوں ہو گیا چنانچہ میں اُس بُت اور اُس برتن کو لے آیا ہوں جو حکم صادر ہو دیا جائے۔"

محمود نے حکم دیا کہ "صاحبِ مکان لایا جائے۔" محمود نے اس کو دیکھا اور تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد عبدالرحمن سے کہا کہ "میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ جو کچھ تم نے کہا ہے صحیح ہے۔" عبدالرحمن نے قسم کھائی اور اپنے بیان کی مکرر تصدیق کی۔ محمود اس پر سخت برہم ہوا اور بولا کہ "اے بزدل سچ بتا تو نے ایسی لغویات کیوں کہی اور کیوں تو اس درویش کا دشمن ہو گیا ہے؟" آخرکار عبدالرحمن کو اقرار کرنا پڑا کہ "یہ جھوٹی شکایت صرف اس لئے کی تھی کہ اس طرح اس کا مکان ضبط کر لیا جائے گا اور مجھے مل جائے گا۔"

عہدِ غزنوی کے کسی مخصوص قانون یا آئین کا پتہ تاریخ سے نہیں چلتا اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محمود تمام معاملات میں صرف مذہب اور شریعت کے مطابق فیصلہ کرتا تھا اور کسی دوسرے آئین کی ضرورت نہ سمجھتا تھا اور اُس کے متقدمین کا بھی اسی پر عمل تھا۔

فوجی انتظام کی بھی کوئی تفصیل نہیں معلوم، لیکن یہ ضرور ثابت ہے کہ محمود کو اس میں خاص ملکہ حاصل تھا، کیونکہ اسکی سپاہ میں ترکی، تاتاری، عربی، ایرانی، ہندی سبھی شامل تھے۔ یہ صرف محمود کی تدبیر و فراست تھی کہ اُس نے ایسے مختلف عناصر کو یکجا کر کے اُن میں امتزاج پیدا کر دیا اگر محمود کی حکومت قلوب انسانی پر نہ ہوتی تو یقیناً وہ کبھی اس میں کامیاب نہ ہوتا اور اتنے وسیع ملک میں جو ایک طرف دریائے دجلہ سے لیکر دریائے گنگ تک اور دوسری طرف تاتار سے لیکر بحرِ ہند تک پھیلا ہوا تھا کبھی امن و امان قائم نہ رہتا۔

ایک بار محمود نے خلیفۂ عباسی القادر باللہ کے پاس تحریر روانہ کی کہ "بلادِ خراسان کے اکثر صوبے میرے قبضہ میں ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے ....

.... کہ چند ایسے مقامات جن پر خلیفہ کے حاکموں کا تصرف ہے میرے حق میں چھوڑ دیئے جائیں۔" چونکہ القادر باللہ میں محمود سے مقابلہ کرنے کی قوت نہ تھی مجبوراً اس کو منظور کر لیا۔ چند دن بعد محمود نے سمرقند بھی طلب کیا اس پر خلیفہ نے انکار کر دیا محمود کو ناگوار ہوا اور اُس نے اطلاع دی کہ "اگر یہ درخواست منظور نہ کی گئی تو میں ہزار ہاتھیوں کو لیکر آؤں گا اور دارالخلافہ کو تباہ کر دوں گا۔" قاصد اس کا جواب لیکر پھر واپس آیا۔ مکتوب کھولا گیا تو اس میں پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھی ہوئی تھی اور

عہدِ غزنوی کا نظامِ حکومت (اقتباس) ... خلافت

اس کے بعد ایک سطر حروف مقطعات میں لکھی ہوئی تھی اور صرف ا ل م، الم پڑھا جاتا تھا۔ بہت کوشش کی گئی کہ اس کا مطلب سمجھ میں آوے، لیکن یہ معمہ حل نہ ہوا، آخرکار ابوبکر قہستانی جو اسوقت ایک معمولی شخص تھا جرأت کر کے آگے بڑھا اور عرض کی کہ "چونکہ خلیفہ کو ہاتھیوں کے حملہ سے ڈرایا گیا تھا اس لئے ممکن ہے کہ ان حروف مقطعات سے مقصود "الم ترکیف فعل ربک باصحاب الفیل" ہو۔ یہ سنتے ہی محمود کے دل پر حد درجہ خوف خدا طاری ہوا اور دیر تک روتا رہا۔[۱]

محمود فطرۃً بے انتہا منکسر المزاج بھی تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک بھی تھا اور اس کی فتوحات نے وسط ایشیا اور سرزمین ہند کے ایک معقول حصّہ کا احاطہ کر لیا تھا لیکن اُس نے خود کبھی اپنے تئیں سلطان نہیں سمجھا۔ اور نہ سکوں میں اپنے نام کے ساتھ لفظ "سلطان" کا اضافہ کیا۔ تخت خلافت کی طرف سے اس کو یمین الدولہ، امین الملتہ کہف الدولہ والاسلام کے خطابات ملے اور طبقات ناصری[۲] کی روایت سے "سلطان" کا خطاب بھی اس کو دیا گیا۔[۳] لیکن محمود نے

---

۱ فرشتہ جلد اول- صفحہ ۲۸- ۲ طبقات ناصری کا مصنف ابو عمر منہاج الدین عثمان ابن سراج الدین الجوزجانی تھا۔ منہاج الدین کا جد اعلےٰ جوزجان سے غزنی آیا تھا اور یہاں سلطان ابراہیم نے اپنی ایک لڑکی کی شادی اس سے کر دی تھی (سلطان ابراہیم کی چالیس لڑکیاں تھیں جو سب کی سب ایسے ہی فاضل اور مشہور لوگوں سے منسوب کی گئی تھیں) اس مواصلت سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ابراہیم رکھا گیا اسی ابراہیم کا بیٹا سراج الدین تھا جو منہاج السراج مصنف طبقات کا باپ تھا۔ سراج الدین ۵۸۲ھ میں بعہد محمد غوری افواج ہندوستان کا قاضی مقرر کیا گیا اور منہاج السراج نے اُسے "اعجوبۃ الزمان و افصح العجم" ظاہر کیا ہے۔ منہاج السراج ۶۲۴ھ میں غور سے سندھ اور ملتان آیا اور اوچ میں دارالعلوم فیروزی کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ دوسرے سال جب سلطان شمس الدین التمش، ناصر الدین قباچہ کو زیر کر کے واپس آیا تو منہاج السراج کو شرف حضوری حاصل ہوا اور ساتھ ہی ساتھ دہلی آیا۔ ۶۲۹ھ میں وہ سلطان التمش کے ساتھ تھا اور محاصرۂ گوالیار کے وقت یہیں وہ محکمۂ افتار و قضا کا صدر اعظم بنایا گیا۔ ۶۳۵ھ میں سلطان رضیہ کی افواج اس طرف آئیں تو منہاج السراج اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گیا۔ جب رضیہ کا انتقال ہو گیا اور بہرام شاہ تخت نشین ہوا اس وقت منہاج السراج دہلی میں تھا۔ ۶۳۹ھ میں بہرام شاہ نے اُسے قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ لیکن وہ عرصہ تک اس عہدہ پر قایم نہ رہ سکا کیونکہ ۶۳۹ھ کے آخر میں بہرام شاہ قتل کیا گیا اور منہاج السراج کو بھی مجبوراً استعفا دینا پڑا۔ ۶۴۰ھ میں وہ لکھنوتی کی طرف روانہ ہوا اور وہاں ۶۴۲ھ تک مقیم رہا اس کے بعد وہ ۶۴۳ھ میں پھر دہلی آیا اور ناصریہ دارالعلوم کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ ۶۴۴ھ میں جب ناصر الدین محمود تخت نشین ہوا تو اُس نے بہت ترقی حاصل کی اور غیاث الدین بلبن کے عہد میں (جو ناصر الدین کے بعد تخت نشین ہوا اور جسے وہ خان معظم لکھتا ہے) وہ صدر جہاں اور قاضی مقرر ہوا۔ طبقات ناصری، ناصر الدین محمود کے نام سے منسوب ہے اور اس کی تخت نشینی کے بعد ۱۵ سال تک کے حالات اُس میں درج کئے گئے ہیں۔ طبقات ناصری نہایت معتبر تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے اور فرشتہ وغیرہ نے اکثر اس کا حوالہ دیا ہے۔ یورپین مورخین بھی اس کو نہایت عزت و توقیر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ منہاج السراج کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی لیکن غالب گمان ہے کہ وہ ناصر الدین کے بعد کچھ زمانہ تک ضرور زندہ رہا۔

۳ طبقات ناصری (ایلیٹ) جلد دوم صفحہ ۲۶۹ -

ہمیشہ لفظ "سلطان" کے استعمال سے احتراز کیا اور خلیفۂ بغداد کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے کبھی اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھا۔

تاریخ "خاندانِ غزنی" کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم پروری کی خصوصیت صرف محمود پر ختم نہیں ہو گئی بلکہ اس کے بیٹے مسعود اور دیگر جانشینوں میں بھی یہی ذوق قائم رہا۔ چنانچہ مسعود کے متعلق بیان[1] کیا جاتا ہے کہ وہ علماء کے لئے بے انتہا فیاض تھا اُسے قابل لوگوں کی صحبت کا اس قدر شوق تھا کہ مختلف ممالک سے ماہرین علم و فن اُس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک شخص "ابوریحان خوارزمی" بہت مشہور ہوا ہے جو اپنے عہد کا بہت بڑا

---

[1] فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۰ — برگس (Briggs) نے جو ترجمہ انگریزی میں تاریخ فرشتہ کا کیا ہے اس میں بجائے ابوریحان کے انوریحان لکھا ہے۔ جس پر ایلیٹ نے بھی اظہار حیرت کیا ہے اور بعض دیگر انگریزی تاریخوں میں بھی برگس پر اعتبار کر کے انوریحان ہی لکھ دیا گیا ہے حالانکہ حقیقت اس غلطی کی یہ ہے کہ :- Briggs (برگس) نے ابوریحان کو انوریحان پڑھ لیا (کیونکہ تحریر میں یہ دونوں ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں اور اگر نقطوں کا محل ذرا بدل جائے تو یہ غلطی بہت ممکن ہو جاتی ہے) افسوس ہے کہ کسی انگریزی مورخ نے اصل کتاب پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ورنہ غریب فرشتہ اس الزام سے بری ہو جاتا۔

بیرونی کا پورا نام محمد بن احمد تھا اور ابوریحان اس کی کنیت تھی۔ اس کی تاریخ ولادت ۳ ذی الحجہ ۳۶۲ھ ہے مسٹر سخاؤ (Sasha) نے تحقیق الہند انگریزی ترجمہ (Alberuni's India) کے دیباچہ میں سنہ ولادت ۹۷۳ء ظاہر کیا ہے۔ اس کی جائے ولادت کا مسئلہ البتہ بحث طلب ہے اگر لفظ بیرونی اس کی جائے ولادت یا مسکن کو ظاہر کرتا ہے تو ہم کو تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ بیرون میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن تحقیق طلب امر یہ ہے کہ بیرون کس جگہ کا نام ہے اور یہ مقام ملک کے کس حصہ میں پایا جاتا تھا۔

شہرزوری اپنی کتاب تاریخ الحکماء میں بیان کرتا ہے کہ ابوریحان بیرون میں پیدا ہوا تھا جو سندھ کا ایک نہایت خوبصورت شہر ہے۔

حاجی خلیفہ نے بھی اس بیان کا تتبع کیا ہے اور ابوالفدا نے بھی ابوسعید کے اسناد سے یہی لکھا ہے۔

ایم رینالڈ (M. Renaud) فرانسیسی مورخ نے بھی اس کو سندھی لکھا ہے اس لئے اب قابل غور امر یہ ہے کہ بیرون سندھ میں کس جگہ واقع ہے؟ جہاں اب حیدرآباد (سندھ) واقع ہے، اس کے قریب ایک مقام نیرون یا نیرون کوٹ اس جگہ واقع ہے جہاں بیرون کا ہونا ظاہر کیا جاتا ہے۔ چونکہ نیرون صرف ایک نقطہ کی جگہ بدل جانے سے بیرون پڑھا جا سکتا ہے اسلئے بالکل ممکن ہے کہ ابوالفدا سے یہ غلطی ہو گئی ہو۔ چونکہ ابوالفدا مورخ خود کبھی ہندوستان نہیں آیا تھا اور سوائے مکہ اور مصر کے سفر کے اس نے کبھی شام کو نہیں چھوڑا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس کا بیان دوسرے لوگوں کی روایت یا تحریر پر منحصر ہے اور اس غلطی کا امکان اس سے بعید نہ تھا۔ ادریسی نے شہر منصورہ کا جغرافیہ بیان کرتے ہوئے دریائے مہران کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ نیرون کے قریب سے بہتا ہوا سمندر میں گرتا ہے۔ تحفۃ الکرام اور چچ نامہ میں بھی نیرون ہی کا ذکر ہے۔ یوروپین مورخین میں فرانسیسی مصنفین ابوالفدا کا تتبع کر کے اسکو بیرون لکھتے ہیں اور انگریزی مصنفین ادریسی کی پیروی کر کے نیرون صحیح سمجھتے ہیں۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۸ پر دیکھیے)

فیلسوف اور ماہر ریاضی و ہیئت و علمِ نجوم تھا، اس نے ریاضی پر مشہور کتاب

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۱)

خود بیرونی نے جو جغرافیہ ہندوستان کا لکھا ہے اس میں کہیں بیرون کا ذکر نہیں ہے اگر بیرون کوئی جگہ سندھ میں ہوتی اور وہ وہاں کے حالات لکھتا۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بیرون کوئی مقام سندھ میں نہیں تھا اور نہ وہ وہاں پیدا ہوا۔

صمعانی نے اپنی مشہور اور نہایت معتبر کتاب الانساب میں جو ۵۶۲ھ کی تصنیف ہے لکھا ہے کہ بیرونی فارسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "باہر کا" اور ہر وہ شخص جو پایۂ تخت سے باہر پیدا ہوتا تھا اُسے بیرونی کہتے تھے۔

فرشتہ نے بھی اس کو خوارزمی لکھا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوارزم کا رہنے والا تھا۔ اور اس لئے حسب بیان کتاب الانساب بیرونی کے نام سے مشہور ہو گیا نصف صدی سے زاید زمانہ گزرا جب مسٹر رالنسن (Rawlinson) نے ۱۸۶۹ء کے کوارٹرلی ریویو Quarterly Review میں ابوریحان کے کچھ حالات لکھے تھے۔ مسٹر ایلیٹ نے اپنی مشہور انگریزی تاریخ ہند میں اس کا ایک جزو نقل کیا ہے۔ فاضل مضمون نگار لکھتا ہے کہ:-

"ابوریحان، خوارزم کا رہنے والا تھا اور سب سے پہلے یہی وہ عرب تھا جس نے صحیح معنی میں مشرق کی تاریخ قدیم کی جستجو کی۔ ابوریحان بہت بڑا فاضل شخص تھا اور اس نے لکھا کہ خوارزم کی تقویم شمسی نہایت مکمل تو تھی اور ابوریحان اس سے بخوبی واقف تھا"

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوارزم کا رہنے والا تھا مسٹر ساشا Sasha کی بھی یہی تحقیق ہے۔

ابوریحان اپنے عہد کا بہت بڑا ماہر نجوم، ریاضی داں، مورخ اور حکیم تھا اسے علمی تحقیقات کا اس قدر شوق تھا کہ (بقول شہرزوری) وہ سال بھر میں صرف دو دن (نوروز و مہرجان) آرام کرتا اور باقی تمام سال تحریر و مطالعہ میں صرف کر دیتا تھا۔

ابوالفضل بیہقی نے جس کا زمانہ بیرونی کے نصف صدی بعد ہوا ہے لکھتا ہے کہ:-

"فلسفہ و ریاضی کا بہت بڑا فاضل و محقق تھا"

رشید الدین مصنف جامع التواریخ لکھتا ہے کہ:-

"ابوریحان بیرونی اپنے عہد میں بے مثل محقق ریاضی و فلسفہ کا ہوا ہے۔ محمود سبکتگین کے عہد میں وہ غزنی آیا اور شاہی ملازم ہو گیا"

مسٹر ساشا، تحقیق الہند کے انگریزی ترجمہ Alberuni's India کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ:-

"محمود کے عہد میں خوارزم ایک ماموتی خاندان کے زیر حکومت تھا اور البیرونی اپنے وطن یعنی خوارزم میں فرمانروائے عہد کا مشیر خاص تھا محمود کسی نہ کسی بہانہ سے خوارزم پر بھی قابض ہو جانا چاہتا تھا اور البیرونی اس کا مخالف تھا جب محمود نے خوارزم پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا تو وہاں اپنا ایک گورنر مقرر کر دیا اور غزنی واپس آیا اس حال میں کہ بہت سامال غنیمت، ماموتی خاندان کے تمام افراد اور بہت سے قیدی وغیرہ ساتھ تھے۔ انھیں لوگوں میں سے ایک ابوریحان بھی تھا۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۳ پر ملاحظہ کیجئے)

"قانون مسعودی[1]" کے نام سے مرتب کی جس کے صلہ میں ایک ہاتھی پر انبار کرکے چاندی اس کو دی گئی۔

اسی عہد کا ایک اور بہت مشہور شخص ابو محمد ناصحی تھا۔ اس نے فقہ حنفی پر ایک کتاب مسعودی کے نام سے تصنیف کی اور بادشاہ کے سامنے پیش کی تھی۔

سلطان مسعود نے علاوہ مساجد کے بہت سے مدارس اور کالج (دار العلوم) ملک کے مختلف حصص میں قایم کئے۔

الغرض مسعود اشاعت علم و ہنر، توقیر فضل و کمال میں اپنے باپ کا صحیح معنی میں جانشین تھا۔ اسکی کوشش یہ تھی کہ معمولی سا معمولی شخص بھی علم کی طرف توجہ کرے، اور یہی وجہ تھی کہ اس نے کسب علم کے لئے بہت سی آسانیاں پبلک کے واسطے بہم پہونچا دی تھیں۔ طلبہ کو وظائف دئے جاتے تھے۔ اُن کے تمام مصارف کا بار برداشت کیا جاتا تھا اور ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ کوشش کا اُٹھا نہ رکھا جاتا تھا۔

صاحب "روضۃ الصفا[2]"، کا بیان ہے کہ مسعود نے ملک کے مختلف حصص میں اس قدر کثرت سے معابد و مساجد، مدارس و کالج تعمیر کرائے کہ اُن کا شمار مشکل ہے اور اس کی فیاضی اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ ایک بار ماہ رمضان میں اسنے ایک لاکھ درہم ایک ہی دن میں غربا کو تقسیم کر دئے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۲)

چونکہ ابوریحان سے محمود خوش نہیں تھا اور اس کا وزیر احمد ابن حسن مہدی بھی مخالف تھا اس لئے وہ ایک منجم کی حیثیت سے محمود کے دربار میں پایا جاتا تھا۔

مسعود کے عہد میں اس نے کافی ترقی کی اور ہندوستان بھی آیا اور یہاں کی زبان سنسکرت سیکھ کر ایک سنسکرت کتاب پاتنجل کا عربی میں ترجمہ کرکے اس کا نام پاتنجل رکھا۔"

کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی مشہور تصنیف ریاضی قانون مسعودی میں اس کتاب سے مدد لی ہے اس کی دوسری کتاب تحقیق الہند بھی بہت مشہور ہے جس کا ترجمہ یوروپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس نے یونانی زبان سے بھی کئی کتابیں ترجمہ کیں اس کی تصانیف کی فہرست طویل ہے ۴۳۰ھ؁ ۱۰۳۸ء؁ اس کا سنہ وفات ہے۔

[1] قانون مسعودی کے ترجمہ و اشاعت کا انتظام نواب محمد اسحاق خانصاحب آنریری سکریٹری کالج نے کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ کوئی شخص اس کا ترجمہ نہ کر سکا اور یہ کام انجام کو نہ پہونچ سکا ——— [2] روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفاء کا مصنف محمد بن خاوندشاہ بن محمود تھا جو میر "خاوند" اور میر "خوند"، کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ۸۳۶ھ؁ کے آخر یا شروع ۸۳۷ھ؁ میں پیدا ہوا۔ "میر خوند" کا باپ سید برہان الدین خاوندشاہ ماوراء النہر کا رہنے والا تھا اس کا سلسلۂ نسب حسن ابن علی سے ملتا ہے جب برہان الدین کا انتقال ہوا تو وہ کم سن تھا اور ترک وطن پر مجبور ہو گیا۔ آخر کار بلخ پہونچا اور یہیں تحصیل علم کی ——— (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۴ پر ملاحظہ فرمایئے)

ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ ابوریحان خوارزمی نے جسے بیرونی بھی کہتے ہیں سلطان مسعود ہی کے زمانہ میں ترقی کی۔ ابوریحان اُس سفارت کے ساتھ محمود کے دربار میں پہونچا تھا جو خوارزم کے بادشاہ نے روانہ کی تھی۔ فارابی اور ابوالخیر بھی اس کے ساتھ تھے۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا سے بھی (جو اس کا ہمعصر تھا) جاتے وقت درخواست کی گئی لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ سفارت کی واپسی کے بعد محمود نے بوعلی سینا نے انکار کر دیا اور ابوریحان نے منظور کر لیا۔[۵۱]

چونکہ محمود کا وزیر خواجہ حسن احمد بن میمندی ابوریحان سے سیاسی مخالفت رکھتا تھا اس لئے اُس کی پوری عزت نہ ہو سکی۔ البتہ مسعود کے عہد میں اُس کی بہت توقیر ہوئی اور اسی کے عہد میں اُس نے بہت سی بے مثل تصانیف ملک کے سامنے پیش کیں۔

اسی بیرونی کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ غزنوی عہد میں عربی و فارسی زبانیں کس قدر ترقی کر رہی تھیں اور یونان و ہند کا نایاب علمی ذخیرہ ان زبانوں میں منتقل ہو رہا تھا، ریاضی، نجوم، فلسفہ، علم الادویہ، ہیئت و ہندسہ یہ خاص فنون تھے جن کی طرف مسلمانوں کو عام طور سے توجہ تھی اور اسی کے ساتھ ادب کا ذخیرہ بھی سنسکرت وغیرہ سے عربی فارسی میں منتقل ہو رہا تھا۔[۵۲] مسعود کو خود علم و ادب کا کیسا ذوق تھا وہ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ زمانۂ ولیعہدی میں جب وہ خراسان سے غزنین آیا اور شعراء نے قصائد تہنیت پیش کئے تو عنصری اور زینبی کو ۵۰، ۵۰ ہزار درہم اور باقی شعراء کو ۲۰، ۲۰ ہزار درہم انعام دلوایا۔[۵۳]

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۲)

اس کے بیٹے میرخوند صاحب روضۃ الصفا کے بھی تفصیلی حالات تاریکی میں ہیں لیکن یہ یقینی ہے کہ اس کا ابتدائی زمانہ بھی سختی و صعوبت میں بسر ہوا یہاں تک کہ وہ دُنیا کی طرف سے سرد دل ہو گیا اور صرف مشاغل علمیہ کو اپنا شعار قرار دیا۔ اتفاق سے میر علی شیر جو سلطان حسین شاہ ایران کا وزیر تھا اور خود بھی فن تاریخ کا بہت بڑا شایق و ماہر تھا اس کا معاون ہو گیا اور اس طرح میرخوند کو اپنے طبعی ذوق کے پورا کرنے کا موقع مل گیا۔ روضۃ الصفا کا اکثر حصہ میرخوند نے اپنی بیماری کے عالم میں لکھا ہے چنانچہ وہ خود لکھتا ہے کہ:۔

"میں صرف داہنے پہلو پر لیٹ کر لکھ سکتا تھا بیٹھ کر ایک صفحہ لکھنا بھی دشوار تھا۔ اطبا نے ہدایت کر دی تھی کہ اگر لکھنا ترک کر دیا گیا تو مرض بڑھ جائے گا۔ چنانچہ جب کبھی وہ چند گھنٹوں کے لئے بھی آرام لینے کے لئے قلم ہاتھ سے رکھ دیتا تو نیند نہ آتی اور بُرے بُرے خواب نظر آتے۔"

میرخوند نے ۹۰۳ھ / ۱۴۹۸ء میں جب اس کی عمر ۶۶ سال کی تھی انتقال کیا۔ روضۃ الصفا نہایت معتبر تاریخ ہے اور تقریباً ۱۹ عربی اور ۲۲ فارسی کی تاریخوں سے مدد لیکر یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ بعد کے مورخین نے اس سے بہت مدد لی ہے اور حاجی خلیفہ کی تاریخ تو تمام تر اسی پر منحصر ہے۔

[۵۱] یہ بیان مسٹر الیٹ کا ہے جو ایشیاء کی تاریخ ہند جلد دوم صفحہ ۳ میں درج ہے لیکن مسٹر ساشا (sasha) کو اختلاف ہے۔

[۵۲] Preface to Alberunis India by sasha [۵۳] مجمع الفصحاء۔

مسعود کریم و فیاض، علم دوست اور ہنر پرور ہونے کے ساتھ ہی بے انتہا دلیر و شجاع بھی تھا۔ اس کی قوت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اُسے رستم ثانی کہا کرتے تھے اور اس کا گرز کوئی شخص ایک ہاتھ سے نہ اُٹھا سکتا تھا۔[۱] اس کی سخاوت کا یہ حال تھا کہ وہ علی ثانی کے نام سے مشہور ہو گیا۔[۲] وہ کبھی گوارا نہ کرتا تھا کہ اُس کی سلطنت میں بے امنی یا جور و ظلم رونما ہو۔ وہ قیام امن کے لئے مختلف تدابیر سے کام لیتا تھا اور بعض دفعہ اس نے حد درجہ ذہانت سے کام لیا۔ چنانچہ جامع الحکایات راوی ہے کہ ایک بار صحرائے کرمان میں قزاقوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا اور قافلوں کو لوٹ لیا کرتا تھا۔ مسعود نے فوج اُسکی سرکوبی کے لئے روانہ کی لیکن وہ سب جنگل میں منتشر ہو گئے اور گرفتار نہ ہو سکے۔ سلطان مسعود کو اسکی اطلاع ملی۔ تھوڑی دیر تک اُسنے غور کیا اور حکم دیا کہ اصفہان سے بہت سے سیب لائے جائیں اور ان میں باریک سا سوراخ کر کے زہر ڈال دیا جائے۔ جب سیب اس طرح مسموم کر دئے گئے تو وہ ایک قافلہ کے سپرد کر دئے گئے جو صحرائے کرمان کی طرف سے گزرنے والا تھا اور ایک دستہ فوج کا بھی مامور کیا گیا کہ قافلہ کے پیچھے پیچھے روانہ ہو۔ جب یہ قافلہ قزاقوں کی جائے پناہ سے گزرا تو اُنھوں نے حملہ کر کے سب سے پہلے ان سیبوں کو کھانا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بڑی جماعت اُن کے زہر کے اثر سے ہلاک ہو گئی اور جو چند نفوس بچ گئے اُن کو دستہ فوج نے آکر گرفتار کر لیا۔[۳]

اسی طرح ایک بار اُس کے سامنے شکایت پیش ہوئی کہ ایک شخص غور جا رہا تھا کہ اُس نواح کے فرمانروا نے اُس کو گرفتار کر کے زبردستی سارا مال چھین لیا۔ مسعود نے ایک تحریر اُس کے پاس روانہ کی کہ سارا مال واپس کر دیا جائے۔ لیکن جو قاصد خط لیکر گیا تھا اس کی بھی سخت توہین کی گئی اور اُس نے مسعود سے سارا حال آکر بیان کیا۔ مسعود نے حکم دیا کہ "دوبارہ خط لکھا جائے اور ہدایت کی جائے کہ اگر ان تمام باتوں کی تلافی نہ کی گئی تو شاہی لشکر سرکوبی کے لئے روانہ کیا جائے گا"۔ جب یہ خط لکھ گیا تو پھر اُسی قاصد کے سپرد کیا گیا جو پہلے تحریر لے گیا تھا اُس نے عرض کیا کہ "جہاں پناہ! کسی نہایت ہی مختصر پرزہ پر یہ پیام تحریر فرما کر حکم دیجے کیونکہ وہاں یقیناً مجھے اس کاغذ کے نگلنے پر مجبور کیا جائے گا اور کاغذ بڑا ہوگا تو مجھے سخت تکلیف ہوگی"۔ مسعود نے یہ سنتے ہی طیاری لشکر کا حکم دیا اور حاکم غور کو شکست دیکر اُس کے ملک پر اپنا قبضہ کر لیا اور جو شخص لوٹا گیا تھا اُس کا مال واپس دلوا دیا۔[۴]

غزنوی خاندان کا ساتواں فرمانروا عبدالرشید ابن محمود بھی بڑا فاضل و ذہین شخص تھا۔[۵] تاریخ کا اُسے بہت شوق تھا اور خود بھی اکثر لکھنے پڑھنے ہی میں اپنا وقت صرف کرتا تھا۔

اسی طرح نواں حکمراں فرخ زاد ابن مسعود حد درجہ حلیم و منصف تھا۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو زابلستان و بائی امراض

۱؎ فرشتہ جلد اول صفحہ ۴۰ — ۲؎ طبقات ناصری (الیٹ) جلد دوم صفحہ ۲۷۱ — ۳و۴؎ جامع الحکایات قسم (۳) باب (۱۷) حکایت (۹)

۵؎ طبقات ناصری (الیٹ) جلد دوم صفحہ ۲۷۴ —

کی وجہ سے تباہ ہو رہا تھا۔ فرخ زاد نے تمام محاصل معاف کر دئے اور عملی طور سے ہمدردی کا اظہار کیا[1]۔

اس کے بعد سلطان ابراہیم کا زمانہ آیا۔ سلطان ابراہیم بن سلطان مسعود غازی جو سلطان فرخ زاد کے بعد تخت نشین ہوا حد درجہ زاہد و متقی تھا اور باوجود عنفوان شباب کے اس نے لذت نفسانی کو بالکل ترک کر دیا تھا۔ ماہ رمضان کے ساتھ رجب و شعبان کو بھی ملا لیا کرتا تھا اور اسی طرح سال میں مسلسل تین ماہ روزہ رکھتا تھا اس کا کوئی لمحہ رعیت پروری اور عدل پسندی کے خیال سے خالی نہ گزرتا تھا اور کثرت سے خیرات کرتا تھا[2]۔

ابراہیم کو نصفت پروری اور حسن انتظام کا کس قدر خیال تھا اس کا حال یوں معلوم ہو سکتا ہے کہ ایک دن وہ صبح سے دوپہر تک ملول و مغموم بیٹھا رہا۔ تمام وزرا و اراکین خائف تھے اور کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی کہ دریافت کرے آخر کار ایک درباری جس سے ابراہیم بہت زیادہ مانوس تھا آگے بڑھا اور وجہ دریافت کی۔ ابراہیم نے کہا کہ "میرا وزیر و مشیر خاص بہت ضعیف ہو گیا ہے۔ آج میں نے تمام ارکانِ دربار کو دیکھا تو ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا جو اس کا جانشین ہو سکے۔ کیا یہ افسوسناک امر نہیں ہے؟" اس نے عرض کیا کہ "جہاں پناہ کی نگاہ آفتاب کی طرح منور و تاباں ہے اور معمولی پتھر کو الماس اور ادنےٰ خاک کو سونا بنا سکتی ہے جس کو بھی اس خدمت پر مامور کیا جائے گا وہ اس قابل ثابت ہوگا"

سلطان ابراہیم نے جواب دیا "یہ صحیح ہے لیکن آفتاب کو بھی ایک زمانہ درکار ہوتا ہے کہ وہ کسی پارۂ سنگ کو الماس بنا سکے اور ایک کیمیاگر بھی سونا نہیں بنا سکتا جب تک تمام ضروری اجزا فراہم نہ ہو جائیں[3]۔"

سلطان ابراہیم نے ہمیشہ اس امر کی کوشش کی کہ انتظام سلطنت قابل اور تجربہ کار ہاتھوں میں رہے۔ وہ اپنے افسروں کو خود تربیت کرتا تھا اور انھیں مختلف طریقوں سے بتاتا تھا کہ راعی و رعایا کے تعلقات کیا ہیں اور امن و سکون کا قیام کن تدابیر پر منحصر ہے۔ اسی کے ساتھ وہ قابل سے قابل افسر کے ذہن میں یہ بات مرتسم کر دیتا تھا کہ سلطنت اس کی محتاج ہے۔ وہ ایک ہی خدمت کے لئے مختلف آدمی رکھتا تھا تاکہ ہر شخص خائف رہے کہ اگر وہ اہل ثابت نہ ہوا تو دوسرا اس جگہ پر کرنے کے لئے موجود ہے[4]۔

فرشتہ، جامع الحکایات کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ سلطان ابراہیم مذہب کی طرف زیادہ مائل تھا اور نہایت پابندی کے ساتھ وہ امام یوسف سجاوندی کی صحبت میں مذہبی معلومات حاصل کیا کرتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ سجاوندی نے سلطان ابراہیم کو سخت الفاظ میں اخلاق کا درس دیا اور اس نے ہمیشہ صبر و تحمل کے ساتھ اسے سنا۔ سلطان ابراہیم درس کے وقت اپنی شاہانہ حیثیت کو بالکل فراموش کر دیتا تھا اور ایک معمولی شاگرد کی طرح زانوے ادب تہ کر کے تمام زجر و توبیخ کو تلمیذانہ رواداری کے ساتھ

۱؎ طبقات ناصری (ایلیٹ) جلد دوم صفحہ ۲۷۷ — ۲؎ فرشتہ جلد اول صفحہ ۴۸ (نولکشور) — ۳؎ زینت المجالس (ایلیٹ) جلد دوم صفحہ ۵۱۰
۴؎ زینت المجالس (ایلیٹ) جلد دوم صفحہ ۵۱۱ ۔

برداشت کرتا تھا۔

سلطان ابراہیم خط نسخ کا خوشنویس تھا اور ہر سال خود اپنے ہاتھ سے دو ایک نسخے کلام مجید کے لکھ کر کبھی مکہ معظمہ اور کبھی مدینہ منورہ بھیجا کرتا تھا[1]۔ ارزقی جو الفیہ و شافیہ کا مصنف ہے اسی کے عہد میں ہوا ہے۔

اس کے بعد اس کا بیٹا علاء الدین مسعود تخت نشین ہوا۔ یہ بھی نہایت بُردبار، فیاض، نیک الاخلاق اور کریم النفس شخص تھا اس نے اُن تمام سخت قوانین کو جو اس سے قبل رائج تھے منسوخ کر دیا علاوہ اس کے ٹیکس اور خراج کے ناقابل برداشت رقوم معاف کر کے ملک میں عام طور سے امن و سکون پیدا کر دیا اور تمام وہ جاگیریں جو امراء دربار کے لئے پہلے سے مقرر تھیں بدستور بحال رکھیں اس کا عہد جو سترہ سال تک رہا نہایت خوشحالی کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے جب تک وہ بادشاہ رہا کسی جگہ نقض امن نہیں ہوا اور رعایا نے اس کے عدل و انصاف، رحم و کرم سے زیادہ اچھا کر نہایت مطمئن زندگی بسر کی[2]۔

خاندان غزنوی میں بہرام شاہ بھی خاص صفات کا بادشاہ تھا اس نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اپنے ذوق علم کا ثبوت دینا شروع کیا۔ اس نے علم و فضل کی اس درجہ قدر کی اور ترقی ادب (لٹریچر) میں اس قدر فیاضی اور عالی حوصلگی سے کام لیا کہ لوگ محمود کے زمانہ کو بھول گئے۔ شیخ نظامی اور سید حسن غزنوی جو مشہور شعراء و حکماء میں شمار کئے جاتے ہیں، بہرام ہی کے دربار کے جوہر تابندہ تھے۔ بہرام نے مختلف کتابیں غیر زبانوں سے فارسی میں ترجمہ کرائیں اور ان ہی میں سے ایک کلیلہ دمنہ بھی تھی۔ عہد قدیم میں یہ کتاب اور شطرنج ہندوستان کے کسی راجہ نے نوشیرواں شاہ فارس کے پاس بھیجی تھی اور اس کے وزیر بزرجمہر نے اس کتاب کا ترجمہ سنسکرت سے پہلوی زبان میں کیا تھا۔ ہارون الرشید کے عہد میں ابن المقفع نے اس کتاب کو عربی زبان میں منتقل کیا اور اس عربی نسخہ سے بہرام نے فارسی میں ترجمہ کرایا۔ چونکہ اس ترجمہ میں عربی الفاظ کثرت سے پائے جاتے تھے اسلئے بعد کو سلطان حسین مرزا خوارزمی کے عہد میں مولانا حسین واعظ کاشفی نے پھر اس کو مرتب کیا اور اس کے اشکال دور کر کے اس کا نام انوار سہیلی رکھا[3]۔

الغرض محمود کی نیک نیتی کا یہ اثر تھا کہ تقریباً غزنوی خاندان کے تمام فرمانروا محمود کی کسی نہ کسی خصوصیت کے حامل تھے یہاں تک کہ آخری فرمانروا خسرو ملک بھی حد درجہ فیاض، شریف الطبع اور حلیم تھا[4]۔

---

[1] فرشتہ جلد اول صفحہ ۴۸ (نولکشور) ——— [3] طبقات ناصری (ایلیٹ) جلد دوم صفحہ ۔ ———

[2] فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۰ (نولکشور) ——— [4] طبقات ناصری (ایلیٹ) جلد دوم۔ صفحہ ۲۸۱ ———

ہندوستان کے کامیاب مسلمان فرمانرواؤں کی خصوصیات

شہاب الدین محمد غوری

ہندوستان کا اولین مسلمان فرمانروا

۵۸۹-۶۰۲ھ
۱۱۹۳-۱۲۰۵ء

شہاب الدین غوری نہ صرف جری، فراخ حوصلہ اور مستقل مزاج شخص تھا بلکہ اسی کے ساتھ وہ بے انتہا ضابط و متحمل بھی تھا۔ باوجود اس کے کہ اس کو نہایت سخت مصائب کا سامنا پڑا اور راجگانِ ہند نے اُسے اکثر حد درجہ مشتعل و غضب آلود کر دیا لیکن میدانِ جنگ میں اُس نے کبھی اُس بیجا ظلم و ستم سے کام نہیں لیا جو وحشی و ناشایستہ قوموں کا شعار ہے اور جسے اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے۔

ہندوستان کے نہایت سخت معرکوں میں وہ معرکہ بھی تھا جو راجہ بنارس اور شہاب الدین محمد غوری کے درمیان پیش آیا لیکن حسبِ بیانِ کامل ابن اثیر[۱] معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے باوجود شدتِ غیظ کے دورانِ جنگ میں، اور باوجود فاتح ہونے کے جنگ کے بعد ایک عورت اور بچّہ پر بھی ہاتھ نہیں اُٹھایا کیونکہ شہاب الدین محمد غوری کبھی جبر و ظلم یا مکر و فریب کو روا نہیں رکھتا۔

---

[۱] کامل التواریخ (جسے تاریخ کامل بھی کہتے ہیں) کا مصنف شیخ ابوالحسن علی ابن ابی الکرم محمد ابن عبدالکریم ابن عبدالواحد الشیبانی تھا۔ اسکی عرفیت عزالدین تھی اور وہ عام طور سے ابن اثیر کے نام سے معروف ہے۔ ۵۵۵ھ میں بمقام جزیرۂ ابن عمر پیدا ہوا تھا اس لئے اس کے نام کے ساتھ الجزری بھی لکھا جاتا ہے۔ ابن خلکان جو ابن اثیر کا دوست تھا، بیان کرتا ہے کہ اس نے پہلے موصل میں تعلیم پائی اور پھر بغداد، شام اور بیت المقدس میں۔ بعد فراغ اس نے موصل میں درس جاری کیا اور اس کا مکان علماءِ عصر کا مرکز بن گیا۔ ابن خلکان اس سے بمقام حلب ۶۲۶ھ میں ملا تھا اور اس کی نسبت یہ رائے قائم کی تھی کہ "ابن اثیر بڑا فاضل نہایت برگزیدہ صفات کا شخص ہے لیکن اسی کے ساتھ حد درجہ شرمیلا۔" دوسری جگہ بھی خلکان اُسے "شیخنا ابن اثیر" کہتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ "وہ علم حدیث کا بڑا متبحر عالم تھا اور جدید و قدیم تاریخ پر اُسے کامل عبور حاصل تھا۔ اسکی تاریخ کامل جو ابتدائے عالم سے ۶۲۸ھ تک محیط ہے اس کی بے مثل تصنیف ہے۔"

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۹ پر ملاحظہ ہو)

مؤلف "جامع الحکایات" بیان کرتا ہے کہ:-

"نہر والہ میں شکست کھانے کے بعد جب شہاب الدین محمد غوری واپس آیا تو بعض نے تحریری مشورہ دیا کہ نہر والہ کے ایک سردار وا سا بھر نے بہت سا اسباب تجارت جسکی قیمت تقریباً دس لاکھ روپے ہوگی غزنیں روانہ کیا ہے اس لئے اُس کو ضبط کر لینا چاہئے اور اسی رقم سے ایک فوج طیار کرکے نہر والہ پر حملہ کرنا چاہئے" شہاب الدین محمد غوری نے اس تحریر کی پشت پر جواب لکھا کہ:- "یہ انصاف کے خلاف ہے میں ایسا نہیں کر سکتا" (جامع الحکایات قسم ۱- باب ۶- حکایت ۳۷)

کیا یورپ جسے اپنی تہذیب و شائستگی پر اس قدر ناز ہے کوئی ایسی مثال پیش کر سکتا ہے، جس میں اس قدر رواداری سے کام لیا گیا ہو۔ جنگ فرانس اور جنگ بلقان میں جو مظالم عورتوں اور بچوں پر کئے گئے اُن کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ شہاب الدین غوری کی جنگ بنارس سے، جس میں ایک عورت اور ایک بچہ ہلاک نہیں کیا گیا اور حال کے عظیم الشان اصول حرب کو سردار نہر والہ کے واقعہ سے مطابق کرکے دیکھنا چاہئے کہ مخالف ملک کی تجارت کو تباہ و برباد کر دینا، وہاں کے مال و اسباب پر قبضہ کر لینا اولین اصول قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ شہاب الدین غوری اب سے آٹھ صدی قبل کے عہد تاریک میں بھی اس کو روا نہ رکھتا تھا۔

قطب الدین ایبک

۶۰۲-۶۰۷ھ
۱۲۰۶-۱۲۱۰ء

قطب الدین ترکی النسل تھا اور علاوہ جمال ظاہری کے حُسنِ سیرت بھی بدرجۂ اتم رکھتا تھا۔ صاحب طبقات ناصری نے لکھا ہے کہ قطب الدین نہایت جری بادشاہ تھا اور سخاوت میں تو اُسے حاتم ثانی کہنا چاہئے۔ اس میں وہ صفات حکمرانی پائی جاتی تھیں جو اُس وقت مشرق و مغرب کے کسی بادشاہ میں نظر نہیں آتی تھیں۔ اُس کی اس فیاضانہ فطرت نے سارے ہندوستان کو

قطب الدین ایبک [illegible]

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۸)

اس میں شک نہیں کہ تاریخ کامل عجیب و غریب تاریخ ہے اور ایشیا و یورپ میں ہر جگہ اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ابن خلدون مشہور مورخ نے بہت کچھ اس سے اقتباس کیا ہے اور یورپ کے موجودہ مورخین نے اسکی مدد سے متعدد تاریخیں لکھی ہیں۔ اسنے دوسری اور تیسری صدی ہجری کے باغیوں کا کچھ حال بیان کیا ہے اور عربوں کی فتوحات سندھ کا بھی ذکر اسمیں موجود ہے لیکن ہندوستان کے متعلق اس کا وہ حصہ بہت زیادہ قابل غور ہے جس میں غزنوی اور غوری سلاطین کا حال درج ہے۔ حبیب السیر کا مصنف بیان کرتا ہے کہ تاریخ کامل کا ترجمہ تیمور کے بیٹے میران شاہ کے حکم سے نجم الدین زراری نے (جو میران شاہ کا کاتب خصوصی تھا) فارسی میں کیا تھا۔ ابن اثیر کی دوسری کتاب اسد الغابہ بھی بہت مشہور کتاب ہے۔ اس کے دو بھائی اور تھے جو اسی طرح علمی مشاغل میں معروف رہتے تھے ان میں سے ایک مجد الدین تھا جس نے اصول حدیث کے فن میں ایک کتاب "جامع الاصول من حدیث الرسول" لکھی ہے اس کتاب کا مصنف غلطی سے ابن اثیر کو ظاہر کیا جاتا ہے۔

اُس کا مطیع بنا دیا، یہاں تک کہ ایک شخص بھی اُس کا دشمن نہ تھا[1]۔

شہاب الدین محمد غوری نے اس کی بلند نظری اور عالی حوصلگی کا اندازہ اول اول کیونکر کیا، اس کے متعلق مورخین نے بیان کیا ہے کہ "ایک شب شہاب الدین محمد غوری نے محفل طرب قایم کی اور فرط مسرت کے عالم میں تمام حاضرین کو بیش بہا انعامات دئے۔ ان انعام پانے والوں میں قطب الدین بھی تھا۔ جب محفل ختم ہوئی تو قطب الدین نے جو کچھ زر و جواہر، درہم و دینار پایا تھا سب کا سب ادنیٰ خادموں کو تقسیم کر دیا اور ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھا۔ صبح کو جب یہ خبر سلطان کو معلوم ہوئی تو اُس نے قطب الدین کی اس ادا کو بہت پسند کیا اور اُسی وقت طبقہ امراء میں اُسے شامل کر لیا[2]۔ اس کے بعد اُس نے بہت جلد جلد ترقی حاصل کی یہاں تک کہ میر آخوری[3] کے عہدہ پر مامور ہو گیا[4] اور پھر رفتہ رفتہ ہندوستان کا وایسرائے ہو کر خود سلاطین غور نے اُسے سلطان ہند تسلیم کر لیا۔

اس میں شک نہیں کہ اِس کا زمانہ سلطان شہاب الدین محمد غوری کی معیت میں اور نیز خود مختار بادشاہ ہونے کے بعد بھی زیادہ تر حرب و جنگ میں بسر ہوا لیکن اسی کے ساتھ اُس نے اپنے ذوق علم کا بھی کافی ثبوت دیا اور سیکڑوں ادارے قایم کئے جو نہ صرف درس مذہبی بلکہ تعلیم علوم و فنون کا بھی مرکز تھے۔

جب غیاث الدین محمود (غیاث الدین محمد غوری کے بیٹے) نے قطب الدین کے لئے چتر بادشاہی اور خطاب سلطانی ہندوستان روانہ کیا اور قطب الدین تخت دہلی پر بیٹھا تو اُس نے اس قدر داد و دہش کی کہ لک بخش کے نام سے مشہور ہو گیا اور بہاء الدین جو اُس کے عہد کا مشہور فاضل تھا ان الفاظ میں تعریف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ:-

اے بخشش لک[5] تو جہان آوردہ　　　کان را کفِ تو کار بجان آوردہ

از رشک کفِ تو خون گرفتہ دل کان　　　وز لعل بہانہ درمیان آوردہ

صاحب تاج المآثر[6] نے لکھا ہے کہ:-

"قطب الدین ایبک ایسا عادل بادشاہ تھا کہ اسکے عہد میں (بطور ضرب المثل) گرگ و گوسفند ایک ہی جگہ پانی پیتے تھے۔"

---

[1] طبقات ناصری جلد ۱ صفحہ ۲۹۵ — [2] طبقات اکبری صفحہ ۴۰ — [3] میر آخور یعنی شاہی اصطبل کا مہتمم۔ اُس کا فرض یہ بھی تھا کہ جب فوج باہر کوچ کرتی تو گھوڑوں کی نگہداشت کرتا اور دیکھتا کہ اُن کے دانہ پانی کا انتظام درست ہے یا نہیں۔ — [4] فرشتہ جلد ۱ صفحہ ۶۱ — [5] تو ہی وہ شخص ہے جس نے لاکھوں کی بخشش کو دنیا میں ظاہر کیا اور زر و جواہر کی معدنیں تیری فیاضی کو دیکھ دیکھ کر حسد سے جلنے لگیں۔ لعل تو صرف بہانہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تیرے دست کرم کے کرشمے دیکھ کر معدن کا دل خون ہو گیا ہے۔ — [6] تاج المآثر میں زیادہ تر صرف قطب الدین ایبک کے حالات درج ہیں معلوم نہیں اسکو تاج المآثر کیوں کہتے ہیں حالانکہ مصنف نے کہیں اس کا نام ظاہر نہیں کیا۔ مشرق میں یہ کتاب ہمیشہ سے خاص شہرت رکھتی تھی۔ لیکن یورپ کو اس کا علم صرف ہیمر (Hammer) کے طفیل سے حاصل ہوا۔ ہیمر لکھتا ہے کہ:- "اگر حسن نظامی (مولف تاج المآثر) قطب الدین کے حالات نہ لکھتا تو آج وہ بھی اُن دوسرے فرمانرواؤں کی طرح گمنام حالت میں رہتے جنکے حالات کہیں تاریخ سے معلوم نہیں ہوتے۔"

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۶۱ پر ملاحظہ کیجئے)

سڑکیں محفوظ تھیں۔ رہزنی مفقود ہو گئی تھی اور تمام رعایا خوشحال اور مطمئن زندگی بسر کرتی تھی۔ تعصب بالکل نہ تھا۔ ہندو بھی مسلمانوں کے برابر سلطان قطب الدین کی فیاضی سے حصہ پاتے تھے اور انصاف میں مذہب، و دولت، جاہ و امارت کا کوئی لحاظ نہ کیا جاتا تھا۔ اس نے دہلی میں ایک نہایت عمدہ مسجد جامع طیار کرانی شروع کی، جس کی یادگار قطب مینار کی صورت میں اب بھی پائی جاتی ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۶۰)

حسن نظامی کے حالات زندگی بہت کم معلوم ہیں اس نے تاج المآثر کے دیباچہ میں اپنا نام حسن نظامی تحریر کیا ہے۔ میر خوند نے اسکا نام صدر الدین محمد بن حسن نظامی ظاہر کیا ہے اور ابو الفضل نے بھی آئین اکبری میں یہی نام درج کیا ہے۔

ہیمر نے اسے باشندۂ لاہور بتایا ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ وہ نیشاپور کا رہنے والا تھا اور اسنے اس وقت تک اپنا وطن نہیں چھوڑا جب تک خراساں کے حالات نے اُسے اس پر مجبور نہیں کر دیا۔ یہ پہلے غزنی آیا اور کچھ دن قیام کرنے کے بعد دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ راہ کی سختیوں کا حال اس نے نہایت موثر انداز میں لکھا ہے۔ دہلی پہونچ کر وہ شرف الملک قاضی شہر سے ملا اور چند دن بعد احباب کے اصرار سے اس نے یہ تاریخ مرتب کرنی شروع کی۔

سنہ ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں اس تاریخ کی ترتیب شروع ہوئی اور اسی سال شعبان کے مہینہ میں شہاب الدین محمد غوری کی وفات وقوع میں آئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جسوقت تاج المآثر کی تحریر شروع ہوئی محمد غوری زندہ تھا اور اس لئے حسن نظامی نے اس کے نام سے اپنی تاریخ کو منسوب کیا۔

ہیمر پرگستال (Hammer Purgstall) کی یہ تحقیق کہ قطب الدین ایبک کی وفات کے بارہ سال بعد تاج المآثر مرتب ہوئی غلط ہے۔ اس نے اس کتاب کو محمد بن سام بن حسین سے منسوب کیا ہے لیکن مسٹر ہیمر نے اس محمد بن سام کو فرمانروائے لاہور خیال کیا حالانکہ مصنف کا مقصود اس سے شہاب الدین محمد غوری ہے۔ یہ تاریخ سنہ ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء سے شروع ہوتی ہے جب محمد غوری اپنی شکست تھانیسر کا انتقام لینے کے لئے حملۂ ہندوستان کی طیاریاں کر رہا تھا۔ عام طور سے جو نسخے تاج المآثر کے نظر آتے ہیں اُن میں سنہ ۶۱۴ھ/۱۲۱۷ء (یعنی قطب الدین ایبک کے سات سال بعد تک) کا حال درج ہے۔ لیکن بعض قلمی نسخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سنہ ۶۲۶ھ/۱۲۲۸ء (یعنی شمس الدین التمش کے زمانہ) کے حالات بھی درج کئے ہیں۔

اس کتاب میں عربی اور فارسی عبارتیں، دونوں کثرت سے ملی ہوئی نظر آتی ہیں اور تشبیہات، استعارات و دیگر صنایع و بدایع سے بہت زیادہ کام لیکر مورخانہ حیثیت کو ضعیف کر دیا ہے۔

سلطنت قطب الدین ایبک کے متعلق جو تاریخی حالات اس میں درج ہیں وہ نہایت قلیل اور غیر اہم ہیں۔

ہیمر نے شمار کر کے ظاہر کیا ہے کہ اس میں بارہ ہزار سطریں ہیں جن میں سات ہزار سطریں عربی اور فارسی کے اشعار پر مشتمل ہیں۔

شمس الدین التمش

۶۰۷ - ۶۳۳ھ
۱۲۱۰ - ۱۲۳۵ء

التمش کی زندگی زیادہ تر سیاسی مشاغل جنگ و حرب میں بسر ہوئی لیکن پھر بھی اُس کی فیاضیوں نے دہلی کو علماء و فضلاء کا مرکز بنا رکھا تھا۔ قاضی حمید الدین ناگوری، مولانا عماد الدین، مولانا جمال الدین اسی عہد کے زندہ شدہ جوہر تھے۔ فخر الملک عصامی جو تیس سال تک وزیر بغداد رہ چکا تھا اور کمالات ظاہر و باطن میں شہرت تامہ رکھتا تھا سلطان التمش کے دربار میں آیا اور اُسی کی قدر شناسی نے اُسے منصب وزارت پر متمکن کیا۔ نور الدین محمد عوفی (جامع الحکایات کا مصنف) اسی کے زمانہ میں تھا۔ جب چنگیز خانی فتنہ سے وسط ایشیا درہم و برہم ہو رہا تھا تو بہت سے علماء و فضلاء ہندوستان کی طرف بھاگ آئے اور انھیں میں امیر روحانی بھی تھا جو بخارا سے دہلی آیا اور التمش نے اُس کی بہت قدر کی یہ شخص اپنے عہد کا بہت بڑا شاعر تھا۔ فتوحات التمش میں اس کے یہ اشعار تہنیت خاص شہرت رکھتے ہیں :-

خبر بہ اہلِ سما بُرد جبرئیل امین ز فتحنامۂ سلطان عہد شمس الدین
کہ اے ملائکہ قدس آسمانہا را بدیں بشارتے بندید کلہ و آئین
کہ از بلادِ سوالک شہنشہ اسلام کشاد بار دگر قلعۂ سپہر آئین
شہ مجاہد و غازی کہ دست تیغش را روانِ حیدرِ کرار می کند تحسین[1]

اُس نے ایک بہت بڑی درسگاہ تعمیر کرائی تھی جہاں دور دور سے طلبہ آتے تھے اور وظائف حاصل کر کے تحصیل علوم میں مشغول رہتے تھے، فیروز شاہ تغلق ایک صدی سے زیادہ زمانہ گزرنے کے بعد اپنی فتوحات فیروز شاہی میں اس مدرسہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :-

"مدرسہ سلطان شمس الدین التمش مسمار ہو چکا تھا میں نے دوبارہ اُس کی تعمیر کرائی اور صندل کے دروازے لگوائے علاوہ اس کے ستون صحن، گنبد وغیرہ کو بھی از سرِ نو تعمیر کرایا۔"

اسی سلسلہ میں فیروز شاہ تغلق نے اُس تالاب کا بھی ذکر کیا ہے جو حوض شمسی کے نام سے مشہور ہے۔ فیروز شاہ تغلق نے اس کی مرمت کرائی اور پانی آنے کے جو راستے مسدود کر دئے گئے تھے اُن کو صاف کرایا[2]۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ :-

---

[1] فرشتہ جلد ا صفحہ ۶۷ — [2] فتوحات فیروز شاہی۔ جلد ۳۔ صفحہ ۳۸۴۔

"شمس الدین التمش بڑا صالح اور عادل بادشاہ تھا، دادرسی کی طرف اُسے خاص توجہ تھی چنانچہ اُسنے حکم دیا تھا کہ سوائے فریادی اور مظلوم کے اور کوئی شخص رنگین کپڑے نہ پہنے۔ چنانچہ جب وہ کسی کو رنگین ملبوس میں دیکھتا تو سمجھ جاتا کہ اس پر ظلم ہوا ہے اور فوراً بلاکر اُس سے حالات دریافت کرتا۔ انصاف کرنے کے لئے وہ شب و روز ہر وقت مستعد رہتا تھا۔ اس نے محل کے دروازہ پر دو شیر سنگ مرمر کے رکھے اور اُنکے گلے میں دو آہنی زنجیریں ڈال کر اُن میں گھنٹیاں لٹکادیں۔ جب کوئی مظلوم رات کو آتا تو زنجیر کو جنبش دیتا اور سلطان فوراً قصر سے باہر آکر اُس کی فریاد سنتا"

رضیہ سلطان

۶۳۴-۶۳۷ھ
۱۲۳۶-۱۲۳۹ء

رضیہ نے تخت نشین ہوتے ہی تمام اُن قواعد و ضوابط کو جو اس کے باپ کے عہد میں رائج تھے اور رکن الدین کے زمانہ میں باطل ہو چکے تھے از سرِ نو قائم کیا اور کمال احتیاط کے ساتھ اپنی عادلانہ حکومت شروع کی۔

نظام الملک محمد جنیدی وزیر اور بعض دیگر امراء نے مخالفت کی اور آمادۂ جنگ ہوئے، لیکن رضیہ نے اپنے حسنِ تدبیر اور فطری شجاعت سے کام لے کر ان سب کو درہم و برہم کر دیا اور اپنی مخالف قوتوں کا استیصال تمام کر دیا۔

جو عزل و نصب اُس نے اپنی حکومت میں کئے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی مردم شناس تھی چنانچہ مہذی غزنوی کا تقرر (بجائے نظام الملک جنیدی کے) عہدۂ وزارت پر اور ملک سیف الدین ایبک کا نیابت لشکر پر اور سلطنت کے تمام دیگر حکام و امراء کا ایک مقام پر تبادلہ اسکی کافی شہادت ہے ــــ جب حکام اور صوبہ داروں کو رضیہ کی قوت اور اہلیت کا علم ہو گیا تو ساری مملکت میں لکھنوتی سے لیکر دیول تک تمام سرداروں اور امیروں نے سرِ اطاعت اس کے سامنے خم کر دیا[۱]۔

منہاج السراج مصنف طبقات ناصری اسی کے عہد میں ناصریہ کالج سے متعلق ہوا اور گوالیار کا قاضی مقرر کیا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رضیہ کیسی علم دوست اور ہنر شناس تھی ــ طبقات ناصری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں اسوقت معزی کالج موجود تھا جس کے دروازہ کو جامع مسجد کا دروازہ سمجھکر ملاحدہ کا گروہ اندر گھس آیا تھا[۲]۔

رضیہ مردانہ لباس پہنتی تھی اور قبا و کلاہ کے ساتھ دربار کیا کرتی تھی۔ ہاتھی پر بھی سوار ہوتی تھی، لیکن گھوڑے کی سواری اُسے بہت پسند تھی۔ جنگ کے وقت فوج کی ترتیب خود کرتی تھی اور سب کے دوش بدوش میدانِ کارزار میں دادِ مردانگی دیتی تھی۔

---

[۱] طبقات ناصری جلد دوم صفحہ ۳۰۳۔ [۲] طبقات ناصری نے اس واقعہ کو رضیہ کے ابتدائی عہد میں درج کیا ہے لیکن طبقات اکبری اور دیگر کتب تاریخ شمس الدین التمش کے آخری عہد میں اس کا وقوع ظاہر کرتے ہیں جن مورخین نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اُن سب کا ماخذ زبدۃ التواریخ مصنف نورالحق ہے۔

ناصر الدین محمود شاہ

۶۴۴-۶۶۴ھ
۱۲۴۶-۱۲۶۵ء

ناصر الدین علاوہ عادل و شجاع ہونے کے حد درجہ عابد و مرتاض تھا۔ خزانہ شاہی سے ایک پیسہ بھی اپنے اوپر صرف نہ کرتا تھا اور صرف کلام مجید لکھ کر اپنا نفقہ حاصل کرتا تھا[1]۔

ابن بطوطہ مشہور سیاح نے ناصر الدین کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن خود دیکھا ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔

"قاضی کمال الدین نے مجھے ایک نسخہ بادشاہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیا جو نہایت خوشخط تھا[2]"

نظام الدین احمد کے حوالہ سے فرشتہ نے لکھا ہے کہ:۔

"وہ ہر سال دو مصحف کی کتابت کرتا۔ ایک بار اُس قلمی مصحف کسی امیر نے زیادہ قیمت دیکر خرید لیا سلطان کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو اُسے ناگوار ہوا اور آیندہ کے لئے حکم دیا کہ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا کلام مجید خفیہ طور سے بازار کی معمولی قیمت پر فروخت کیا جائے۔"

سلطان ناصر الدین صرف ایک منکوحہ بی بی رکھتا تھا اور کوئی خادمہ وغیرہ نہ تھی۔ ایک دن بی بی نے شکایت کی کہ میرے ہاتھ روٹی پکاتے پکاتے جلے جاتے ہیں اگر کوئی کنیز لے لی جائے تو کیا حرج ہے۔" سلطان نے جواب دیا کہ:۔ "بیت المال بندگانِ خدا کا حق ہے میں اس میں سے کچھ صرف نہیں کر سکتا ورنہ کوئی کنیز مہیا کر دیتا[3]۔"

ناصر الدین دوسرے کے جذبات کا بہت لحاظ کرتا تھا اور کبھی کسی کو تکلیف پہونچانا یا مایوس کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ ایک بار وہ کلام مجید کی تلاوت کر رہا تھا کہ ایک شخص اجنبی آگیا اور بولا کہ "لفظ فیہ مکرر لکھا ہوا ہے۔" سلطان نے فوراً اُس لفظ کے گرد قلم سے حلقہ کھینچ دیا اور اُس شخص کا حال پوچھ کر رفع حاجت کر دی۔ جب وہ چلا گیا تو پھر قلم تراش سے اُس حلقہ کو مٹا دیا۔ ایک غلام نے دریافت کیا کہ حلقہ کھینچنے اور پھر اُس کے محو کر دینے کا کیا سبب تھا؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ "یہ شخص اپنی حاجت لیکر آیا تھا اگر میں اُس سے کہدیتا کہ لفظ فیہ غلط تحریر نہیں ہوا تو وہ نادم ہو جاتا اس لئے میں نے حلقہ کھینچ دیا کہ اس کا محو کر دینا بہ نسبت غبار ملال رفع کرنے کے زیادہ آسان ہے۔"

مذہب کا وہ حد درجہ احترام کرتا اور عظمت نبوی کے خیال سے ہر وقت کانپتا رہتا تھا۔ اس کا ایک ندیم تھا جس کا نام محمد تھا۔ سلطان ناصر الدین جب اس کو بلاتا تو ہمیشہ نام لیکر پکارتا اور جو کام ہوتا کہدیتا۔ ایک دن تاج الدین کہکر آواز دی۔

---

[1] فرشتہ صفحہ ۷۱ — [2] الیٹ جلد سوم صفحہ ۵۹۳ — [3] طبقات اکبری صفحہ ۳۰ —

ندیم آیا اور کام کر کے گھر چلا گیا۔ جب تین دن تک حاضر نہ ہوا تو سلطان نے اُس کو طلب کر کے وجہ دریافت کی۔ اُسنے کہا کہ "سلطان ہمیشہ میرا نام لیکر پکارا کرتا تھا اُس دن بالکل خلاف معمول تاج الدین کہکر آواز دی، میں سمجھا کہ سلطان کچھ برہم ہے بیقرار و مضطرب ہوکر گھر چلا گیا"۔ سلطان نے قسم کھا کر کہا کہ "میں تم سے مطلق رنجیدہ نہیں ہوں اُس دن تمہارا نام نہ لینے کی وجہ یہ تھی کہ میں باوضو نہ تھا اور بغیر طہارت کامل کے لفظ محمد میں اپنی زبان سے ادا نہ کر سکتا تھا"[۱]

غیاث الدین بلبن

۶۶۴-۶۸۶ھ
۱۲۶۵-۱۲۸۷ء

ابن بطوطہ نے بیان کیا کہ جب بلبن سلطان شمس الدین التمش کے روبرو لایا گیا تو اُس نے خریداری سے انکار کر دیا کیونکہ یہ بہت پستہ قامت اور بدصورت تھا۔ بلبن نے یہ معلوم کر کے سوال کیا کہ "جہاں پناہ اور غلام کس کے لئے خرید کئے گئے ہیں؟" التمش نے ہنس کر جواب دیا کہ "اپنے لئے"۔ بلبن نے عرض کیا کہ "تو پھر ایک مجھے خدا کے لئے مول لے لیجئے"۔ یہ سن کر التمش خوش ہوا اور اسکو مول لے کر سقہ کی خدمت سپرد کر دی۔

چونکہ بلبن فطرت کی طرف سے بہترین صفات و خصایل لیکر آیا تھا اس لئے اُس کا تقرب بڑھتا گیا۔ رضیہ کے عہد میں میر شکار ہوگیا اور سلطان بہرام شاہ نے اس کو میر آخور بنا دیا۔ سلطان علاءالدین مسعود کے زمانہ میں "امیر حاجب" ہوگیا اور سلطان ناصرالدین نے تو تمام اُمور سلطنت ہی اس کے سپرد کر دئے۔ یہاں تک کہ سلطان ناصرالدین کے بعد بالاتفاق سب نے اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔

بلبن نے اپنا طویل زمانۂ سلطنت جس فراست و دانائی سے بسر کیا ہے اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ خصوصیات کیونکر اُسے حاصل ہوگئیں جبکہ اس کا زمانۂ تربیت کافی تکلیف و مصائب میں بسر ہوا۔ ضیاءالدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں[۲] لکھا ہے

---

[۱] فرشتہ صفحہ ۷۰ ۔۔۔ ۷۵

[۲] ضیاءالدین برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" نہایت مشہور کتاب ہے جس سے دیگر مورخین (فرشتہ وغیرہ) نے بہت مدد لی ہے۔ یہ کتاب ناصری کے بعد لکھی گئی۔ منہاج السراج نے سلطنت سلطان ناصرالدین محمود کے صرف پندرہ سال تک کے حالات لکھے تھے، اس کے بعد ایک صدی تک کسی مورخ نے توجہ نہیں کی آخر کار ضیاءالدین برنی کو خیال پیدا ہوا اور اس نے سلطان غیاث الدین بلبن کے حالات سے اپنی تاریخ کو شروع کر کے سلطان فیروز شاہ تغلق کے حالات پر ختم کر دیا ہے۔ چونکہ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اس نے یہ تاریخ مرتب کی تھی اس لئے اسی کے نام سے منسوب کی گئی۔ تاریخ فیروز شاہی میں مسلسل واقعات کا لحاظ کم رکھا گیا ہے اور تاریخوں کی صحت کی طرف بھی زیادہ اعتنا نہیں کیا گیا۔ تاہم اس لحاظ سے کہ اس عہد کی تاریخ کوئی اور مرتب نہ تھی تمام مورخین نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ضیاءالدین برنی کا آخری زمانہ نہایت افلاس و تنگدستی میں بسر ہوا اس کی قبر حضرت امیر خسرو کے مزار کے قریب ہی نظام الدین (دہلی) میں واقع ہے۔

بلبن کی فرض شناسی

"جس زمانہ میں یہ صرف ایک سردار کی حیثیت رکھتا تھا اُس وقت وہ عیش و تفریح کی طرف مایل تھا۔ بذلہ سنج ندیم اور خوش گلو مغنی اُس کی محفل میں رہتے تھے اور وہ بھی بادہ خواری، قمار بازی اور اسی طرح کے دوسرے مشاغل میں معروف نظر آتا تھا لیکن جب بادشاہ ہوا تو اُس نے اپنی زندگی کا ورق ہی اُلٹ دیا۔ نہ کہیں محفل عیش و طرب تھی نہ بزم بادہ خواری وہ حد درجہ متین۔ سنجیدہ ہوگیا۔ شراب خواری کو نہ خود ترک کیا بلکہ عام طور سے اُس کے استعمال کی سخت ممانعت کردی۔ نماز روزہ کا سختی کے ساتھ پابند ہوگیا، یہاں تک کہ اشراق و تہجد کی نماز بھی وہ ترک نہ کرتا تھا، ہمیشہ باوضو رہتا، بغیر علماء و صلحاء کی صحبت کے کھانا نہ کھاتا، ہمیشہ اُن سے مسایل شرعیہ دریافت کرتا رہتا اور بزرگوں کے مکانوں پر خود حاضری دیتا، لوگوں کی تعزیت کرتا، اکابر کے جنازوں میں حاضر رہتا اور اگر راستہ میں کہیں مجلس وعظ برپا دیکھتا تو تعظیماً سواری سے اُتر پڑتا اور کچھ دیر سنتا۔ یہ تھا اُس کے زہد و ورع کا عالم"[لے]

انتظام سلطنت اور آداب حکمرانی

انتظام سلطنت کا اُسے اس قدر خیال تھا کہ جب تک وہ پوری طرح کسی شخص کی شرافت نفس اور اہلیت کو معلوم نہ کرلیتا اُس وقت تک اُس کو کوئی عہدہ نہ دیتا اور اگر کوئی ملازم یا حاکم صلاح و تقوے، دیانت و امانت سے منحرف ہوجاتا تو فوراً معزول کر دیتا۔ کبھی رذیل اور معمولی لوگوں سے بات نہ کرتا۔ کسی ہزل گو یا مسخرہ کو دربار میں آنے نہ دیتا اور ہمیشہ نہایت سنجیدہ اور معقول لوگوں کو اپنی صحبت میں رکھتا۔ وہ قہقہہ سے کبھی نہ ہنستا تھا اور نہ کسی اور کو جرأت ہوتی تھی کہ اُس کے سامنے ہنسے[کے]

فیاضی و دریا دلی

ملحقات طبقات ناصری مصنفہ شیخ عین الدین بیجاپوری کے حوالہ سے فرشتہ نے لکھا ہے کہ "فتنۂ چنگیز خانی سے بھاگ کر ترکستان، ماوراء النہر، خراسان و عراق، فارس اور روم و شام وغیرہ کے پندرہ شاہزادوں نے بلبن کی سلطنت میں پناہ لی تھی بلبن نے ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک محلہ الگ کر دیا تھا اور سب کے شاہانہ وظایف مقرر کر دئے تھے۔

دربار بلبن علما کا مرکز تھا

چونکہ اس زمانہ میں وسط ایشیا اور اس کے جوار کے تمام صاحبان کمال تاتاری فتنہ سے پریشان تھے اس لئے ان کے لئے سوائے سلطنت دہلی کے اور کوئی مامن نہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ:-

"زبدہ و نخبہ و خلاصۂ عالم از اصحاب سیف و قلم و سازندہ و خوانندہ و ارباب ہنر کہ در ربع مسکون عدیل و نظیر نہ داشتند در درگاہ بلبن جمع شدہ بودند و درگاہ او را بر درگاہ محمودی و سنجری ترجیح می دادند"[سے]

عدل پروری

بلبن کی عدل پروری کا یہ عالم تھا کہ وہ انصاف کے معاملہ میں کسی کی رعایت نہ کرتا تھا اور نہ کسی کی سفارش کو مانتا تھا اس نے اپنے لڑکوں سے صاف صاف کہدیا تھا کہ اگر کبھی تمہاری طرف سے ظلم و ستم ظاہر ہوگا تو میں بغیر سزا دئے ہوئے نہ چھوڑوں گا۔

جو نصیحتیں وہ اپنی اولاد کو سناتا تھا اُس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کن اُصول پر حکمرانی کرنا چاہتا تھا۔ اُسنے ایک بار

لے طبقات اکبری صفحات ۳۹-۴۰ ─── کے تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی جلد سوم صفحہ ۱۰۰ ─── سے فرشتہ صفحہ ۷۵

بلبن کے نصائح

اپنے بیٹوں سے کہا کہ "دیکھو ایک بادشاہ کی نجات چار باتوں پر منحصر ہے۔ ایک یہ کہ وہ خدا سے ڈر کر رعایا کے آرام و سکون کا انتظام کرے۔ دوسرے یہ کہ فسق و فجور کا ملک سے استیصال کلی کر دے۔ تیسرے یہ کہ خدمات حکومت ہمیشہ خدا ترس، امین اور شایستہ لوگوں کے سپرد کرے۔ چوتھی بات یہ کہ ظلم و ستم نہ ہونے دے اور انصاف کرنے میں کسی کی رعایت نہ کرے۔"

انصاف کی عجیب و غریب مثال

ایک بار ملک نعیق پسر جامدار نے جو امراء کبار میں سے تھا اور ولایت بدایوں اُس کی جاگیر میں تھی حالت مستی میں ایک فراش کو اس قدر دُرّے مارے کہ وہ مر گیا۔ جب سلطان بلبن، بدایوں پہونچا تو فراش کی بیوی دربار عام میں حاضر ہوئی۔ سلطان بلبن نے اُسی وقت سب کے سامنے ملک نعیق کو طلب کیا اور اس قدر دُرّے لگوائے کہ وہ بھی مر گیا اور بدایوں کے بریدوں (پرچہ نگاروں) کو جنھوں نے اس واقعہ کی اطلاع اُسے نہیں دی تھی شہر کے پھاٹک پر سولی دیدی۔

دوسری مثال

اسی طرح ایک بار ہیبت خاں نے جو سلطان بلبن کے نہایت معتبر غلاموں میں سے تھا اور اقطاع اودھ جاگیر میں رکھتا تھا ایک شخص کو حالتِ مستی میں مار ڈالا۔ اُس کی بیوی سلطان کے پاس فریاد لائی۔ سلطان نے ہیبت خاں کو طلب کر کے پانچسو دُرّے لگوائے اور عورت سے کہا کہ "ہیبت خاں آج تک میرا غلام تھا لیکن آج سے تو اس کی مالک ہے۔ تجھے اختیار ہے چاہے مار ڈال چاہے معاف کر دے۔" بمشکل تمام ہیبت خاں نے بیس ہزار تنکہ دے کر اُس عورت کو راضی کیا اور نجات پائی۔[1]

محکمۂ جاسوسی

سلطان بلبن نے اپنی سلطنت کے صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے کثرت سے جاسوس یا برید مقرر کر دئے تھے اور وہ نہایت سختی سے احتساب کیا کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ نہ جاسوس کوئی غلط خبر اُس تک پہونچا سکتا تھا اور نہ حکام کو جادۂ عدل سے ہٹنے کا یارا تھا۔

فوج کی تہذیب و ترتیب

بلبن نے تخت نشین ہوتے ہی جس طرف توجہ کی وہ سپاہ تھی اس نے تمام فوج کا جایزہ لیا اور کمان ایسے ہاتھوں میں دی جن کی وفاداری مسلم تھی۔ بلبن اپنی سلطنت میں دورہ بھی کثرت سے کیا کرتا تھا اور خود انتظامی حالات کو دیکھ کر اُن میں اصلاحیں کیا کرتا تھا۔ ہر چند وہ نظم و نسق کے باب میں بہت سخت تھا لیکن پھر بھی وہ بہت رحم و کرم کرتا اور ضعفاء کا بہت خیال رکھتا۔

رحم و کرم

ایک بار بلبن کو معلوم ہوا کہ عہد شمسی (شمس الدین التمش) کے بہت سے سپاہی ضعیف ہو کر بیکار ہو گئے ہیں۔ بلبن نے حکم دیا کہ جو مواضعات اُن کے پاس ہیں خالصہ میں لے لئے جائیں اور ہر ایک کے لئے تیس تنکہ بطور مدد معاش کے مقرر کر دیا جائے۔ اس سے ان لوگوں میں سخت اضطراب پیدا ہو گیا اور سب کے سب ملک فخر الدین کوتوال کے پاس روتے ہوئے آئے۔ کوتوال ملول و مضمحل سلطان کی خدمت میں گیا اور دریافت کرنے پر عرض کی کہ "جہاں پناہ نے ضعفاء کو اپنے رحم و کرم سے محروم کر دیا ہے اگر خدا نے قیامت کے دن بھی اسی طرح ہم ضعیفوں کو مردود کر دیا تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟" یہ سُن کر سلطان بلبن بہت رویا اور فرمایا کہ "بہ نہج سابق یہ سب کی معاش بحال رکھی جائے اور آئندہ کوئی تعرض نہ کیا جائے۔"[2]

۱؎ تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی جلد سوم صفحہ ۱۰۱ — ۲؎ فرشتہ صفحہ ۷۰ ۔ تاریخ فیروز شاہی جلد سوم صفحہ ۱۰۸

سفر کے دوران میں اگر کسی پل، گھاٹ یا گزرگاہ عام پر پہونچ جاتا تو اپنے سرداروں کو مقرر کرتا کہ سب سے پہلے عورتوں، بچوں، ضعیفوں اور کمزور جانوروں کے گزر جانے کا انتظام کریں اور پھر دوسرے لوگ عبور کریں۔

باغیوں کی سرکوبی

سلطان بلبن کبھی اس کو گوارا نہ کرتا کہ کوئی شخص اُس کی سلطنت میں بغاوت یا نقضِ امن کا مجرم ہو۔ وہ مفسدوں اور باغیوں کو سخت سزائیں دیتا اور خود فوج لیجاکر سرکوبی کرتا۔ طغرل کی بغاوت میواتیوں کی شورش اس کے عہد کے خاص واقعات ہیں۔ پھر بلبن نے جس طرح ان فتنوں کو فرو کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاست میں بھی وہ خاص ملکہ رکھتا تھا۔

سطوت و جبروت

سلطان غیاث الدین بلبن اپنے تمام صفات رحم و کرم، بذل و نوال کے ساتھ سطوت و جبروت بھی بدرجۂ اتم قایم رکھتا تھا اور لوگوں کے دلوں میں اس نے اپنی ہیبت و عظمت بہت قایم کر رکھی تھی۔ تخت نشینی کے دوسرے سال جب اس نے جلوس نکالا تو سیکڑوں کوس سے لوگ دیکھنے کے لئے جمع ہوئے اور اس قدر تزک و احتشام کی نمایش کی گئی کہ دنیا متحیر تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے قبل کسی بادشاہ نے اس شان و شوکت کا اظہار نہیں کیا۔

خودداری

وہ اپنی خانگی زندگی میں بھی اس کا لحاظ رکھتا تھا کہ کوئی خادم گستاخ نہ ہو جائے اور اس کے بعض ایسے خادم جو ہر وقت خلوت میں ساتھ رہتے تھے اُن کا بیان ہے کہ ہم نے کبھی بادشاہ کو خلوت کے نصف لباس میں نہیں دیکھا ہمیشہ وہ اپنے پورے ملبوس میں نظر آتا تھا[1]۔

بلبن کا بڑا بیٹا محمد سلطان اور اس کے فضائل

بلبن کے بڑے بیٹے کا نام محمد سلطان تھا جو بعد کو خان شہید کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی تعلیم و تربیت کے انتظام میں بلبن نے نہایت احتیاط سے کام لیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مکارم اخلاق اور محاسن اوصاف میں وہ اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ فضیلت دانش و ہنر میں بھی وہ بے مثل شخص تھا اور اس کا دربار علماء و فضلا کا مرکز تھا۔ صاحبانِ فضل و کمال اور شعراء عصر ہر وقت اسکے پاس جمع رہتے اور وہ اپنی شاہانہ بخشش سے سب کو مالا مال کر دیتا۔ حضرت امیر خسرو جن کی ذات پر ہندوستان کو فخر حاصل ہے اور خواجہ حسن جو بہترین شعراء میں سے تھے اسی شاہزادہ کے دربار کے جواہر تابندہ میں سے تھے۔

محمد سلطان کی تہذیب - محمد سلطان کی بیاض

محمد اس قدر مہذب تھا کہ مجلس میں بعض اوقات پورا ایک ایک دن ایک ایک رات بسر ہو جاتی لیکن اپنا زانو بلند نہ کرتا۔ وہ قسم نہ کھاتا اور اگر کبھی ضرورت ہوتی تو صرف "حقا" کہدیتا۔ عمر بھر اس کی زبان سے کوئی ناملایم لفظ نہیں نکلا۔ اس کی مجالس میں زیادہ تر شاہنامہ، دیوان خاقانی و انوری خمسۂ نظامی اور اشعار امیر خسرو پڑھے جاتے۔ حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں کہ:۔

"بجودتِ طبع و دریافت معنی دقیق و سخن شناسی و یادداشت اشعار متقدمین و متاخرین ہیچ محمد سلطان کم کسے را دیدہ ام"

محمد سلطان کے پاس ایک بیاض تھی جس میں اُس نے بیس ہزار اشعار قدماء کے انتخاب کئے تھے۔ امیر خسرو اور خواجہ حسن کا بیان ہے کہ "اس سے بہتر انتخاب کوئی دوسرا کر ہی نہ سکتا تھا" جب محمد سلطان شہید ہوا تو اس بیاض کو سلطان

---

[1] تاریخ فیروز شاہی جلد سوم صفحہ ۱۰۳۔ [2] تاریخ فیروز شاہی جلد سوم صفحہ ۱۰۰۰

بلبن نے امیر علی جامدار کے سپرد کیا اور پھر یہاں سے حضرت امیر خسرو کے پاس پہونچی اور اُس سے بہت سے صاحبانِ ذوق نے اشعار کا انتخاب کیا۔

اقامتِ ملتان کے زمانہ میں شیخ عثمان ترمذی جو اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ و درویش تھے تشریف لائے۔ محمد سلطان نے تحایف پیش کر کے اقامتِ ملتان کی درخواست پیش کی اور ایک خانقاہ تعمیر کرا کے دیہات وقف کر دینے کا وعدہ کیا لیکن شیخ نے قبول نہ کیا۔

اگر اس کی مجلس میں احیاناً کوئی شعر ایسا پڑھ دیتا جس میں کوئی پند و نصیحت ہوتی تو سارے کام چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہو جاتا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ ایک صحبت سماع برپا تھی شیخ عثمان اور شیخ صدرالدین بن شیخ بہاء الدین ذکریا بھی موجود تھے کسی شعر پر ان لوگوں کو رقت طاری ہوئی تو سلطان محمد فرطِ تاثر سے بیتاب ہو گیا اور ان حضرات کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو کر زار زار رونے لگا۔

سلطان محمد نے دو بار اپنا خاص آدمی اور قیمتی تحائف شیخ سعدی شیرازی کے پاس بھیجکر ملتان آنے کی درخواست کی لیکن شیخ نے اپنی ضعیفی کا ذکر کر کے معذرت چاہی اور کہلا بھیجا کہ امیر خسرو وہاں موجود ہیں اُن کی قدر دانی فرمائی جائے۔[1]

بلبن کے عہد میں اور بھی بڑے بڑے صاحب کمال موجود تھے مثلاً شیخ فریدالدین مسعود شکر گنج، شیخ الشیوخ بہاء الدین ذکریا، شیخ صدرالدین بن شیخ بہاء الدین، شیخ بدرالدین غزنوی، خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور سید مولہ وغیرہ کہ ان میں سے ہر ایک بے مثل شخص تھا۔[1]

علاوہ مشائخ و علماء کے اور لوگ بھی خاص خاص صفات کے موجود تھے مثلاً ایبک کشلی خاں جو تیر اندازی، نیزہ بازی اور دیگر فنونِ حرب میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ اسی طرح بلبن کا برادر زادہ علاء الدین محمد بن اعز الدین جو مجلس آرائی اور بخشش و کرم میں بڑی شہرت رکھتا تھا مصر و شام، روم و بغداد، عراق و خراسان وغیرہ سے شعراء اور اکابر علماء آتے تھے اور اس کے بذل و نوال سے بہرہ مند ہو کر نہایت مطمئن و مسرور واپس جاتے تھے ایک بار خواجہ شمس الدین اور خواجہ حمید الدین قطب الدین حسن غوری کے ندیم خاص نے چند اشعار علاء الدین کی مدح کہکر مغنیوں کو یاد کرا دئے اور تاکید کر دی کہ تقریب نوروز (جشن بلبنی) میں ان کو گا کر سنائیں جب جشن منعقد ہوا تو مطربوں نے وہی اشعار مدح سنائے، علاء الدین بھی موجود تھا۔ یہ سُنکر مجلس سے اُٹھ گیا اور گھر پہونچکر دریافت کیا کہ یہ اشعار کس کے تھے اور خواجہ شمس الدین کو طلب کر کے مجلس نوروز کا تمام سامان و اسباب جو اُسنے اپنے لئے ترتیب دیا تھا اُٹھا کر اس کو دیدیا اور دس ہزار تنکہ مطربوں کو بلا کر دیا۔ اس کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ آخر وقت میں اس کے پاس سوا اُس کپڑے کے جو اُس کے جسم پر تھا ایک چیز بھی باقی نہ رہ گئی تھی۔[2]

---

[1] فرشتہ صفحہ ۸۳ — [2] تاریخ فرشتہ صفحہ ۷۷۔

حکومت بلبن پر ایک عمومی تبصرہ

بلبن نے جو پہلے ایک معمولی غلام تھا اور پھر رفتہ رفتہ ترقی کر کے میر شکار، میر آخور، جنرل اور وزیر کے درجہ تک پہونچا بہ حیثیت بادشاہ اور وزیر ہونے کے چالیس سال تک ہندوستان پر حکومت کی اور اس میں شک نہیں کہ اس کا زمانہ عجیب خیر و برکت کا زمانہ تھا، انتظام سلطنت، عدل و انصاف، بیدار مغزی و دور اندیشی، رحم و کرم، علم پروری، ہنر شناسی الغرض ہر اعتبار سے سلطان بلبن اپنا جواب نہ رکھتا تھا، رعایا مسرور و مطمئن تھی، عمال امین و متدین تھے۔ علماء و فضلاء شعراء و مشائخ کا ہجوم تھا، علم و فضل کا چشمہ ہر جگہ سے اُبلتا ہوا نظر آتا تھا ملک میں ہر جگہ امن و سکون کی حکومت تھی۔ تمام ایشیا کے بڑے بڑے شاہزادے، امراء اور شعراء دربار کی رونق بڑھا رہے تھے اور حضرت امیر خسرو کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ "اسوقت بخارا بھی جو وسط ایشیا کا بہت بڑا مرکز علم و ہنر تھا، دہلی پر رشک کر رہا تھا"

فراست و دانائی

مسٹر لین پول کی رائے ہے کہ سلطان بلبن سے زیادہ کسی بادشاہ نے نہیں سمجھا کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے اور یہاں کی رعایا کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے[1]۔

غیاث الدین بلبن کی تمام سیاسی زندگی ایک مرقع ہے اُس جرأت و بسالت و فراست و دانائی کا جو نہ صرف غلام خاندان بلکہ تمام مسلم فرمانروایان ہند میں بہت کم نظر آتا ہے۔

ناصرالدین شاہ کی کامیابی کا راز

اس نے مسلسل بیس سال تک ناصرالدین محمود شاہ کی جس محنت و صداقت سے خدمت انجام دی اُس کی اہمیت اس وقت بہت بڑھ جاتی ہے جب دیکھا جاتا ہے کہ وہ زمانہ کس سازش و بغاوت کا تھا اور مغلوں نے حکومت ہند کے قیام کو کس قدر دشوار بنا دیا تھا۔ ناصرالدین ایک درویش صفت بادشاہ تھا۔ قرآن مجید لکھ کر اپنی معاش بہم پہونچاتا تھا اور اُسکی اکیلی بیوی بغیر اس کے کہ کوئی خادمہ اُس کی مدد کرے کھانا پکایا کرتی تھی، وہ ایک فیاض طبیعت فاضل شخص تھا اور ہمیشہ علماء و حکماء کی صحبت پسند کرتا تھا لیکن ساتویں صدی کے پر آشوب عہد کے لئے وہ یقیناً کسی طرح موزوں نہ تھا جب کہ ہندوستان کو ایک نہایت ہی سخت گیر، جنگجو اور سیاست داں بادشاہ کی ضرورت تھی۔ پھر باوجود ان صفات کے فقدان کے جو کامیابی ناصرالدین کو حاصل ہوئی اُس کی وجہ صرف یہی تھی کہ بلبن اس کا دست راست تھا اور اس نے ساری سلطنت کو اپنی مٹھی میں کر رکھا تھا۔

قزاقوں کا انتظام

اس نے اپنی آہنی تدبیروں سے قرب و جوار کی لوٹ مار کا سدِ باب کیا اور دہلی کے نواح میں جس قدر گاؤں آباد تھے اُنہیں عسکر سلطانی نے گھس گھس کر قزاقوں کو گرفتار کیا، جنگلوں کو صاف کیا اور تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کی قربانی کر کے ان غارتگروں کی کمین گاہ کو پُر امن قابل زراعت ضلع میں تبدیل کر دیا۔

اس نے تمام ایسے مقامات میں جہاں فتنہ پردازوں کو فساد پیدا کرنے کا موقع ملتا تھا، قلعے تعمیر کرائے، چوکیاں قایم کیں

---

[1] Medieval India by Lane Poole

اور اس طرح تمام اُن راستوں کو صاف اور پرامن بنا دیا جو بقول ضیا برنی، ساٹھ سال سے قزاقوں کا مسکن بنے ہوئے تھے، اور لوگوں کی آمد و رفت وہاں مسدود تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ انتظام نرمی و آسانی سے نہ ہو سکتا تھا، اس لئے جب بلبن کو کسی ایسے گروہ کا پتہ چلا تو وہ فوراً شیر کی طرح وہاں پہونچ گیا اور شیر ہی کی طرح دشمنوں اور فتنہ برپا کرنے والوں کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس غرض سے اس نے بہت سے جنگل کٹوا کر سڑکیں بنوا دیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ تدبیر اس کی بہت کارگر ہوئی۔

جلال الدین فیروز شاہ

۶۸۹-۶۹۵ھ
۱۲۹۰-۱۲۹۵ء

سلطان جلال الدین بڑا خدا ترس، رحم دل اور خطا پوش بادشاہ تھا اس نے کبھی خونریزی کو روا نہیں رکھا اور بڑے بڑے مجرموں کی خطائیں در گزر کر دیں۔

جب جلال الدین پرانی دہلی گیا اور قصر کے پاس اُترا تو اُس نے نمازِ شکرانہ ادا کی اور بہ آوازِ بلند کہا کہ میں کیونکر خدا کا شکر ادا کر سکتا ہوں کہ جس تخت کے سامنے میں نے برسوں سر جھکایا ہے اُس پر آج اپنا قدم رکھتا ہوں اس کے بعد وہ کوشک محل میں جو غیاث الدین بلبن کا محل خاص تھا گیا اور وہاں پہونچتے ہی گھوڑے سے اُتر پڑا۔ ملک احمد حبیب نے عرض کیا کہ "سواری سے اُترنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ یہ قصر بھی بادشاہ کی ملکیت ہے"۔ جلال الدین نے کہا کہ "یہ میرے آقائے ولی نعمت کا قصر ہے اور مجھ پر تعظیم فرض ہے"۔ پھر ملک حبیب احمد نے کہا کہ "بادشاہ کو یہیں سکونت اختیار کرنی چاہئے"۔ جلال الدین نے جواب دیا کہ "اس عمارت کو شاہ بلبن نے اپنی سرداری کے عہد میں تعمیر کرایا ہے اس لئے یہ اُس کے ورثاء کی ملکیت ہے میں صرف عارضی مصلحت کی وجہ سے قواعدِ اسلام کو ترک نہیں کر سکتا"۔ جب کوشک محل کے اندر جلال الدین پہونچا تو وہ اُس جگہ نہیں بیٹھا جہاں شاہ بلبن بیٹھا کرتا تھا بلکہ امراء کی نشست میں جلوس فرما کر حاضرین سے کہا کہ "ایتمر کچھن اور ایتمر سرخہ کا گھر تباہ ہو کہ انھوں نے میرے مار ڈالنے کا قصد کیا اور میں اپنی جان کے اندیشہ سے اس گناہ کا مرتکب ہوا ورنہ کہاں بادشاہی اور کہاں میں دیکھئے مآل کار کیا ہوتا ہے اور میری اولاد پر کیا گزرتی ہے"۔

جلال الدین بے انتہا حلیم و کریم تھا جب وہ کسی کو جاگیر دیتا تو کبھی اُس میں تغیر نہ کرتا اور امراء و مقربین سے اگر کوئی جرم سرزد ہوتا تو کبھی انھیں ذلیل نہ کرتا۔ وہ امراء کے ساتھ مساویانہ سلوک کرتا اور نہایت بے تکلفی کے ساتھ اُن سے ملتا۔

وہ علم دوست بھی اسی درجہ کا تھا۔ حضرت امیر خسرو، تاج الدین عراقی، خواجہ حسن، موید جاجرمی، موید دیوانہ، امیر ارسلان کلامی وغیرہ جو اپنے عہد کے بڑے فاضل و کامل لوگ تھے جلال الدین کے ندیم تھے، امیر خاصہ، حمید راجہ

غزل خوانان دربار میں سے تھے اور محمد شاہ چنگی، فتوخاں، نصیر خاں اور بہروز جو موسیقی کے بے بدل ماہر تھے اس کے مطرب تھے۔ امیر خسرو روز اس کی مجلس میں کوئی نہ کوئی غزل پڑھتے اور شاہانہ انعامات کی بارش اُن پر ہوتی۔ جب جلال الدین عہدۂ میر جانداری سے ترقی پاکر عارض ممالک کے درجہ پر پہونچا تو اُسی وقت امیر خسرو کو اپنے پاس بلالیا اور سفید جامہ و کمر بند عنایت کرکے، جو امرائے کبار کے لئے مخصوص تھا، اُن کو مصحف داری کی خدمت سپرد کردی اور بہت بڑا منصب مقرر کردیا۔ جب بادشاہ ہوا تو یہ التفات اور زیادہ بڑھ گیا اور دہلی کے شاہی کتب خانہ کا اہتمام امیر خسرو کے سپرد کردیا۔[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم و ہنر کی پوری قدر کرتا تھا اور مردم شناسی کی صحیح قابلیت اپنے اندر رکھتا تھا۔ جلال الدین خود بھی شعر کہتا تھا چنانچہ بدایونی[2] نے اس کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں:۔

آں زلف پریشانت ژولیدہ نمی خواہم وال روئے چو گلنارت تفسیدہ نمی خواہم

بے پیرہنت خواہم یک شب بہ کنار آئی ہاں بانگ بلند است ایں پوشیدہ نمی خواہم

اسی طرح جب وہ محاصرۂ گوالیار میں مصروف تھا تو وہاں اُس نے ایک عمارت مقبرہ طیار کرائی اور یہ رباعی تصنیف کی تاکہ بطور کتبہ کے وہاں درج کی جائے۔

---

[1] فرشتہ صفحہ ۹۰۔ تاریخ فیروز شاہی (الیٹ) جلد سوم صفحہ ۱۴۴۔ طبقات اکبری صفحہ ۶۱

[2] اس کتاب کا نام منتخب التواریخ ہے اور اس کا مصنف ملا عبدالقادر بدایونی ہے چونکہ بہت سے لوگوں نے منتخب التواریخ کے نام سے کتابیں لکھی ہیں اس لئے ملا عبدالقادر کی منتخب التواریخ کو ممتاز کرنے کے لئے صرف تاریخ بدایونی کے نام سے مشہور ہے۔

بدایونی میں عہدِ غزنوی سے لیکر اکبر کے چالیس سال تک کے واقعات درج کئے گئے ہیں۔ عہد اکبری کی یہ مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے گو اس میں شک نہیں کہ اس نے بہت زیادہ سختی سے تنقید کی ہے۔

ملا عبدالقادر سنہ ۹۴۷ھ یا سنہ ۹۴۹ھ میں بمقام بدایوں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام شیخ ملوک شاہ تھا اور شیخ پنجو سنبھلی کا (جو مشہور درویش تھے) مرید تھا۔ ملوک شاہ کا انتقال سنہ ۹۶۹ھ میں ہوا۔

عبدالقادر نے تکمیل علوم اسوقت کے بڑے بڑے علماء کی خدمت میں جاکر کی اور علاوہ تمام فنون متداولہ کے موسیقی، تاریخ اور علم نجوم میں بھی کافی مہارت پیدا کی۔ جلال خاں قورچی نے اسے دربار اکبری میں پیش کیا اور چالیس سال تک وہ شیخ مبارک اور اس کے دونوں بیٹے فیضی اور ابوالفضل کے ساتھ رہا۔ بدایونی ہمیشہ ان دونوں بھائیوں سے برہم رہا کیونکہ اس کے نزدیک یہ ملحد تھے۔

ملا بدایونی بڑا فاضل شخص تھا۔ اس نے شہنشاہ اکبر کی فرمائش سے مختلف کتابیں عربی اور سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیں جن میں معجم البلدان، جامع رشیدی اور رامائن خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس نے فن حدیث میں ایک کتاب بحر الاثمار لکھی اور دوسری کتاب اخلاق میں نجات الرشید تصنیف کی۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

ما را کہ قدم بر سرِ گردوں ساید　　　از تودۂ سنگ و گل چہ قدر افزاید
ایں سنگِ شکستہ زاں نہادیم درست　　　باشد کہ دلِ شکستہ آساید[۱]

غیاث الدین بلبن کے بھتیجہ ملک چھجو نے ولایت کڑہ میں سلطان مغیث الدین کا لقب اختیار کر کے اپنے نام کا سکّہ اور خطبہ جاری کر دیا اور ایک عظیم لشکر لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ جب یہ خبر شاہ جلال الدین خلجی کو پہونچی تو اُس نے اپنے بیٹے ارکلی خاں کو ہراول بناکر آگے روانہ کیا اور خود بارہ کوس کے فاصلہ سے عقب میں روانہ ہوا۔ ارکلی خاں اور چھجو کا مقابلہ ہوا جس میں چھجو کو شکست ہوئی۔ ملک چھجو نے امیر علی میر جاندار اور دوسرے باغی امراء کو قید کر کے اُن کی گردن میں دوشاخہ[۲] ڈال کر اونٹوں پر سوار کر دیا اور اپنے باپ کے پاس اسی حال میں روانہ کیا۔ جب یہ لوگ بادشاہ کے پاس پہونچے تو اُس نے فوراً اپنی آنکھوں پر رومال ڈال لیا اور بے اختیار ہو کر چیخ پڑا کہ "یہ کیا ہے؟ فوراً ان لوگوں کو اُتارو اور حمام میں لے جاؤ" جب یہ لوگ نہا چکے تو خاص خلعتیں عطا ہوئیں اور دربار میں بلا کر حد درجہ نرمی و محبت سے اُن کے ساتھ پیش آیا۔ اُس کے اس طرزِ عمل سے یہ لوگ سخت منفعل ہوئے لیکن بادشاہ اس کو بھی گوارا نہ کر سکا اور کہا کہ "آپ لوگوں نے مجھ سے بغاوت کر کے کوئی نمک حرامی نہیں کی کیونکہ میں تمہارا بادشاہ نہ تھا کہ مجھ سے مخالفت نمک حرامی ہوتی بلکہ تم نے اپنے ولی نعمت کی طرفداری کی اور یہ تمہارا فرض تھا۔"

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷۲)

اس نے کچھ حصہ مہابھارت کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور ملا شاہ محمد شاہ آبادی کی تاریخ کشمیر کا (جسے شاہ آبادی نے اصل ہندی زبان سے ترجمہ کیا تھا) بھی خلاصہ کیا۔ باوجود اس کے کہ ملا عبدالقادر، شہنشاہ اکبر کا بہت زیادہ زیر بار احسان تھا اس نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ اکبر سے اس لئے جلتا تھا کہ اس نے مذہب کا خیال ترک کر دیا اور صحیح طریقۂ شریعت سے منحرف ہو گیا تھا — چونکہ بدایونی کی نفرت اکبر اور اس کے درباریوں سے اسی بناء پر بہت بڑھ گئی تھی اس لئے اس نے عہد اکبری کی تاریخ نہایت تعصب کے ساتھ درج کی ہے اور اکثر جگہ اپنی بیجا نکتہ چینیوں سے اس کو پایۂ اعتبار سے گرا دیا ہے۔ یہ تاریخ سنہ ۱۰۰۴ھ کے ابتداء میں ختم ہو جاتی ہے۔ مراۃ العالم میں لکھا ہے کہ "اس تاریخ کے مسودات عہد جہانگیر میں دستیاب ہوئے۔ اور جب ملا عبدالقادر کی اولاد سے پوچھا گیا تو انھوں نے انکار کیا کہ ہم اس سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ جہانگیر اس پر ناخوش ہوا" افسوس ہے کہ تزک جہانگیری میں اس کا کہیں ذکر نہیں پایا جاتا۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ سنہ ۱۰۲۳ھ (یعنی جہانگیر کے نویں سال جلوس) تک اس تاریخ کا کسی کو پتہ نہ تھا، کیونکہ مصنف مآثر رحیمی شکایت کرتا ہے کہ سوائے طبقات اکبری اور اکبر نامہ کے اور کوئی تاریخ نظر نہیں آتی۔

ہر چند بدایونی نے اعتراف کیا ہے کہ اس کی تاریخ صرف تاریخ اکبر شاہی اور طبقات اکبری سے ماخوذ ہے حتٰی کہ وہ نجات الرشید میں اسے صرف طبقات کا خلاصہ تحریر کرتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس نے بہت کچھ اور بھی شامل کیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ وہ نیز دلیجہ جس سے اسکا تعصب پیدا ہے صرف بدایونی ہی کے دماغ کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ طبقات شاہجہانی میں بدایونی کا سنہ وفات سنہ ۱۰۰۴ھ لکھا ہے۔

[۱] بدایونی صفحہ ۱۴۶ — [۲] دوشاخہ سے مراد جُوا ہے جو بیلوں کے کندھوں پر رکھا جاتا ہے۔

اتفاق سے چند دن بعد چھجو کو بھی کسی زمیندار نے گرفتار کر کے پیش کر دیا۔ بادشاہ نے اس کی بڑی عزت کی اور ملتان بھیجکر وہاں کے حاکم کو لکھا کہ "شاہ بلبن کے برادر زادہ کو نہایت دلجوئی سے رکھا جائے اور اس کے لئے تمام سامان عیش و تفریح کا مہیا کیا جائے۔" لوگوں نے کہا بھی کہ دشمنوں کے ساتھ یہ سلوک مناسب نہیں ہے ان کو قتل کر دینا چاہئے۔ لیکن سلطان جلال الدین نے کہا کہ "میں ضعیف ہو گیا ہوں اور اسوقت تک میں نے کسی کا خون نہیں بہایا اب وقت آخر میں مجھے اس پر مجبور نہ کرو" اس واقعہ کو ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ "خود حضرت امیر خسرو نے اس واقعہ کی روایت اُس سے کی تھی"[1]

جب سلطان کا رحم و کرم اس حد تک بڑھ گیا تو ایک دن ملک تاج الدین کوچی کے مکان پر یہ لوگ جمع ہوئے اور نشہ کی حالت میں یہ فیصلہ کیا کہ "ملک تاج الدین بادشاہ ہونے کے قابل ہے۔" ایک نے کہا کہ "میں اس تیم شکاری (چاقو) سے جلال الدین کا فیصلہ کئے دیتا ہوں۔" دوسرے نے کہا کہ "ابھی تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔" بادشاہ کو اس کی خبر ہوئی تو سب کو طلب کیا اور برہم ہو کر تلوار ان لوگوں کے سامنے ڈالدی اور کہا کہ "اگر تم میں کوئی مرد ہے تو اسی وقت نکل آئے اور مجھ سے مردانہ فیصلہ کر لے، ورنہ یوں فضول مزخرفات بکنے سے کیا فایدہ ہے۔" سب لوگ نادم و منفعل کھڑے تھے اور بادشاہ کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ آخر ملک نصرت "دوات دار" نے جو بادشاہ کا ندیم تھا اور خود بھی اس سازش کرنے والی جماعت میں شریک تھا عرض کیا کہ "جہاں پناہ کو معلوم ہے کہ نشہ کی حالت میں انسان کے منھ سے ایسی ہی فضول باتیں نکل جاتی ہیں اور اگر بادشاہ مواخذہ کرے گا تو پھر ہم لوگوں کے لئے مفر کہاں ہے۔" سلطان جلال الدین کا غصہ اس الحاح سے فرو ہو گیا اور کسی کو معمولی تنبیہ بھی نہیں کی۔[2]

غیاث الدین بلبن کے عہد میں جب جلال الدین نائب سامانہ اور سر جاندار تھا، تو صوبہ کیتھل اس کی حکومت میں تھا۔ اس نے مولانا جلال الدین سے جو شعراء عصر میں سے تھے اور جن کے پاس ایک گاؤں مدد معاش میں بطور جاگیر یا وظیفہ کے تھا، حسب قاعدہ خراج طلب کیا۔ مولانا نے برہم ہو کر جلال الدین کی ہجو میں ایک مثنوی لکھی اور اس کا نام خلجی نامہ رکھا۔ جب جلال الدین بادشاہ ہوا تو یہ ڈرے اور اپنے گلے میں رسی ڈال کر گناہگاروں کی طرح دربار میں حاضر ہوئے لیکن سلطان جلال الدین نے نہایت عزت سے ان کی پذیرائی کی اور خلعت فاخرہ اور انعامات سے سرفراز کر کے اس گاؤں کے علاوہ ایک گاؤں اور جاگیر میں دیا۔[3]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی (الیٹ) جلد ۳ صفحہ ۱۳۸ - فرشتہ ۹۱ - طبقات اکبری صفحہ ۵۸ — [2] طبقات اکبری صفحہ ۶۰ — تاریخ فیروز شاہی (الیٹ) ۱۴۲-۱۴۳ - فرشتہ، صفحہ ۹۱ — [3] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۱۴۴ - طبقات اکبری صفحہ ۶۰ - فرشتہ صفحہ ۹۱-۹۲ -

اس سے زیادہ دلچسپ ایک اور واقعہ ہے۔ جس زمانہ میں جلال الدین نائب سمانہ اور منڈاہروں کے دیہات پر تاخت میں مصروف تھا تو ایک منڈاہر نے اس کے چہرہ پر آکر تلوار ماری اور ایسا سخت زخمی کیا کہ جلال الدین ایک سال تک بیمار رہا اور زخم کا نشان آخر عمر تک نہ گیا۔ جب جلال الدین بادشاہ ہوا تو یہ منڈاہر بھی مولانا جلال الدین کی طرح گلے میں رسّی ڈال کر حاضر ہوا۔ سلطان نے اس کو دیکھ کر کہا کہ "میں نے اس منڈاہر جیسا کوئی مرد نہیں دیکھا" اور علاوہ خلعت وغیرہ کے ایک لاکھ جیتل کا وظیفہ مقرر کیا۔

سلطان جلال الدین نے چونکہ مغلوں کے مقابلہ میں متعدد بار جنگ کی اور کامیابی بھی حاصل کی اس لئے اس کے ذہن میں آیا کہ اُسے مجاہد فی سبیل اللہ کہا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا۔ اس لئے اُس نے اپنی بیوی ملکۂ جہاں سے کہا کہ:۔ "جب قضاۃ و علماء اس کے پاس آئیں تو وہ اپنی طرف سے اس کی تحریک کرے۔" چنانچہ ملکۂ جہاں نے ان لوگوں سے تحریک کی اور سبھی نے بالاتفاق تسلیم کیا کہ سلطان کو مجاہد فی سبیل اللہ کہنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے اور جلال الدین کے حضور میں جاکر درخواست پیش کی کہ "آیندہ سے خطبہ میں سلطان کو مجاہد فی سبیل اللہ کے لقب سے یاد کرنے کی اجازت دیجائے" سلطان جلال الدین یہ سن کر کانپ گیا اور آبدیدہ ہوکر کہا کہ "میں نے ملکۂ جہاں کو اس پر آمادہ کیا تھا کہ وہ آپ لوگوں سے اسکی تحریک کرے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری یہ تمام نبرد آزمائیاں محض دنیاوی غرض اور ہوس جاہ کی بنا پر تھیں اور جہاد مقصود نہ تھا اس لئے میں اس کا اہل نہیں ہوں اور ہرگز اس لقب کو اختیار نہیں کرسکتا۔"[1]

جب سلطان جلال الدین نے ۶۸۹ھ میں جھائین[2] اور مالوہ فتح کر کے قلعۂ رنتھنبور کا محاصرہ کیا اور تمام مناجیق وغیرہ نصب کرادیں تو اس کو صرف اس وجہ سے انجام تک نہ پہونچا سکا کہ اس میں زیادہ خونریزی ہوتی اور یہ اُسے پسند نہ تھا۔[3]

سلطان علاؤالدین خلجی

۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ء = ۷۱۵ھ / جنوری ۱۳۱۶ء

یہ بالکل صحیح ہے کہ علاء الدین جاہل و ناشائستہ تھا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ بے انتہا

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ۱۴۵ - طبقات اکبری صفحہ ۱۰ - فرشتہ صفحہ ۹۲ — [2] فرشتہ نے اس کو جھاین لکھا ہے - طبقات اکبری میں جہاآن درج ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد اوجین ہے لیکن یہ غلط ہے کیونکہ علاء الدین خلجی کے عہد میں جہاں اس مقام کا ذکر آیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام رنتھنبور کے قریب تھا اور اسی کو شہر نو یا نوشہر بھی کہتے تھے — [3] فرشتہ صفحہ ۹۴ - طبقات اکبری ۹۲ - تاریخ فیروز شاہی ۱۴۶-۱۴۷۔

بیدار مغز اور مستقل ارادہ کا شخص تھا۔ اس نے بیس سال تک حکومت کی اور اس زمانہ میں سلطنتِ دہلی کے حدود دکن تک وسیع ہوگئے۔ بڑے بڑے راجاؤں نے سرِ اطاعت خم کر دیا۔ دولت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سیکڑوں نئی نئی عمارتیں قایم ہوگئیں۔ علماء و فضلاء سرزمین دہلی کے ذرہ ذرہ سے پیدا ہونے لگے۔ خانقاہیں آباد ہوگئیں۔ مساجد کی رونق بڑھ گئی، مدارس میں درس و تدریس کا مشغلہ عام ہوگیا۔ بڑے بڑے صاحبانِ دل و اربابِ ذوق رونما ہوگئے۔ دربار اساتذۂ فن کا مرکز بن گیا۔ ارزانی حیرتناک طریقہ تک بڑھ گئی۔ اور سلطنت ایسی نظر آنے لگی جیسے کسی مشینری میں کوئی نہایت قوی اور بالکل نیا انجن کام کر رہا ہو۔ الغرض یہ تھا نظامِ حکومت اس مسلمان بادشاہ کے عہد کا جس کا شمار حد درجہ کے ظالم لوگوں میں کیا جاتا ہے۔

یقیناً وہ فضولی کی حد تک فیاض و سخی نہ تھا لیکن ایسی متعدد مثالیں ملیں گی کہ مناسب وقت پر اُس نے کمال بیدردی سے دولت صرف کر دی اور مصلحت کے مقابلہ میں کبھی طمع کو ترجیح نہیں دی۔

جب علاء الدین کڑہ سے دہلی کی طرف تخت نشین ہونے کے لئے چلا تو اس نے حکم دیا کہ نہایت آزادی کے ساتھ روپیہ تقسیم کیا جائے اس سے مقصود یہ تھا کہ دہلی پہونچتے پہونچتے ایک بڑی جماعت متبعین کی اس کے ساتھ شریک ہو جائے چونکہ جلال الدین کے قتل سے لوگوں میں برہمی پیدا ہوگئی تھی اور یہ بھی خیال تھا کہ شاید دہلی میں جنگ کرنی پڑے اس لئے اس نے اس ذریعہ سے لوگوں کو مالوف کرنا چاہا اور ایک بڑی جماعت اپنے ساتھ کر لی، ضیا برنی لکھتا ہے کہ:-

> "ہر منزل پر پانچ من زریں ستارے (اختر زر) ایک سبک سی منجنیق میں رکھ کر لٹائے جاتے تھے اور ہزاروں آدمی اُن کے لوٹنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے"

سلطان علاؤالدین، باوجود ایک جابر و خود سر بادشاہ ہونے کے، ہمیشہ تمام اُمور میں اپنے امراء سے مشورہ طلب کرتا تھا اور ایک صائب رائے کے مقابلہ میں اپنے بڑے سے بڑے ارادہ کو ترک کر دیتا تھا۔

جب وہ نشہ کی حالت میں کسی مسئلہ پر گفتگو کرتا تو اس کے امراء و ندیم خوف کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکتے۔ ایکدن علاء الملک کوتوال کے سامنے بھی یہی ذکر ہوا اس نے حد درجہ جرأت سے کام لیکر علاء الدین کو سمجھایا کہ منصبِ نبوت خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے اور چونکہ اب سلسلۂ نبوت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا ہے اس لئے یہ خیال قایم کرنا سخت نادانی اور خلافِ انصاف ہے۔ رہا سکندر کی طرح عزم جہاں کشائی کرنا، سو اس کے لئے دیکھ لیجئے کہ آپ کے پاس کوئی وزیر ارسطاطالیس کی طرح ہے جو

ملہ علاء الدین، سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں کڑہ مانک پور کا حاکم تھا ۱۲۹۴ء یعنی ۶۹۴ھ میں تخت نشین ہونے کے سال ڈیڑھ سال قبل اسنے مالوہ اور بندیلکھنڈ کی شورشوں کو دفع کر کے کوہستان وندھیا کے دشوار گزار دروں کو طے کیا اور صرف ۸۰۰۰ آدمیوں کی جمعیت سے دیوگر پہونچا جو مرہٹہ راج کا پایۂ تخت تھا اور اس کو فتح کر کے دکن کی طرف بڑھ کر ایلچپور پر قبضہ کیا یہ مسلمانوں کا پہلا قدم تھا جو دکن کی طرف بڑھا ان فتوحات سے علاؤالدین نے بے شمار دولت حاصل کر لی تھی جسے وہ اب اپنے قیامِ سلطنت کے لئے بیدریغ صرف کر رہا تھا۔

آپ کی غیبت میں انتظام سلطنت کو درہم و برہم نہ ہونے دے"۔ یہ سن کر علاؤالدین نے کہا کہ پھر اب میں کیا کروں یہ تمام خزائن و دفائن کس کام میں لائے جائیں۔ علاؤالملک نے کہا کہ ابھی تو ہندوستان کا سارا جنوبی حصہ تسخیر کے لئے پڑا ہوا ہے، رنتھنبور، چندیری، چتوڑ، مالوہ، دھار، اجین فتح کیجئے، علاوہ اس کے حدود کابل کا مستحکم کرنا ضروری ہے تاکہ مغلوں کی طرف سے اطمینان کلی حاصل ہو جائے۔

سلطان علاؤالدین نے یہ سنکر اپنے خیال سے توبہ کی اور اسی وقت علاء الملک کو دس ہزار تنکہ دو آراستہ گھوڑے نہایت قیمتی زرین خلعت۔ طلائی کمر بند جو وزن میں نصف من تھا، اور دو گاؤں انعام میں دئے۔[1]

سلطان علاؤالدین راست پسندی کے ساتھ اصول سیاست سے بھی کماحقہ واقف تھا اور نظم و نسق قائم رکھنے کے لئے وہ اپنے تمام ذرائع صرف کر دیا کرتا تھا۔ جب وہ قلعہ رنتھنبور کی تسخیر کے لئے آمادہ ہوا اور وہاں توقع سے زیادہ اسکو دیر لگی تو دہلی میں مسلسل تین چار سازشیں اس کے خلاف ہوئیں۔ سب سے پہلے سلیمان شاہ اکت خاں (برادر زادہ علاؤالدین) نے سازش کی اور اپنے نزدیک سلطان علاؤالدین کو ہلاک کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اس کے بعد عمر خاں اور منگو خاں (علاؤالدین کے ہمشیر زادگان) نے سلطان کی غیبت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر علم بغاوت بلند کیا، لیکن یہ بھی گرفتار ہو کر اپنی سزا کو پہونچے۔ پھر آخر میں حاجی نامی ایک شخص نے زیادہ سنگین بغاوت کی۔ یہ امیر الامراء فخر الدین کوتوال سابق کا غلام تھا اس نے دہلی کو خالی پاکر ہنگامہ مچا دیا، جو مشکل سے فرو ہو سکا۔ گجرات کے نو مسلموں کی بغاوت اس سے قبل ظاہر ہو چکی تھی۔ الغرض سلطان علاؤالدین متردد ہوا اور بغاوتوں کے اس سلسلہ کو ختم کر دینے کے لئے اس نے امراء کو جمع کر کے مشورہ طلب کیا۔ ان میں بعض نے کہا کہ بدامنی کے چار اسباب ہوا کرتے ہیں:

۱۔ خلق کے نیک و بد سے بادشاہ کا لاعلم رہنا۔

۲۔ شراب کا علانیہ استعمال کیونکہ نشہ کی حالت میں لوگ مافی الضمیر کو آزادی کے ساتھ ظاہر کر دیتے ہیں اور اس طرح باہم دگر فتنہ و فساد پر لوگوں میں اتفاق ہو جاتا ہے۔

۳۔ امراء و اعیان کا ایک دوسرے سے تعلق رشتہ داری اور خلوص و محبت کا بڑھ جانا کہ ایک پر اگر آفت آتی ہے تو سب اسکی مدد کرتے ہیں۔

۴۔ زر و مال کی کثرت کہ جب بعض آدمی دولت مند ہو جاتے ہیں تو ہمیشہ ان میں خیالات فاسد ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔

علاؤالدین یہ سنکر متنبہ ہوا اور سب سے پہلے اس نے اپنی بیخبری دور کرنے کے لئے تمام ملک میں جاسوس مقرر کئے اور خبر رسانی کا ایک ایسا مکمل انتظام کیا کہ امراء وغیرہ جو باتیں رات کو اپنے گھر کے اندر کرتے تھے وہ صبح کے وقت بادشاہ کو معلوم

---

[1] فیروز شاہی (الیٹ) ۳ - ۱۸۰ - ۱۸۱ -

ہوجاتی تھیں اور جب امیر آتا تو بادشاہ ایک پرچہ لکھ کر اس کو دکھا دیتا کہ رات کو تم نے یہ یہ باتیں کی ہیں۔ رفتہ رفتہ لوگ اس قدر خائف ہوگئے کہ خلوت و جلوت میں گفتگو کرنا دشوار ہوگیا اور سازش و سرگوشی کا بالکل سدباب ہوگیا۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنے ملک کے تمام راستوں کو اس قدر محفوظ کر دیا کہ تمام قافلے آزادی کے ساتھ سفر کرتے تھے اور رات کو اپنا اسباب بغیر کسی حفاظت کے یونہی کھلا چھوڑ دیتے تھے، پھر یہ انتظام صرف دہلی ہی کے قرب و جوار میں نہ تھا بلکہ کابل و کشمیر سے لیکر بنگال تک، سندھ و گجرات سے لیکر تلنگانہ و معبر تک ہر جگہ راستوں کے پُرامن ہونے کی یہی کیفیت تھی اور رہزنی و قزاقی بالکل مفقود ہوگئی تھی اگر کوئی سیاح یا مسافر گاؤں میں پہونچتا تو مقدم اور اُس گاؤں کے لوگ، اس کو عزت کے ساتھ ٹھیراتے اور کھانے پینے کا بندوبست کرتے۔

دوسرا انتظام شراب خواری کا تھا۔ ہرچند یہ ذرا مشکل کام تھا کیونکہ علاؤالدین خود اس کا عادی تھا لیکن اس نے اپنی طبیعت پر سخت جبر کیا اور سب سے پہلے اپنے آبدارخانہ کو درہم و برہم کیا۔ جس قدر چینی کے برتن تھے ان کو تڑوا دیا اور طلائی و نقرئی ظروف کو گلوا کر دارالضرب میں بھیجدیا اور تمام ملک میں اعلان کر دیا کہ بادشاہ نے شراب سے توبہ کرلی ہے اس لئے اب اگر کوئی شراب بنائے گا یا پیئے گا تو قتل کر دیا جائے گا۔

مورخین کا بیان ہے کہ اس فرمان کے بعد اس قدر شراب کے قرابے لوگوں نے اپنے گھروں سے نکال نکال کر لنڈھائے کہ تمام راستوں میں کیچڑ ہوگئی۔ الغرض جب وہ اس انتظام سے بھی فارغ ہوا۔ تو امراء و اعیان کے لئے ایک فرمان جاری کیا کہ آیندہ سے بلا حکم سلطانی آپس میں نہ کوئی رشتہ قایم کریں نہ ایک دوسرے کی دعوت کریں۔ اس سے تمام امراء کا ایکدوسرے سے ملنا جلنا اور آپس میں تعلقات رشتہ داری پیدا کرنا مسدود ہوگیا۔

چوتھے سبب کا اس نے یہ انتظام کیا کہ سوائے مخصوص امراء و اعیان کے اور لوگوں کے پاس جتنے گاؤں، وقف، انعام، جاگیر یا منصب کی صورت میں پائے جاتے تھے، سب کو ضبط کر کے خالصہ کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب پر معاش تنگ ہوگئی اور فتنہ و فساد کا خیال دور ہوگیا۔

اس انتظام سے فارغ ہونے کے بعد وہ دیہات کی طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت تک انتظام کی صورت یہ تھی کہ مقدم اور چودھری سے وصولی مالگذاری کا معاملہ ہوا کرتا تھا اور یہ لوگ رعایا کو سخت تباہ کر رہے تھے چنانچہ سلطان نے پیمایشِ زمین کے مطابق مالگزاری فی بسوہ مقرر کی اور حکم دیا کہ نصف پیداوار بلا کسی استثناء و کمی کے سب سے وصول کرلی جائے۔ علاوہ اس کے مقدموں سے جو وصول ہو وہ خزانہ میں داخل کیا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص خواہ مقدم ہو یا معمولی کاشتکار۔ چار بیل، دو بھینس، دو گائے اور بارہ بکریوں یا بھیڑوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتا۔ پھر چرائی بھی مقرر کی اور آباد گھروں کا کرایہ بھی معین کیا۔ اگر کوئی محرر یا عامل بد دیانتی کرتا یا ان احکام کی پوری پابندی نہ کرتا تو اسکو سخت سزا دیجاتی اور اگر سوائے چارہ کے وہ کوئی اور چیز گاؤں سے حاصل کرتا تو پٹواری کے کاغذات سے دیکھ کر اس کی قیمت وصول کرلی جاتی۔

اس سختی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خایت عمالی و محرر ملازمت سے بیزار ہو کر یاں ترک کرنے لگے اور تمام مقدم و چودھری جو معزز و امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے بالکل محتاج ہو گئے اور ان کی عورتیں محنت و مزدوری کرنے لگیں۔

جب علاؤالدین سنہ ۷۰۳ھ میں قلعہ چتور کے محاصرہ میں مصروف تھا تو ماوراءالنہر میں یہ خبر پہونچی کہ میدان خالی ہے اور مغل فوجیں دہلی کی طرف بڑھنے لگیں۔ علاؤالدین قلعۂ چتور فتح کرنے کے بعد مجبوراً پھر دہلی واپس آیا لیکن چونکہ شاہی افواج کا ایک بڑا حصہ ورنگل کی طرف فتوحات میں مصروف تھا اس لئے یہ بہت متردد ہوا کہ کیا کرے۔ تاہم اس نے حصار بندی اور خندقوں سے دہلی کو محفوظ کیا اور اپنی افواج منتشر کو فراہم کرنا چاہا اتفاق سے دو ماہ محاصرہ کرنے کے بعد مغلوں میں از خود خوف و ہراس پیدا ہو گیا اور وہ واپس چلے گئے۔ اس کے بعد علاؤالدین نے حصار دہلی کو از سر نو تعمیر کرایا۔ قصر ہزار ستون اور دوسری عمارات طیار کیں لیکن صرف حصار و عمارات بیکار تھیں اس لئے اس نے یہ بھی چاہا کہ عساکر سلطانی کی مقدار و تعداد زیادہ کر دی جائے یہ اسوقت ممکن تھا جب تنخواہیں کم کر دی جائیں ورنہ یوں تو موجودہ خزانہ صرف ۶ سال کے مصارف کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ امراء سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ لشکریوں کی تنخواہ اس وقت کم ہو سکتی ہے جب تمام اشیاء ارزاں ہو جائیں چنانچہ اس کے لئے علاؤالدین نے چند قواعد مقرر کئے اس کا اثر یہ ہوا کہ غلہ کپڑا وغیرہ بہت ارزاں ہو گیا اور باوجود اس کے کہ پھر قحط بھی رونما ہوا لیکن ارزانی بدستور باقی رہی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قواعد سلطان علاؤالدین کی خصوصیات حکومت میں داخل ہیں جس کی طرف اس سے قبل کسی کو توجہ نہیں ہوئی اور نہ اس قدر ارزانی اس سے پہلے کبھی دیکھی گئی۔ پھر لطف یہ کہ ارزانی عارضی نہ تھی بلکہ علاؤالدین کے بقیہ ایام حکمرانی تک بدستور باقی رہی۔ اور اس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا۔ وہ ضوابط و قواعد مجملاً یہاں بیان کئے جاتے ہیں۔

۱- اہل بازار کو نرخ مقرر کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ صرف بادشاہ نرخ مقرر کرے گا، چنانچہ تمام مملکت میں حسب تفصیل ذیل نرخ مقرر کیا گیا:-

ایک من گیہوں	۷ ½	جیتل	ایک سیر شکر تری	۱ ½	جیتل [1]
" جو	۴	"	" شکر سرخ (گڑ)	⅓	"
" چاول	۵	"	۲ ½ سیر گھی، مکھن	۱	"
" ماش	۵	"	۳ سیر روغن کنجد	۱	"
" چنا	۵	"	۲ ½ من نمک	۵	"
" موٹھ	۳	"			

[1] عہد علائی کا من موجودہ وزن کے لحاظ سے ۱۲ ½ سیر کا تھا۔ ایک سیر موجودہ ۶ چھٹانک کے برابر اور ایک جیتل تقریباً دو پیسہ یا ایک دھیلے کی قیمت کا۔ اس لئے اگر حساب لگایا جائے، تو معلوم ہو سکتا ہے کہ موجودہ ارزانی اور سکوں کے لحاظ سے عہد علائی میں ایک من (یعنی موجودہ ٣١ سیر) گیہوں کی قیمت ۱۲ ۱۱ (سکۂ انگریزی) تھی۔

۲۔ ملک قبول الغ خاں (جو انتظامی معاملات میں نہایت صحیح فراست رکھتا تھا) منڈی کا داروغہ یا شحنہ مقرر کیا گیا جس کا کام صرف یہ تھا کہ مقررہ نرخ میں کوئی تفاوت نہ ہونے دے۔

۳۔ دوآب کے تمام خالصہ دیہات کی مالگذاری غلّہ کی صورت میں وصول کی جائے اور سلطنت کی طرف سے غلّہ کے انبار محفوظ رہیں اگر بازار کا غلّہ کم ہو جائے تو شاہی غلّہ کو بازار کے نرخ سے فروخت کریں۔

۴۔ سلطنت کے تمام سفری غلّہ فروشوں (بنجاروں) کو طلب کر کے ساحل جمن پر آباد کیا جائے اور اُن سے معاہدہ لیا جائے کہ باہر سے غلّہ منگا کر شہر میں مقررہ نرخ سے فروخت کریں گے۔

۵۔ غلّہ جمع کرنے کی سخت ممانعت کر دی گئی۔ اگر کوئی شخص غلّہ جمع کرتا تو بحق سلطنت قرق کر لیا جاتا اور سخت تنبیہ کی جاتی، ولایت دوآبہ کے افسران مال سے اقرار نامہ لیا گیا کہ کوئی شخص اُن کے علاقہ میں غلّہ جمع نہ کرے۔

۶۔ افسران مال (ریونیو) سے اقرار نامہ لیا گیا کہ وہ کھیتوں ہی پر بنجاروں سے قیمت دلا کر غلّہ دیدیں اور سوائے اپنے ضروری خرچ کے غلّہ کا ایک دانہ بھی کوئی کاشتکار گھر نہ لیجائے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ بنجاروں کو غلّہ آسانی سے ملنے لگا اور بازار میں افراط ہو گئی۔

۷۔ منڈی کے حالات معلوم کرنے کے لئے اس نے تین عہدہ دار مقرر کئے ایک شحنۂ منڈی، دوسرے بریدِ منڈی، تیسرے جاسوس منڈی۔ ان میں سے ہر ایک علٰحدہ علٰحدہ بازار کے حال اور منڈی کے نرخ سے روزانہ بادشاہ کو اطلاع دیتا۔ اگر ان اطلاعوں میں ذرا بھی تفاوت ہوتا تو شحنہ سے سخت باز پرس کی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کوئی شخص مقررہ قواعد سے انحراف کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا اور تمام بازار کا بازار ایک مشین کی طرح چل رہا تھا اور حیرت یہ ہے کہ امساکِ باراں کے زمانہ میں بھی غلّہ کے نرخ میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار قحط کے زمانہ میں شحنہ نے صرف نصف جیتل (ایک پیسہ) فی من نرخ بڑھا دینے کی درخواست کی تو سلطان نے ۲۰ چوب اس کے ماریں۔

کوئی شخص ایک وقت میں روزانہ خرچ کے علاوہ نصف من سے زیادہ نہیں خرید سکتا تھا۔ اگر قحط کی وجہ سے مساکین کا ہجوم زیادہ ہو جاتا اور ان کا کوئی معقول انتظام نہ ہوتا تو شحنہ کو سخت سزا دیجاتی۔ شہر کا ہر محلہ ایک بنجارے کے سپرد تھا اور اس کا فرض تھا کہ وہ اس محلہ کے لوگوں کو روزانہ غلّہ مہیا کرے۔

۸۔ اسی طرح کپڑے کا نرخ مقرر کیا گیا۔ اعلیٰ درجہ کا سوتی کپڑا بیس گز فی تنکہ[1] (نقرہ) اوسط درجہ کا سوتی کپڑا تیس گز فی تنکہ (نقرہ) فروخت کرنے کا حکم دیا گیا اور اسی مناسبت سے اور تمام قسم کے کپڑوں کی قیمت متعین کی گئی۔ اس کے علاوہ اس نے

---

[1] فرشتہ نے لکھا ہے کہ تنکہ نقرئی ہو یا طلائی ایک تولہ چاندی یا سونے کا ہوتا تھا ہر نقرئی تنکہ کی قیمت تبادلہ پچاس جیتل (تانبہ کا پیسہ) ہوتی تھی۔ جیتل کا وزن البتہ مشتبہ ہے بعض کہتے ہیں ایک تولہ تانبہ کا ہوتا تھا، بعض پونے دو تولہ کا بتاتے ہیں۔

ایک مکان سرائے عدل کے نام سے تعمیر کرایا اور حکم دیا کہ یہاں صبح سے پیشتر نماز پیشین تک دکانیں کھلی رہیں۔

۹- سوداگران شہر واطراف کے نام دفتر میں درج کئے گئے اور ان سے اقرار نامہ لیا گیا کہ اس قدر کپڑا اور اس قسم کا ہر سال لاکر سرائے عدل میں مقررہ نرخ پر فروخت کیا کریں۔

۱۰- ملتانیوں (ملتان کے رہنے والے سوداگروں کو) بیس لاکھ تنکہ (نقرہ) خزانہ شاہی سے دیا گیا کہ اطراف ممالک سے کپڑا خرید کر کے لائیں اور نرخ مقررہ سے بازار میں فروخت کریں۔

۱۱- امراء وغیرہ میں سے جس کو نفیس اور قیمتی کپڑوں کی ضرورت ہو پہلے رئیس بازار کا پروانہ حاصل کرے۔ یہ قید اسلئے لگائی تھی کہ سوداگر یہاں سے نرخ سلطانی پر ارزاں کپڑا خرید کر کے باہر گراں قیمت پر فروخت نہ کرسکیں۔

۱۲- گھوڑوں کی قیمت ۱۲۰ تنکہ (نقرہ) سے بارہ تنکہ (نقرہ) تک مقرر کی گئی اور حکم دیا گیا کہ صرف بازار ہی میں نرخ مقررہ کے مطابق گھوڑوں کی خرید و فروخت ہو۔

۱۳- لونڈی، غلاموں کی قیمت ۲۰۰۰ تنکہ (نقرہ) سے ۵ تنکہ نقرہ تک مقرر کی گئی۔

الغرض اس نے گائے، بھینس، بکری اور بازار کی تمام چیزوں یعنی ٹوپی سے موزہ تک، شانہ سے سوزن تک، نیشکر سے سبزی تک، ہریسہ سے شوربہ تک، حلوائے صابونی سے ریوڑی تک، بریانی سے روٹی تک، پان، پھول سے ساگ پات تک، الغرض تمام ضروری اشیاء حتے کہ ایک ندیم خاص کے کہنے پر شاہدان بازاری تک کا نرخ مقرر کردیا۔ چنانچہ فرشتہ نے لکھا ہے کہ:-

"عہد علائی میں مصری بحساب فی سیر[1] دو جیتل۔ شکر تری فی سیر ایک جیتل۔ شکر سرخ فی سیر نصف جیتل۔ نمک ۵ سیر فی جیتل فروخت ہوتا تھا۔"

۱۴- بادشاہ صرف شحنہ وغیرہ کی اطلاع پر کفایت نہ کرتا بلکہ کمسن لڑکوں کو جنہیں کوئی وقوف نہ ہوتا دام دے کر بازار بھیجتا اور پھر ان چیزوں کو وزن کراتا۔ اگر وزن یا قیمت میں خلاف قاعدہ کوئی فرق ہوتا تو سخت سزا دی جاتی اور کمترین سزا یہ تھی کہ ناک کان کاٹ لئے جاتے یا جس قدر کم اس نے دیا ہے اتنا ہی گوشت اس کی ران یا کولھے سے کاٹ کر اس کے سامنے ڈال دیا جاتا۔

الغرض علاؤالدین نے مستحکم اور عجیب و غریب انتظام بازار کا کیا کہ اس کی حالت میں پھر کوئی تغیر نہیں ہوا اور کبھی کسی نے قانون مقررہ کی خلاف ورزی نہیں کی۔

۱۵- جب علاؤالدین بازار کا سارا انتظام کرچکا تو اس نے سپاہیوں کی تنخواہیں حسب ذیل مقرر کیں:-

سپاہی درجہ اول - دو سو چونتیس تنکہ (تقریباً ۱۴ پونڈ طلائی موجودہ انگریزی سکہ کے مطابق) ماہوار۔

سپاہی درجہ دوم - ۱۵۶ تنکہ ماہوار ---- سپاہی درجہ سوم - ۷۸ تنکہ ماہوار۔

---

[1] حسب بیان فرشتہ اس وقت سیر، وزن میں ۲۴ تولہ کا ہوتا تھا

جس کے پاس دو گھوڑے ہوتے اس کو ۷۸ تنکہ اور زیادہ ملتا۔

۱۶- عارضِ ممالک (جسے موجودہ اصطلاح انگریزی میں Master Cavalier کہہ سکتے ہیں) تمام سپاہ کا معائنہ کرتا اور جو فنِ تیراندازی و شمشیرزنی وغیرہ کا ماہر ثابت ہوتا اسے گھوڑے کی قیمت دیدی جاتی اور گھوڑا داغ دیا جاتا۔

جب علاؤالدین ان تمام انتظامات سے فارغ ہوگیا اور اس نے فوج کا جایزہ لیا تو معلوم ہوا کہ صرف سواروں کی تعداد چار لاکھ بہتّر ہزار ہے۔

اسی عسکری انتظام کا نتیجہ تھا کہ اس کے بعد جب مغلوں نے عہد علائی میں ہندوستان کا قصد کیا تو ہمیشہ ان کو شکست ہوئی اور نہایت کثیر تعداد میں مقتول و مقید ہوئے۔

علاؤالدین پہلے بالکل ناخواندہ شخص تھا اور بعد کو اس نے صرف معمولی نوشت و خواند سیکھ لی تھی۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ جتنے ماہرانِ فن، بزرگانِ دین، علمار کرام، شعراء عظام اس کے زمانہ میں ہوئے ہیں کسی عہد کو نصیب نہیں ہوئے۔

حضرت شیخ الاسلام شیخ نظام الدین اولیا، شیخ علاؤالدین صابر نبیرہ شیخ فریدالدین گنج شکر، قطب لاولیا، شیخ رکن الدین بن صدرالدین عارف ملتانی- اسی عہد کے بزرگوں میں سے تھے۔

علاوہ ان حضرات کے شیخ صدرالدین جو بے مثل فیاض تھے تاج الدین ولد صدرالدین جو اپنی جود و سخاوت علم و حلم کے لحاظ سے بہت مشہور تھے۔ سید مغیث الدین و سید نجیب الدین، قاضی جلال الدین، قاضی صدرالدین، مولانا ضیاءالدین بیانوی حمیدالدین ملتانی جو اپنے کمالات ظاہری و باطنی میں مخصوص درجہ رکھتے تھے اسی بادشاہ کے دربار سے متعلق تھے۔

علمار ظاہری میں اس وقت ۴۶ صرف وہ لوگ تھے جو درس و تدریس کے مشغلہ میں مصروف تھے۔ فنِ قرأت کے جاننے والوں میں مولانا شاطی، مولانا علاؤالدین، خواجہ زکی خواہرزادہ شیخ حسن بصری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اہلِ وعظ میں سے مولانا حسام الدین، مولوی جلال الدین، مولانا شہاب الدین جلیل، مولانا کریم وہ نفوس تھے جنھیں نوادر روزگار میں جگہ دیجاتی ہے۔

طبقۂ شعرار میں صدرالدین عالی، فخرالدین، حمیدالدین، مولانا عارف، عبدالحکیم، شہاب الدین جن میں سے ہر ایک شیوہ شاعری میں ایک خاص طرز کا مالک تھا اور ان سب کے سرتاج حضرۃ امیر خسرو جو جامع کمالات ظاہری و باطنی ہونے کی حیثیت سے دنیا میں فرد تسلیم کئے جاتے ہیں اسی دربار کے زلہ ربا تھے۔

اطبار میں صدرالدین، جوینی طبیب، علیم الدین اور مولانا بدرالدین دمشقی خاص لوگ تھے۔ مولانا بدرالدین کی مسیحائی و حذاقت کا یہ عالم تھا کہ اسوقت تک کوئی دوسرا طبیب اس ذہانت و فراست کا پیدا نہیں ہوسکا ان کی نسبت مشہور ہے کہ اگر چند جانوروں کا قارورہ ایک جگہ ملا دیا جاتا تو یہ بتا دیتے کہ فلاں فلاں جانوروں کا بول اس میں شامل ہے۔

علاوہ ان کے دیگر فنون کے ماہرین، جن میں منشی مقرب، اہلِ نجوم وغیرہ شامل تھے کثرت سے پائے جاتے تھے اور انکا شمار مشکل تھا

علاؤ الدین کے عہد میں اس قدر مسجدیں، خانقاہیں، حوض، مینار اور حصار طیار ہوئے کہ کسی اور بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ:- علاؤ الدین کے شاگرد پیشہ کی تعداد ۷۰ ہزار تھی جن میں سات ہزار صرف معمار و گلکار تھے جو بڑی سی بڑی عمارت کو چند ہفتوں میں طیار کر دیتے تھے۔ تمام سلطنت میں سڑکیں کثرت سے بن گئی تھیں اور نہایت عمدہ حالت میں تھیں۔

جب سلطان قطب الدین مبارک شاہ (علاؤ الدین کے بیٹے اور جانشین) نے دہلی سے دولت آباد تک کا سفر کیا ہے تو اسوقت کا حال ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ "دہلی سے دولت آباد (دیوگڑھ) تک چالیس دن کا سفر تھا اور ان دونوں شہروں کے درمیان جو سڑک تھی اس کے دونوں جانب بید وغیرہ کے درخت لگے ہوئے تھے ایک مسافر ایسا محسوس کرتا تھا کہ گویا وہ کسی باغ کی روش پر چل رہا ہے۔ ہر میل پر ڈاک کی چوکی تھی اور راستہ میں ہر جگہ اس کو تمام ضرورت کی چیزیں اسقدر فراوانی سے دستیاب ہوتی تھیں گویا بازار لگا ہوا ہے۔

یہاں سے اور سڑکیں ۶ مہینہ کی راہ کی معبر اور تلنگانہ تک بنی ہوئی تھیں۔ ہر منزل پر بادشاہ اور دیگر مسافروں کے قیام کے لئے مکانات بنے ہوئے تھے۔ مفلس مسافروں کو زاد راہ کی مطلق فکر نہیں ہوتی تھی اور ان کو تمام چیزیں مفت ملتی تھیں۔

سب سے پہلے جو شخص ہاتھی پر عماری رکھ کر سوار ہوا۔ علاؤ الدین خلجی تھا۔ چنانچہ امیر خسرو فرماتے ہیں:-

کسے در شاہی وانگہ سواری
جز او ننہاد بر فیلاں عماری

سلطان علاؤ الدین اپنے عزم و جبروت، اپنی سطوت و سیاست کے لحاظ سے تاریخ ہندوستان کا عجیب و غریب بادشاہ ہوا ہے، اس کے عہد کی چند خصوصیات کو ضیاء برنی نے ایک جگہ حسب ذیل جمع کیا ہے:-

۱- غلّہ - کپڑا اور دیگر اشیاء کی ارزانی
۲- مسلسل فتوحات اور دولت کا بیشمار انبار
۳- بڑی فوج کا قیام قلیل خرچ سے
۴- باغیوں کی سرکوبی اور تمام راجاؤں اور ماتحت فرمانرواؤں کا اطاعت شعار رہنا
۵- مغلوں کی تباہی
۶- ملک کے تمام راستوں کی حفاظت
۷- بازاری لوگوں کا ایماندار ہو جانا
۸- مسجدوں، میناروں، قلعوں، تالابوں وغیرہ کا کثرت سے تعمیر کیا جانا

غیاث الدین تغلق

۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء — ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء

غیاث الدین تغلق نے عہد علائی کے تمام معزول و تباہ شدہ امراء کو طلب کرکے، اُن کے مواجب و انعامات بحال کئے، خاندان علائی کے بقیۃ السیف افراد کی حد درجہ عزت کی اور خواتین خلجیہ کا احترام کرنے میں اس نے اپنی ساری کوشش صرف کردی۔ الغرض ملک کا نظام حکومت جو بہت ابتر ہوگیا تھا اس کو ایک ہفتہ کے اندر اصلی حالت پر لے آیا۔ مستحقین کے حقوق ادا کئے اور ظالموں کی دار و گیر شروع کی۔

وہ حد درجہ معتدل مزاج تھا اور افراط و تفریط سے ہٹکر ایک مناسب رائے تمام اُمور میں قایم کیا کرتا تھا۔ کام کرنے والے لوگوں کی اس نے قدر کی اور ناکارہ لوگوں کو اپنے دیار سے خارج کردیا۔

اس نے خراج کے اُصول از سرِ نو منضبط کئے اور پیداوار کے دسویں یا گیارھویں حصہ سے زیادہ محصول لینے کی سخت ممانعت کردی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ ہر سال رقبۂ زراعت بڑھتا جائے اور مقدم و چودھری کاشتکاران پر جبر نہ کرسکیں جن امراء و ملوک کے پاس جاگیریں تھیں ان کی انتظامی حالت کی بھی نگرانی کرتا اور جبر و تعدی پر سخت باز پرس کرتا۔ خسرو خاں نے جن لوگوں کو خزانۂ شاہی سے بیجا انعامات دئے تھے وہ سب وصول کرکے خزانہ میں داخل کئے۔

جب کوئی فتح یا کامیابی کی خبر اس کو ملتی، بیٹا پیدا ہوتا، یا شاہزادوں کی شادی وغیرہ ہوتی تو تمام اکابر و علماء کو طلب کرتا اور حسب حیثیت انعامات سے سرفراز کرتا جو مشایخ و صوفیہ خلوت نشین ہوتے اُن کے پاس تحایف و نذرانے وہیں بھیجتا۔ چاہتا تھا کہ مسرت جسے حاصل ہو، اس میں ساری رعایا شریک ہو، چنانچہ وہ سب کو کچھ نہ کچھ دیتا اور اکثر ایسی داد و دہش کے بہانے پیدا کرتا رہتا۔ اس کا مقصود سلطنت یہ تھا کہ سارا ملک فراغت و اطمینان سے زندگی بسر کرے رعایا خوش حال ہوجائے لوگ گدائی چھوڑ دیں اور حلال کی کمائی حاصل کریں۔ اسی خیال کے زیر اثر اس نے مزدوری و اُجرت میں ۱۵ فیصدی اضافہ کردیا۔ کاشتکاروں اور ہندوؤں کی حالت میں جو تمدنی انحطاط عارضی اسباب کی وجہ سے ہوگیا تھا دور ہوگیا اور پھر وہ آزادی کے ساتھ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہوگئے۔

جس سپاہ کو خسرو خاں نے مواجب سے زیادہ روپیہ تقسیم کردیا تھا وہ آہستہ آہستہ اس نے وصول کیا اور فوج کے باب میں جو قواعد علاؤالدین خلجی نے مقرر کئے تھے (حلیہ، امتحان، داغ اور تعین قیمت وغیرہ) وہ سب بدستور جاری رکھے البتہ اس کی احتیاط ضرور کی کہ کوئی افسر یا امیر سپاہیوں کو ذلیل نہ سمجھے اور اُن کے کوڑے نہ مارے۔

مطالبات کے وصول کرنے میں بھی وہ بہت نرمی سے کام لیتا لاکھوں کے مطالبہ میں اگر ہزاروں بھی وصول ہو جاتے تو غنیمت سمجھتا اور حد درجہ نرمی و آشتی سے کام لیکر معاملات کو طے کرتا۔ وہ نہ معمولی باتوں پر کسی کو حد سے زیادہ انعام دیتا اور نہ ضرورت سے زیادہ سختی عمل میں لاتا۔ میانہ روی اس کی خصوصیت تھی اور عدل و انصاف اس کی حکومت کا تنہا نصب العین۔

انھیں باتوں کے ساتھ اس نے مغلوں کی طرف سے بھی ہندوستان کو مطمئن کر دیا اور ایسی سخت ناکہ بندی کر دی کہ اسکے عہد میں ان کو حدودِ ہند کی طرف آنے کی جراٴت ہی نہ ہوئی۔

اس نے نہریں کثرت سے کھدوائیں، باغات تعمیر کرائے، ویرانوں کو آباد کیا، بنجر زمین کو تردد سے قابل کاشت کیا اور متعدد عمارات قایم کرادیں۔ حصار تغلق آباد[1] اس بادشاہ کی یادگار ہے۔

غیاث الدین صوم و صلوٰۃ کا بھی پابند تھا وہ ہمیشہ باجماعت نماز ادا کرتا اور تراویح کے ساتھ روزہ رکھتا۔ وہ اکثر باوضو رہتا اور شراب نہ خود پیتا اور نہ کسی کو پینے دیتا۔ کبر و غرور اس میں نام کو نہ تھا۔ مکر و فریب سے وہ بالکل ناآشنا تھا اور سادگی اس کی فطری خصوصیت تھی۔

محمد بن تغلق شاہ

۷۲۵ھ ۱۳۲۵-۲۴ء — ۷۵۲ھ ۱۳۵۱ء

محمد تغلق نہایت شیریں بیان اور فصیح مقرر تھا عربی و فارسی میں فی البدیہ ایسے مراسلات تحریر کرا دیتا تھا کہ بڑے بڑے ماہرین فن متحیر ہو جاتے تھے۔ ذہانت کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص کو دیکھتے ہی اس کے تمام محاسن و معائب سے اس طرح آگاہ ہو جاتا جیسے کہ برسوں کے تجربہ کا نتیجہ ہو۔ علم تاریخ میں وہ مہارت حاصل تھی کہ مشکل سے اس کے سامنے کسی کو گفتگو کی جراٴت ہوتی، حافظہ اس بلا کا تھا کہ جو ایک بار دیکھ یا سُن لیتا پھر وہ نقش کالحجر ہو جاتا۔ حکمت، نجوم، ریاضی و منطق میں تبحر کی یہ کیفیت تھی کہ دقیق ترین مسایلِ علمیہ بات کی بات میں حل کر دیتا۔ فنِ شعر میں بھی اس کی جامعیت مشہور ہے اُسے نہ صرف قدما کے کلام پر عبور حاصل تھا بلکہ خود بھی نہایت پاکیزہ شعر کہتا۔ فنِ طب کا ایسا مجتہدانہ ذوق رکھتا تھا کہ خود مریضوں کا علاج کرتا۔

---

[1] غیاث الدین نے سکونت دہلی ترک کر کے دس بارہ میل کے فاصلہ پر "تغلق آباد" آباد کیا اور یہیں قیام رکھا۔ اب بھی یہاں کی شکستہ عمارتیں سیاحوں کے لئے جاذب نظر ہیں ۱۲

فنِ کتابت میں ایسا ملکہ اُسے حاصل تھا کہ بڑے بڑے خوشنویس اس سے شرماتے تھے۔ مذہب کا حد درجہ احترام کرتا اور فرائض کے علاوہ نوافل و مستحبات بھی کبھی اس سے ترک نہ ہوتے تھے۔ شراب کو اس نے کبھی منھ نہیں لگایا اور دیگر مشاغل لہو و لعب جو امرا و سلاطین کے ساتھ مخصوص ہیں اس نے کبھی اختیار نہیں کئے۔ بخشش و کرم کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کسی درویش کو خزانہ بھی اٹھا کر دیدیتا تو یہی سمجھتا کہ میں نے کچھ نہیں دیا۔ ممکن نہیں تھا کہ کسی بیوہ یا غریب و ضعیف کی فریاد اس تک پہونچ جائے اور وہ اُسے مالا مال نہ کر دے۔ عراق و خراسان، ماوراء النہر و ترکستان، روم و عربستان کے علماء و فضلاء ماہرین فنون اس کے دربار میں کھنچے ہوئے چلے آ رہے تھے اور وہ دونوں ہاتھوں سے زر و جواہر کی بارش ان پر کر رہا تھا۔

تاتار خاں والی سُنار گاؤں کو جب اس نے بہرام خاں کا خطاب دیا تو اس کے ساتھ ایک ہی دن میں سو ہاتھی ہزار گھوڑے اور ایک کرور تنکہ سُرخ (اشرفی) بھی مرحمت فرمایا۔

ملک سنجر بدخشانی کو اسی لاکھ تنکہ۔ ملک عماد الدین کو ستر لاکھ تنکہ اور مولانا ظہیر الدین اپنے اُستاد کو چالیس لاکھ تنکہ ایک دن میں اُٹھا کر دیدیا۔ اسی طرح مولانا ناصر الدین اور ملک غازی کو جو ایک فاضل شاعر تھا سالانہ لاکھوں تنکے انعام میں دیدیتا۔[1]

پھر اس کے ساتھ جرأت و بہادری، علوئے حوصلہ، پختگی عزم، رسوخ تدابیر کو بھی شامل کیجئے اور اس کے بعد غور کیجئے کہ ان صفات کا بادشاہ کیا چیز ہو سکتا ہے اور اس کو کتنا کامیاب ہونا چاہئے۔

دولت آباد اور دہلی کی کیفیت

صاحب مسالک الابصار[2] نے سراج الدین ابو الفتح عمر و (جو اودھ کا رہنے والا اور محمد تغلق کے دربار سے عرصہ تک متعلق رہا تھا) اور شیخ مبارک کی روایت سے مفصل حالات اس عہد کے لکھے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد تغلق کس شوکت و جبروت کا بادشاہ تھا اس کے دربار کا کیا آئین تھا اور اس کے زمانہ میں دہلی اور دیوگیر (دولت آباد) کی رونق کا کیا عالم تھا۔ دولت آباد کا نام اس نے قبۃ الاسلام رکھا تھا اور کثرت سے عمارتیں بنوا کر مخصوص جماعتوں کے قیام کے لئے شہر کو وقف

---

[1] فرشتہ ۱۳۳۔ طبقات اکبری ۹۹ - ۱۰۰ ۔۔۔ [2] "مسالک الابصار فی ممالک الامصار" کا مصنف شہاب الدین ابو العباس احمد دمشقی تھا جو ۷۰۰ھ / ۱۳۰۱ء میں پیدا ہوا اور ۷۴۹ھ / ۱۳۴۸ء میں بمقام دمشق مر گیا۔ مصنف نے اپنے اور اپنے خاندان کے حالات بالکل نہیں لکھے، البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور اس کا خاندان سلاطین مصر سے وابستہ تھا اس کا باپ قاضی محی الدین دمشق میں صیغۂ راز کا سکریٹری تھا۔ جب وہ یہاں سے علحدہ ہو گیا تو اس کے چند دن بعد اسی خدمت پر مصر میں مامور ہو گیا۔ شہاب الدین دونوں جگہ اپنے باپ کا معاون رہا لیکن آخر کار وہ دمشق چلا آیا اور یہیں اپنی عمر گزار دی ۔۔۔ شہاب الدین بڑا فاضل شخص تھا اس نے تمام علوم متداولہ میں تبحر تام حاصل کیا تھا اور بہت سی کتابیں اس نے تصنیف کیں جو آج بالکل مفقود ہیں۔۔۔ مسالک الابصار بیس جلدوں میں تمام کی لیکن اب صرف ۵ جلدیں نظر آتی ہیں اور وہ بھی یورپ کے کتب خانوں میں ہندوستان میں اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔۔۔ شہاب الدین نے عہد محمد تغلق کے حالات نہایت معتبر ذرائع سے فراہم کر کے لکھے ہیں اور تحقیق و جستجو اس کی تمام تصانیف کی خصوصیت بتائی جاتی ہے۔ مصنف نزہت القلوب نے بھی اپنی تصنیف میں شہاب الدین کی تصانیف کا حوالہ دیا ہے۔

کردیا تھا۔ علماء، فقراء، مشائخ، امراء، ملوک، خواتین، فوج، وزراء، تجار، پیشہ ور لوگ، انگریز، نجار، عماد وغیرہ کے لئے الگ الگ محلے مقرر کئے اور وہاں اُن کے لئے مسجدیں، بازار، حمام، بھٹیاں، اور ضرورت کی تمام عمارتیں قایم کرا دیں۔ ہر محلہ گویا ایک مستقل قصبہ تھا اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے دوسرے محلہ کا محتاج نہ تھا۔

دہلی کا یہ حال تھا کہ یہاں چھوٹے بڑے مدارس ایک ہزار کے قریب تھے، اور ستر اسپتال (دار الشفاء) تھے جن میں غرباء کا علاج ہوتا تھا۔ ۲۰۰۰ مسجدیں تھیں اور خانقاہوں اور حماموں کا کوئی شمار نہ تھا۔ کنوئیں کثرت سے موجود تھے۔

افسرانِ ریاست درجہ بدرجہ خان، ملک، امیر، سپہ سالار اور جند کہلاتے تھے اور سواروں کی تعداد نو لاکھ تھی جن میں ترک، ایرانی اور ہندوستانی لوگ شامل تھے ان کے گھوڑے عمدہ، وردی نفیس، اور اسلحہ کی حالت بغایت پسندیدہ تھی۔

ایک خان کی ماتحتی میں دس ہزار سوار اور ایک ملک کی ماتحتی میں ایک ہزار سوار ہوتے تھے۔ امیر سو سواروں کے دستہ کا افسر تھا اور سپہ سالار اس سے کم درجہ کا۔ سپہ سالار، بادشاہ کی حضوری میں نہیں جا سکتا تھا۔ ان کی تنخواہوں کے عوض میں جاگیریں مقرر تھیں جن میں کبھی کمی نہ ہوتی تھی۔ ہر خان کو دو لاکھ تنکہ (ہر تنکہ آٹھ درم کے برابر) ہر ملک کو پچاس اور ساٹھ ہزار تنکہ کے درمیان ہر امیر کو تیس اور چالیس ہزار تنکہ کے درمیان اور سپہ سالار بیس ہزار تنکہ کی جاگیر اس کے ذاتی مصارف کے لئے مقرر تھی۔ سپاہیوں اور مملوکوں کی تنخواہ علاوہ خوراک، لباس اور مصارف اسپ کے ۵۰۰ تنکہ مقرر تھی، جو خزانۂ شاہی سے نقد ملتی تھی۔

غلاموں کو دس تنکہ ماہوار تنخواہ دیجاتی تھی اور چار جوڑے کپڑے ہر سال مرحمت ہوتے۔ اس کے علاوہ ماہوار دو من گیہوں اور چاول، اور روزانہ تین سیر گوشت معہ ضروری سامان گھی اور مسالہ وغیرہ کے ہر غلام کے لئے مقرر تھا۔

سلطان کا ایک ذاتی کارخانہ کپڑا بننے کا تھا جس میں چار سو آدمی ہر قسم کا ریشمی کپڑا بُنا کرتے تھے۔ اس کارخانہ میں جو کپڑے طیار ہوتے، ان سے خلعت وغیرہ بھی طیار کئے جاتے۔ سلطان ہر سال موسم بہار میں ایک لاکھ اور موسم خزاں میں ایک لاکھ خلعت تقسیم کرتا۔ موسم بہار کی خلعتیں اسکندریہ کے ریشمی کپڑوں کی ہوتیں اور موسم خزاں کے خلعت دہلی یا چین وعراق کے کپڑے کی طیار کی جاتیں۔ خلعتیں، خانقاہوں میں مشائخ وعلماء وغیرہ کو بھی تقسیم کی جاتی تھیں۔

صرف سلطان کے ذاتی کارخانے زردوزی اور کارچوب کے ۴۰۰ تھے جن میں خواتین حرم و دیگر معزز خواتین کے لئے ہر وقت کام ہوتا رہتا تھا۔

سلطان ہر سال دس ہزار عرب گھوڑے نہایت اچھی نسل کے معہ ساز و یراق کے امراء کو تقسیم کرتا تھا اور معمولی گھوڑوں کا تو کوئی شمار نہ تھا۔

سلطان کا ایک نائب بھی ہوتا تھا جو خوانین سے منتخب کیا جاتا تھا۔ اس کی جاگیر کا رقبہ صوبۂ عراق سے کم نہ تھا۔ اسی طرح ایک وزیر بھی ہوتا تھا وزیر کی ماتحتی میں چار اس کے معاون ہوتے تھے۔ جن کی جاگیر بیس ہزار اور چالیس ہزار تنکہ کے

درمیان ہوتی تھی ۔ علاوہ ان کے چار دبیر (یا میر منشی) بھی ہوتے تھے ۔ بعض محرروں کی جاگیر بھی تھی اور نقد تنخواہ بھی ۔

ایک عہدہ قاضی القضاۃ کا بھی ہوتا تھا جسے صدر جہاں[1] اور صدر الاسلام بھی کہتے تھے ۔ اس کی جاگیر میں دس قصبات ہوتے تھے جن کی آمدنی ساٹھ ہزار تنکہ سے کم نہ ہوتی تھی ۔ ایک شخص شیخ الاسلام بھی ہوتا تھا اور اس کی جاگیر بھی اسی قدر ہوتی تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ صدر جہاں کا کام مقدمات کی سماعت اور احکام سزا وغیرہ دینا تھا، اور شیخ الاسلام صرف قاضی تھا جو شرع کے مطابق مسائل عامہ طے کیا کرتا تھا ۔ ایک عہدہ محتسب (کوتوال) کا بھی تھا اس کی تنخواہ ۸۰۰۰ تنکہ تھی ۔ سلطان کے دربار میں ۱۲۰۰ طبیب تھے اور دس ہزار شکاری جو گھوڑوں پر سوار ہوکر ہاتھیوں پر باز اور شاہین بٹھائے ہوئے نکلتے تھے ۔ ۳۰۰۰ ہانکہ کرنے والے بھی نوکر تھے اور علاوہ ان کے تین ہزار ایسے لوگ بھی تھے جو اس شکار کے تمام اور ضروریات کو مہیا کرتے تھے ۔

سلطان کے دسترخوان پر ۵۰۰ امراء کھانے میں شریک ہوتے اور ۱۲۰۰ مغنی ہر وقت حاضر رہتے اس میں اُن ایکہزار مغنیوں کی تعداد شامل نہیں ہے جو موسیقی کی تعلیم دینے کے لئے قصر شاہی کے اندر رہتے تھے ایک ہزار شاعر بھی دربار سے متعلق تھے جن میں سے بعض عربی بعض فارسی اور بعض ہندی زبان میں شاعری کرتے ۔ ان مغنیوں اور شعراء میں بعض کی بڑی بڑی جاگیریں مقرر تھیں اور بعض نقد تنخواہیں بیس ہزار سے ۴۰ ہزار تنکہ تک پاتے تھے ۔ انعام و اکرام اس کے علاوہ تھا ۔

شیخ مبارک کا بیان ہے کہ سلطان روزانہ صبح و شام دربار کرتا تھا اور اس کے بعد کھانا ہوتا تھا جس میں بیس ہزار خواتین وملوک، امراء وارکین شامل ہوتے تھے خاص بادشاہ کے دسترخوان پر بڑے بڑے علماء (جن کی تعداد ۲۰۰ تھی) بیٹھتے تھے اور بادشاہ کھانے کے دوران میں ان سے علمی مباحث پر گفتگو کیا کرتا تھا ۔

شیخ ابوبکر بن خلال کا بیان ہے کہ شاہی مطبخ کے لئے روزانہ ۲۵۰۰ بیل یا گائے اور ۲۰۰۰ بکریاں ذبح ہوتی تھیں چڑیوں کا تو کوئی شمار نہ تھا ۔

فوج اور رعایا کا انتظام نائب السلطان کے سپرد تھا ۔ علماء وفقہاء ہندی ہوں یا اجنبی سب کا تعلق صدر جہاں سے تھا ۔ اسی طرح مشائخ وفقراء کا معاملہ شیخ الاسلام کی وساطت سے طے ہوتا تھا ۔ سیاحین وسفراء، شعراء و دیگر اہل کمال دبیروں (سکریٹریوں) سے متعلق تھے ۔

جب بادشاہ شکار کو جاتا تو ایک لاکھ سوار اور ۲۰۰ ہاتھی اس کے جلو میں ہوتے ۔ لکڑی کے سفری مکان دو دو منزل کے ساتھ ہوتے جنھیں دوسو اونٹ کھینچتے ۔ خیمے اور قناتیں وغیرہ بھی کثرت سے ساتھ ہوتیں ۔

---

[1] جس زمانہ کا ذکر صاحب مسالک الابصار نے کیا ہے اس وقت کمال الدین ابن برہان الدین اس عہدہ پر ممتاز تھا ۔

جب بادشاہ ایک مقام سے کسی دوسرے مقام پر کسی غرض سے سفر کرتا تو تیس ہزار سوار ۲۰۰ ہاتھی اور ایک ہزار کوتل گھوڑے جواہر کار ساز و یراق سے آراستہ ہمراہ ہوتے۔

بادشاہ بہت منکسر مزاج تھا۔ ابوالصفا عمر بن اسحاق کا بیان ہے کہ خود اس نے بادشاہ کو ایک فقیر کے جنازہ کو کاندھا دیتے ہوئے دیکھا تھا وہ کلام مجید کا حافظ تھا اور شرع حنفی کی تمام کتابوں پر اس کو پورا عبور تھا۔ وہ علمائے کبار سے برابر مسائل علمیہ میں مباحثہ کرتا شعر و شاعری میں حد درجہ پاکیزہ مذاق رکھتا اور فن کتابت کا زبردست ماہر تھا۔

شراب کا رواج کہیں نہ تھا۔ بادشاہ کو اس سے سخت نفرت تھی اور یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص ایک قطرہ شراب کا اپنے مکان میں رکھ لے۔ پان کا رواج عام تھا اور اس کی ممانعت بھی نہ تھی۔

خبر رسانی کا انتظام بھی سلطان نے نہایت مکمل کیا تھا علاوہ جاسوسوں کے ڈاک کی آمد و روانگی کے لئے ہرکارے بھی مقرر تھے ہر محکمہ میں شاہی جاسوس پھرا کرتے تھے اور وہاں کی خبریں اپنے افسران کے ذریعہ سے بادشاہ تک پہونچاتے تھے۔ دور دراز مقامات کے حالات ڈاک کے ذریعہ سے پہونچتے تھے اس کا انتظام اس طور پر تھا کہ سڑکوں پر چار تیر کی مسافت سے چوکیاں بنی ہوئی تھیں، ہر چوکی پر دس ہرکارے متعین تھے جن کا فرض تھا کہ وہ ڈاک کو ہر ممکن سرعت کے ساتھ اگلی چوکی تک پہونچا دیں اس صورت سے ڈاک اِدھر سے اُدھر بہت جلد پہونچ جاتی تھی۔ ہر چوکی پر ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی جہاں مسافر قیام کرتے، نمازیں ادا کرتے اور شیریں پانی کے لبریز حوضوں سے اپنی تشنگی رفع کرتے۔ اسی طرح ہر چوکی کے پاس ایک بازار بھی تھا جس میں تمام ضروری اشیاء غذا کی ملتی تھیں اور جانوروں کی بھی خرید و فروخت ہوتی تھی۔

دہلی اور دولت آباد کے درمیان ہر چوکی پر ایک نقارہ بھی رکھا رہتا اور کسی خاص امر کے وقوع پر وہ بجایا جاتا اس سے یہ فائدہ تھا کہ بادشاہ دہلی میں ہو یا دولت آباد میں اس کو دوسرے شہر کے تمام واقعات کی اطلاع فوراً ہو جاتی۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ ڈاک کی انتظامی حالت بیان کی ہے وہ لکھتا ہے کہ "اُس وقت ڈاک دو قسم کی تھیں ایک بریدالخیل (گھوڑے کی ڈاک) دوسرے بریدالرجال (قاصدوں یا ہرکاروں کی ڈاک) ہر میل کے اندر تین چوکیاں ڈاک کی ہوتی ہیں۔ یہاں ہرکارے متعین ہوتے ہیں۔ جس وقت کسی ہرکارے کے پاس ڈاک پہونچتی ہے وہ فوراً اپنی کمر کستا ہے اور ایک ہاتھ میں ڈاک اور دوسرے میں گھونگرو دار چابک لئے ہوئے جسے وہ راستہ بھر بجاتا جاتا ہے، دوسری چوکی کی طرف روانہ ہوتا ہے اسی طرح وہاں کا ہرکارہ آگے لیجاتا ہے۔

اسی ڈاک کے ذریعہ سے خراسان کے میوے، طباقوں کے اندر سربمُہر روزانہ بادشاہ کے پاس پہونچتے تھے، اور گنگا کا پانی بھی چالیس دن کے راستہ سے شاہی استعمال کے لئے اسی ذریعہ سے روزانہ پہونچتا تھا۔

جب کوئی اجنبی ہندوستان آتا تو انھیں ہرکاروں کے ذریعہ سے بادشاہ کو فوراً معلوم ہو جاتا کہ فلاں شخص اس شکل و حلیہ اس صورت و لباس کا فلاں مقام پر آیا ہے اور اس کے متعلق مناسب احکام صادر کئے جاتے۔ خاص خاص قیدی

بھی ڈاک ہی کے ذریعہ سے بادشاہ تک پہونچائے جاتے تھے۔

سکوں کی تفصیل

طلائی تنکہ کو تنکۂ سرخ کہتے تھے جس کا وزن تین مشقال کا تھا۔ نقرئی تنکہ کی قیمت ۸ درہم ہشت کانی تھی اور درہم ہشت کانی کا وہی وزن تھا جو اس وقت مصر و شام کے ایک نقرئی درہم کا ہوتا تھا۔

ایک درہم ہشت کانی، چار درہم سلطانی کے برابر سمجھا جاتا تھا جنھیں دوکانی بھی کہتے تھے۔ ایک سکہ نصف درہم سلطانی کا بھی تھا جس کو یکانی کہتے تھے اور اس کی قیمت ایک جیتل تھی۔ ایک درہم کا نام دوازدہ کانی بھی تھا جو ڈیڑھ ہشت کانی کے برابر تھا۔ ایک سکہ شانزدہ کانی بھی تھا جس کی قیمت دو درہم کے برابر تھی۔ کل چھ نقرئی سکے اس وقت رائج تھے۔ شانزدہ کانی دوازدہ کانی، ہشتکانی، ششش کانی، سلطانی اور یکانی، درہم سلطانی ۸ فلوس (پیسوں) کے برابر تھا اور جیتل چار فلوس کے برابر۔ درہم ہشتکانی کے ۳۲ فلوس ملتے تھے۔ سیر ستر مشقال کا تھا اور ایک من چالیس سیر کا ہوتا تھا۔

اشیاء کی ارزانی

ایک من گیہوں ڈیڑھ ہشتکانی میں ملتا تھا۔ ایک من جو ایک درہم میں، چاول ایک درہم میں ۲۔۱ من سیر اور چنا ایک درہم ہشتکانی میں دو من ملتا تھا۔ گوشت بکری کا ایک درہم سلطانی میں ۴ سیر ملتا تھا۔ بڑی بط دو درہم ہشتکانی میں ملتی تھی اور ایک ہشتکانی کی چار مرغیاں فروخت ہوتی تھیں۔ شکر ایک ایک ہشتکانی میں ۵ سیر ملتی تھی اور نہایت نفیس اور فربہ بھیڑ ایک تنکہ میں۔ اسی طرح ایک عمدہ بیل دو تنکہ میں فروخت ہوتا تھا۔[1]

ابن بطوطہ نے جو حالات دربار وغیرہ کے لکھے ہیں وہ بھی نہایت دلچسپ ہیں اس نے مختصر الفاظ میں ان کا اظہار یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے، لکھتا ہے کہ:-

دربار کی تفصیل

"سلطان نے جو قصر دہلی میں تعمیر کرایا ہے اس کا نام دار سرا ہے اور اس میں متعدد دروازے ہیں پہلے دروازہ پر محافظ فوج کا ایک دستہ ہر وقت متعین رہتا ہے اور نقارے، نفیریاں اور قرنا وغیرہ بھی موجود رہتے ہیں جو امراء و کبار کی آمد پر بجائے جاتے ہیں۔ یہی حال دوسرے اور تیسرے دروازہ کا ہے آخری دروازہ کے بعد قصر ہزار ستون[2] ملتا ہے جہاں بادشاہ لوگوں سے ملاقات کرتا ہے۔ نقیبوں کے سر پر زریں دستار، کمر میں پٹکا، ہاتھ میں طلائی یا نقرئی دستہ کا کوڑا رکھنا ضروری ہے۔ نقیب اعظم کے ہاتھ میں سونے کی چوب ہوتی ہے اور سر پر زریں کلاہ جس میں جواہر جگمگاتے رہتے ہیں۔

دربار کی نشست اکثر عصر کے بعد ہوتی ہے۔ ایک چبوترہ پر سفید فرش بچھا کر اس پر شاہی تخت رکھا جاتا ہے جب بادشاہ برآمد ہو کر اپنی نشست پر جاتا ہے تو تمام نقیب اور حاجب باآواز بلند بسم اللہ کہتے ہیں اور ملک کبیر چنور لیکر کھڑا ہوتا ہے۔ سلطان کے داہنے اور بائیں جانب سو سو مسلح سپاہی کھڑے ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں میں تلواریں اور شانوں پر

---

[1] یہ تمام حالات سوائے ان بیانات کے جہاں ابن بطوطہ کی صراحت کر دی گئی ہے مسالک الابصار (ایلیٹ) جلد سوم صفحہ ۵۸۰ - ۵۸۳ سے ماخوذ ہیں۔

[2] قصر ہزار ستون کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں ایک ہزار چوبی ستون لگے ہوئے تھے اس قصر کی چھت بھی لکڑی ہی کی تھی۔

کمائیں ہوتی ہیں تمام امراء درجہ بدرجہ بٹھائے جاتے ہیں یہاں سات کوتل گھوڑے بھی جواہر کار ساز و یراق کے ساتھ رہتے ہیں گھوڑوں کے بعد پچاس ہاتھی کھڑے ہوتے ہیں ان کی جھولیں حریر کی ہوتی ہیں جن پر زر دوزی کا کام ہوتا ہے اور ان کے دانتوں پر لوہے کا خول چڑھا رہتا ہے۔ ان ہاتھیوں پر ہودہ ہوتا اور ہر ہودہ پر چار علم بھی ہوتے ہیں۔

عید کی صبح کو ہاتھی آراستہ کئے جاتے ہیں اور ان پر جواہر کار زر دوزی کی جھولیں ڈالی جاتی ہیں سولہ ہاتھی بادشاہ کی سواری کے لئے مخصوص ہیں جن پر مرصع چتر ہوتے ہیں، چتر کی ڈنڈی خالص سونے کی ہوتی ہے۔ بادشاہ جس ہاتھی پر سوار ہوتا ہے اس کی مستک پر ایک روشن ستارہ جواہرات کا لگا دیا جاتا ہے، اس ہاتھی کے آگے غلاموں کی قطار ہوتی ہے جن کے سروں پر سونے کی کلغیاں ہوتی ہیں اور کمریں جواہر کار پٹکے۔ ان کے آگے ۳۰۰ نقیب ہوتے ہیں جو سر سے پاؤں تک سونے سے لدے رہتے۔ ان کے آگے امراء ہاتھیوں اور گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اور پھر فوج اور ماہی مراتب عیدگاہ کے دروازہ پر پہونچ کر ٹھہر جاتا ہے اور جب تمام علماء و امراء اندر چلے جاتے ہیں تو پھر خود ہاتھی سے اتر کر اندر جاتا اور نماز سے فارغ ہوکر اونٹ کی قربانی کرتا ہے۔

عید کے دربار میں صد درجہ تزک و احتشام سے کام لیا جاتا، جس کا بیان ابن بطوطہ نے نہایت تفصیل سے کیا ہے لیکن ہم اس کا ذکر یہاں نہیں کرتے بیان ماسبق سے اس کی شان و شوکت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جب بادشاہ کسی سفر سے واپس آتا تو ہاتھی آراستہ کئے جاتے اور ۱۶ ہاتھیوں پر جواہر کار ہودے رکھے جاتے ہر ایک کی مستک پر ایک ستارہ لگایا جاتا جس میں موتی و الماس ٹنکے ہوتے۔ علاوہ ان کے کئی کئی منزل کے چوبی قبے بنائے جاتے اور ان پر ریشمی کپڑا لپیٹ دیا جاتا۔ ان قبوں کی ہر منزل میں خوبصورت کنیزیں پر تکلف لباس اور قیمتی زیور پہنے ہوئے نغمہ و رقص میں مصروف نظر آتیں۔ راستہ میں تمام ریشمی فرش ہوتا اور اس پر سے سلطان کی سواری گزرتی۔ شہر کے دروازہ سے لیکر قصر کے دروازہ تک راستے آراستہ کئے جاتے اور ان پر بھی ریشمی فرش کیا جاتا۔ بادشاہ کے آگے ہزار غلام ہوتے اور پیچھے فوج کے دستے۔ بادشاہ جس وقت شہر کے اندر داخل ہوتا تو دینار و درم کی بارش ہونے لگتی تھی، غرباء انھیں لوٹتے تھے اور سلطان اسی حال میں قصر کے اندر داخل ہو جاتا۔

طریقِ طعام یہ تھا کہ جب مطبخ سے کھانا چلتا تو نقیب باآواز بلند بسم اللہ کہتے ہوئے آگے ہوتے جب کھانا بادشاہ کے قریب پہونچ جاتا تو سوائے بادشاہ کے سب کھڑے ہو جاتے اور کھانا فرش پر چُنا جاتا اس کے بعد نقیبِ اعظم، بادشاہ کی مدح و تعریف کرتا اور تمام نقیب بادشاہ کو مجرا کرکے ہٹ جاتے پھر بادشاہ کے سامنے تمام حاضرین کی فہرست پڑھی جاتی اور اس کے بعد کھانا کھایا جاتا۔ صدر دسترخوان پر فقہاء و علماء یا قضاۃ و مشائخ ہوتے اس کے بعد بادشاہ کے اقارب و امراء کبار اور پھر تمام آدمی اپنی اپنی معین جگہ پر بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد شراب دار سونے چاندی کے برتن لئے ہوئے آتے جن میں مصری کا شربت ہوتا پہلے یہ پی لیا جاتا اس کے بعد کھانا شروع کیا جاتا۔ فراغتِ طعام کے بعد جو اور موٹھ کا افشردہ پینے کو

دیا جاتا اور پھر ریشمی تاگے سے بندھی ہوئی پان کی گلوریاں تقسیم ہوتیں۔

عدل و انصاف

سلطان عدل و انصاف کے معاملہ میں بہت سخت تھا حتیٰ کہ وہ اپنے وجود کو بھی اس سے مستثنیٰ نہ سمجھتا تھا۔ ایک بار کسی ہندو امیر نے قاضی کے ہاں نالش کی کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بے سبب قتل کر ڈالا ہے۔ قاضی نے سلطان کو طلب کیا چنانچہ یہ گیا اور قاضی کو سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ جب قاضی نے بیٹھنے کی اجازت دی تو بیٹھا اور اسوقت تک عدالت سے باہر نہ گیا جب تک مدعی راضی نہیں ہو گیا۔[1]

ان تمام بیانات سے یہ امر بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ محمد تغلق اپنی صفات کے لحاظ سے ایک بے مثل حکمراں تھا، عزم و استقلال، سطوت و جبروت، بذل و کرم، زہد و اتقا، شجاعت و بسالت، اس میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ وہ خود تمام امور کا انتظام کرتا، قوانین نافذ کرتا اور خود اپنے کو بھی اس سے مستثنیٰ نہ سمجھتا، خود میدانِ جنگ میں فوج کے ساتھ جاتا اور دشمن کا مقابلہ کرتا لیکن باوجود ان تمام باتوں کے وہ کامیاب بادشاہ ثابت نہ ہوا اور تمام صوبے اس کے آخر عہد میں خود مختار ہو گئے۔

سلطان فیروز شاہ

۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء — ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء

اصلاحات فیروز شاہی خود اس کی زبان سے

فیروز شاہ نے اپنے عہد میں بہت سے انتظامات کئے اور قوانین رائجہ میں متعدد اصلاحیں کیں لیکن ان میں سے کوئی اصلاح ایسی نہ تھی جس کی بنیاد رحم و انصاف پر نہ ہو۔

چنانچہ وہ خود فتوحات فیروز شاہی میں لکھتا ہے کہ:-

(۱) مجھ سے قبل بہت سے ناجائز اور نامشروع ٹیکس[2] قائم تھے۔ میں نے ان کو یک قلم منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ صرف شرع کے مطابق خراج وصول کیا جائے یعنی زمین مزروعہ کی پیداوار کا دسواں حصہ، معدنی پیداوار کا ایک خمس، اور مسلمانوں کی صدقہ و زکوٰۃ کی رقم خزانہ میں داخل ہونی چاہئے۔

---

[1] ابن بطوطہ (تاریخ ہندوستان مولوی ذکاء اللہ) ۱۴۴ - ۱۵۶

[2] ان کی فہرست بھی فیروز شاہ نے دی ہے جن میں سے خاص خاص ٹیکس کے نام یہ تھے:- گل فروشی، دلالی بازاری، جنگی غلہ، ماہی فروشی، صابون گری، ریسمان فروشی، روغن گری، نخود بریانی، تہ بازاری، قمار خانہ، کوتوالی، چرائی۔

(۲) میرے عہد سے پہلے مال غنیمت کا پانچواں حصہ سپاہیوں کو دیا جاتا تھا باقی خزانہ میں داخل ہوتا تھا میں نے اسکو بھی موقوف کیا کیونکہ حکم شرعی اسکے بالکل خلاف تھا، چنانچہ میں نے ہمیشہ خزانہ میں مال غنیمت کا ایک خمس داخل کیا اور باقی سپاہیوں کو تقسیم کر دیا۔

(۳) شرع کے خلاف مسلمانوں میں عام طور سے یہ رواج ہو گیا تھا کہ ان کی عورتیں شہر کے باہر مزاروں پر جاتی تھیں جہاں اوباشوں کو بد معاشی کا زیادہ موقع ملتا تھا اس لئے میں نے حکم دیا کہ آیندہ جو عورت مزاروں پر جائے گی اس کو سخت سزا دیجائیگی چنانچہ یہ دستور بالکل موقوف ہو گیا۔

(۴) مجھ سے قبل یہ دستور تھا کہ شاہی دسترخوان پر سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھایا جاتا تھا اور تلواروں کے قبضے وغیرہ زر و جواہر سے مرصع ہوتے تھے میں نے ان باتوں کو ممنوع قرار دیا اور حکم دیا کہ ہتھیاروں میں صرف ہڈیوں کے دستے لگائے جائیں اور ظروف نقرئی و طلائی کا استعمال یک قلم موقوف کر دیا جائے۔

(۵) امراء زریں لباس پہنا کرتے تھے اور زین، لگام، گلوبند، صراحی، خیمے، پردے، کرسیاں اور تمام چیزیں تصویروں سے آراستہ کی جاتی تھیں، میں نے ان ناجایز نقش و نگار کو محو کرا کے آیندہ کے لئے ممانعت کر دی۔

(۶) ریشمیں و زربفت کے لباس کا بھی امراء میں عام رواج تھا۔ میں نے اس کی بھی ممانعت کی اور شریعت کے مطابق ایک انگل سے زیادہ عریض ریشمی کپڑے کا استعمال ممنوع قرار دیا۔

(۷) میرے مربی اور آقا سلطان محمد تغلق کے عہد میں جو لوگ قتل ہوئے ان کے وارثوں کو اور جو مفلوج الاعضاء تھے خود انھیں بلا کر اتنی بخشش کی کہ انھوں نے رضامندی کا اظہار کر کے اقرار نامے لکھدیئے کہ ہم کو اب سلطان محمد تغلق پر کوئی دعوےٰ نہیں ہے میں نے یہ سارے اقرار نامے ایک صندوق میں بند کرا کے محمد تغلق کی قبر کے سرہانے رکھدئے اس امید کے ساتھ کہ خدا میرے آقا کے ساتھ مہربانی فرمائے گا۔

(۸) مجھ سے قبل جو وظایف اور دیہات معافی وغیرہ کے ضبط ہو گئے تھے ان کے متعلق میں نے عام حکم دیدیا کہ از روئے سند جس کا حق ثابت ہو اس کے حق میں تمام وظایف وغیرہ بحال کر دئے جائیں۔

سراج عفیف نے فیروز شاہ کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتاً فیروز نہایت اچھے صفات کا بادشاہ تھا اور محمد تغلق کے بعد ہندوستان کو ایسا فرمانروا مل جانا ایک ایسا مرہم تھا جس نے تمام جراحتوں کو مندمل کر دیا۔ فیروز شاہی عہد میں جو انتظامات ہوئے، ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

(۱) بازار نفیس اور عمدہ اسباب تجارت سے معمور ہو گئے۔ (۲) مزدوروں کو پوری اجرت ملنے لگی اور ان کی اقتصادی حالت بہتر ہو گئی۔ (۳) پیشہ ور لوگ نہایت اطمینان سے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے اور شہر کی رونق بڑھنے لگی۔ (۴) ایک ایک کوس کے اندر چار چار گاؤں آباد ہو گئے۔ (۵) رعایا کے پاس غلہ اور تمام ضروری سامان زندگی مہیا ہو گیا اور تمام

سلطنت میں امن وسکون ومسرت وخوشحالی نظر آنے لگی ۔ ہرچند ان ٹیکسوں کے موقوف کر دینے سے سلطنت کی آمدنی کم ہوگئی لیکن اس کے عوض مخلوق خدا کو جو راحت وآسانی حاصل ہوئی وہ کافی سے زیادہ معاوضہ اس کی کمی کا تھا جس پہ فیروز شاہ قانع تھا۔

سلطنت کے امراء وارکین افسران ومعززین علاؤالدین خلجی سے پہلے جاگیریں رکھتے تھے اور وہی ان کی خدمات کا معاوضہ سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن علاؤالدین خلجی نے اس دستور کو مٹا کر نقد تنخواہیں کر دی تھیں اور تمام جاگیریں وغیرہ خالصہ میں شامل کر لی تھیں۔ اس کے بعد بھی یہی دستور جاری رہا۔ لیکن جب فیروز شاہ نے عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لی تو اسنے اپنی فطری فیاضی اور نرمی سے مجبور ہو کر جاگیریں پھر بحال کر دیں اور کامل چالیس سال تک اس کے عہد سلطنت میں اس قاعدہ کی پابندی کی گئی اور کسی جاگیردار یا معافی دار کی طرف سے اظہار سرکشی وبغاوت نہیں ہوا جس کے خوف سے علاؤالدین خلجی نے جاگیریں ضبط کر لی تھیں[1]۔

فوجی[2] ملازمین کے لئے اس نے ایک قانون اور بنایا وہ یہ تھا کہ کوئی افسر مر جائے یا ضعیف ہو جائے تو اس کے بیٹے کو جگہ دیجائے اگر بیٹا نہ ہو تو داماد کو، اگر یہ بھی نہ ہو تو غلام کو اور اس کے بعد اور کسی قریبی رشتہ دار کو۔ جب تک فیروز شاہ زندہ رہا اس قانون پر اس نے عمل کیا اور اس طرح فوجی خدمات کی طرف لوگوں کو بہت زیادہ توجہ ہو گئی[3]۔

فیروز شاہ کو چونکہ غلاموں کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا اس لئے تھوڑے دنوں میں تحائف اور نذرانوں کی صورت سے اس قدر کثیر تعداد میں غلام جمع ہو گئے کہ سلطان کو مستقلاً ان کا انتظام کرنا پڑا۔ بہت سے غلام تو اس نے مختلف اضلاع میں بھیجدئے اور وہاں ان کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا۔ جو غلام شہر میں رہ گئے ان کا مشاہرہ ۱۰۰ تنکہ سے دس تنکہ تک حسب حیثیت مقرر کیا۔ علاوہ اس کے ہر غلام کو اس کی میلان طبیعت کے موافق تعلیم بھی دلائی، کسی کو حافظ بنایا اور کسی کو فقیہہ کسی کو حدیث کا درس دلایا اور کسی کو علم کلام کا، کسی کو خوشنویسی کی تعلیم دلائی اور کسی کو سپاہ گری کی۔ اسی طرح دوسرے پیشوں اور حرفوں کی طرف ان کو راغب کیا۔ چنانچہ ایک لاکھ اسی ہزار غلاموں میں بارہ ہزار غلام صرف وہ تھے جو مختلف پیشوں

---

[1] جاگیردار ملوک وامرا کی خوشحالی کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ ہر شخص اپنی جگہ رئیس بنا ہوا تھا اور باغات، قصبات، مزیات اور پرگنوں کی آمدنی سے بڑے بڑے کارخانے ان کے ہاں جاری تھے رعایا سے لیکر جاگیردار تک، امیر سے لیکر غریب تک، کاشتکار سے لیکر مقدم اور کھیا تک ہر شخص اپنی اپنی جگہ خوش اور نہایت بے فکری سے زندگی بسر کر رہا تھا۔

[2] جب ملک عماد الملک دیوان عرض ضعیف ہو گیا تو اس کا بیٹا ملک اسحٰق اس کی جگہ کام کرنے لگا کہ ایک دن اسحاق نے بادشاہ سے کہا کہ سپاہ میں بعض آدمی بہت ضعیف ہو گئے ہیں ان کی جگہ دوسرے جوان آدمی بھرتی کرنا چاہئے بادشاہ نے کہا یہ رائے مناسب ہے لیکن پہلے مجھے تمہارے باپ کو علحدہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ بھی بہت ضعیف ہے، یہ سنکر اسحٰق خاموش ہو گیا۔ [3] فیروز شاہ کے عہد میں اسی نوے ہزار سوار شاہی سپاہ میں تھے

اور صنعتوں کے ماہر تھے۔ بادشاہ نے غلاموں کا محکمہ ہی جدا کر دیا تھا اور اس محکمہ کے دیوان، خزانچی، محاسب، وزیر الگ کر دئے تھے۔ جن امراء کو غلام دئے جاتے تھے اُن کو سخت تاکید کی جاتی تھی کہ اپنے بچوں کی طرح انکی پرورش کریں اور تعلیم و تربیت کی خاص نگرانی رکھیں۔

زراعت و آبادی کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ دوآبہ کے ۵۲ پرگنے تھے اور تمام پرگنوں میں ایک گاؤں بھی غیر آباد نہ تھا اور ایک جریب زمین کاشت سے خالی نہ تھی، صوبہ سامانہ میں بھی ایک کوس کے اندر چار چار گاؤں آباد ہو گئے تھے اور تمام رعایا خوش حال نظر آتی تھی۔

ارزانی کی یہ کیفیت تھی کہ خاص دہلی میں (جہاں پایۂ تخت تھا اور بڑا شہر ہونے کی وجہ سے غلّہ کو قدرتاً گراں ہونا چاہئے) ایک من گیہوں ۸ جیتل میں، ایک من جوار اور جو ۴ جیتل میں عام طور سے فروخت ہوتا تھا۔ ایک سوار اپنے گھوڑے کے لئے دس سیر دلا ہوا غلّہ جسے سراج عفیف نے دلیدہ یعنی "دلیہ" سے تعبیر کیا ہے ایک جیتل میں خرید لیتا تھا۔ گھی ڈھائی جیتل کا ایک سیر اور شکر ۳ یا ۳½ جیتل کی ایک سیر ملتی تھی۔[1] اگر کبھی امساک باراں ہوتا تو ایک تنکہ فی من سے زیادہ کبھی نرخ نہ بڑھتا، چالیس سال تک فیروز شاہ نے حکومت کی اور اس زمانہ میں قحط عام یا گرانی کی شکایت کسی کو نہیں ہوئی کپڑے کی ارزانی کا بھی یہی عالم تھا۔

اس کے عہد میں صرف دوآبہ کی آمدنی ۸۰ لاکھ تنکہ اور کل سلطنت کی ۶ کروڑ ۸۵ لاکھ تنکہ تھی لیکن یہ سب خزانۂ شاہی میں نہ آتی تھی بلکہ مختلف امراء و اراکین، ملوک و وزراء، ملازمین مال و فوج پر جاگیروں کی صورت میں منقسم تھی۔ خان جہاں وزیر کی ذات خاص کا تیرہ لاکھ تنکہ مقرر تھا۔ اسی طرح کسی کی جاگیر آٹھ لاکھ کی تھی، کسی کی ۶ لاکھ کی، کسی کی ۴ لاکھ تنکہ کی۔ چنانچہ امرا کی دولت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ جب ملک شاہین شحنہ (جو مجلس خاص کا نائب امیر بھی) مرا ہے تو علاوہ قیمتی گھوڑوں اور جواہرات کے پچاس لاکھ تنکہ نقد اس کے گھر سے نکلا تھا۔ اسی طرح عماد الملک کی دولت کا کوئی اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔ مشہور ہے کہ اس نے روپیہ رکھنے کے لئے جو تھیلیاں سلوائی تھیں ان میں ڈھائی ہزار تنکہ صرف ہو گیا تھا۔ (حالانکہ اُسوقت ایک ٹاٹ کا تھیلا چار جیتل میں آتا تھا) کہا جاتا ہے کہ ستر کروڑ تنکہ نقد اس کے پاس موجود تھا۔ پھر یہ دولت و خوشحالی مخصوص افراد کا حصہ نہ تھی بلکہ تمام امراء و اراکین ملازمین و متوسلین یہاں تک کہ کاشتکار اور مزدور بھی ایک دوسرے سے مستغنی نظر آتے تھے اور حد درجہ راحت و آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ علماء و مشائخ کے لئے ۳۶ لاکھ تنکہ اور سائلین و فقراء کے لئے ایک لاکھ تنکہ بطور وظائف کے تقسیم کیا جاتا تھا۔

فیروز شاہ کے لئے یہ امر بہت تکلیف دہ تھا کہ کوئی شخص اس کی سلطنت میں بیکار پھرے اور تکلیف سے زندگی بسر کرے چنانچہ اس نے ایک عام حکم دیدیا تھا کہ جب کوئی بیکار آدمی نظر آئے تو کوتوال اہل محلہ سے اس کے حالات تحقیق کر کے بادشاہ کے روبرو پیش کرے۔ پھر بادشاہ ہر بیکار کو اسکی حسب حیثیت مشاغل بتا دیتا۔ کسی کو کارخانہ میں بھیج دیتا کسی کو وزیر کے پاس

زراعت و آبادی

ارزانی

سلطنت کی آمدنی اور امرا کی ثروت

بیکاروں کا انتظام

---

[1] گھی اور شکر کا نرخ سراج عفیف نے نہیں لکھا بلکہ مارکوئس ہیسٹنگز نے اپنی تحقیق سے لکھا ہے جسے ایڈورڈ ٹامس نے اپنی کتاب کرانکلس آف دی پٹھان کنگس میں درج کیا ہے۔

بھیجدیتا اگر کوئی کسی جاگیردار کے پاس رہنا چاہتا تو وہاں بھیجدیا جاتا۔ ان لوگوں کے رہنے کے لئے مکان ملتے اور ان کی معاش کا پورا انتظام کیا جاتا۔

کارخانے اور ان کے مصارف

بادشاہ نے ۳۶ کارخانے قایم کر رکھے تھے۔ ان کی دو قسمیں تھیں معمولی اور غیر معمولی۔ معمولی قسم میں فیل خانہ یا پائے گاہ (اصطبل) مطبخ، شتر خانہ، سگ خانہ، آبدار خانہ وغیرہ شامل تھے ان کا خرچ ماہوار ایک لاکھ ساٹھ ہزار تنکہ تھا اور اس قدر صرف ملازمین وغیرہ کے مشاہرہ کا تھا۔

غیر معمولی قسم میں جامدار خانہ، علم خانہ، فراش خانہ، رکاب خانہ وغیرہ داخل تھے ان کارخانوں کے لئے ہر سال نیا سامان خریدا جاتا۔ جامدار خانہ کے لئے موسم سرما میں (بہار و گرمی کی خریداری علحدہ تھی) ۶ لاکھ تنکہ کا، علم خانہ کے لئے ہر سال ۸۰ ہزار تنکہ کا اور فراش خانہ کے لئے ہر سال دو لاکھ تنکہ کا اسباب خریدا جاتا۔ ہر کارخانہ ایک امیر کے سپرد تھا اور سب کا حساب جداگانہ مرتب کیا جاتا تمام کارخانوں کی نگرانی خواجہ ابوالحسن کے ذمہ تھی

فیروز شاہی سکے اور ان کی قیمتیں

سلطان محمد تغلق کی طرح فیروز شاہ کو بھی سکوں کی طرف بہت توجہ تھی اس نے بڑی احتیاط کی کہ سکے عمدہ اور خالص طیار ہوں۔ اس کے عہد کے خاص سکے علاوہ طلائی اور نقرئی تنکہ کے جو پہلے سے رائج تھے۔ چہل و ہشت گانی۔ بست و پنج گانی (یہ سکے خاص فیروز شاہ کی اختراع تھے) بست و چہار گانی، دوازدہ گانی، دہ گانی، ہشت گانی، شش گانی تھے۔ انکی قیمتیں علی الترتیب ۴۸ سے لیکر ۶ جیتل تک تھیں۔

ایک بار بادشاہ کو خیال آیا کہ خرید و فروخت کے وقت ایک جیتل سے کم کا حساب ہوتا ہوگا تو بیچنے والا کیونکر فاضل رقم واپس کرتا ہوگا، جبکہ جیتل سے کم کوئی سکہ نہیں ہے[1]، چنانچہ اس نے دو سکے اور رائج کئے ایک نصف جیتل کا جسے آدھا کہتے تھے اور دوسرا پاؤ جیتل کا جس کا نام بیکھ[2] رکھا گیا۔

ایک دفعہ بادشاہ کو دو آدمیوں نے خبر دی کہ شش گانی سکہ میں کچھ خفیف سی کھوٹ ہے اور بازار میں اس کا چرچا ہو رہا ہے۔ بادشاہ نے وزراء کو حکم دیا کہ اس کی کامل تحقیقات کی جائے۔ یہ واقعہ ۷۷۲ھ ۱۳۷۰ء کا ہے۔ خان جہاں زندہ تھا جب اس کو بھی خبر ہوئی تو بادشاہ سے عرض کیا کہ سکہ کی حالت نا کتخدا لڑکی کی سی ہے کہ اگر اس کی عصمت پر جھوٹا الزام بھی لگ جائے تو پھر اسے کوئی نہیں پوچھتا، اس لئے اگر علانیہ تحقیقات کی گئی اور کھوٹ ثابت ہو گیا تو شاہی سکہ کا اعتبار اٹھ جائے گا اسلئے پہلے خفیہ جانچ مناسب ہے اسوقت کجر شاہ ٹکسال کا مہتمم تھا۔ اس سے خان جہاں دونوں مخبروں کو حراست میں لیکر کہا کہ کیا تم اپنی طور پر تحقیق کر کے مجھے اطلاع دو گے۔ چنانچہ اس نے تفتیش کی اور خان جہاں سے کہا کہ واقعی ٹکسال کے بعض شریر

---

[1] جیتل سے کم قیمت سکے فلوس (پیسے) کہلاتے تھے لیکن کوئی سکہ جیتل کی قسم کا اس سے کم قیمت نہ تھا، اس نے چاندی اور تانبہ ملا کر نہایت چھوٹے چھوٹے دو سکے ½ اور ¼ جیتل کی قیمت کے اور رائج کئے — [2] غالباً اس لفظ کی حقیقت "بھیک" رہی ہوگی یعنی وہ سکہ جو گداگروں کو بھیک میں آسانی سے دیا جاسکے

آدمیوں نے سکّہ میں کچھ کھوٹ ملادی ہے۔ خان جہاں یہ سن کر خاموش ہوگیا اور پھر کچھ سوچکر حکم دیا کہ سُناروں کو بلاکر بادشاہ کے سامنے اس طور سے جانچ کرائی جاوے کہ وہ سکّہ کے کھرے ہونے کی طرف سے مطمئن ہوجائے۔ کجر شاہ نے سُناروں سے حالات بیان کئے اُنھوں نے مشورہ دیا کہ ہم لوگ بادشاہ کے سامنے بغیر کسی سامان کے برہنہ طلب کئے جائیں لیکن تھوڑی سی چاندی کسی کوئلہ کے اندر رکھ کر سوراخ یا شگاف کو موم سے بند کر دیا جائے۔ جب ہم سکّہ گلائیں گے تو اس کوئلہ کو بھی اس میں ڈالدیں گے اور اسکی چاندی سکّہ کی چاندی سے ملکر وزن کو پورا کر دے گی۔ چنانچہ اس پر عمل کیا گیا اور مجمع عام میں بادشاہ کے سامنے سکہ کی جانچ کی گئی۔ چونکہ اس ترکیب سے کسی کو کھوٹ کا پتہ نہ چلا اور سکّہ کا وزن صحیح نکلا اس لئے بازاروں میں عام اعلان کر دیا گیا کہ جانچ سے ششگانی بالکل کھرا معلوم ہوتا ہے اور اس میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ کجر شاہ کو خلعت دیا گیا اور مخبروں کو شہر بدر کر دیا گیا۔ لیکن چند دن بعد خانِ جہاں نے کسی اور بہانے سے کجر شاہ کو علٰحدہ کر دیا۔

اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ خانِ جہاں کس قابلیت کا وزیر تھا بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ معاملات سلطنت میں فیروز شاہ کیسا امین اور متدین تھا۔

جب بادشاہ نے بنگال کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد شہر حصار فیروزہ کی بنیاد ڈالی (جس کا حال ہم آگے بیان کریں گے) تو اس نے اس نواح کی زمین کو (جس میں فتح آباد اور حصار فیروزہ دونوں داخل تھے) بہت آباد کیا[1] اور نہریں جاری کر کے تمام قصبات و دیہات (جس میں ہانسی، جمنید[2] اور دہاترہ بھی شامل تھے) کی پیداوار کو بہت بڑھایا۔

بادشاہ کو آبادیِ املاک کا اس قدر خیال تھا کہ بارش کے زمانہ میں وہ خاص خاص سرداروں کو متعین کرتا کہ نہروں کے کنارے پھر کر دیکھیں کہ سیلاب کہاں تک بہہ پہنچتا ہے اور وہ بہت خوش ہوتا جب اُسے معلوم ہوتا کہ کاشتکار نہروں سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ فیروز شاہ کے یہی انتظامات تھے جنھوں نے نہ صرف اُس کی جاگیر بلکہ سارے ملک کو آباد و خوش حال بنا دیا تھا۔

فیروز شاہ کے عہد میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کی تعمیرات ہیں جنھوں نے ایک طرف ملک کو پُر رونق بنانے میں مدد دی تو دوسری طرف رفاہِ عام میں غیر معمولی اضافہ کیا۔

اس کو تعمیرات[3] کا غیر معمولی شوق تھا اور آثار قدیمہ کی طرف توجہ کرنے میں اوّلیت کا فخر اسی بادشاہ کو حاصل ہے۔

---

[1] ان اضلاع میں تقریباً ۸۰ کوس تک نہروں کے ذریعہ سے آبپاشی ہوتی تھی اور کوئی حصۂ زمین زراعت سے خالی نہ تھا۔

[2] اس سے مراد غالباً وہی جنید ہے جہاں آجکل ایک سکھ خاندان فرمانروا ہے۔

[3] فیروز شاہ کے عہد میں ملک غازی شحنہ میر تعمیرات تھا جو اس فن کا بہت بڑا ماہر تھا اس کا نائب ایک شخص عبدالحق تھا جسے جاہر سوندھار بھی کہتے تھے چوب تراشوں، سنگ سازوں، آہنگروں، وغیرہ کی جماعتیں الگ الگ تھیں اور ہر ایک جماعت پر ایک شحنہ یا داروغہ مقرر تھا۔ جب کوئی عمارت زیر تجویز ہوتی تو دیوان وزارت کے سامنے نقشہ پیش کیا جاتا اور وہ اسکو دیکھنے کے بعد خزانہ سے ضروری روپیہ تعمیر کیلئے شحنہ کے تفویض کر دیتا۔

علاوہ فتح آباد[1] و فیروزہ حصار[2] کے اس نے حسب تفصیل ذیل اور نئے شہر تعمیر کئے:۔
فیروز آباد[3]۔ فیروز آباد ہارنی کھیڑا، تغلق پور کاسنہ، تغلق پور ملک کموت اور جونپور[4]، اس نے محلات بھی کثرت سے تعمیر کرائے جس میں فیروز کوشک، نزول کوشک، مہندواری، کوشک حصار فیروزہ، کوشک فتح آباد، کوشک جونپور، کوشک شکار (جسے اب فیروز شاہ کا کوٹلہ کہتے ہیں اور جو دلی سے نظام الدین جاتے ہوئے راستہ میں ملتا ہے) کوشک بند فتح خاں، کوشک سامورہ، خاص شہرت رکھتے تھے۔

---

[1] جب فیروز شاہ، سندھ سے دہلی کی طرف عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کی غرض سے چلا اور سرستی سے گزر کر منزل اکدار میں پہونچا تو وہاں اسکے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اس نے فتح خاں رکھا اور وہیں اس مسرت کی یادگار میں ایک شہر فتح آباد کے نام سے تعمیر کرایا۔

[2] جب بادشاہ، بنگال کی مہم سے فارغ ہوکر دہلی آیا اور انتظام مملکت کی طرف متوجہ ہوا تو اسنے اسی سلسلہ میں حصار فیروزہ کی بھی تعمیر کی۔ جہاں حصار طیار کیا گیا وہاں پہلے ایک گاؤں (لہراس نہنگ) آباد تھا پانی یہاں تقریباً معدوم تھا اور عراق و خراسان کی طرف سے جب مسافر یہاں آکر ٹھہرتے تھے تو انھیں ایک گھڑے پانی کے لئے چار چار جیتل ادا کرنا پڑتا تھا۔ فیروز شاہ نے اس جگہ کو پسند کیا اور حصار کی تعمیر شروع کرادی۔ تمام ملوک و امراء کو خدمتیں تقسیم کردیں اور چند سال میں یہ حصار (جو پتھر اور چونے سے بنایا گیا ہے) مکمل ہوگیا اور اسکا نام حصار فیروزہ کہا۔ اسکے بعد چاروں طرف خندق کھدوائی اور اسکی مٹی سے حصار کے گرد دمدمہ بنوالیا۔ حصار کے اندر ایک بہت بڑا تالاب تعمیر کرایا۔ جسکے پانی سے خندق بھی ہر وقت لبریز رہا کرتی تھی یہیں اس نے ایک بہت بڑا قصر بھول بھلیاں کی طرح تعمیر کرلیا اور متعدد دیگر محل بنوائے۔ پہلے صدر مقام تحصیل مالگذاری کے لئے ہانسی مقرر تھا لیکن جب یہ شہر مکمل ہوگیا تو صدر مقام اس نواح کا حصار فیروزہ کردیا گیا۔

[3] فیروز آباد کی تعمیر دہلی سے پانچ کوس کے فاصلہ پر شروع ہوئی اور تقریباً ۱۸ دیہات کی زمین اس میں داخل کرلی گئی خاص خاص دیہات کے نام یہ تھے: اندرپت، سرائے ابوبکر طوسی، کھیتواڑہ، مہرولہ (غالباً موجودہ مہرولی یا قطب صاحب) مقبرہ رضیہ سلطان کی زمین بھی اس شہر کے اندر آگئی تھی۔
اس شہر میں اس کثرت سے عمارتیں بنوائی گئیں کہ اندرپت سے لیکر کوشک شکار (جسے اب کوٹلہ فیروز شاہ کہتے ہیں) تک ۵ کوس میں ایک چپہ زمین بھی ایسی نہ تھی جہاں کوئی نہ کوئی عمارت نہ ہو۔ تمام مکانات پختہ اور وسیع تھے۔ ۸ مسجدیں صرف نماز جمعہ کے لئے اتنی وسیع بنوائیں کہ ہر مسجد میں دس ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے تھے۔ یہ مسجدیں امراء نے تعمیر کرائی تھیں جو انھیں کے نام سے موسوم کی گئیں (کہا جاتا ہے کہ دہلی کی موجودہ کالی مسجد اور مسجد ترکمان دروازہ انھیں مسجدوں میں سے ہیں) جب تک فیروز شاہ زندہ رہا، دہلی اور فیروز آباد کے درمیان کثرت سے لوگوں کی آمد و رفت جاری رہی اور ہر وقت اس پانچ کوس کے اندر میلا سا لگا رہتا تھا۔ صبح نماز کے وقت سے اونٹ، گھوڑے، خچر، گاڑیاں، چھکڑے، پالکیاں، طیار رہتی تھیں اور لوگ دہلی سے فیروز آباد اور فیروز آباد سے دہلی تک آیا جایا کرتے تھے۔ گاڑی کا کرایہ چار جیتل، اونٹ کا ۶ جیتل، گھوڑے کا بارہ جیتل، پالکی کا نصف تنکہ تھا۔

[4] جب فیروز شاہ دوبارہ لکھنوتی کی مہم پر گیا اور قنوج و اودھ ہوتا ہوا اس مقام پر پہونچا جہاں اب جونپور ہے تو یہاں اسنے مناسب جگہ دیکھ کر ایک شہر آباد کرنا چاہا چنانچہ اس نے ساحل گومتی پر ۶ ماہ کے اندر ایک شہر تعمیر کرایا اور اپنے آقا و برادر عم زاد سلطان محمد تغلق کے نام پر (جسے جوناخاں بھی کہتے تھے) اسکا نام جوناپور رکھا جو بعد کو کثرت استعمال سے جونپور ہوگیا۔ یہ شہر بعد میں مشرقی سلطنت کا پایۂ تخت ہوگیا جس کا حال آپ آیندہ معلوم کریں گے۔

اس نے پانی کے بند بھی کثرت سے بنوائے۔ ان میں "بند فتح خاں" "بند مالچا" "بند مہپالپور" بند شکر خاں، بند سالورہ اور بند وزیر آباد، بہت مشہور ہیں اور چھوٹے چھوٹے بندوں کا کوئی شمار نہیں ہے۔

دہلی اور فیروز آباد میں اس نے ایک سو بیس خانقاہیں اور سرائیں تعمیر کرائیں یہ ہمیشہ مسافروں سے بھری رہتیں اور بادشاہ کی طرف سے سب کو کھانا وغیرہ دیا جاتا تمام مصارف خزانہ شاہی سے نقد دئے جاتے تھے اور ایک امیر، ان کا متولی تھا۔

فیروز آباد میں اس نے اپنے دربار کے لئے تین محل تیار کئے تھے ایک کا نام "محل صحن گلی" اس کو محل انگوری بھی کہتے تھے۔ دوسرے کا نام "محل چھجہ چوبیں" تھا اور تیسرے کو "محل بار عام" کہتے تھے (صحن میانگی اس کا دوسرا نام تھا) پہلے محل میں صرف خوانین، ملوک، امراء، اور خاص خاص اہل قلم سے ملاقات ہوتی تھی۔ دوسرا محل گویا خلوتکدہ تھا اور نہایت ہی مخصوص امراء کے ساتھ وہاں نشست ہوتی تھی، تیسرا محل عام دربار کے لئے تھا۔[۱]

فیروز شاہ کو باغوں کا بھی بہت شوق تھا، دہلی کے قریب اسنے بارہ سو باغات نصب کرائے اور علاؤالدین کے زمانے کے تیس باغات کو بھی از سر نو آباد کر کے بہت ترقی دی۔ اسی طرح سلورہ کے قریب اس نے ۸۰ باغ طیار کرائے اور چتور میں چوالیس تمام باغوں میں علاوہ اور میووں اور پھلوں کے صرف انگور سات قسم کے پیدا ہوتے تھے اور بحساب فی سیر ایک جیتل فروخت کئے جاتے تھے۔ اسی ہزار تنکہ صرف ان پھلوں کی آمدنی تھی۔ جب حصار فیروزہ میں نہر کا پانی آنے لگا تو یہاں بھی کثرت سے باغات نصب کرائے۔

فیروز شاہ کے تمام کاموں میں جو رفاہ عام سے متعلق ہیں سب سے بڑا اور اہم کام نہروں کا اجراء تھا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حصار فیروزہ[۲] جس جگہ بنایا گیا تھا وہاں پانی کی بہت تکلیف تھی اس لئے اس نے، یہ مصیبت دور کرنے کے لئے اور نیز مزارعین کو فایدہ پہونچانے کے لئے دو نہریں بنوائیں۔ ایک نہر اس نے دریائے جمن سے نکالی جسکا نام اسنے رجیواہ (رجیواہ) رکھا اور دوسری نہر دریائے ستلج سے جس کا نام الغ خانی تھا۔ یہ دونوں نہریں کرنال کے قریب ہو کر گزرتی تھیں اور ۸۰ کوس کے بعد دونوں ملکر شہر فیروزہ حصار میں پہونچتی تھیں۔[۳]

---

[۱] فیروز شاہ نے دہلی کا قیام ترک کر دیا تھا اور فیروز آباد ہی میں رہا کرتا تھا۔ جب دربار وغیرہ کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ ان محلات میں آتا تھا۔ دربار میں تمام امراء کی جائے نشست مقرر تھی۔ خان جہاں وزیر تخت سے متصل داہنی جانب بیٹھتا تھا اور سراج عفیف (مصنف تاریخ فیروز شاہی) بھی کبھی کبھی دربار میں شریک ہوتا تھا۔ [۲] قبل اجراء نہر فیروزہ حصار میں بوجہ قلت آب صرف خریف کی فصل ہوتی تھی اور وہ بھی ناقص لیکن جب نہر جاری ہو گئی تو ربیع و خریف دونوں فصلیں نہایت اچھی ہونے لگیں۔ ان نہروں سے ہزاروں بیگہ زمین کی آبپاشی ہوتی تھی اور وہ وسیع رقبہ جو نہروں کے قرب و جوار میں تھا چند دنوں کے بعد حد درجہ زرخیز اور آباد نظر آنے لگا۔ [۳] اصل عبارت سراج عفیف کی یہ ہے:۔ "یک جوئے از لب آب جون کشیدہ، و جوئے دوم از دہانہ لب آب ستلج آوردہ از لب آب جون، چنانچہ رجیواہ و جوئے الغ خانی دہانہ ایں ہر دو جوئے از اتصال کرنال بیرون آوردہ میان ہشتاد کروہ کردہ در شہر حصار فیروزہ بردہ۔"

نہرِ جیواہ جس کا اوپر ذکر ہوا اب بھی موجود ہے اور پورے ۲۰۰ میل کے رقبہ زمین میں اس وقت بھی آبپاشی ہوتی ہے اسی طرح نہر ستلج اب بھی روپڑ اور سرہند کے درمیان موجود ہے۔

سنہ ۱۸۲۳ء میں کرنل کالون نے نہر جیواہ کے متعلق تحقیق کی تھی جس سے معلوم ہوا تھا کہ اس نہر کی تعمیر اس جگہ سے شروع کی گئی تھی جہاں سے جمنا نکلی ہے (اب اس مقام کا نام بادشاہ محل ہے) اور چھپروَلی، بوریہ، ہوتی ہوئی کرنال تک آئی تھی اور یہاں سفید ندی[1] کے قریب دریائے چتانگ کی مشرقی شاخ سے مل کر ہانسی اور حصار تک چلی گئی تھی۔[2]

اس نہر کا ثبوت عہدِ اکبری کی ایک سند (سنہ ۹۷۱ھ) سے بھی ملتا ہے جس کے شروع میں لکھا ہے کہ "دریائے چتانگ سے ۲۱۰ سال ہوئے سلطان فیروز شاہ نے نہر نکالی تھی۔ نالوں وغیرہ کا پانی بہتا ہوا سادھورہ[3] کے قریب ہانسی، حصار کی پہاڑی کے دامن میں پہونچتا ہے"۔

علاوہ ان نہروں کے فیروز شاہ نے اور بھی متعدد نہریں جاری کی تھیں جن میں سے ایک کا ذکر تیمور نے اپنی ملفوظات میں قلعہ لونی کا حال لکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "قلعۂ لونی دریائے جمنا اور ہنڈون کے درمیان واقع ہے۔ ہنڈون حقیقتاً ایک بڑی نہر ہے جسے فیروز شاہ نے دریائے کالی ندی سے نکال کر فیروز آباد کے محاذ میں جمنا سے ملا دیا تھا۔

ان تمام بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ کو عمارات اور رفاہ عام کے کاموں کی طرف بہت توجہ تھی اور اس نے کثرت سے اس قسم کی عمارتیں بنوائیں جن سے پبلک کو فایدہ پہونچے۔

آثار قدیمہ کو محفوظ رکھنے کا خیال سب سے پہلے سلطنت ہند میں فیروز شاہ کو پیدا ہوا اور اس خیال کے ماتحت جن جن عمارتوں کی اس نے مرمت کرائی ان کا ذکر خود اس نے اپنی فتوحات میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "پرانی عمارتیں جو خراب و ویران ہو گئی تھیں میں نے ان کی مرمت کرائی اور ان کی آبادی کو میں نے اپنے محلات میں تعمیر پر مقدم جانا۔ چنانچہ:-

(۱) دہلی کی جامع مسجد جو سلطان معز الدین سام نے تعمیر کرائی تھی اور کہنگی کے سبب سے خراب ہو گئی تھی میں نے اس کو بالکل نیا کرا دیا۔ (۲) سلطان معز الدین سام کے مقبرہ کی مغربی دیوار بوسیدہ ہو گئی تھی میں نے اس کو از سر نو تعمیر کرایا اور منقش محرابیں صندل کی لگوا دیں۔ سلطان معز الدین کا مینار بھی بجلی سے گر پڑا تھا میں نے اس کو پہلے سے بھی زیادہ بلند بنوا دیا۔

(۳) حوض شمسی (سلطان التمش کے حوض) میں بعض شریر آدمیوں نے پانی آنے کی راہیں بند کر دی تھیں، میں نے ان لوگوں

---

[1] دریائے چتانگ، ہندوؤں کے متبرک دریاؤں میں سے شمار ہوتا ہے

[2] اس نہر سے بعد کو سترھویں صدی عیسوی میں علی مردان خاں نے ایک شاخ دہلی کے اندر پہونچائی۔

[3] سادھورہ ضلع انبالہ کا ایک قصبہ، جو جمنا سے ۲۰ میل جانب مغرب واقع ہے۔ اس کے قریب مرکنڈا ندی بہتی ہے لیکن چتانگ دریا کے چشمے بھی اس سے آٹھ میل کے فصل پر پائے جاتے ہیں۔

کو سزادی اور باقی کے منبع پھر جاری کردئے۔ اسی طرح حوض علائی (سلطان علاء الدین کا حوض) مٹی سے بھر گیا تھا۔ اور وہاں کھیتی ہونے لگی تھی میں نے اس کو بھی صاف کرایا۔ (۴) سلطان التمش کا مدرسہ (جو التمش کے مقبرہ سے ملحق تھا) بالکل خراب ہوگیا تھا میں نے اُسے بھی از سر نو بنایا اور صندل کے دروازے اس میں لگوادئے جو ستون گر گئے تھے ان کو پہلے سے زیادہ اچھا بنوایا، مقبرہ کا صحن مدور نہ تھا میں نے اُسے مدور کرادیا۔ چاروں برجوں کا پشتہ گر گیا تھا وہ بھی میں نے وسیع کرادیا (۵) سلطان شمس الدین کے بیٹے معز الدین سام کا مقبرہ جو ملک پور میں تھا بالکل کھنڈر ہوگیا تھا اور قبر کا کہیں نشان نہ تھا میں نے از سر نو برج کی تعمیر کرائی۔ اور احاطہ کی دیوار کھچوا کر قبر کا چبوترا بنوادیا۔ (۶) سلطان شمس الدین کے بیٹے سلطان رکن الدین کا مقبرہ جو ملک پور میں تھا بالکل خراب ہوگیا تھا میں نے اس کی دیوار احاطہ کھنچوائی اور نیا گنبد بنوا کر ایک خانقاہ بھی وہیں تعمیر کرادی۔ (۷) سلطان علاء الدین کے مقبرہ کی مرمت کرائی اور صندلی دروازے اس میں لگوادئے آبدار خانہ کی دیوار اور مدرسہ کے اندر جو مسجد تھی اس کی مغربی دیوار بنوائی اور چوبڑ کا فرش طیار کرایا۔ (۸) سلطان قطب الدین کا مقبرہ اور سلطان علاء الدین کے بیٹوں، خضر خاں، شادی خاں، فرید خاں، سلطان شہاب الدین، سکندر خاں، محمد خاں، عثمان اور اس کے پوتوں اور پرپوتوں کے مقبروں کی مرمت کرائی اور از سر نو تعمیر کرایا۔ (۹) شیخ الاسلام نظام الدین (اولیا) کے مقبرہ کے دروازہ اور قبر کی صندلی جالیاں خراب ہوگئی تھیں ان کی مرمت کرائی اور چاروں محرابوں میں سونے کے جھاڑ طلائی زنجیروں سے آویزاں کرادئے ایک مجلس خانہ[1] بھی بنوادیا جو اس سے قبل نہیں تھا۔ (۱۰) سلطان علاء الدین کے وزیر اعظم تاج الملک کافوری کی قبر ہموار ہوگئی تھی اور گنبد گر پڑا تھا میں نے اس کی بھی از سر نو تعمیر کرائی۔ (۱۱) دار الامان (یہ بڑے بڑے آدمیوں کے دفن ہونے کی جگہ تھی) میں نئے دروازے صندل کے لگوائے اور مشہور آدمیوں کی قبروں کے غلاف اور پردے بنوائے۔ (۱۲) سلطان محمد تغلق نے "جہاں پناہ"[2] کی بنیاد ڈالی تھی میں نے اُسے مکمل کرادیا کیونکہ سلطان محمد تغلق میرا مربی اور اُستاد تھا۔ (۱۳) دہلی میں اگلے بادشاہوں نے جتنے قلعے اور حصار بنوائے تھے ان سب کی میں نے مرمت کرائی۔ (۱۴) ان مدرسوں و مقبروں کی تعمیر کا خرچ ان کی قدیم املاک اوقاف کی آمدنی سے کیا گیا بعض عمارتیں ایسی بھی تھیں جن کے فرش، روشنی اور مسافرین و زائرین کی مہمان نوازی کے لئے کوئی آمدنی نہ تھی، میں نے ان کے لئے دیہات وقف کئے تاکہ ان کی آمدنی سے مصارف پورے ہوتے رہیں۔ (۱۵) نامور سلاطین اور اولیاء کے مقابر کے لئے دیہات وقف تھے میں نے ان کو بدستور قایم رکھا اور بعض جدید مقابر و مزارات کے لئے بھی زمین وقف کردی۔ (۱۶) میں نے دار الشفاء بھی تعمیر کرایا اسمیں

---

[1] اس وقت مزارات اولیاء کے ساتھ مجلس خانوں کی تعمیر کا عام رواج تھا شیخ صلاح الدین (عہد محمد تغلق کے مشہور بزرگ) کا مقبرہ جو موضع کھڑکی میں بنایا گیا تھا اس میں بھی مجلس خانہ شامل تھا۔ (آثار قدیمہ دہلی اسٹیفن)

[2] سلطان محمد تغلق نے قلعہ علائی سے قلعہ رائے پتھورا تک (جو سلطان جلال الدین فیروز خلجی کے وقت پُرانی دلی کے نام سے مشہور تھا) دو دیواریں شہر پناہ کے انداز پر بنائی تھیں ایک سرا ان دیواروں کا قلعہ علائی یا قلعہ سیری سے ملا دیا تھا اور دوسرا قلعہ رائے پتھورا سے اور اس کا نام جہاں پناہ رکھا تھا (آثار الصنادید)

اور نئے والے تمام طبقوں کے مریضوں کا علاج ہوتا ہے اطبا رحاذق تشخیص امراض و معالجہ کے لئے مقرر ہیں اور غذا دوا وغیرہ سب جایداد موقوفہ کی آمدنی سے مہیا کی جاتی ہے۔"

فیروز شاہ نے جو مدارس قایم کئے تھے ان میں سے ایک فتح خاں کے مقبرہ کے پاس تھا جسے "قدم شریف"[1] کہتے ہیں۔ اسی کے متصل ایک مسجد بھی تھی اور ایک حوض بھی۔ فتح خاں، فیروز شاہ کا بہت محبوب فرزند تھا اور یہ مدرسہ مع مسجد کے اسی کی یادگار میں تعمیر کیا گیا تھا۔

دوسرا مشہور مدرسہ فیروز آباد میں تھا جو "فیروز شاہی مدرسہ" کے نام سے مشہور تھا۔ ضیاء برنی نے لکھا ہے کہ "یہ مدرسہ بلحاظ عمارت و تعلیم اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔"

اس مدرسہ کی عمارت بہت وسیع تھی اور اس کے گنبد بڑے شاندار تھے۔ یہ مدرسہ ایک بہت بڑے باغ کے اندر تالاب کے کنارے واقع تھا ہر وقت سیکڑوں طلبہ اور کثیر علماء و فضلاء یہاں موجود رہتے تھے اور سارا باغ ان کے لئے وقف تھا۔ یہاں ان کی تعلیم و تعلم، درس و تدریس، عبادت و تفریح کے لئے مکانات بنے ہوئے تھے اور وہ نہایت آزادی کے ساتھ تالاب کے کنارے باغ کے کنجوں میں سنگ مرمر کے صیقل کئے ہوئے فرش پر اپنے مشاغل علمیہ میں منہمک نظر آتے تھے[2]۔

اس مدرسہ سے متعلق ایک مہمان خانہ بھی تھا جہاں سیاح آکر قیام کرتے تھے اور مسجد مدرسہ کے ساتھ ایک لنگر خانہ یا خیرات خانہ بھی تھا جس سے تمام غربا اور مساکین کو امداد ملتی تھی[3]۔

فیروز شاہ کے تمام کاموں میں سے سب سے زیادہ اہم اور موجودہ تہذیب کے نقطۂ نظر سے بے انتہا قابل قدر کام یہ ہے کہ اس نے قدیم عہد کے دو سنگین مینار میرٹھ اور خضر آباد کے قریب سے اُکھڑوا کر کوشک شکار میں نصب کرائے یہ دونوں مینارے ۲۰۰ سال قبل مسیح کے ہیں۔ جن پر پالی حروف میں اسوکا (بدھ مذہب کے بہت بڑے مبلغ) کے احکام مذہبی منقوش ہیں جب یہ دونوں مینار دہلی پہنچے تو فیروز شاہ نے تمام پنڈتوں کو جمع کیا لیکن کوئی منقوش عبارت کو نہ پڑھ سکا[4]۔

---

[1] قدم شریف موجودہ دہلی کے "لاہوری دروازہ" سے ڈیڑھ میل جانب جنوب واقع ہے۔

[2] مسٹر اسٹیفن نے دہلی کے آثار قدیمہ پر ریویو کرتے ہوئے ایک مدرسہ کا ذکر کیا ہے کہ "۷۵۳ھ - ۱۳۵۲ء میں فیروز شاہ نے ایک مدرسہ، حوض علائی کے قریب تعمیر کرایا تھا اب یہ عمارت مدرسہ شکستہ حالت میں ہے اور گاؤں کے لوگ یہاں رہتے ہیں اس مدرسہ کے متولی سید محمد سف بن جمال نے ۱۲۸۹ھ میں انتقال کیا" یقیناً یہ مدرسہ "مدرسۂ فیروز شاہی" سے علحدہ تھا کیونکہ حوض علائی کسی باغ کے اندر نہ تھا اور "فیروز شاہی مدرسہ" کا باغ کے اندر پایا جانا ثابت ہے۔ حوض علائی اب بھی موجود ہے اور اس کے مشرقی جانب متعدد عمارتیں ہیں انھیں میں مقبرہ فیروز شاہ کی عمارت بھی (مع ایک مسجد و مدرسہ کے) پائی جاتی ہے۔ [3] تاریخ فیروز شاہ برنی۔ [4] اب مسٹر جیمس پرنسپ نے جو آثار قدیمہ کے مشہور ماہر تھے ان کتبوں کو پڑھ لیا ہے ان میں بودھ مذہب کی کچھ ہدایات درج ہیں اور خاص خاص مذہبی اصول بتائے گئے ہیں۔

ہر چند یہ دونوں مینار ہندو یا بودھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے، لیکن فیروز شاہ نے بے انتہا کاوش و سعی محنت و صرف سے ان دونوں میناروں کو اپنی دارالحکومت میں منتقل کرایا۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ آثار قدیمہ کی حفاظت کا فطری ذوق رکھتا تھا اس مسئلہ میں بھی وہ مذہبی تعصب سے کام لیتا تھا۔ بالکل ممکن تھا کہ وہ ان دونوں میناروں کو مسمار کرا کے تباہ کرا دیتا، یا یہ کہ وہ ان کی حفاظت نہ کرتا اور وہ خود ٹوٹ کر پامال و معدوم ہو جاتے لیکن فیروز شاہ نے ایسا نہیں کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا یہ احسان ایسا معمولی نہیں ہے جسے آثار قدیمہ اور بودھ مذہب فراموش کر سکے۔

اس قدر بیان سے یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ فیروز شاہ کو عمارات کا بڑا شوق تھا۔ ہمارے پاس کوئی مکمل فہرست ان تمام

---

[1] ٹھٹہ کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد فیروز شاہ نے دوران سیر و شکار میں خضر آباد کے قریب (جو دہلی سے ۹۰ کوس کے فصل پر واقع ہے) ایک گاؤں (توپرہ) میں ایک سنگین منار پہاڑی پر نصب دیکھا اور ارادہ کیا کہ اسے دہلی لے جائے چنانچہ اس نے قرب وجوار کے تمام لوگوں کو جمع کیا اور فوج کو بھی طلب کیا اس کے بعد اس نے سیمل روئی منگوا کر مینار کے گرد لپیٹی، زمین پر چاروں طرف موٹے موٹے تکیے اس روئی کے زمین پر بچھوا دئے اور پھر زمین کھدوا کر مینار کو اس نرم جگہ پر لٹا دیا۔ اس کی بنیاد کے نیچے ایک بڑا چوکور پتھر تھا اسے بھی کھود کر نکالا۔ خیر یہاں تک تو کوئی ایسا دشوار کام نہ تھا، لیکن بڑی دقت اس مینار کو دہلی تک لیجانے میں تھی، بادشاہ نے اس غرض کے لئے ایک چھکڑا ۴۲ پہیوں کا طیار کرایا اور ہر پہیہ کے دھرے میں مضبوط رسے بندھوائے اور ہر رسے پر ۲۰۰ آدمی کھینچنے والے متعین کئے۔ اس طرح وہ ساحل جمنا تک لایا گیا یہاں بڑی بڑی کشتیاں (جن میں سات سات ہزار من غلہ لادا جاتا تھا) مہیا کی گئیں اور ان پر یہ مینار نہایت احتیاط سے بار کر کے فیروز آباد تک لایا گیا (بادشاہ خود اس اہتمام کے وقت موجود تھا)، یہاں جامع مسجد کے قریب پتھر چونے کی ایک عمارت پایہ دار بنائی گئی جب ایک پایہ بن جاتا تو مینار اس پر چڑھایا جاتا پھر دوسرا پایہ بن جاتا تو اس پر رکھا جاتا اس صورت سے وہ اوپر تک پہونچایا گیا۔ اس کو سیدھا کرنے میں بڑی محنت صرف کی گئی اس کے سرے میں رسا باندھا گیا اور رسے کا دوسرا سرا چرخ میں باندھ کر اس کو گھمایا گیا۔ جب مینار آدھ گز بلند ہو جاتا تو اسکے نیچے سیمل روئی کے تکیے رکھے جاتے اور وہ بلند کیا جاتا اسی طرح جب وہ سیدھا عمود کی طرح کھڑا ہو گیا تو بنیاد میں پہلے وہی چوکور پتھر رکھا گیا اور اسکے بعد وہ مینار نصب کیا گیا۔ مینار کے گرد سنگ مرمر اور عباسی کا کام کیا گیا چوٹی پر سونے کا کلس لگایا گیا (اس لئے اس کو مینار زریں کہتے ہیں) اب بھی یہ مینار دہلی میں کوشک فیروز شاہ کے اندر (جسے کوٹلہ کہتے ہیں) موجود ہے۔ سراج عفیف نے لکھا ہے کہ اس کا طول ۳۲ گز تھا (۸ گز زمین کے اندر اور ۲۴ گز باہر) مگر اب اس کا طول ۴۲ فٹ ۷ انچ ہے جس میں سے چار فٹ ایک انچ زمین کے اندر ہے۔

دوسرا مینار میرٹھ میں تھا لیکن یہ کچھ چھوٹا تھا۔ بادشاہ نے اسے بھی نہایت احتیاط سے منتقل کرا کے کوشک شکار میں نصب کیا۔ جب یہ مینار نصب ہو گیا تو بادشاہ نے بڑا جشن کیا اور پبلک کو عام اجازت اسکے دیکھنے کی دی گئی۔ شربت کی سبیل قائم کی جو کوئی دیکھنے آتا اُسے شربت پلایا جاتا۔ فرخ سیر کے عہد میں بارود اُڑنے کی وجہ سے اسکے پانچ ٹکڑے ہو گئے لیکن انگریزوں نے اس کو جوڑ کر پھر ہندو راؤ کے باڑے میں نصب کیا جہاں وہ اب تک موجود ہے۔

عمارات کی نہیں ہے جو فیروز شاہ نے تعمیر کرائیں۔ البتہ فرشتہ نے اور صاحب طبقات اکبری نے حسب ذیل فہرست مرتب کی ہے:۔
۵ بند جن سے آب پاشی ہوتی تھی ـــ ۴۰ مسجدیں ـــ ۳۰ مدارس جن کے ساتھ مسجدیں بھی تھیں ـــ ۲۰ خانقاہیں ـــ ۱۰۰ محل ـــ ۵ شفاخانے ـــ ۱۰۰ مقبرے ـــ ۱۰ حمام ـــ ۱۵۰ کنوئیں ـــ ۱۰۰ پل

فہرست مرتبۂ طبقات اکبری:۔ ۵ بند (غالباً ۵۰) ـــ ۴ ساجد (غالباً ۴۰) ۳۰ مدرسے ـــ ۲۰ خانقاہیں ـــ ۱۰۰ محل ـــ ۲۰۰ رباط (کارواں سرائے) ـــ ۳ شہر ـــ ۴ حوض ـــ ۴ شفاخانے ـــ ۱۰۰ مقبرے ـــ ۱۰ حمام ـــ ۱۰ مینارے ـــ ۱۵۰ کوئیں ـــ ۱۰۰ پل ـــ باغوں وغیرہ کا کوئی شمار نہیں ہے ان میں سے ہر عمارت کے لئے اس نے جائداد وقف کی تاکہ وہ خراب نہ ہونے پائے اور اس کے مصارف پورے ہوتے رہیں۔

مدارس کے متعلق مورخین کا اختلاف ہے ماٰثر رحیمی[1] میں پچاس مدرسے درج ہیں۔ فقیر محمد لکھتے ہیں کہ طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ میں تیس کی تعداد درج ہے۔ اگر ان میں سے کوئی تعداد صحیح نہ ہو تو بھی اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اسنے متعدد مدرسے قایم کئے۔

ان شفاخانوں کا جو انتظام تھا اس کا حال خود فیروز شاہ نے اپنی فتوحات میں لکھدیا ہے اور جسے ہم درج کر چکے ہیں۔

غربا کے فایدہ و سہولت کے لئے اس نے دیوان خیرات بھی قایم کیا تھا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ جن غربا و مساکین کی لڑکیاں جوان ہوگئی ہوں اور بوجہ افلاس ان کی شادی نہ ہو سکتی ہو انھیں امداد دیجائے۔ پچاس سے پچیس تنکہ تک ہر شخص کی مدد کی جاتی تھی۔ سراج عفیف لکھتا ہے کہ "اس سلسلہ میں ہزار آدمیوں کی اعانت کی گئی اور خدا جانے کتنی ناکتخدا لڑکیوں کی شادی ہوگئی"۔

یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ علماء و مشائخ کے لئے اس نے ۳۶ لاکھ تنکہ کے وظایف مقرر کئے (مقابر کے لئے ایک لاکھ تنکہ اسکے علاوہ تھے) لیکن اس نے خدمت علم صرف اسی حد تک نہیں کی، بلکہ تصانیف کی طرف بھی خاص توجہ کی جب سلطان نے نگرکوٹ[2] فتح کرنے کے بعد وہاں کے راجہ کو بدستور حکمراں قایم رکھا تو اس نے چند دن وہاں قیام بھی کیا۔ اس دوران میں اس سے لوگوں نے کہا کہ جب سکندر ذوالقرنین یہاں آیا تھا تو برہمنوں نے نوشابہ (سکندر بی بی) کا بت طیار کر کے اسکی پرستش

---

[1] ماٰثر رحیمی کا مصنف محمد عبدالباقی الرحیمی النہاوندی تھا۔ یہ عہد اکبری کے خاص لوگوں میں اور عبدالرحیم خان خاناں کے متوسلین خصوصی میں سے تھا۔ اس کتاب میں سلاطین دہلی کی تاریخ درج ہے اور خصوصیت کے ساتھ عہد اکبری کے امراء و ملوک کے حالات نہایت تفصیل سے درج کئے گئے ہیں۔ عبدالرحیم خانخاناں کے حالات اس قدر شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہیں کہ بعض لوگوں نے اسکو خانخاناں ہی کی سیرۃ قرار دیدیا۔ چونکہ یہ کتاب عبدالرحیم خانخاناں کے نام منسوب ہے اسی لئے اس کا نام ماٰثر رحیمی رکھا گیا۔ [3] فتح کے بعد نگرکوٹ کا نام اسنے سلطان محمد تغلق کی یادگار میں (کیونکہ تغلق یہاں آیا تھا) محمد آباد رکھا۔ [2] نگرکوٹ آنے سے قبل فیروز شاہ سرہند کی طرف فتوحات میں مصروف تھا اور وہاں اس نے ایک قلعہ فیروز پور کے نام سے تعمیر کرایا تھا۔

شروع کر دی تھی۔ چنانچہ اب بھی یہاں کے لوگ اسی مجسمہ کو پوجتے ہیں، علاوہ اس کے فیروز شاہ سے یہ بھی کہا گیا کہ مندر میں ۱۳۰۰ کتابیں قدیم زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں۔ چنانچہ فیروز شاہ اس بت خانہ[1] میں جس کو "جوالا مکھی" کہتے تھے گیا اور وہاں تمام علماء کو طلب کر کے بعض کتابوں کا ترجمہ کرایا، انھیں کتابوں میں سے ایک کتاب حکمت نظری و عملی کی تھی جس کو اعز الدین خالد خانی نے (جو اسوقت کے مشہور شعراء میں سے تھا) نظم کر کے دلایل فیروز شاہی نام رکھا[2] ایک کتاب عروض علم موسیقی کی اور ایک فن پٹہ بازی کی بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ کے عہد میں حاکم و محکوم کے درمیان ایسے تعلق پیدا ہو گئے تھے کہ ایک دوسرے کی زبان کو سیکھتا تھا اور تعصب بڑی حد تک مٹ چکا تھا۔ ضیاء برنی کی تاریخ فیروز شاہی (جس میں عہد فیروز شاہی کے ابتدائی دس سال کے حالات بھی درج ہیں) اسی کے عہد میں ختم ہوئی تفسیر تاتارخانی[3] فتاوائے تاتارخاں (جو فن تفسیر و فن فقہ کی بے مثل کتابیں ہیں) اور عین الملکی[4] بھی اسی عہد کی مشہور تصانیف ہیں۔

---

[1] جوالا مکھی، کوہ آتش فشاں کو کہتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مندر میں کوئی آتشکدہ قائم تھا اور وہاں آتش پرستی ہوتی تھی۔ [2] فرشتہ ۱۴۸۔

[3] غیاث الدین تغلق کے عہد میں خراسان کے فرمانروا نے ملتان اور دیپال پور پر حملہ کیا اسکی بیوی بہت خوبصورت تھی جس سے وہ ایک لمحہ کے لئے جدا نہ ہو سکتا تھا اور ساتھ ساتھ رکھتا تھا۔ چنانچہ حملۂ ملتان کے وقت بھی وہ ہمراہ تھی یہیں اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا جب سلطان تغلق نے مغلوں کو شکست دی اور فرمانروائے خراسان بھاگا تو اضطراب میں یہ لڑکا یہیں رہ گیا۔ محمد تغلق نے اسکی پرورش اپنے بچوں کی طرح کی اور اس کا نام تاتار ملک رکھا وہ ابھی کمسن ہی تھا کہ سلطان محمد تغلق کا انتقال ہو گیا۔ لیکن محمد تغلق نے بھی اس کی تربیت کا خاص خیال رکھا بعد کو تاتار ملک نے اپنی قابلیت سے بہت جلد مناسب جلیلہ حاصل کئے فیروز شاہ کے عہد میں تاتارخاں کا خطاب ملا۔ اس کو علم کی طرف بہت شغف تھا اور خود بھی ایک فاضل شخص تھا اس نے اس عہد کے تمام اکابر علماء و فقہاء کو جمع کر کے فن تفسیر میں ایک کتاب تفسیر تاتارخانی اور ایک کتاب فقہ میں فتاوائے تاتارخانی مرتب کرائی۔ فیروز شاہ کی تخت نشینی کے چند سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

[4] عین الملک کا نام عین ماہرو بھی تھا۔ یہ نہایت قابل و ذہین شخص تھا سلطان محمد تغلق کے عہد میں ایک بار اس کے بھائیوں کی طرف سے کوئی نامناسب حرکت سرزد ہوئی تھی تو سارے خاندان پر زوال آ گیا تھا لیکن اسکے بعد ایک بار محمد تغلق دربار کر رہا تھا کہ اسکی نگاہ عین پر پڑی، چونکہ محمد تغلق اسکی ذاتی قابلیت سے واقف تھا اس لئے اس کا قصور معاف کر کے پھر دربار میں اس کو جگہ دی۔ اس نے محمد تغلق اور فیروز شاہ کے عہد میں متعدد تصانیف کیں انھیں میں سے ایک عین الملکی ہے۔

فیروز شاہ کے عہد میں یہ اشرف الملک کے درجہ تک پہونچ گیا تھا لیکن کسی بات پر خان جہان وزیر اور اسکے درمیان کچھ نا اتفاقی ہو گئی اور یہ اختلاف اس حد تک پہونچ گیا کہ فیروز شاہ نے مجبور ہو کر اسے ملتان، بھکر اور سوستان کی جاگیر دیکر دربار سے چلے جانے کا حکم دیا۔ عین الملک نے کہا کہ میں صرف اس شرط سے اس جاگیر کو قبول کرتا ہوں کہ اس کا حساب خان جہاں کے پاس نہ بھیجوں گا۔ بادشاہ نے یہ بھی منظور کیا جب اور درباریوں کو یہ معلوم ہوا تو وہ ڈرے کہ کہیں خان جہاں ان پر بھی حملہ کرے اسلئے انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ خان جہاں کے حوصلوں کا اس قدر وسیع کر دینا مناسب نہیں ہے اور عین الملک کا دربار سے علحدہ رہنا خلاف مصلحت ہے چنانچہ وہ ابھی صرف ۲۰ کوس گیا ہوگا کہ فیروز شاہ نے اُسے طلب کیا اور خلوت میں بلا کر خان جہاں کی بابت مشورہ کیا اور لوگ بھی موجود تھے سب نے یہی رائے دی کہ خان جہاں کو وزارت سے علحدہ کر دینا چاہیئے لیکن عین الملک نے اسکی مخالفت کی اور فیروز شاہ سے کہا کہ خان جہاں سے زیادہ مناسب شخص اور کوئی اس عہدہ کے لئے نہیں ہو سکتا اسکا ہٹا دینا سلطنت کے لئے بہت مضر ہوگا۔ فیروز شاہ اسکے اس انصاف پسندی سے بہت خوش ہوا اور بعد کو خان جہاں اور اسکے درمیان صفائی کرا دی۔ جب خان جہاں کو یہ معلوم ہوا کہ عین الملک نے باوجود دشمن ہونے کے بادشاہ سے اسکی تعریف کی تو وہ بہت گرویدہ ہو گیا اور عین الملک کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔

فیروز شاہ کے عہد میں بڑے بڑے علماء پائے جاتے تھے ان میں سے ایک مولانا جلال الدین رومی[1] تھے جو مدرسۂ فیروز شاہی کے پرنسپل تھے۔ دوسرے مولانا عالم آندرپتی جن کی نسبت مولانا عبدالحق دہلوی[2] نے لکھا ہے کہ فتاوائے تاتارخانی

---

[1] مشہور مثنوی کے مصنف مولانا روم دوسرے تھے۔ [2] مولانا عبدالحق بن سیف الدین دہلوی کی تاریخ حقی مشہور کتاب ہے اس میں سلاطین غلام خاندان سے لیکر اکبر تک کے حالات درج ہیں۔ یہ تاریخ ۱۰۰۵ھ میں (جب اکبر کی تخت نشینی کا بیالیسواں سال تھا) مرتب ہوئی مصنف کے آباو اجداد بخارا سے ہندوستان آئے تھے اور دہلی میں مقیم ہو گئے۔ مصنف بادشاہ نامہ لکھتا ہے کہ جب تیمور دہلی کی تاخت سے فارغ ہو کر اپنے وطن واپس گیا تو اسکے ساتھیوں میں سے کچھ لوگ یہاں رہ گئے تھے اور انھیں میں سے کسی کی اولاد میں عبدالحق ہیں۔ لیکن مولوی عبدالحق دہلوی کتاب اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں کہ میرا جد اعلےٰ آغا ترک علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں دہلی آیا۔ آغا ترک کا بوتا ماوراء النہر چلا گیا تھا اور پھر وہاں سے تیمور کے ساتھ آیا تھا۔ مسٹر مارشکاف نے اپنے مسودۂ تاریخ حقی میں لکھا ہے کہ ان کا مورث اعلےٰ بخارا سے دہلی آیا اور یہاں شاہی دربار سے متعلق ہو گیا بہر حال اس میں کلام نہیں کہ مولوی عبدالحق کے آباو اجداد بخاری تھے۔ اس لئے مولوی عبدالحق کے بیٹے "دہلوی البخاری" کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ مولوی عبدالحق کے والد ایک بزرگ آدمی تھے جن کی تعریف مصنف نے کی ہے۔ مولوی عبدالحق بیس سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ سے فارغ ہو گئے اور قرآن بھی حفظ کیا (بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری) دوران تعلیم کا حال بیان کرتے ہوئے وہ خود اپنی مشہور تصنیف اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں کہ وہ دونوں وقت مدرسہ جایا کرتے تھے اور صرف کھانا کھانے کے لئے تھوڑی دیر کو گھر آتے تھے ان کا گھر مدرسہ سے دو میل کے فصل پر تھا اسلئے شوق تعلیم میں یہ روزانہ ۸ میل کا سفر کیا کرتے تھے۔ دہلی چھوڑنے کے بعد کچھ عرصہ تک ملا عبدالقادر بدایونی، فیضی اور نظام الدین مؤلف طبقات اکبری کے ساتھ فتحپور سیکری میں رہے (تاریخ بدایونی) لیکن بعد کو کسی اختلاف کی بناء پر علحدہ ہو گئے اور حج کو چلے گئے بعد فراغ حج عرب میں عرصہ تک قیام رہا اور مدینہ و مکہ کے علماء سے بہت کچھ فیضان حاصل کیا۔ اصول تصوف، مذہب، سیاحت، تفسیر وغیرہ کی بہت سی کتابیں اُن کی تصنیف سے ہیں۔ خود انھوں نے اپنی تصانیف کی تعداد ایک سو بتائی ہے۔ ان میں سے مدینہ سکینہ، مدارج النبوت، جذب القلوب (تاریخ مدینہ) اور اخبار الاخیار بہت مشہور ہیں۔ مولوی عبدالحق ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۵۲ھ میں انتقال کیا۔ انھوں نے حوض شمسی کے پاس اپنا مقبرہ اپنی ہی زندگی میں طیار کرا لیا تھا۔ چنانچہ یہیں مدفون ہوئے (یہ مقبرہ اب بھی موجود ہے اور اچھی حالت میں ہے) مولوی عبدالحق بہت صحیح و توانا شخص تھے مؤلف بادشاہ نامہ کا بیان ہے کہ ۱۰۴۱ھ میں جبکہ ان کی عمر ۸۳ سال کی تھی انکے قوا نہایت اچھے تھے اور اپنے مشاغل تصنیف و تالیف میں اسی طرح مصروف تھے جیسے عالم شباب میں۔ مصنف کا بیان ہے کہ تاریخ لکھنے کا شوق انھیں ضیاء برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو دیکھ کر پیدا ہوا چونکہ تاریخ فیروز شاہی میں صرف فیروز شاہ تک کے حالات تھے اس لئے بعد کے سلاطین کے حالات انھوں نے تاریخ بہادر شاہی (مصنفہ حسام سلطان بہادر گجراتی) سے مدد لیکر بہلول لودی تک کی تاریخ مرتب کی اس کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ ان بادشاہوں کا حال بھی لکھنا چاہئے جن کی طرف ضیاء برنی نے اعتنا نہیں کیا ہے۔ اس غرض سے انھوں نے طبقات ناصری سے مدد لیکر فخر الدین سام (محمد غوری) کے حالات سے اپنی تاریخ کو شروع کیا۔ بہلول لودی کے وقت سے عہد اکبری کے حالات انھوں نے زیادہ تر زبانی روایات اور اپنے ذاتی معلومات کی بناء پر لکھے ہیں۔ انھوں نے سلاطین بنگال، جونپور، مانڈو (مالوہ) دکن، ملتان، سندھ و کشمیر کے حالات بھی لکھے ہیں لیکن نہایت مجمل و مختصر۔۔۔ تاریخ حقی کمیاب ہے اور ہندوستان میں اس کے قلمی نسخے شاذ و نادر کہیں کہیں پائے جاتے ہیں ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے اور دوسرا رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں

کی ترتیب میں انھیں کا خاص حصہ تھا۔ علاوہ ان کے مولانا خواجگی (قاضی شہاب الدین[1] دولت آبادی کے اُستاد) مولانا احمد تھانیسری اور قاضی عبدالمقتدر (جو علاوہ فاضل ہونے کے بے مثل شاعر بھی عربی و فارسی کے تھے اور جنھوں نے لامیۃ العجم کا جواب لکھکر شہرت دوام حاصل کرلی ہے) ملک احمد[2] ولد امیر خسرو اور مولانا مظہر[3] کڑوی اور قاضی عابد[4] بھی اپنی اپنی جگہ بے مثل علماء و صاحبان کمال میں شمار کئے جاتے تھے۔

---

[1] سلطان ابراہیم شرقی بادشاہ جونپور کے عہد میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے عروج حاصل کیا۔ قاضی صاحب اپنے عہد کے درخشندہ تسلیم کئے جاتے تھے اور اس وقت کے تمام علماء انھیں "ملک العلماء" کہا کرتے تھے کیونکہ ان سے زیادہ صاحب فضل وکمال اور کوئی شخص نہ تھا۔ قاضی صاحب کی تصانیف متعدد ہیں جن میں حواشی کافیہ (جو ان کی بہترین تصنیف کہی جاتی ہے) ارشاد، بدیع البیان خاص شہرت رکھتی ہے۔

[2] ملک احمد امیر خسرو کے صاحبزادے تھے اور مذاق شعری نہایت پاکیزہ رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کا کوئی دیوان اب نہیں پایا جاتا، لیکن شعرائے متقدمین کے کلام میں جو اصلاحیں انھوں نے دی ہیں وہ کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ بدایونی نے چند مثالیں لکھی ہیں مثلاً ظہیر کا شعر ہے:-

کلاہ گوشۂ حکم تو از طریق نفاذ　　　ربودہ از سر گردوں کلاہ جباری

انھوں نے ربودہ کو فگندہ سے بدل دیا۔ بخیل کی ہجو میں ایک شعر مشہور ہے:-

ایں سہل سہل بود کہ گو گرد سرخ خواست　　　گر نان خواہ خواستے آں راہ گردمی

ملک صاحب نے بجائے گوگرد سرخ کے آب حیات کر دیا۔ اسی طرح ایک اور شعر ہے:

گر مشک خواند خاک درت را فلک مریخ　　　نرخ گہر بہ طعن خریدار نشکند۔

ملک احمد نے پہلے مصرعہ کو یوں کر دیا:- "گر لعل خواند سنگ درت مشتری مریخ" (بدایونی، ۶۷) - (شعر العجم - ۲ - ۴۴)

[3] مولانا مظہر کڑوی کے متعلق بدایونی نے لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں مولانا مظہر کی اولاد لکھنؤ میں موجود تھی۔ مولانا دربار فیروز شاہ میں خاص عزت رکھتے تھے۔ ان کا ایک دیوان بھی ۱۵ ہزار اشعار کا تھا۔ لیکن چونکہ ان پر زہد و علم کا رنگ زیادہ غالب تھا اس لئے ملا بدایونی کے نزدیک اُن کے اشعار زیادہ پر لطف اور بامزہ نہ ہوتے تھے۔

[4] قاضی عابد شاعر بھی تھے چنانچہ ان کا یہ قطعہ بہت مشہور ہے اور حقیقتاً نہایت خوب ہے:-

دوستاں گویند عابد با چنیں طبع لطیف　　　چیست کاشعار غزل از تو فراداں برنخاست

ماکراشعر و غزل گوئیم چوں در عہد ما　　　شاہ موزوں و ممدوحی زرافشاں برنخاست

یہ قطعہ بالکل ترجمہ معلوم ہوتا ہے عربی کے اس قطعہ کا۔

قالوا ترکت الشعر قلت ضرورۃ　　　باب الدواعی والبواعث مغلق

خلت الدیار فلا کریم یرتجی　　　منہ النوال ولا ملیح یعشق

(لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کیا تو نے شعر گوئی ترک کر دی۔ میں جواب دیتا ہوں کہ ہاں کیونکہ اسباب شعر گوئی ناپید ہیں۔ نہ کوئی ایسا سخی ہے جس کی رحم میں شعر کے بخشش کی توقع قایم کی جائے اور نہ کوئی ایسا سبزہ رنگ معشوق ہی ہے جس کی محبت شعر کہنے پر مجبور کر دے۔)

فیروز شاہ کو تمام فنون کے ساتھ دلچسپی تھی چنانچہ اُستادوں کے ماتحت اس نے اپنے غلاموں کی بڑی تعداد کو مختلف پیشوں اور حرفوں کی تعلیم دلائی۔ اور لوگوں میں مختلف نئی نئی چیزیں بنانے کا ولولہ پیدا کر دیا اس عہد کے ایک مشہور ایجاد طاس گھڑیال ہے جس سے نمازوں کے اوقات روزہ کھولنے کا وقت سایہ کا حال، شب و روز کے گھٹنے بڑھنے کی کیفیت معلوم ہوتی تھی۔ فیروز آباد میں جہاں یہ گھڑیال لگا تھا وہاں اس کے دیکھنے کے لئے ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اس ایجاد کو خود فیروز شاہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ہر جشن کے موقعہ پر جو سال میں چار بار (عیدین، نوروز و شب برات) ہوتے تھے اور ہر جمعہ کو نماز کے بعد داستان گو، گوئے ماہرین رقص، پہلوان اور کرتب دکھانے والے جمع ہو کر اپنا کمال اور تماشہ دکھایا کرتے تھے۔ اور بادشاہ سب کو انعام دے کر رخصت کرتا تھا۔

فیروز شاہ کو قدیم اور نادر چیزیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا، چنانچہ اشوکا کے سنگین ستونوں کا فیروز آباد میں نصب کرنا بھی اسی ذوق کی بنا پر تھا۔ اس نے ایک خاص مکان اس لئے تعمیر کرایا تاکہ وہاں ایسی عجیب و غریب چیزیں رکھی جائیں۔

فیروز شاہ کا عجائب خانہ

سراج عفیف نے لکھا ہے کہ اس عجائب خانہ میں ایک پستہ قد شخص ایسا تھا جو صرف ایک گز لمبا تھا لیکن اس کا سر تین آدمیوں کے برابر تھا۔ دو آدمی دراز قامت تھے۔ یہ اتنے لمبے تھے کہ اُس وقت کا طویل سے طویل قد رکھنے والا آدمی ان کی کمر تک پہونچتا تھا۔ دو عورتیں ایسی تھیں جن کی داڑھی بالکل مردوں کی طرح تھی۔ ایک بکری تین پاؤں کی تھی جو خوب دودھ دیتی تھی۔ ایک سیاہ کوا اسرخ چونچ کا، ایک سپید طوطی سیاہ منقار کی ایک گائے جس کے سُم گھوڑے کی طرح تھے۔ اور علاوہ ان کے اور بہت سی چیزیں اس عجائب خانہ میں تھیں۔ آدمیوں اور ہاتھیوں کی وہ ہڈیاں بھی اس عجائب خانہ میں رکھی ہوئی تھیں، جو سرستی اور ستلج کے درمیان بشتۂ زمین کھودنے سے برآمد ہوئی تھیں۔ بعض ہڈیاں ایسی تھیں جو نصف پتھر ہو گئی تھیں۔

فیروز شاہ کے قتل کی سازش

جب فیروز شاہ، دہلی آکر انتظام سلطنت میں مصروف ہوا تو خداوند زادہ (سلطان محمد تغلق کی بہن) معہ اپنے شوہر کے وہیں ایک محل میں رہتی تھی، فیروز شاہ ہر جمعہ کو اس محل میں جاتا۔ ملک خسرو آگے کھڑا رہتا اور ملک داور (خداوند زادہ کا بیٹا) ماں کے پیچھے بیٹھتا۔ جب بادشاہ رخصت ہونے لگتا تو خداوند زادہ پان دیتی۔

ہر چند خداوند زادہ، فیروز شاہ کی تخت نشینی پر راضی ہو گئی تھی، لیکن حقیقتاً وہ اس سے خوش نہ تھی ایک بار اس نے فیروز شاہ کو قتل کر دینے کی سازش کی اور محل کے اندر حجرو [illegible] زرہ پوش سپاہیوں کو چھپا کر تاکید کر دی کہ جب میں اپنے سر پر دوپٹہ کو درست کروں تو تم لوگ فیروز شاہ کا کام تمام کر دیں۔"

جب فیروز شاہ حسب معمول آیا تو داور ملک نے جو اس سازش میں شریک نہ تھا بادشاہ کو چلے جانے کا اشارہ کیا یہ کچھ سمجھ کر فوراً وہاں سے چل دیا۔ خداوند زادہ روکتی رہی، مگر یہ کوئی عذر کر کے چلا آیا۔ اس کے بعد جب خداوند زادہ کے محل کا محاصرہ کیا گیا تو زرہ پوش سپاہی گرفتار ہوئے اور انھوں نے سارا حال بیان کر دیا۔ بادشاہ نے خداوند زادہ کو صرف یہ یہ سزا دی کہ

وہ گوشہ نشین ہو جائے اور اپنا وظیفہ لیتی جائے اور اس کے شوہر خسرو ملک کو جلاوطن کر دیا۔

جب بادشاہ اول مرتبہ بنگال کی مہم پر گیا تو تاتار خاں بھی ساتھ تھا۔ بادشاہ کبھی کبھی شراب کا شغل کیا کرتا تھا۔ ایک دن صبح کو اتفاق سے تاتار خاں اس کے خیمے میں پہونچ گیا۔ فیروز اس وقت اسی شغل میں مصروف تھا فوراً شراب کا سامان پلنگ کے نیچے چھپا دیا۔ لیکن تاتار خاں نے دیکھ لیا اور بادشاہ کو نہایت سختی سے زجر و توبیخ کی۔ بادشاہ بہت نادم ہوا اور آیندہ کے لئے عہد کیا کہ میں تمھاری موجودگی میں کبھی شراب نہ پیوں گا۔

تاتار خاں صرف ایک فوجی افسر تھا۔ لیکن یہ فیروز شاہ کی حد درجہ انصاف پسندی اور سلامت طبع تھی کہ اس نے اپنے ایک معمولی امیر کی جھڑکی سُن لی اور جواب میں سوائے انفعال و ندامت کے اظہار کے اور کچھ نہ کہا۔

بہلول لودی

بہلول لودی مذہب کا سخت پابند اور بے انتہا سخی و شجاع بادشاہ تھا۔ رحم و رافت اس کی فطرت تھی اور احکام شرع کی پابندی اس کا نصب العین۔ وہ اکثر علماء و مشایخ کو اپنی صحبت میں رکھتا اور غربا و مساکین کے حالات ہمیشہ تحقیق کرتا رہتا۔ اس نے کبھی کسی سایل کو محروم نہیں کیا۔

وہ پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ مسجد میں ادا کرتا اور لوگوں کی شکایتیں خود سنکر فیصلہ کیا کرتا تھا۔ وہ بے انتہا دانشمند تھا اور حد درجہ غور و تامل لطف و مہربانی سے کام لے کر انصاف کرتا تھا۔ (جو کچھ روپیہ، اسباب وغیرہ) اُسے ملتا وہ سب فوج کو تقسیم کر دیتا تھا، اور خود صرف خشک روٹی پر زندگی بسر کرتا تھا۔ دوستانہ صحبتوں میں وہ کبھی تخت پر نہ بیٹھتا اور نہ رؤسا کو اپنے سامنے کھڑا رہنے دیتا۔ وہ سب کو اپنے برابر جگہ دیتا اور اگر کوئی امیر ناراض ہو جاتا تو اسکے خوش کرنے کے لئے بعض اوقات یہاں تک ایثار سے کام لیتا کہ اس کے قدموں پر پگڑی تک ڈال دیتا۔

اس کی تخت نشینی سے پہلے دہلی کے پٹھانوں میں یہ رسم تھی کہ مُردہ کے سیوم میں مٹھائی، شربت اور پان وغیرہ تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس نے اس رسم کو بالکل ممنوع قرار دیا کیونکہ اس رسم میں فضول مصارف ہوتے تھے۔

اس کے ضبط کی عجیب و غریب شان وہ ہے جب ایک دن جامع مسجد کے اندر ایک مُلّا نے اس کو اور اس کے خاندان والوں کو صاف طور پر ذریات شیطان سے تعبیر کیا اور اس نے ہنس کر صرف یہ کہا کہ "ملا صاحب ہم سب تو بندگان خدا ہیں"[1]

تعمیرات کا بھی اسے شوق تھا لیکن اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ تاہم اگر یہ جدید تحقیق صحیح ہے کہ آگرہ کی بنیاد

---

[1] تاریخ داؤدی (الیٹ) - ۴ - صفحہ ۳۶ - ۳۷ -

اس نے رکھی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس لحاظ سے بھی اس نے اپنے کو غیر فانی بنا دیا[۱] لیکن تمام مورخین آگرہ کی بنیاد[۲] سکندر لودی سے منسوب کرتے ہیں۔

مآثر رحیمی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے متعدد مدارس بھی قائم کئے[۳]۔ بہلولی سکہ جو پیسہ کے قایم مقام رائج ہوا[۴] اسی کی یادگار ہے۔

سکندر لودی

سلطان سکندر لودی، اپنی ظاہری صورت کے لحاظ سے جس قدر حسین و جمیل[۵] تھا اُس قدر اس کا باطن پاکیزہ تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرح حد درجہ سادگی پسند تھا اور کبھی شاہانہ تکلفات میں اپنا وقت ضایع نہ کرتا تھا۔ اس کی فطرت نہایت سلیم اور اسکی طبیعت رافت و عطوفت کی طرف از بس مائل تھی وہ خدا سے ڈرتا تھا اور بندگانِ خدا پر ہمیشہ رحم کرتا تھا۔

جیسا وہ شجاع تھا ویسا ہی عادل بھی تھا۔ انتظام سلطنت، تصفیۂ معاملات میں وہ ہندو مسلمان، قوی و ضعیف کو برابر سمجھتا تھا اور چاہتا تھا کہ سر مو انصاف سے احتراز نہ ہو۔

بادشاہ ضبط اوقات کا بے انتہا پابند تھا اور جو معمول اس نے اپنے یا کسی اور کے لئے مقرر کر دیا، اس میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں کی۔

بادشاہ کا معمول تھا کہ وہ نماز ظہر ادا کر کے مجلس علماء میں جاتا اور قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کر کے حرم سرا میں جاتا اور ایک گھنٹہ وہاں قیام کر کے خلوت خاص میں جاتا اور وہاں لوگوں کے استغاثے سنتا، اُمورِ سلطنت

---

[۱] Keen's Article Medieval India. Cal Review LXXIV. P.T I (188?)

[۲] تاریخ داؤدی میں لکھا ہے کہ آگرہ نے شہر کی حیثیت سکندر لودی ہی کے زمانہ میں اختیار کی۔ اس سے قبل وہ صرف ایک گاؤں تھا۔ ہندوؤں کا بیان ہے کہ راجہ کنس فرمانروائے متھرا کے عہد میں آگرہ ایک مضبوط قلعہ تھا اور یہاں قیدی رکھے جاتے تھے۔ جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس نے آگرہ کو بھی تباہ کیا حتیٰ کہ وہ ایک معمولی گاؤں رہ گیا۔ اس کے بعد پھر سلطان سکندر لودی کے عہد سے اس میں دوبارہ ترقی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ اکبر کے زمانہ میں وہ دارالحکومت قرار پایا۔ (تاریخ داؤدی (ایلیٹ) ۴ – ۴۵۰)۔

[۳] Promotion of Learning India

[۴] ایک روپیہ کے چالیس بہلولی پیسہ ملا کرتے تھے۔ ایک بہلولی کا وزن ایک تولہ ماشہ رتی ہوا کرتا تھا۔ بہلولی کو دام بھی کہتے تھے۔

[۵] مصنف تاریخ داؤدی نے لکھا ہے کہ اس کے حسن کا یہ عالم تھا کہ جو شخص دیکھتا تھا متحیر رہ جاتا تھا۔

کی اصلاح کرتا۔ فرامین تحریر کرتا اور سلاطین معاصر کے نام خطوط لکھتا۔ رات کو بہت کم سوتا۔ بڑے جید اور زبردست سترہ عالم خلوت خاص میں اس کے پاس رہتے اور نصف شب تک مذہبی احکام وغیرہ ان سے دریافت کرتا رہتا۔ اس کے بعد کھانا چنا جاتا اس کی ساری عمر گزر گئی لیکن یہ معمول کبھی ترک نہیں ہوا۔

اس کی وضعداری اور پختگی انتظام کی دوسری مثال یہ ہے کہ ایک بار گرمی کے موسم میں شیخ عبدالغنی جونپوری بادشاہ سے ملنے آئے۔ ان کے لئے جو کھانا آیا اس میں موسم گرما کی وجہ سے شربت کے شیشے بھی موجود تھے۔ اس کے بعد اتفاق سے شیخ صاحب جاڑوں میں آئے، لیکن شربت کے قرابے اب بھی پیش کئے گئے ایک بار وہ جس طرح ایک آدمی سے ملتا پھر عمر گزر جاتی اسی طرح پیش آتا اور اس میں سر مو تفاوت نہ ہوتا۔

اس کی عدالت و بیدار مغزی کا یہ عالم تھا کہ ہر متدین شخص سلطنت کا اپنی جگہ پر مطمئن اور ہر خائن شخص ہر وقت لرزاں رہتا تھا اس طرح اس کی دیانت و سیر چشمی کی یہ کیفیت تھی کہ اگر دنیا کی ساری دولت اس کے سامنے رکھدی جاتی تو وہ خلاف احکام مذہب اس پر نگاہ نہ کرتا۔

جب لشکر کو وہ کسی مہم پر روانہ کرتا تو روزانہ دو فرمان عسکر کے نام پہونچتے۔ ایک نماز صبح کے وقت جس میں اور ہدایتیں درج ہوتیں، سرایوں میں گھوڑوں کی ڈاک ہر وقت طیار رہتی۔ اگر لشکر ۵۰۰ کوس پر بھی ہوتا تو بھی اس معمول میں فرق نہ آتا۔ روز اس کے سامنے کل اشیاء کا نرخ نامہ اور سلطنت کے تمام حالات و واقعات کی رپورٹ پیش ہوتی اور وہ فوراً تحقیقات کا حکم دیتا اگر کوئی نامناسب بات اُسے نظر آتی۔ یہی انتظام تھا کہ اس کے عہد میں غلہ اور تمام زندگی کی ضروری چیزیں بہت ارزاں تھیں اور قلیل آمدنی رکھنے والا بھی فراغت سے زندگی بسر کرتا تھا۔

اس نے ایک قاضی کے علاوہ بارہ علماء بھی صرف مقدمات فیصلہ کرنے کے لئے مقرر کئے تھے اور جاسوس متعین تھے جو عدالت کی تمام خبریں روزانہ بادشاہ تک پہونچاتے تھے۔ دریا خاں وکیل کو حکم دیا تھا کہ عدالت کے اندر پہر رات گئے تک بیٹھا رہے، کیونکہ ممکن ہے اس وقت کوئی مستغیث آجائے علاوہ اس کے وہ بعض اہم مقدمات کی خود تحقیقات کرتا اور سلطنت کے انتظام پر آپ توجہ کرکے آئین مقرر کرتا اور رعایا کے امن و سکون کی تدابیر ہر وقت سوچتا رہتا۔

اس غرض کے لئے اس نے کثرت سے مخبر و جاسوس مقرر کر رکھے تھے جو رعایا و حکام کے تمام حالات اس تک پہونچاتے تھے اور یہ انتظام اس قدر مکمل تھا کہ بسا اوقات لوگوں کی وہ باتیں جو انتہائی خلوت سے متعلق ہوتیں اس کو معلوم ہو جاتیں چنانچہ عام طور سے ان لوگوں کا خیال تھا کہ سلطان کے قابو میں کوئی جن ہے جو تمام باتوں سے آگاہ کر دیتا ہے[۱]۔

وہ انصاف کرنے میں حد درجہ کاوش کرتا اور خاص فراست و دانائی سے کام لیکر حقیقت تک پہونچتا۔ چنانچہ

---

[۱] طبقات اکبری - ۱۷۱ -

ضعیفوں اور بیکسوں کی غمخواری
سلطان کی عدالت
انتظامی امور
غلہ اور اشیاء کی ارزانی
قضاۃ و علماء کا تقرر
مخبر و جاسوس

صاحب طبقات اکبری نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ:۔

"گوالیار کے دو غریب آدمی جو بھائی بھائی تھے مفلسی سے تنگ آکر فوج میں شامل ہوگئے۔ ایک لڑائی میں انھیں غارت کے سلسلہ میں دو لعل بھی مل گئے۔ ایک اس دولت پر قانع ہوکر واپس جانا چاہتا تھا اور دوسرا اس کے بعد بھی قسمت آزمائی پر مصر تھا۔ جب ایک بھائی گھر جانے لگا تو دوسرے بھائی نے لعل سپرد کرکے کہا کہ میری بیوی کو دیدینا۔ جب یہ گوالیار واپس آیا تو اس نے اور چیزیں تو دیدیں لیکن لعل نہ دیا جب مالک واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی سے استفسار کیا۔ اس نے انکار کیا۔ القرض یہ معاملہ میاں بھوڑا[1] تک پہونچا جو دربار سکندر لودی کے امراء کبار میں سے تھے اور وہاں کے میر عدل بھی تھے انھوں نے گواہ طلب کئے خائن بھائی نے ایک قمار خانہ سے دو جھوٹے گواہ پیش کردئے، اور میاں بھوڑا نے ان گواہوں پر اعتبار کرکے فیصلہ کردیا کہ "لعل بیوی سے وصول کرلینا چاہئے" یہ غریب بہت پریشان ہوئی اور سیدھی آگرہ جاکر بادشاہ کی خدمت میں پہونچی۔ بادشاہ نے فریقین اور گواہوں کو طلب کیا۔ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی۔ بادشاہ کو یقین تھا کہ لعل اس عورت کو نہیں دیا گیا۔ لیکن گواہوں کی موجودگی میں وہ کوئی خلاف حکم نہ دے سکتا تھا آخرکار اس نے سوچ کر گواہوں سے پوچھا کہ جب تمھارے سامنے اس عورت کو لعل دیا گیا ہے تو تم نے اسے ضرور دیکھا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ہم نے دیکھا تھا۔ یہ سنکر بادشاہ نے موم کا ایک ٹکڑا ان دونوں کو دیا اور کہا کہ جاؤ الگ الگ اس لعل کی صورت و مقدار موم کے ذریعہ سے ظاہر کرو۔ جب یہ دونوں بناکر لائے تو ایک کا بنایا ہوا نمونہ دوسرے کے نمونہ سے بالکل مختلف تھا اور لعل کی ہیئت و صورت سے کوئی مناسبت نہ تھی بادشاہ نے گواہوں کو دھمکایا اور انھوں نے سارا حال بیان کردیا جس سے حقیقت واضح ہوگئی"[2]

انصاف کے باب میں وہ ضعیف اور قوی کو برابر سمجھتا اور کسی کی رعایت نہ کرتا۔ ایک بار کسی سید نے شکایت پیش کی کہ میاں ملک جاگیر دار نے اس کی زمین چھین لی ہے۔ بادشاہ نے میاں بھوڑا کو تحقیقات کا حکم دیا۔ لیکن اس مسئلہ میں کچھ ایسے نزاعات پیش آگئے کہ دو ماہ تک فیصلہ نہ ہوسکا۔ بادشاہ نے میاں بھوڑا کو بلاکر کہا کہ کیوں اب تک فیصلہ نہیں ہوسکا۔ آج اُسوقت تک عدالت گاہ سے کوئی نہ جائے جب تک یہ معاملہ طے نہ ہوجائے۔ چنانچہ تمام علماء تین پہر رات گئے تک بیٹھے رہے اور اسی وقت بادشاہ کو نتیجہ سے اطلاع دی گئی جو مستغیث سید کے حق میں تھا۔ بادشاہ نے میاں ملک جاگیردار کو بلاکر دریافت کیا کہ کیوں تمنے میرے خلاف حکم ظلم کیا اور وظائف واملاک کی زمین تم نے کیوں چھینی۔ میاں ملک نے منفعل ہوکر اعتراف جرم کیا۔ بادشاہ نے اس سے تین بار سب کے سامنے اعتراف جرم کراکے نادم کیا اور پھر کبھی اس کو کوئی جاگیر نہ دی۔[3]

---

[1] اس نام میں اختلاف ہے بعض مورخین نے بھودہ اور بعض نے بھوڈا لکھا ہے۔ [2] طبقات اکبری۔ ۱۶۲ ۔ فرشتہ ۱۸۹۔

[3] تاریخ داؤدی (الیٹ) ۴ - ۴۵۴۔

وہ غیر معمولی انتہا سیر چشم واقع ہوا تھا۔ ایک بار سنبھل کے ضلع میں کسی شخص کو زمین ۵۰۰۰ اشرفیوں کا دفینہ مل گیا۔ لیکن میاں قاسم حاکم سنبھل نے اس سے لے لیا۔ اس نے بادشاہ کی خدمت میں درخواست روانہ کی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ فوراً دفینہ پانے والے کو واپس دیا جائے۔

حاکم سنبھل نے عرضداشت روانہ کی کہ اتنی بڑی رقم پانے کا یہ شخص مستحق نہیں ہے۔

بادشاہ نے ایک فرمان اس کے پاس بھیجا کہ "اے بیوقوف جس نے اس کو یہ دفینہ عطا کیا ہے وہ بہتر جاننے والا ہے اگر یہ شخص مستحق نہ ہوتا تو وہ کیوں دیتا۔ ہم لوگ سب خدا کے بندے ہیں اور وہی بہتر جانتا ہے کہ ہم میں سے کون کس چیز کا مستحق ہے"[۱]

اسی طرح ایک بار اجودھن میں ایک درویش شیخ محمد کے کھیت میں بہت بڑا دفینہ برآمد ہوا اس میں کچھ طلائی برتن ایسے بھی تھے جن پر سکندر کی مہر ثبت تھی۔ علی خاں حاکم لاہور و دیپال پور نے شیخ کو لکھا کہ یہ دفینہ میرے حدود حکومت کے اندر برآمد ہوا ہے اس لئے میرے پاس بھیجدو۔ شیخ نے انکار کیا اس پر علی خاں نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ :۔

"اجودھن میں شیخ محمد کو شاہی خزانہ دستیاب ہوا ہے"

بادشاہ نے اس کے جواب میں صرف یہ لکھدیا کہ :۔

"تم کو اس سے کیا واسطہ ہے اور تم کیوں شیخ محمد کے حالات سے اعتنا کرتے ہو"

اس کے بعد شیخ محمد نے کچھ طلائی برتن بادشاہ کی خدمت میں روانہ کئے، لیکن اس نے واپس کر دئے اور کہا کہ :۔

"تمہیں رکھو، ہمیں تمہیں سب کو خدا کے سامنے اپنے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہے"[۱]

یہ واقعہ تاریخ سلاطین افاغنہ اور واقعات مشتاقی[۲] میں بھی درج ہے۔

اگر وہ کسی کو جاگیر عطا کر دیتا اور پھر کسی سبب سے اس کی آمدنی بڑھ جاتی تو مطلقاً پرواہ نہ کرتا۔

ایک بار اس نے ملک بدرالدین کا وظیفہ سات لاکھ تنکہ مقرر کر کے ایک پرگنہ تفویض کر دیا۔ پہلے ہی سال اسکی آمدنی ۹ لاکھ تنکہ ہو گئی اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ "زاید دو لاکھ کی بابت کیا حکم ہوتا ہے" بادشاہ نے کہا کہ : "تم رکھ لو" دوسرے سال

---

[۱] تاریخ داؤدی (ایلیٹ) ۴ ۔ ۴۵۲ - ۴۵۳ — [۲] واقعات مشتاقی کا مصنف شیخ رزق اللہ مشتاقی تھا۔ یہ ۸۹۷ھ میں پیدا ہوا اور ۹۸۹ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ مخزن افغانی میں اس کو صرف مولانا مشتاقی لکھا ہے۔

اس کے باپ کا نام شیخ سعد اللہ تھا۔ مولانا مشتاقی کو کمسنی سے علماء کی صحبت کا بہت شوق تھا اور اس طرح اس نے بہت فایدہ اٹھایا جو کچھ واقعات و حالات گزشتہ زمانہ کے اس کو علماء و مشائخ کے ذریعہ سے معلوم ہوتے تھے وہ لوگوں کے سامنے بیان کرتا تھا۔ آخر کار اس کے احباب نے مجبور کیا کہ وہ ان تمام حالات کو قلمبند کرے چنانچہ اس نے اپنے تمام تاریخی معلومات و تحقیقات کو یکجا فراہم کر دیا اور اس کا نام واقعات مشتاقی رکھا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۴ پر ملاحظہ فرمایئے)

گیارہ لاکھ آمدنی ہوئی اور بادشاہ نے پھر یہی حکم دیا۔ تیسرے سال آمدنی پندرہ لاکھ ہوگئی اس نے پھر عرض کیا۔ بادشاہ نے کہا:-
"جاگیر تمھاری ہے اس لئے اس کی آمدنی بھی صرف تمھاری ہی ہوسکتی ہے مجھ سے کیوں بار بار ذکر کرتے ہو[1]؟"

چونکہ خود بادشاہ کی نیت اچھی تھی اس لئے تمام امراء و جاگیردار بھی ایسے ہی، دیانت دار و امین تھے۔ جاگیر مقرر کرنے کے بعد وہ کبھی اس میں تغیر نہ کرتا لیکن اس وقت کہ اگر کسی جاگیر دار پر کوئی قصور ثابت ہوجائے تو اس صورت میں اسکی جاگیر لے لیتا۔ لیکن اس کی توقیر و عزت میں کمی نہ کرتا۔

وہ حرص و طمع کے جذبات سے بالکل ناواقف تھا اور ہمیشہ ایسے جرموں میں جن کا تعلق سلطنت کی آمدنی سے ہوتا بہت نرمی سے کام لیتا۔ جشن عید اور ۱۲ ربیع الاول[2] کو قیدیوں کی فہرست اس کے سامنے پیش کی جاتی اور بقایائے مالگذاری کے سبب سے جتنے لوگ قید ہوتے سب کو رہا کر دیتا۔

مذہب کی طرف بہت غلو تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی کام خلاف شریعت اس کی سلطنت میں نظر نہ آئے۔ چنانچہ اس نے اسی سلسلہ میں حکم نافذ کر دیا کہ مزاروں پر عورتوں کا جانا اور سالانہ سالار مسعود کی چھڑیاں نکالنا ممنوع قرار دیا جائے، مولانا مشتاقی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تعزیہ داری اور سیتلا کی پوجا کو بھی اس نے روک دیا۔

اس نے کثرت سے مساجد تعمیر کرائیں اور ہر مسجد میں ایک واعظ ایک قاری اور ایک جاروب کش مقرر کیا جن کو ماہوار تنخواہ

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۳)

مولانا عبدالحق نے اپنے تاریخ حقی اور شیخ نورالحق (عبدالحق کے بیٹے) نے اپنی زبدۃ التواریخ میں مولانا مشتاقی کی نسبت لکھا ہے کہ وہ بہت بڑے سیاح تھے انھوں نے اپنے عصر کے بڑے بڑے علماء و مشائخ اور صاحبان فضل و کمال کی صحبت سے فایدہ اٹھایا وہ خود بھی بڑے فاضل شخص تھے اور علم تصوف سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ فارسی میں ان کا تخلص مشتاق اور ہندی میں راجن تھا۔ ہندی زبان کے بہت بڑے ماہر تھے۔ ان کی تصنیف "پیا بن جوب نرنجن" اور دیگر رسایل ہندی زبان میں بہت مشہور ہیں۔

مولانا مشتاقی کے آٹھ بھائی تھے جو سب کے سب قابل تھے۔ ان کا دادا شیخ فیروز علاوہ صاحب سیف ہونے کے مشہور اہل قلم بھی تھا۔ اس نے سلطان بہلول اور سلطان حسین شرقی کی باہمی جنگ کا حال ایک طویل نظم میں تحریر کیا تھا جو مولانا عبدالحق کے پاس تھی لیکن بعد کو گم ہوگئی۔ شیخ فیروز کا انتقال ۸۶۲ھ میں ہوا۔

واقعات مشتاقی میں سلطان بہلول لودی سے ابتدا کی گئی ہے اور سلسلہ وار عہد اکبری کے حالات لکھ کر شیر شاہ، اسلام شاہ، سلطان محمود عادل، غیاث الدین خلجی (مالوہ) اور سلطان مظفر شاہ (گجرات) کے حالات پر یہ کتاب ختم ہوجاتی ہے۔

یہ کتاب نایاب ہے اور صرف دو نسخے اس وقت اس کے موجود ہیں۔ ایک مسٹر الیٹ کے پاس تھا جس سے انھوں نے فایدہ اٹھایا، دوسرا لکھنؤ کے کتب خانہ موتی محل میں ۔۔۔ [1] تاریخ داؤدی (الیٹ) ۴، ۴۵۳، ۴۴ ۔۔ [2] رسول اللہ صلعم کی تاریخ رحلت۔

ملتی تھی۔ موسم سرما میں محتاجوں کو کثرت سے کپڑے اور شالیں تقسیم کی جاتیں اور ہر جمعہ کو ایک مقررہ رقم غربا کو تقسیم کی جاتی۔ رمضان اور ربیع الاول کے مہینوں میں مساکین و مستحقین کو بیدریغ روپیہ دیتا۔

اس نے حکم دے رکھا تھا کہ ہر شش ماہی پر سلطنت کے تمام غربا و مساکین کی فہرست پیش کی جائے۔ جب یہ فہرست پیش ہوتی تو وہ اُن کو اس قدر روپیہ دیتا کہ چھ ماہ کے لئے کافی ہو جاتا۔ علاوہ اس کے مختلف شہروں میں مدِ خیرات کے متعلق بہت سے مہتمم مقرر تھے جو غریبوں اور محتاجوں کا حال معلوم کرکے بادشاہ تک خبر پہونچاتے اور خزانۂ شاہی سے روپیہ لیکر انھیں تقسیم کرتے۔[۱]

چونکہ بادشاہ کو اس طرف بہت توجہ تھی اس لئے تمام امرا، ارکین، خوانین و ملوک نے بھی غربا و مساکین کے وظایف مقرر کر رکھے تھے چنانچہ واقعات مشتاقی میں لکھا ہے کہ اس داد و دہش کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی فقیر مر جاتا تو اس کے پاس سے کافی دولت نکلتی جو اس کے اعزہ کو دیجاتی اور اگر کوئی عزیز نہ ہوتا تو پھر فقرا کو تقسیم کر دیجاتی۔

اس کے عہد میں زراعت کثرت سے ہوتی تھی۔ چیزیں بہت ارزاں تھیں تاجر خوش حال تھے اور تمام اہل پیشہ اپنے اپنے مشاغل میں نہایت اطمینان کے ساتھ مصروف نظر آتے تھے۔ سلطنت میں کہیں چوروں اور رہزنوں کا پتہ نہ تھا اور قافلے نہایت امن و سکون کے ساتھ رات دن سفر کیا کرتے تھے۔ سکندر شاہ کو مغربی مورخین نے عام طور سے حد درجہ متعصب ظاہر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مذہب اسلام کا پابند تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ہندوؤں کی رواداری نہیں کرتا تھا بالکل غلط ہے۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ جو عنداللہ حق ہے وہی کیا جائے۔ چنانچہ جس زمانہ میں وہ اپنے بھائی باربک شاہ سے لڑ رہا تھا ایک قلندر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے کہا کہ "فتح تیری ہے" بادشاہ نے جھنجھلا کر ہاتھ الگ کر لیا اور جواب دیا کہ "دعا یہ کرنی چاہئے کہ اللہ اُس کو فتح دے جو حق پر ہے اور وہی ظہور میں آئے جو بہتر و مناسب ہو۔"

قبل تخت نشینی کے ایک بار سکندر کو معلوم ہوا کہ تھانیسر میں ایک گاؤں ہے۔ وہاں کے ایک تالاب میں ہندو جمع ہو کر اشنان کرتے ہیں اس نے علماء سے استصواب کیا۔ میاں عبداللہ اجودھنی نے جو بڑے جید عالم تھے کہا کہ:-

"ہندوؤں کے کسی قدیم معبد کو غارت کرنا یا اُن کی کسی مذہبی رسم سے تعرض کرنا مناسب نہیں ہے"

سکندر نے یہ سُن کر کچھ نہیں کہا اور اپنے خیال سے باز آگیا۔[۲]

وہ ان تمام صفات کے ساتھ علم دوست بھی اس درجہ کا تھا کہ اس کے عہد میں آگرہ (جو اس کا دارالحکومت تھا) علماء و فضلاء، مشائخ و صوفیہ شعراء و ادباء کا مرکز ہو گیا تھا۔ فارس و عرب، ہند و بخارا کے تمام صاحبانِ کمال کھنچ کھنچ کر آگرہ چلے آرہے تھے اور بادشاہ کی فیاضیوں سے مالامال نظر آتے تھے۔

مذہبی مباحث کا اُسے بہت شوق تھا اور اکثر علماء کو جمع کرکے وہ ان کی گفتگو سنا کرتا تھا۔ ایک بار جب بودھن نامی ایک برہمن

---

[۱] تاریخ داؤدی (ایلیٹ) ۴ - ۴۴۶ — [۲] تاریخ فرشتہ ۱۸۶ - تاریخ داؤدی (ایلیٹ) ۴ - ۴۳۹ -

نے یہ دعویٰ کیا کہ تمام مذاہب برابر ہیں تو سکندر شاہ نے بہت سے مقتدر علماء[1] کو حکم دیا کہ وہ اس سے بحث کریں۔

ذوقِ شعر و شاعری

شعر و سخن کا بھی اُسے ذوق تھا گل رخ اس کا تخلص تھا کبھی کبھی شعر کہتا تھا[2] اور شیخ جمال کنبوہ[3] سے جو بڑے پایہ کا شاعر تھا اصلاح لیا کرتا تھا۔

اس کی صحبت میں علماء کے ساتھ شعرا بھی رہا کرتے تھے ان میں سے ایک ڈونگر برہمن بھی تھا جو عربی و فارسی کا عالم ہونے کے علاوہ شاعر بھی اچھا تھا۔

شیخ عبد اللہ اور شیخ عزیز اللہ

ملائے بدایونی، عہد سکندری کے بعض مقتدر علماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"شیخ عبد اللہ اور شیخ عزیز اللہ بڑے پایہ کے فاضل تھے۔ جب ملتان تباہ ہوا تو دہلی کی طرف آئے اور چالیس علماء (مثلاً جمال خاں دہلوی، شیخ لودی، سید جلال الدین بدایونی وغیرہ) شیخ عبد اللہ کی درسگاہ سے نکل کر اشاعت علوم کا باعث ہوئے۔ ہندوستان میں علوم معقولی کا رواج شیخ عبد اللہ کے وقت سے ہوا ورنہ اس سے قبل علم منطق و کلام میں صرف شرح شمسیہ اور شرح صحائف پڑھائی جاتی تھیں"۔

سکندر شاہ، مولانا شیخ عبد اللہ کا صد درجہ احترام کرتا تھا جب کبھی درس کے وقت پہونچتا تو پوشیدہ طور سے کسی کونے میں جا کر بیٹھ جاتا۔ تاکہ درس و تدریس میں حرج واقع نہ ہو جب وہ فارغ ہو جاتے تو بادشاہ سلام علیک کہہ کر سامنے آجاتا۔

شیخ عزیز اللہ

شیخ عزیز اللہ کے استحضار علوم کا یہ حال تھا کہ مشکل سی مشکل کتاب زبانی پڑھاتے تھے، انھیں کے شاگردوں میں میاں قاسم سنبھلی تھے۔

---

[1] ان علماء کی فہرست حسب روایت فرشتہ یہ تھی:۔ میاں قادر بن شیخ خواجو۔ میاں عبد اللہ۔ سید محمد بن سید خاں دہلوی۔ ملا قطب الدین و ملا الہ داد صالح سرہندی۔ سید امان۔ سید برہان۔ سید احسن قنوجی۔ سید صدر الدین۔ میاں عبد الرحمن۔ میاں عبد الرحمن۔ میاں عبد العزیز سنبھلی (فرشتہ ۱۸۲)۔ [2] ملائے بدایونی نے یہ غزل اس کی منتخب التواریخ میں درج کی ہے:۔

سروے کہ سمن پیرہن و گل بدنستش | روحے ست مجسم کہ دراں پیرہنستش
مشک ختن چیست کہ صد مملکت چین | در حلقۂ آں زلف شکن در شکنستش
در سوزن مژگاں بکشم رشتۂ جاں را | تا چاک بدوزم کہ دراں پیرہنستش
گل رخ چہ کند جوہر دندان ترا وصف | ہمچوں ودر سیراب سخن در دہنستش

[3] عہد سکندر شاہ میں شیخ جمالی بڑا مشہور شاعر تھا اور بادشاہ اس سے بہت مانوس تھا اور مشورہ بھی لیا کرتا تھا۔ شیخ جمالی کا یہ ایک شعر فرشتہ اور ملائے بدایونی نے نقل کیا ہے:۔

مارا ز خاک کویت پیراہنے ست بر تن | آنہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن

سیر العارفین اسی کی تصنیف ہے اور اس کا ایک دیوان بھی ۹ ہزار سے زائد اشعار کا تھا۔

اسی عصر کے ایک اور زبردست عالم شیخ الہ دیا بھی تھے جنھوں نے ہدایہ کی شرح کئی جلد میں تحریر کی ہے علاوہ اس کے تفسیر مدارک پر اُن کے حواشی اور شرح کافیہ کافی شہرت رکھتے ہیں اس زمانہ میں ان کی یہ تمام کتابیں درسیات میں داخل تھیں۔

ایک بار سلطان سکندر نے تمام علما کو جمع کر کے ایک جانب شیخ عبد اللہ[1] اور شیخ عزیز کو، دوسری جانب شیخ الہ دیا اور اُن کے بیٹے بھکاری کو رکھ کے مباحثہ سنا اور آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ وہ دونوں تقریر میں اور یہ دونوں تحریر میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔[2]

الغرض سکندر شاہ کے دربار میں ہر وقت علمی چرچا ہوا کرتا تھا اور یہ فخر اس بادشاہ کو حاصل ہے کہ اس کے عہد میں سب سے پہلے ہندوؤں نے فارسی کی طرف توجہ کی اور مسلمانوں کے علوم حاصل کرنے شروع کئے۔[3]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان کافی تعلقات قایم ہو گئے تھے اور وہ ایک دوسرے کی زبان کو نہایت شوق سے حاصل کرتے تھے۔ مسٹر بلاک مین کلکتہ ریویو میں ظاہر کرتے ہیں کہ "ہندوؤں نے سولھویں صدی عیسوی سے فارسی کی طرف ایسی توجہ کی ایک صدی گزرنے سے قبل وہ اس زبان میں مسلمانوں کے برابر ہو گئے۔"

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں زیادہ اتحاد پیدا ہو گیا تھا اور دوسرے یہ کہ سکندر لودی نے قصداً ہندوؤں میں یہ مذاق پیدا کیا تاکہ انھیں سلطنت کے انتظامی عہدے دئے جائیں۔ چنانچہ جب فارسی خوان ہندوؤں کی ضرورت ہوئی تو اس نے پہلے برہمنوں سے درخواست کی کہ فارسی سیکھیں۔ انھوں نے انکار کیا تو چھتریوں سے کہا گیا انھوں نے جواب دیا کہ ہم اہل سیف ہیں اہل قلم بننا پسند نہیں کرتے۔ اس کے بعد ویش طبقہ کو توجہ دلائی گئی لیکن اس نے تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے عذر کیا آخر کار کایستھوں نے اسے قبول کیا اور قلیل زمانہ میں ایسی دستگاہ حاصل کر لی کہ وہ مسلمانوں کے علوم کا درس دینے لگے اور سلطنت میں بڑے بڑے عہدے ان کو ملے۔

سلطان سکندر کے عہد میں تصانیف کثرت سے ہوئیں۔ جن میں خود بادشاہ اور اس کے امراء کا ذوق علمی بہت کچھ شامل تھا تاریخ داؤدی میں لکھا ہے کہ ارکرِ دھاوید، جو فن طب کے متعلق سنسکرت کی مشہور کتاب تھی۔ فارسی زبان میں طب سکندری کے نام سے ترجمہ کی گئی اور بعد کو اطبا ہند نے اس سے بہت فائدہ اُٹھایا۔[4]

---

[1] شیخ عبد اللہ کا انتقال ۹۲۲ھ میں ہوا۔ [2] منتخب التواریخ - ۸۶ -

[3] Cal Review XII al (Keen's medieval India . Cal Review LXXIX p 94

[4] واقعات مشتاقی کا مصنف اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے کہ "میاں بودہ نے جو خواص خاں کے جانشین ہوئے تھے خراسان سے بہت سی کتابیں فراہم کیں اور تمام علماء ہند و ایران کو طلب کر کے طب سکندری کو مرتب کرایا تھا۔ میاں بودہ بڑا علم دوست امیر تھا۔ بڑے بڑے اہل کمال اسکے دربار میں موجود رہتے تھے اور یہ اُن سے مختلف فنون پر کتابیں تصنیف کرایا کرتا تھا۔

بادشاہ کو دیگر فنون و صناعات کے علاوہ جن کے کارخانے کثرت سے قایم تھے۔ موسیقی کا بہت ذوق تھا وہ دربار عام میں تو کبھی گانا سننا پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن تنہائی میں اہل موسیقی کو اپنا کمال ظاہر کرنے کی اجازت دیتا اسوقت صرف سید رفیع الدین اور سید ابن رسول جو مقربانِ خصوصی میں سے تھے، اسکے خیمہ کے قریب ہوتے اُسے سُرنا و شہنائی کا بھی شوق تھا۔ جو دربار میں ۹ بجے شب تک بجائی جاتی تھی۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ صرف چار راگنیاں مالکوس، کلیان، کانڑا اور حسینی بجائی جائیں۔[1]

سلطان ابراہیم

سلطان ابراہیم نے کل ۹ سال سلطنت کی (جس کو فرشتہ نے خدا جانے کس حساب سے بیس سال تحریر کیا ہے) اور اس کے دوران حکومت میں اگر کوئی خاص بات نظر آتی ہے تو وہ غیر معمولی ارزانی ہے۔

مصنف تاریخ داؤدی کا بیان ہے کہ سلطان بہرام کے عہد میں، غلہ، کپڑا اور تمام چیزیں ایسی ارزاں تھیں کہ اس سے قبل کبھی نظر نہ آیئں۔ سلطان علاءالدین خلجی کے عہد میں جو ارزانی تھی وہ جبر و سختی سے پیدا ہوئی تھی۔ لیکن ابراہیم کے زمانہ میں پیداوار اس قدر کثرت سے ہوئی تھی کہ لوگ خود ارزاں فروخت کرنے پر مجبور تھے۔ سکندر لودی کے وقت میں بھی ارزانی بہت تھی، لیکن نہ اس قدر۔ اس کے عہد میں ایک بہلولی سکہ[2] کا دس من غلہ آتا تھا، پانچ سیر گھی اور دس گز کپڑے کی قیمت بھی ایک بہلولی تھی۔ علاوہ ان کے اور تمام اشیاء کی ارزانی کا بھی یہی عالم تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بارش کی موزونی سے وہ چند غلہ پیدا ہونے لگا اور بادشاہ نے حکم دیدیا کہ لگان میں بجائے روپیہ کے غلہ وصول کیا جائے۔ جس نے سکہ کی قیمت کو گھٹا دیا اور امراء و جاگیرداروں کو مجبور کر دیا کہ اپنے اپنے اقطاع کا غلہ نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کریں۔ ایک روز آدمی معہ اپنے خاندان کے پانچ تنکہ ماہوار کی آمدنی میں نہایت امن و راحت سے زندگی بسر کرتا تھا اور اگر کوئی سوار[3] دہلی سے آگرہ کا سفر کرتا تو صرف ایک بہلولی سکہ اس کے، اس کے گھوڑے اور سائیس کے مصارف کے لئے کافی ہوتا تھا۔[4]

---

[1] یہ بیان تاریخ داؤدی کا ہے۔ واقعاتِ مشتاقی میں ان چار راگنیوں کا نام گورا، کلیان، کانڑا، مقام حسینی تحریر کیا ہے۔ احمد یادگار (مصنف سلاطین افاغنہ) بیان کرتا ہے کہ بادشاہ کے چار غلام تھے جو موسیقی کے ماہر تھے ایک چنگ نہایت خوب بجاتا تھا، دوسرا قانون تیسرا طنبورہ کا ماہر تھا اور چوتھا بین کا۔ یہ غلام حسن صورت کے لحاظ سے بھی بے مثل تھے۔

[2] تانبہ کا سکہ تقریباً پونے دو تولہ کے برابر۔

[3] سوار کی تنخواہ بیس سے تیس تنکہ تک تھی اور اس سے اُس عہد کی خوشحالی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

[4] تاریخ داؤدی (الیٹ) - ۴ - ۴۷۵ - ۴۷۶ -

علوم اسلامی پر اک مورّخانہ نظر

علوم عرب قبل اسلام ہر چند ہمبر پرگسٹال (مشہور جرمن مستشرق) کا یہ قول بڑی حد تک صحیح ہے کہ عرب اور عربی لٹریچر کی صحیح تاریخ اُس وقت سے شروع ہوتی ہے، جب وہاں آفتابِ رسالت طلوع ہوا لیکن غالباً اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قبل عہد اسلام، عرب میں کسی علم کا رواج ہی نہ تھا اور "زمانۂ جاہلیت" علمی نقطۂ نظر سے بالکل تاریکی و ظلمت میں ملفوف تھا۔

علامۂ شہرستانی نے اپنی مشہور تصنیف الملل والنحل میں لکھا ہے کہ قبل اسلام، عرب میں خصوصیت کے ساتھ چار علوم کا زیادہ رواج تھا: (۱) علم الانساب (۲) تاریخ (۳) تعبیر الرؤیا اور (۴) علوم النجوم۔

شاہانِ حیرہ و غسان نہ صرف علوم و فنون کی قدر کرتے تھے بلکہ وہ خود بھی شعر کہتے تھے اور ان میں سے بعض بعض اچھے شاعر تھے۔

منذر، اپنی سیاسی ذہانت کی وجہ سے، تاریخ میں بہت نمایاں نظر آتا ہے اور اس کے بیٹے عمرو کے دربار میں المتلمس اور طرفہ دو مشہور شاعر رہا کرتے تھے، جن میں سے موخر الذکر معلقات میں سے ایک قصیدہ کا مصنف تھا۔ منذر کے جانشین نعمان نے جس سیر چشمی سے نابغہ اور لبید شعراء کی قدر کی، وہ تاریخ کا روشن واقعہ ہے۔

بنو غسان کا آخری بادشاہ، جبلہ ابن الایہم، جو خلیفۂ ثانی کے عہد تک زندہ رہا اپنے عہد کا مشہور شاعر تھا، اور فرمانروایانِ عرب کی صف میں امرؤ القیس کو جو مرتبۂ شاعری کے لحاظ سے نصیب ہوا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آج دنیا میں وہ شاعر ہی کی حیثیت سے مشہور ہے اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ حیرہ کا تاجدار بھی تھا۔

حیرہ کی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ فنِ تحریر کو رواج دینے میں یہی رہنمائے اولین تھا، کیونکہ اہلِ حجاز نے اس فن کو حیرہ یا انبار ہی سے حاصل کیا تھا اور پھر جب ایک صدی بعد خلیفۂ ثانی کے عہد میں کوفہ کی بنیاد قائم ہوئی، تو یہ فن وہاں بھی رائج ہوگیا۔ جسے آج بھی کوفی خط سے تعبیر کرتے ہیں، اس سے قبل اس مسئلہ میں اختلاف تھا کہ عربوں میں فن تحریر کا رواج کب سے ہوا اور بعض لوگ اس کی قدامت ثابت کرنے میں بہت مبالغہ سے کام لیتے تھے، لیکن اب یہ واقعہ پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ قدیم ترین عربی تحریریں وہ ہیں، جو عہدِ رسالت سے ایک صدی قبل لکھی گئی تھیں۔ اس سے پہلے کسی

تحریر کا پایا جانا یا اس فن کا رائج ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ قبل اسلام کی جو تحریریں پائی گئی ہیں، اُن میں قصاید کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں، جو اظہار تفاخر میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے سامنے پڑھا کرتا تھا اس لئے یہ امر بخوبی ثابت ہے کہ عہد رسالت سے پہلے ایام جاہلیت میں مذاق شعری، اعراب میں پوری طرح پایا جاتا تھا، اور سوسائٹی کا پورا طبقہ ایسا نہ تھا، جو اس سے متاثر نہ ہو، چنانچہ قبیلۂ ہذیل کی نظموں کا مجموعہ یا حماسہ وغیرہ کافی شہادت اس امر کی ہے۔

علم الانساب بھی، حسب بیان شہرستانی، ان میں رائج تھا، لیکن جہاں تک معلوم ہوتا ہے اس کی طرف پوری توجہ حضرت عمرؓ کے عہد سے ہوئی، جب مجاہدین کی تنخواہیں مقرر کرنے کے لئے اسم نویسی کی ضرورت لاحق ہوئی، اس سلسلہ میں بلاذری کی انساب الاشراف خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

علاوہ شاعری اور علم الانساب کے اہل عرب میں قبل ظہور اسلام قصہ گوئی کا بھی کافی ذوق پایا جاتا تھا۔ چنانچہ ابو علبیدہ عہد جاہلیت کے مشہور اور بے نظیر داستان گو سمجھے جاتے تھے۔

عہد رسالت اور خلفائے راشدین جب آنحضرت نے تبلیغ اسلام شروع کی تو جن مصائب کا سامنا آپ کو کرنا پڑا، وہ سب پر ظاہر ہے اور ایسی صورت میں جبکہ لاکھوں افکار آپ کے پیش نظر تھے، علوم و فنون کی طرف کوئی توجہ نہ ہو سکتی تھی، تاہم جب آپ کے پیش نظر کوئی ایسا موقع آیا تو آپ نے ضرور فایدہ اُٹھایا، چنانچہ آپ نے بدر کے قیدیوں کو صرف اس شرط پر رہا کر دیا کہ وہ لوگوں کو لکھنا سکھائیں۔ پھر اسکے ساتھ اگر رسول اللہؐ کی احادیث کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے کن کن طریقوں سے لوگوں کو علوم و فنون سیکھنے کی طرف رغبت دلائی ہے۔ رسول اللہ کے بعد خلیفۂ اول کا عہد شروع ہوا، لیکن افسوس ہے کہ وہ بہت کم رہا۔ خلیفۂ دوم نے نسبتاً طویل زمانہ پایا، لیکن آپ کو حکومت اسلام کی بنیاد ہی استوار کرنے سے فرصت نہ ملی تھی کہ قدرت نے اس عجیب و غریب ہستی کو اپنے پاس بلا لیا۔ خلیفۂ ثالث کا عہد بہت طویل تھا، لیکن آپ کی صداقت اور نیکی سے لوگوں نے اس قدر ناجایز فایدہ اُٹھایا کہ آخرکار اندرون ملک میں انتشار و افتراق کی آگ مشتعل ہوگئی، جس کی چنگاریاں صدیوں بعد تک تمام اکناف عالم میں اڑتی رہیں۔ خلیفۂ چہارم نے باوجود اسکے کہ حد درجہ بدامنی کی حالت میں عنان خلافت ہاتھ میں لی، اور حکومت اسلام کے دو حصے آپ کے عہد ہی میں ہوگئے، تاہم آپ علم کی طرف سے غافل نہیں رہے اور آپ ہی کے اشارہ سے الاسود الدؤلی نے زبان عربی کو صحیح لکھنے اور صحیح بولنے کے قواعد مرتب کئے۔ اس کے بعد خلیل نے علم عروض کے قواعد مرتب کئے، اور آخرکار بصرہ و کوفہ مسلمانوں کی ادبی تحریکات کا مرکز ہوگئے جن سے کسائی اور سیبویہ کی مشہور ہستیوں کو کبھی جدا نہیں کیا جا سکتا۔

عہد بنی امیہ عہد بنی امیہ کے ساتھ ہی حکومت اسلام کا رنگ بدل گیا اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ مذہبی حکومت، جو خلفائے راشدین کے عہد میں پائی جاتی تھی، مفقود ہوگئی اور اس کے بجائے دنیاوی جاہ و جلال کے مناظر ہر طرف نمودار ہونے لگے، لیکن اسی کے ساتھ یہ کہنا کہ بنو امیہ نے ترقی تعلیم و تہذیب کی طرف توجہ نہیں کی حقیقتاً انصاف کا خون کرنا ہے

اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ "اسپرٹ آف اسلام" کے مصنف نے کیونکر ایسا غلط الزام بنو آمیہ پر لگا کر اپنی عصبیت کو اس بری طرح سے ظاہر کرنا پسند کیا۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ خاندانِ بنی آمیہ کے بعض افراد (مثلاً ولید ثانی، یزید ثالث اور مروان ثانی) ایسے تھے جن پر یہ الزام عاید ہو سکتا ہے، لیکن کیسا صریح ظلم ہے کہ ان بعض افراد کے حال پر قیاس کر کے سارے خاندانِ بنی آمیہ کی نسبت تو یہ حکم لگا دیا جاتا ہے لیکن خاندانِ بنی عباس میں (جس کی علم پروری کے افسانے اس قدر مشہور ہیں) متوکل اور مقتدر کے واقعات کو پیشِ نظر رکھ کر سارے خاندانِ عباسیہ کو علم و تہذیب کا دشمن قرار نہیں دیا جاتا۔

امیر معاویہ، جو خاندانِ بنی آمیہ کے موسسِ اولین ہیں (اُن کی نسبت خواہ کوئی کچھ ہی کیوں نہ کہے) لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ بڑے دل والے اور سیر چشم آدمی تھے۔ آپ نے اپنی مسیحی رعایا کے ساتھ جس سلوک کو روا رکھا اگر اس کو بازنطائن فرمانروایان کے طرزِ عمل کے ساتھ ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ امیر معاویہ کس قدر فراخ دل رکھتے تھے۔ دنیا کو معلوم ہے کہ آپ ہی نے ایک مسیحی طبیب ابن اثال کو اپنے دربار میں بلا کر حکم دیا تھا کہ طب کی کتابیں، عربی میں ترجمہ کرے اور آپ ہی نے عابد کو صنعا سے طلب کر کے مجبور کیا تھا کہ وہ شاہان یمن کی تاریخ کو ایک جگہ کتابی صورت میں محفوظ کر دے۔

امیر معاویہ کا بیٹا اور جانشین، یزید بھی اچھا شاعر تھا اور شعرا کی قدر کیا کرتا تھا اور خالد ابن یزید کو تو علوم کی طرف خاص شغف تھا چنانچہ اُس نے متعدد آدمی متعین کئے تھے کہ وہ مختلف کتابیں، عربی زبان میں منتقل کریں اور اگر ابن ندیم اور ابن ابی عصیبہ کی روایت پر اعتماد کیا جائے، تو خالد کے اکتسابات علمیہ کا درجہ بہت بلند نظر آتا ہے۔

عمر ابن عبد العزیز، مصر کے گورنر ہی تھے کہ یونانی علوم کی طرف آپ کو توجہ ہوئی، چنانچہ ابن ابجر سے جو اسکندریہ میں یونان کے علوم فلسفیہ کا بہت بڑا ماہر تھا، آپ نے ملاقات پیدا کی اور یہ مراسم اس حد تک مستحکم ہو گئے کہ جب آپ خلیفہ ہوئے تو ابن ابجر کو سارے محکمۂ حفظان صحت کا منتظم بنا دیا۔

ابن ابی عصیبہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی کے عہد میں یونان کے بہت سے علوم و فنون مصر سے انطاکیہ اور حران میں منتقل ہوئے اور وہاں سے دیگر بلادِ اسلامی میں۔

ہشام بن عبد الملک، اک اعلیٰ درجہ کا محارب ہونے کے ساتھ ہی جیسا قابل و فاضل خلیفہ تھا، وہ تاریخ کا روشن واقعہ ہے۔ اُس کا وزیر کاتب خصوصی وہی سالم تھا جو اپنے عہد کا بڑا مشہور زباندان تسلیم کیا جاتا تھا اور جس نے ارسطاطالیس کی متعدد کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کیا۔ سالم کے بیٹے جبلہ نے بھی متعدد تاریخی کتابیں فارسی سے عربی میں ترجمہ کیں۔

ابن ندیم نے بیان کیا ہے کہ اکاسرۂ عجم کا جو علمی خزانہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا اس میں ایک تاریخ ایران بھی تھی جو نہایت بسیط و مفصل ہونے کے علاوہ مصور بھی تھی، چنانچہ خلیفہ ہشام نے ۱۱۳ھ میں اس کا ترجمہ عربی میں کرایا جسے مسعودی

نے خود بمقام اصطخر ۳۰۲ھ میں دیکھا تھا۔

عبدالقاسم حماد، جس کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اس نے ایک بار ایک نشست میں ۲۹۰۰ قصیدے شعرائے جاہلیت کے سنا دئے۔ ولید ابن عبدالملک اور ہشام ہی کے دربار کا شخص تھا اور اگر انصاف سے کام لیا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھیں خلفا کی کوشش تھی جس نے قدیم شعرا کے کلام کو محفوظ رکھا ورنہ آج ایک لفظ بھی عہد قدیم کے لٹریچر کا نظر نہ آتا۔

ہر چند ہشام کے ساتھ ہی عہد بنی امیہ کے عروج کا بھی خاتمہ ہو گیا، تاہم اس وقت تک جو کچھ ہو چکا تھا وہ بھی کم نہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ بنیاد تھی جس پر بعد کو بنو عباس نے اپنی عمارت قایم کی اور اگر اسی کے ساتھ اسپین کی اموی خلافت قرطبہ کو بھی سامنے رکھا جائے جس نے قرون وسطیٰ میں اپنے علم و تہذیب کے کارناموں سے دُنیا کو متحیر کر دیا، تو شاید خاندانِ بنی امیہ کے احسانات علمیہ کا کوئی استقصا ہو ہی نہیں سکتا۔

عہد بنی عباس جب بنو عباس کا عہد شروع ہوا، تو انھوں نے عہد بنی امیہ کے علمی باقیات الصالحات کو نہ صرف محفوظ رکھا، بلکہ اس میں ترقی پیدا کرنے کی کوشش تام کی۔ چونکہ حکومت بنی عباس کے اُصول بنو امیہ سے الگ تھے اور اُن کے امیال و عواطف زیادہ تر عجمی عنصر سے متعلق تھے اس لئے ان کی کوششیں بھی جدا تھیں اور علمی مساعی کے حدود بھی بنو امیہ سے ذرا مختلف تھے۔

اس زمانہ میں نہ صرف تاریخ پر توجہ کی گئی، بلکہ علم الفقہ، فلسفہ اور دیگر علوم عقلیہ کی طرف بھی کافی اعتنا کیا گیا اور چونکہ اس عہد میں یونانی تہذیب کے ساتھ عجمی مذاق بھی مل گیا تھا، اس لئے انھوں نے شائستگی کی طرف نہایت سریع قدم اُٹھایا لیکن اسی کے ساتھ انحطاط و زوال کے وہ جراثیم بھی پیدا ہو گئے جو دنیاوی جاہ و جلال، مادی دولت و ثروت اور انسانی تہذیب و شائستگی کے اجزاء لازم ہیں اور جنھوں نے آخر کار دولتِ عباسیہ کا شیرازہ منتشر کر دینے میں کوئی دقیقہ کوشش کا فروگذاشت نہیں کیا۔

عرب میں، یونانی علوم و فنون کا رواج تین ذرائع سے ہوا۔ اسکندر اعظم کے وقت سے دجلہ و فرات کے درمیان کا حصہ تمام تر یونانی تہذیب سے متاثر تھا۔ چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب شاہِ اسپارٹا کے دربار میں کراسس کی موت کی خبر پہونچی، تو اسوقت وہاں یوریپڈس (یونان کا نہایت مشہور شاعر و ڈراما نگار) کا ایک ڈرامہ جو ٹریجڈی سے متعلق تھا، دکھایا جا رہا تھا۔ اس کے بعد ۵۳۱ء میں ساسانی بادشاہ، خسرو انوشیرواں نے خوزستان میں جندشاپور کے مقام پر ایک اکیڈیمی (مجلس علمیہ) قایم کی، جو ساسانی حکومت کے زوال کے بعد بھی تین صدی تک قایم رہی۔ یہاں یونانی طب و فلسفہ کی بھی تعلیم دیجاتی تھی۔

اس کے بعد شامیوں نے دوآبہ دجلہ و فرات میں عربوں کے اندر یونانی فلسفہ کا مذاق پیدا کیا اور یہ مذاق اُن میں اس حد تک

رچ گیا کہ مذہب عیسویت کے متعلق جو خیالات انھوں نے قایم کئے وہ بھی اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور اس طرح حکومت بازنطاین نے جو فایدہ اس سے اُٹھایا وہ تاریخ کا کھلا ہوا واقعہ ہے۔

چونکہ حکومت بازنطاین کے زیر اثر، یونانی اور رومن حکماء سے اہلِ عرب کو تبادلۂ خیالات کا بہت موقع ملتا تھا، اس لئے وہ اقلیدس، افلاطون اور ارسطاطالیس کی کتابیں عام طور سے پڑھتے تھے اور اُن سے فایدہ اُٹھاتے تھے۔ علاوہ اسکے انطاکیہ اور موصل کے درمیان شامی عیسائیوں کی جماعتیں خانقاہوں کے اندر یونانی کتابیں عربی میں منتقل کر رہی تھیں، اور اس طرح علومِ یونانی کے ساتھ ساتھ مسیحی خیالات بھی آہستہ آہستہ عربوں میں پھیلتے جاتے تھے۔

حرآن کے رہنے والے (شام کی یہی جماعت ایسی تھی جو اپنے اصلی مذہب پر قایم رہی) بھی خاص ذریعہ ہیں جن سے عربوں نے یونانی تہذیب کو حاصل کیا، چونکہ اہلِ حرآن، عربی زبان نہایت اچھی جانتے تھے اس لئے جو تراجم اُن کے ذریعہ سے ہوئے وہ نہایت مکمل تھے۔

خاندانِ عباسیہ کے عروج کا بنیادی پتھر منصور نے رکھا اور حقیقت یہ ہے کہ اُس کے عہد میں زبانِ عربی کو بہت ترقی حاصل ہوئی، سیبویہ، کسائی، خلیل اسی عہد کے درخشندہ گوہر تھے اور اسی نے کسائی کو اپنے بیٹے مہدی کی تعلیم کے لئے بحیثیت اتالیق مقرر کیا تھا۔ اصمعی بھی اسی زمانہ میں ہوا ہے، جو اپنی قوتِ حافظہ کے لحاظ سے تاریخ عرب کی ایک نہایت ہی مشہور ہستی ہے۔

ذہبی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴۳ھ میں علماء اسلام نے فقہ، حدیث اور تفسیر کی کتابیں مدوّن کرنا شروع کیں۔ چنانچہ ابن جریج مکہ میں اور امام مالک (صاحب موطا) مدینہ میں، اوزاعی شام میں، ابن ابی عروبہ، حماد، ابو سلمہ بصرہ میں، معمر، یمن میں اور سفیان الثوری، کوفہ میں مصروفِ تصنیف و تالیف تھے۔

جب ۱۴۸ھ میں خلیفہ منصور، بیمار ہوا اور اُس کے دربار کے اطباء نے جواب دیدیا، تو اُس نے جارج کو جو جند شاپور کی مجلس علمیہ کا مہتمم تھا، طلب کیا اور اس کے علاج سے فایدہ ہوا۔ چنانچہ اس کے بعد سے دربارِ خلیفہ میں متعلقین اکیڈیمی کا اثر قایم ہوگیا اور بعد کو جارج کا پوتا (جبرئیل) ہارون الرشید کے دربار کا طبیب خاص مقرر کیا گیا۔

منصور کے عہد میں ایک اور شخص ابن مقفع بھی تھا، جو عربی اور فارسی کا بڑا زبردست ماہر تھا۔ اس نے کلیلہ دمنہ کا ترجمہ عربی زبان میں کرکے سب سے پہلے عربوں میں رومان کا مذاق پیدا کیا، جس کی ارتقائی صورت الف لیلیٰ نظر آتی ہے۔ ابن مقفع نے شاہنامہ کا ترجمہ بھی عربی میں کیا اور یہی وہ تصنیف تھی جو بعد کو شاہنامۂ فردوسی کی بنیاد قرار پائی۔

معقولات کو، جن کی ابتدا حسن بصری سے ہوئی تھی، ابتدا عہدِ عباسیہ میں زیادہ ترقی حاصل ہوئی اور خلیفہ منصور نے غیر مذاہب کی کتابوں کا بھی ترجمہ عربی میں کرایا، چنانچہ تعلیمات مانی کی کتابیں بھی اسی عہد میں ترجمہ کی گئیں۔ اسکے علاوہ سنسکرت کی کتابوں پر بھی توجہ کی گئی، جن میں سے ایک سدھنتا خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت، معقولات کا رواج زیادہ ہوتا جاتا تھا، لیکن اس کے ساتھ منقولات کو بھی پس پشت

نہیں ڈالا جا سکتا تھا اور ان کا اثر اس قدر قایم تھا کہ ماموں بھی خلقِ قرآن کے مسئلہ کو عام طور سے رائج نہ کر سکا۔

عہد عباسیہ کے ابتدائی دس سال کے اندر علم الفقہ شروع ہو کر مرتب ہو گیا، عہد منصور میں ابو حنیفہ، عہد ہارون میں مالک و شافعی اور عہد مامون میں احمد ابن حنبل وہ ہستیاں تھیں جن سے آج بھی ہر مسلمان اچھی طرح واقف ہے۔ خلیفہ مہدی کا زمانہ چنداں قابلِ ذکر نہیں، کیونکہ اس نے علوم عقلیہ کی سخت مخالفت کی، لیکن اس کے بعد ہارون نے اس کی بہت کچھ تلافی کر دی۔

ہارون نے اک بیت الحکمۃ ہی صرف اس لئے قایم کیا تھا کہ وہاں نہ صرف پہلی کتابیں محفوظ رہیں بلکہ اور جدید تصانیف، مختلف علوم کی شایع کی جائیں۔ فضل ابن نوبخت کو فارسی کتابوں کا مہتمم بنایا گیا، اور وہ یونانی کتابیں جنھیں ہارون، ایشیائے کوچک کی طرف سے لایا تھا، یوحنا ابن ماسویہ کے سپرد کی گئیں۔ ہارون الرشید اپنے علم پروری کے لحاظ سے عجیب و غریب خلیفہ گزرا ہے۔ اسی نے ایک بار سفیان ابن عیینہ کو ایک لاکھ درہم اور اسحاق موصلی کو دو لاکھ درہم بطور علمی انعام کے دیئے اور یہی وہ خلیفہ تھا، جس نے مروان ابن ابی حفصہ کو صرف ایک نظم کے صلہ میں پانچ ہزار دینار، ایک خلعتِ زریں، ایک گھوڑا اور دس یونانی کنیزیں ایک وقت میں بخش دیں۔

الغرض اس کا دربار علماء و شعراء، حکماء و فضلاء کا مرکز تھا اور اُس کی قدر دانی علم کی شہرت تمام اطراف عالم میں پھیل گئی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ معقولات و منقولات کی تطبیق کا سخت مخالف تھا۔

اس کے بعد جب ماموں کا عہد آیا تو مذہبی آزادی زیادہ بڑھ گئی اور اس نے خلقِ قرآن کے مسئلہ کو خود پیش کر کے علماءِ عصر کی تصدیق کرانی چاہی، جس میں زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔

ماموں، لٹریچر، فلسفہ اور دیگر علوم و فنون کا بہت بڑا قدر شناس تھا اور اس کے عہد میں علوم اسلامی نے اس قدر ترقی کی کہ اس کی نظیر کسی اور بادشاہ کے عہد میں نہیں مل سکتی۔

چونکہ ماموں کی ماں اور بیوی دونوں ایرانی النسل تھیں اور علاوہ اس کے اس کا ابتدائی زمانہ مرو میں بسر ہوا تھا جہاں ایرانی تہذیب کے مناظر کثرت سے نظر آتے تھے، اس لئے اُس کے عہد میں ایرانیوں کو بہت درخور حاصل ہو گیا اور اس نے اپنے تمدن کو ساسانی بادشاہوں کے انداز پر قایم رکھنا چاہا، جو بظاہر بہت خوشنما بات تھی، لیکن وہی آخر زوال خلافت کا باعث قرار پائی۔

ہارون الرشید کے عہد میں جو بیت الحکمۃ قایم ہوا تھا، اُس کو ماموں نے اور زیادہ ترقی دی اور اُس نے قیصر روم کے پاس سے یونانی کتابیں منگوا کر عربی میں اُن کا ترجمہ کرایا۔ حُنین اور یعقوب کندی مخصوص طور پر یونانی کتابوں کا ترجمہ کرنے پر مامور تھے، ان کے علمی کارنامے اس قدر ہیں کہ اُن کے ظاہر کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔

ماموں کو علم ہیئت و نجوم کی طرف بھی خاص رجحان تھا، چنانچہ اُس کے اشارے سے یحییٰ ابن ابی منصور المامونی نے جو الزیج الممتحن اور کتاب العل کا مصنف ہے، بغداد و دمشق کے قریب رصد گاہیں قایم کیں۔ لیکن ماموں کی بے وقت موت کی وجہ

سے یہ کام انجام کو نہ پہونچ سکا۔ محمد ابن موسیٰ بن شاکر کا زمین کی پیمائش کی طرف متوجہ ہونا بھی مامون ہی کے حکم سے ہوا تھا۔

مامون کے بعد المعتصم کا عہد شروع ہوا، جو ایک سپاہی مزاج خلیفہ تھا، اس لئے علوم و فنون کا وہ سیلاب جو مامون کے عہد میں رونما ہوا تھا، اس کے عہد میں رُک گیا اور تقریباً دس سال تک اسی حالت میں رہا۔

جب ۲۲۷ھ میں واثق سریر آرائے خلافت ہوا تو پھر وہی علمی بیداری ہر جگہ نظر آنے لگی، جو عہدِ مامون میں باقی جاتی تھی۔ اس کے عہد میں بھی کثرت سے غیر زبانوں کی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں اور مذہبی آزادی بہت بڑھ گئی۔ یوحنا ابن ماسویہ اس کا دست راست ہو گیا اور بے شمار انعامات اس نے حاصل کئے۔ مسعودی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ واثق نے اس کو تین لاکھ درہم اُٹھا کر دے دئے۔

اس کا جانشین، المتوکل ہر چند ایسا علم دوست نہیں تھا، تاہم ترجمہ و تالیف کا کام اس کے زمانہ میں بھی جاری رہا۔ متوکل کے بعد خاندانِ عباسیہ کا زوال شروع ہو گیا لیکن اب بھی کچھ نہ کچھ سلسلہ علوم و فنون کا جاری رہا یہاں تک کہ شروع سے لیکر زوالِ خلافت عباسیہ تک بغداد کی سرزمین پر جو کچھ ہو گیا وہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اگر اس کی تفصیل بیان کی جائے تو ایک مستقل تصنیف مرتب ہو سکتی ہے۔

اسی سلسلہ میں ہم یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ خلافت بنی عباس کی تاریخ پانچ دور میں تقسیم ہوتی ہے اس کا بہترین زمانہ جسے عہدِ زریں کہنا چاہئے، مامون پر ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد دوسرا دور وہ تھا جب جماعت اتراک کو عروج حاصل ہوا، یہ زمانہ ۳۳۴ھ تک قایم رہا۔ تیسرا دور بنی بویہ خاندان کے اثر و اقتدار کا تھا، چوتھا سلاجقہ کی قوت کا اور پانچواں وہ جب انحطاط کی آخری منازل شروع ہوئیں اور آخر کار مغلوں نے آکر بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

ہر چند ۲۳۲ھ کے بعد سے ۶۵۶ھ تک کا زمانہ انتشار و انشقاق کا ہی تھا اور بہت سی چھوٹی چھوٹی اسلامی حکومتیں قایم ہو کر، وہ مرکزی اقتدار جاتا رہا تھا جو مامون کے عہد تک پایا جاتا تھا، تاہم علم دوستی کا وہ مذاق جو اس سے قبل پیدا ہو چکا تھا، مفقود نہیں ہوا اور جہاں جہاں اسلامی حکومتیں قایم ہوئیں وہیں علوم و فنون کی قدر کی گئی۔

اس لئے اگر آپ خلافتِ عباسیہ کے سارے عہد کو پیشِ نظر رکھ کر (جس میں تمام چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں بھی شامل ہیں) صرف یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اس تمام زمانہ میں کتنے علماء گزرے ہیں تو ان کی صحیح تعداد بھی نہیں معلوم ہو سکتی۔ لیکن اگر صرف مشاہیر و اکابر ہی کو لیا جائے تو ان کی فہرست مرتب کرنے کے لئے بھی اک دفتر درکار ہے۔

فارابی، ابوبکر الرازی، ابو بشر، بو علی سینا، ابن رشد، غزالی، فخر الدین رازی وغیرہ بہت سی ایسی مشہور ہستیاں ہیں جو اس عہد میں رونما ہوئیں اور اپنے نقوش، صفحاتِ تاریخ پر ہمیشہ کے لئے ثبت کر گئیں۔

فارابی، ترکستان میں پیدا ہوئے اور مختلف زبانیں اُنھوں نے حاصل کیں، جس وقت یہ بغداد گئے تو ابو بشر کے خطبات فلسفہ میں شریک ہوئے اور اسکے بعد حران جاکر، ابو یوحنا، ابن خیلان سے فلسفہ مسیحیت سیکھا، جب وہ بغداد واپس آئے تو یہاں خود فلسفہ کی تعلیم لوگوں کو دینے لگے۔ ان کو تفلسف کی طرف اس قدر رجحان تھا کہ انھوں نے ارسطا طالیس کی بعض

بعض کتابیں چالیس چالیس مرتبہ پڑھیں اور پھر بھی اپنی عمر کی طرف سے بیوفائی کی شکایت نہ گئی۔

ان کی بہت سی تصانیف، جو ان کی شہرت کا باعث ہوئیں، بغداد ہی میں لکھی گئی تھیں۔اس کے بعد یہ دمشق چلے گئے اور وہاں سے مصر۔ مصر سے واپس آنے کے بعد وہ سیدھے شام آئے اور اُس جماعتِ علماء میں داخل ہو گئے جو سیف الدولہ حاکم حلب کے دربار میں پائی جاتی تھی۔ سیف الدولہ بڑا علم دوست شخص تھا، اس نے اس کی بہت قدر کی اور جب دمشق گیا تو انھیں بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

ابو بشر، منطق میں فارابی کا اُستاد تھا۔ یہ عیسائی تھا اور بغداد اس کا مسقط الراس تھا، منطق میں اس کو بڑا تبحر حاصل تھا اور اسی علم کی خدمت کرتے کرتے اس نے اپنی عمر تمام کر دی۔ طبقات الحکماء میں اس کے تصانیف کی ایک طویل فہرست موجود ہے

ابو بکر الرازی، خلیفہ مقتدر کے دربار کا طبیب خاص تھا۔ اس نے چیچک پر اک عجیب و غریب رسالہ لکھا، جو اب لاطینی میں معہ ترجمہ و حواشی کے شایع بھی ہو چکا ہے۔

سامانی فرمانروا منصور ابن نوح نے بھی اس کی سرپرستی کی تھی جس کے لئے اس نے رسالہ طب پر المنصوری کے نام سے تحریر کیا تھا۔

حکمت عملی کے سلسلہ میں حسن ابن حسین، ابوالوفا، اور ابن یونس خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں اور حکمت نظری کے لحاظ سے غزالی اور فخر الدین رازی اپنے عہد کے بے نظیر علماء میں سے تھے۔ غزالی نے نظام الملک طوسی کی سرپرستی میں ترقی کی اور اس قدر شہرت حاصل کر لی کہ خود اُن کے اُستاد بو علی سینا کو بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

ہر چند خلفاء عباسیہ کا سیاسی اقتدار، امتدادِ زمانہ کے ساتھ کھوتا جاتا تھا اور اس کے ساتھ علمی ذوق و شوق میں انحطاط ہو رہا تھا (یہاں تک کہ الراضی باللہ آخری خلیفہ تھا جس نے ممبر پر کھڑے ہو کر قابل ذکر خطبہ دیا اور اپنے دربار و نظامِ حکومت کے لحاظ سے فی الجملہ خلیفہ کہا جا سکتا تھا) تاہم یہ عجیب و غریب بات ہے کہ خلافت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کے بعد بھی مختلف خود مختار اسلامی حکومتوں نے علم و حکمت کی قدر دانی کو ترک نہیں کیا۔

اسد الدولہ نے علوم و فنون کی ترقی میں جس قدر حصہ لیا وہ اس سے ظاہر ہے کہ عبد الرحمن مشہور علم ہیئت اسکے دربار کا جوہر تابندہ تھا۔ اسی طرح المنصور سامانی، سیف الدولہ حمادی نے فارابی کی سرپرستی کر کے اپنی فضل شناسی کا جو ثبوت پیش کیا وہ بھی کچھ کم نہیں ہے، نظام الملک طوسی (الپ ارسلان اور ملک شاہ کے وزیر) سے کون واقف نہیں ہے کہ اُس نے کیسے کیسے اہل کمال کو یکجا کر دیا تھا اور سب جانتے ہیں کہ صلاح الدین کی صحبت میں ہمیشہ بہاؤ الدین، قاضی افضل اور امام الدین کاتب ایسے نفوس رہا کرتے تھے۔

کوئی اسلامی حکومت ایسی نہ تھی جہاں کتب خانے اور دار العلوم کثرت سے قایم نہ ہوئے ہوں اور ہر حکومت دوسری حکومت سے اس مسئلہ میں بڑھ جانے کی کوشش نہ کرتی ہو۔

بصرہ، کوفہ، بغداد، دمشق، مصر اور ادھر سارے عجم میں گھر گھر علم کا چرچا تھا۔ مسجدیں اور خانقاہیں اہلِ کمال کے فضلا خطبات سے گونجا کرتی تھیں اور ممالک اسلامی کے ذرّے ذرّے سے علم و فضل کا دریا اُبل رہا تھا۔

کیا بصرہ کی تاریخ، واصل بن عطاء اور جماعتِ اخوان الصفاء کو کبھی فراموش کر سکتی ہے؟ کیا وہاں کی مسجدیں اس لذت کو کبھی فراموش کر سکتی ہیں کہ علم و ادب، فلسفہ و ریاضی، ہیئت و نجوم کے کیسے کیسے اہم مسایل انھیں کی چار دیواریوں کے اندر حل ہوتے تھے؟ کیا قدیم قاہرہ، جامع الازہر پر بجا طور سے فخر نہیں کر سکتا جہاں سے ہزاروں ہستیاں فضل و کمال کا بہترین طرۂ امتیاز حاصل کر کے باہر نکلیں؟

کیا مسجد دمشق اُن واقعات کو بھول سکتی ہے کہ ابن ہشام المخزومی، روزانہ وہاں علمی مباحث جاری رکھتے تھے؟ کیا کوفہ کی مسجد سلمی کے اُن دُروسِ قرآنی کو بھول جائے گی، جن سے روزانہ اس کے در و دیوار گونجا کرتے تھے؟ اور کیا کوئی شخص دار العلوم نظامیہ اور مستنصریہ کو کبھی فراموش کر سکتا ہے؟ یہ حال تھا خاص خاص درسگاہوں کا ورنہ یوں تو ممالکِ اسلامی میں اتنی کثرت سے مدارس جاری ہوئے کہ آج کوئی اُن کا شمار بھی نہیں کر سکتا پھر اس کے ساتھ جب آپ اس حقیقت پر غور کریں گے کہ شوقِ علمی صرف مردوں ہی میں نہ تھا بلکہ عورتیں بھی اس میں حصّہ دار تھیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ علمی لہریں ممالک اسلامی کے مخفی ترین حصوں میں دوڑ گئی تھیں اور کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو اِن سے فیضیاب نہ ہو۔

ازاویہ کا دار الحکمت، نور الدولہ کی بیٹی ہی نے قایم کیا تھا اور دمشق میں بھی دو اکیڈیمی ایک خاتون ہی نے قایم کی تھیں جن کا نام ست الشم تھا۔

حکومتِ مصر

مصر میں فاطمیین اور فرمانروایانِ ملوک نے بھی خاندانِ عباسیہ سے کم علم کی قدر دانی نہیں کی۔ علامہ سیوطی نے حسن المحاضرۃ میں تفصیل کے ساتھ اس عہد کے علمی کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ المعز اور اس کے بعد تین فرمانرواؤں نے ترقی علم و تہذیب کے لئے اپنی پوری کوششیں صرف کیں اور بعض اوقات تو خلفاء فاطمیین کے مساعی اس باب میں خلفاء عباسیہ سے بھی سبقت لے گئے۔ چنانچہ الحاکم بامر اللہ کا قایم کردہ دار الحکمۃ، تمام اسلامی ممالک کے مدارس سے زیادہ وسیع تھا۔

حکومتِ اسپین

اسپین کی حکومتِ اسلام پر جب آپ مورخانہ نگاہ ڈالیں گے، تو یہاں بھی آپ کو عجیب و غریب علمی مناظر نظر آئیں گے اور آپ کو حیرت ہوگی کہ کیونکر ایسے دور و دراز ملک میں پہونچکر مسلمانوں نے اس قدر ترقی کر لی اور کس طرح انھیں مسیحی دشمنوں کے درمیان رہ کر اس قدر فرصت نصیب ہوئی کہ علوم و فنون کو بھی اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

اسپین کا مشہور مصنف، ابن سعید لکھتا ہے کہ "قواعد اور علم بیان اور معانی میں، اندلس والوں کو اس قدر انہماک تھا، کہ انھوں نے خلیل اور سیبویہ کے عہد کو بھی شرمادیا" پھر اسی کے ساتھ دیگر فنون میں بھی انھوں نے کم ترقی نہیں کی۔

ابن زہر کی کتاب التیسیر (جو علم طب کی بے مثل کتاب ہے اور جس کا ترجمہ اب یورپ کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے) زہراوی کی تصنیف فنِ تشریح پر، یحییٰ کی کتاب علم الادویہ پر دولت ہسپانیہ کے عہد حکومت کے خاص کارنامے ہیں۔

حکم ثانی کے زمانہ کو دیکھئے تو معلوم ہو سکتا ہے، کہ اسوقت علم کا کیسا چرچا تھا۔ یہ کتابوں کا حد درجہ شایق تھا اور اُسنے تمام ممالکِ مشرق میں آدمی بھیج بھیج اس قدر نادر نسخے فراہم کئے تھے، کہ اُن کی فہرست صرف چالیس جلدوں میں مرتب ہوئی تھی ابن باجہ اور ابن رشد اُسی کے عہد میں رونما ہوئے جن کے علمی کارنامے بیان کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔

اسپین کے مسلم عہدِ حکومت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ عورتیں حد درجہ مہذب و شایستہ ہوگئی تھیں۔ ولادہ (المستکفی کی بیٹی) اپنے عہد کی بڑی زبردست شاعرہ تھی اور علم بیان و معانی میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھی، اسی طرح عایشہ (شاہزادۂ احمد کی بیٹی) اس قدر فاضل تھی کہ اُس کے خطبات، قرطبہ کے دارالعلوم میں پڑھے جاتے تھے اور لوگ اُن سے فصاحت و بلاغت کا درس لیا کرتے تھے۔ یہ حال طبقۂ امراء کی عورتوں کا تھا لیکن معمولی طبقہ بھی اس سے محروم نہیں تھا۔ چنانچہ لبنیٰ، قرطبہ کے ایک معمولی خاندان کی لڑکی تھی، لیکن ادب و فلسفہ میں مشکل سے کوئی مرد بھی اُس کے سامنے بروئے کار آسکتا تھا اور خلیفہ حکم نے اس کے انھیں اکتسابات بلند کو دیکھ کر اپنے پرائیویٹ سکریٹری کی جگہ دیدی تھی، جو اس سے قبل و بعد کبھی کسی عورت کو نصیب نہیں ہوئی اسی طرح ایک خاتون، مریم (یعقوب الانصاری کی لڑکی) تھی جو ادب و شعر کی تعلیم لوگوں کو دیا کرتی تھی۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ ہسپانیہ میں، اس وقت ستر کتب خانے موجود تھے۔ اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمان فرمانرواؤں کو علم کا بہت ذوق تھا، بلکہ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مذاقِ علم وہاں پبلک میں بھی عام ہو گیا تھا۔ یہ تھا اک عام تبصرہ مسلمانوں کے ذوقِ علمی کا جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کے کارنامے کیا کیا تھے اور شاہانِ اسلام کی سرپرستی میں کیسے کیسے لوگ پیدا ہوئے اور علوم و فنون کا کیسا معتد بہ ذخیرہ فراہم ہو گیا۔

حاجی خلیفہ نے بارہ سو صرف تاریخی کتابوں کا نام اپنی فہرست میں درج کیا ہے اور اس میں وہ کتابیں شامل نہیں ہیں جن کا پتہ اُسے نہیں مل سکا۔

مورخ ابن ہشام سے لیکر (جو خلیفہ منصور کے عہد میں پائے جاتے تھے) ابن خلدون کے زمانہ تک (جو تیمور کا ہم عصر تھا) جتنی تاریخی کتابیں مدون ہوئی ہیں، اگر آج وہ سب دستیاب ہو جائیں تو کئی کتب خانے صرف تاریخ کی کتابوں سے بھر سکتے ہیں۔ تمام مورخین میں سے آج ہمیں صرف طبری، ابن اثیر، مسعودی، بلاذری، ابن قتیبہ، خلدون، ابن خلکان وغیرہ کے چند نام معلوم ہیں، اور نہیں کہہ سکتے کہ اور کتنے تھے جن کے کارنامے آج دنیا کے سامنے موجود نہیں۔

اسی طرح فن جغرافیہ میں ہمیں ابن خوردادبہ، قدامہ، مقدسی، یاقوت، ابوالفداء وغیرہ سے اور دیگر علوم میں بھی صرف مخصوص افراد سے آگاہی حاصل ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صرف علوم اسلامی کی مفصل تاریخ لکھنے بیٹھے تو باوجود اس کے کہ لاکھوں کتابیں مفقود ہو گئی ہیں، ہزاروں مصنفین کے نام دماغوں سے محو ہو گئے ہیں، اپنی پوری عمر صرف کرنے کے بعد بھی وہ اس فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

حکومتِ اسلام اور سنسکرت

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں پہلا وہ شخص، جس نے سنسکرت حاصل کی، فیضی تھا، لیکن یہ درست نہیں۔ اکبر نے جس فیاضی اور دریا دلی کے ساتھ، علوم و فنون کی قدر کی اور جس بے تعصبی کے ساتھ اس نے اپنی ہندو رعایا کے جذبات کی رعایت ملحوظ رکھی، اس کا اقتضاء یہ نہیں تھا کہ صرف فیضی ہی سنسکرت کی طرف توجہ کرتا۔

یہ واقعہ ہے کہ دربار اکبری میں متعدد نفوس ایسے تھے، جو سنسکرت کے عالم خیال کئے جاتے تھے، اس لئے اولیت کا فخر فیضی کے لئے مخصوص کر دینا حُسنِ ظن سے زیادہ کوئی درجہ نہیں رکھتا۔

ان لوگوں کی فہرست میں، جنھوں نے عہدِ اکبری میں، سنسکرت کی کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، علاوہ فیضی کے عبدالقادر، نقیب خاں، ملا شاہ محمد، سلطان حاجی، حاجی ابراہیم وغیرہ کا بھی نام نظر آتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جہاں کہیں اس نوع کے ترجمہ کا ذکر آیا ہے وہاں مورخین نے یہی لکھا ہے کہ "ہندی سے ترجمہ کیا گیا" لیکن ادنیٰ غور سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہندی سے مراد اُن کی سنسکرت تھی۔

ملا نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ عبدالقادر نے متعدد کتابوں کا ترجمہ ہندی سے فارسی میں کیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی محقق ہے کہ انھوں نے رامائن اور سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ کیا تھا اور اس لئے اغلب گمان یہی ہے کہ وہ ترجمہ اصل سنسکرت زبان ہی سے کیا گیا ہوگا۔

عبدالقادر اور فرشتہ نے لکھا ہے کہ مہابھارت کا ترجمہ بھی ہندی سے فارسی میں کیا گیا تھا، بدایونی کا بیان ہے کہ کچھ ترجمہ انھوں نے کیا اور کچھ نقیب خاں نے۔ فرشتہ، فیضی کی طرف منسوب کرتا ہے (سیر المتاخرین میں مہابھارت کے ترجمہ کو بدایونی سے منسوب کیا ہے) یہاں بھی قیاس یہی چاہتا ہے کہ اصل سنسکرت زبان سے ترجمہ ہوا ہوگا۔

دوسری جگہ بدایونی نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے اسے طلب کر کے اتھرو وید کے ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ لیکن چونکہ یہ کام بہت مشکل تھا اس لئے ملا عبدالقادر نے عذر پیش کیا۔ اور ابراہیم سرہندی اس خدمت کے لئے منتخب ہوئے۔

اس بیان سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ترجمہ اصل سنسکرت زبان سے کیا جاتا تھا ورنہ اسقدر اشکال پیش آنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں سکہ حضرت امیر خسرو نے عشقیہ اطفرذی نہ سپہر میں صاف طور

پر ظاہر کر دیا ہے کہ ہندی سے مراد سنسکرت زبان تھی جس میں خود انھیں بھی کافی دستگاہ حاصل تھی۔

یہ ذکر تو عہدِ اکبری کا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اس سے بہت قبل سنسکرت سے آشنا ہو چکے تھے اور اس زبان کی طرف اُنھیں بہت پہلے سے توجہ تھی۔

عہدِ مامون الرشید میں، جو علمی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے انتہائے عروج کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے، جبر و مقابلہ میں محمد بن موسیٰ کا رسالہ اور فنِ طب پر متعدد رسایل سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کئے گئے تھے۔ اگر زیادہ غور و تامل سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سے بھی قبل چرک اور سنسکرت کا ترجمہ عربی میں ہو چکا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں میں ہندوستانی طب کی طرف بہت پہلے سے خیال تھا۔

علاوہ اس کے ابتدائے عہدِ خلافت میں نجوم، موسیقی، ہیئت، علم التعبیر، علم الاصنام، مذہب، زراعت، سمیات، قیافہ، فراست الید وغیرہ کے بہت سے رسایل سنسکرت زبان سے عربی میں منتقل ہو چکے تھے۔

اگر مخصوص طور سے ہندوستان ہی کی تاریخ کو پیشِ نظر رکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ابھی مسلمانوں کے قدم اچھی طرح جمے بھی نہ تھے کہ اُنھیں یہاں کے علوم و فنون حاصل کرنے کی طرف توجہ ہوئی۔ چنانچہ ابوریحان بیرونی کے حالات سے دنیا واقف ہے کہ اس نے ہندوستان کی زبان اور یہاں کے علوم کو اس قدر محنت کے ساتھ حاصل کیا تھا کہ وہ نہایت قلیل زمانہ میں سنسکرت کی نہایت دقیق کتابوں کا ترجمہ عربی، فارسی میں اور عربی، فارسی کتابوں کا ترجمہ سنسکرت میں نہایت آسانی سے کرنے لگا۔ محمد بن اسرائیل التنوخی نے ہندوستان کا سفر ہی صرف اس لئے کیا تھا کہ وہ یہاں کے علم نجوم کو حاصل کرے۔

جب فیروز شاہ تغلق کو تسخیر نگر کوٹ کے سلسلہ میں سنسکرت کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا تو اُس نے حکم دیا کہ فلسفہ، پیشینگوئی اور شگون کی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کیا جائے۔ چنانچہ عزالدین خالد خانی نے اس کی تعمیل کی اور اس مجموعہ کا نام دلائل فیروز شاہی رکھا۔ اسی کے بعد اُس نے ہیئت کی ایک کتاب سنسکرت سے فارسی زبان میں منتقل کی۔

ایک اور کتاب فن بیطرہ پر سنسکرت سے فارسی میں منتقل کی گئی۔ جس کے دیباچہ میں مترجم نے لکھا ہے کہ "یہ کتاب غیاث الدین محمد شاہ خلجی کے حکم سے ۷۸۳ھ میں ترجمہ کی گئی"۔ بغداد میں اس سے قبل ایک کتاب اسی فن پر سنسکرت سے ترجمہ ہو چکی تھی، جس کا نام کتاب البیطرہ تھا۔

صاحب مجمل التواریخ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس نے ہندوؤں کے قدیم فلسفہ کی کتاب کا ترجمہ فارسی میں دیکھا جو ۴۱۷ھ میں کسی دیلمی سردار کے حکم سے ابوالحسن علی بن محمد الجیلی نے کیا تھا۔

ان تمام واقعات سے یہ حقیقت واضح ہے کہ اس باب میں مسلمانوں کے اندر اولیت کا فخر فیضی کو حاصل نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بہت قبل قرونِ اولیٰ میں عربوں کو اس طرف توجہ ہو گئی تھی۔

عجم کے کارنامے اسلام کے عہدِ زریں میں

اگر خالص مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کسی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حقیقی معنی میں اسلام کا عہدِ زریں تو وہی تھا جب تک بانیِ اسلام اس عالمِ آب و گل میں بقیدِ حیات رہے لیکن اگر اس خیال سے قطع نظر کرکے علوم و فنون کے ارتقاء، مدنیت و حضارت کے عروج کو پیشِ نگاہ رکھا جائے، تو یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ وہ زمانہ ۱۳۲ھ سے شروع ہوتا ہے۔ جب عہدِ عباسیہ کا اوّلین فرمانروا خلیفہ رونما ہوا اور پوری ایک صدی کے بعد ۲۳۲ھ پر ختم ہو جاتا ہے، جب قدرت نے عنانِ خلافت، متوکل (دسویں خلیفہ) کے سپرد کی۔

جن لوگوں نے تاریخ کا سرسری مطالعہ کیا ہے وہ بھی اس سے واقف ہوں گے کہ خلافتِ عباسیہ کی بنیاد صرف ایرانی النسل لوگوں کی مدد سے قایم ہوئی اور انھیں کی اعانت و مشورت نے اس خاندان کی حکومت کو انتہائے عروج تک پہونچا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ بنو امیہ نے نہایت اہتمام و شان کے ساتھ حکومت کی، فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا، اور اسلام میں مادی دولت کا بھی کافی اضافہ ہوا، لیکن بنو امیہ کی حکومت خالص عربی النسل لوگوں کی حکومت تھی، اور چونکہ اعراب، فطرت سے درشتی و خشن طبیعت لیکر آئے تھے، اس لئے باوجود بنو امیہ کی وسعتِ فتوحات و ملک گیری کے ان کی طبائع میں وہ لچک پیدا نہیں ہوئی جو حضارت و تمدن کے لئے ضروری ہے اور جس سے یہ لوگ بالکل نا آشنا تھے۔

جب بنو عباس کی خلافت کے ساتھ ساتھ، ایرانی اثر نظامِ حکومت میں غالب ہوا اور عربوں کا اقتدار کم ہونے لگا تو تمام وہی خصوصیات جو کسی وقت اکاسرۂ عجم کی حکومت میں پائی جاتی تھیں، آہستہ آہستہ ان میں بھی پیدا ہونے لگیں، علوم و فنون کی طرف توجہ، تمدن و معاشرت کے لوازم کی فراہمی، ظاہری شان و شوکت، معاشرت کی رفعت و پاکیزگی، مذہبی وسعتِ نظر یہ سب وہ باتیں تھیں جو اس زمانہ میں پیدا ہوئیں۔ آلِ برمک[1] نے دربارِ خلافت میں جو اثر اپنا پیدا کر لیا تھا وہ حقیقتاً اک انتقام تھا

---

[1] برمک حقیقتاً کسی شخص کا نام نہ تھا بلکہ یہ ایک لقب تھا جس سے بلخ کے مشہور آتشکدۂ نوبہار کا محافظ پکارا جاتا تھا۔ مسعودی کا بیان ہے کہ وہ شخص، جس کے سپرد یہ خدمت ہوتی تھی، بے انتہا معزز و ممتاز خیال کیا جاتا تھا۔ اور جو دولت، ہدایا کی صورت میں جمع ہوتی تھی اس کا بھی انتظام اسی کے سپرد ہوتا تھا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۳۲ پر ملاحظہ فرمائیے)

جو عجم سرزمین عرب سے لے رہا تھا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی آخری حد کیا ہوتی، اگر درمیان میں ترکوں کی جماعت اس اثر کو مٹا کر ہوا کا رُخ نہ بدل دیتی۔

ایرانیوں یا آل برمک کے اقتدار کا نمایاں اثر یہ ہوا کہ دربار خلافت، علمی جلوؤں سے معمور ہوگیا اور ایک گروہ ایسے علماء کا پیدا ہوگیا جو نقل و عقل کو مطابق کرنا چاہتا تھا اور جسے اب معتزلہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، معتزلہ نے کیا کیا، کس حد تک انھوں نے اسلام کی خدمت ادا کی، اپنے اخلاق و اُصول کے لحاظ سے یہ لوگ کیسے تھے، اس کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے، یہاں مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر معتزلہ کا وجود نہ ہوتا، تو اسلام فطری مذہب ہونے کے لحاظ سے لوگوں کی نگاہوں سے گر گیا ہوتا اور ایک الہامی دین کی حیثیت سے اس کو نہایت سخت آزار پہونچ جاتا، لیکن ترکوں کے عروج کے ساتھ ہی ایک طرف ایرانیوں کا اثر دربار خلافت سے کم ہوگیا اور دوسری طرف وہ مذہبی و علمی ترقی جو معتزلہ کی وجہ سے ہو رہی تھی دفعتاً رک گئی اور رفتہ آہستہ آہستہ اس کی جگہ انھیں اُصول نے لے لی، جو صرف ایک مسلمان ہی کے سامنے پیش کئے جا سکتے ہیں اور جنھیں وہی شخص تسلیم کر سکتا ہے جو پہلے سے اسلام کا ماننے والا ہو۔

ہم یہ ابھی بیان کر چکے ہیں کہ خلافتِ عباسیہ کی بنیاد بھی ایرانی ہاتھوں سے پڑی، اس لئے اگر اس عہد میں ان کا اثر غالب ہوگیا، ان کو امور سلطنت میں زیادہ درخور حاصل ہوگیا، تو جائے تعجب نہیں کیونکہ خلفائے عباسیہ قدرتی طور سے اُن کی پاسداری پر مجبور تھے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس کے اہل بھی تھے۔

یوں تو عہد عباسیہ کے اول خلیفہ سفاح ہی کے وقت سے ایرانیوں کا اثر اور اس کے ساتھ اُن کی روشن خیالیاں نمایاں ہو چلی تھیں، لیکن اس کا شباب خلیفہ مامون کے عہد میں آیا جس کی ماں اور بیوی[۲] دونوں ایرانی النسل تھیں، ہرچند خاندانِ برمک قریب قریب بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ لیکن ایران کا دوسرا خاندان اور موجود تھا، جس نے اس کی جگہ لے لی اور عروج کو پہو

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۳۱)

قزوینی نے بھی آثار البلاد میں لکھا ہے کہ ترک اور ایرانی اس آتشکدہ کی بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ آتشکدہ کی لمبائی اور چوڑائی سو سو ہاتھ تھی اور بلندی اس سے کچھ زاید۔ اسکی حفاظت برامکہ کے سپرد تھی، ہندوستان اور چین کے بادشاہ بھی یہاں آتے تھے اور برمک کے ہاتھوں کو بوسہ دیکر پرستش میں مصروف ہوتے تھے۔ یہ آتشکدہ اُسوقت ٹھنڈا ہوا جب حضرت عثمان غنی کے عہد میں خراسان فتح ہوا۔ اسوقت خالد کا باپ یہاں کا برمک (یعنی مہاتما) تھا۔ — [۲] اس کا نام پوران تھا جو حسن بن سہل کی بیٹی اور فضل بن سہل (مامون کے وزیر) کی بھتیجی تھی۔

ابن خلکان اور ثعالبی نے تفصیل کے ساتھ اس شادی کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت تمدن و معاشرت ارتقاء کے کس درجہ پر تھے۔ اور نمود و نمایش، شان و شوکت کس حد تک پہونچ گئی تھی۔

مامون کی ماں کا نام مراجل تھا جو ہرات کی رہنے والی تھی اور بصورت کنیز، ہارون الرشید کے حرم میں داخل ہوئی تھی۔

ماموں کے خلاف، امین کی طرف سے اک قسمت آزما جنگ کر چکے تھے، بدستور دربار خلافت سے الگ ہی رکھا۔

خلیفہ کے بعد سب سے بڑا درجہ وزیر[1] کا تھا اور وہ اس عہد میں قریب قریب ایرانیوں ہی کے ہاتھ میں رہا۔ عہد عباسیہ سے قبل وزیر کا وجود نہ تھا بلکہ اس کے بجائے ایک شخص کاتب یا مشیر کے نام سے موسوم ہوتا تھا، جو قریب قریب یہی خدمت انجام دیتا تھا۔ سب سے پہلے عہد عباسیہ ہی میں وزیر کا عہدہ ایجاد کیا گیا اور اس کے فرایض مقرر کئے گئے۔

ہر چند یہ عہدہ قریب قریب ایرانیوں ہی کے ہاتھ میں تھا اور انھوں نے نہایت قابلیت سے اس خدمت کو انجام دیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تھا حد درجہ خطرناک۔

چنانچہ ابو مسلم جسے امین آل محمد کہتے تھے، جس بُری طرح قتل کیا گیا، تاریخ کا مشہور واقعہ ہے اور ابو مسلم سے قبل جو وزیر (ابو سلمہ) تھا، اُسے خود ابو مسلم نے سفاح کے حکم سے جس بُری طرح ہلاک کیا وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ ابو مسلم کے بعد ابو الجہم وزیر ہوا اور اس کو بھی خلیفہ نے زہر دیا۔ جب اس پر زہر کا اثر شروع ہوا اور وہ کمرہ سے اُٹھ کر چلا تو خلیفہ نے پوچھا "کہاں چلے؟" اُس نے جواب دیا "جہاں آپ مجھے بھیجنا چاہتے ہیں"

اس وزیر کے بعد آل برمک کا عروج ہوا اور نصف صدی تک اس طنطنہ کے ساتھ انھوں نے وزارت کی کہ تاریخ مشکل سے کوئی دوسری مثال پیش کر سکتی ہے۔ لیکن باوجود اس تمام اقتدار و اثر کے یہ بھی نہایت احتیاط سے اور ڈرتے ہوئے کام کرتے تھے کہ مبادا اُن سے کوئی حرکت ایسی سرزد ہو جائے جس سے اُن پر مجوسی الاصل ہونے کی وجہ سے تعصب کرنے کا الزام عاید ہو۔

ایک بار خلیفہ منصور نے ابو ایوب کے مشورہ سے ارادہ کیا کہ ایوانِ کسریٰ کو منہدم کرا کے اُس کے سامان سے دوسرا قصر طیار کرائے۔ جب خالد ابن برمک سے ذکر آیا تو اس نے کہا کہ "امیر المومنین، ایسا نہ کیجئے، کیونکہ اس کو قائم رکھنا حقیقتًہ اسلام کے نشان اقبال کو قائم رکھنا ہے۔ آیندہ نسلیں جب دیکھیں گی تو کہیں گی کہ کیسی کیسی سلطنتیں مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی تھیں، علاوہ اس کے یہ وہ مکان ہے جہاں علی ابن ابی طالب نے نماز ادا کی ہے۔ لیکن اگر یہ باتیں قابل لحاظ نہ ہوں تو بھی اس کا مسمار کرنا اقتصادی نقطۂ نظر سے مفید نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے برباد کرنے میں جس قدر صرف ہو جائے گا، اس سے کم میں اک نئی عمارت قایم ہو سکتی ہے۔" منصور نے یہ سنکر جواب دیا کہ "اے خالد جب تو کوئی بات کہتا ہے تو ہمیشہ اس سے

---

[1] اس لفظ کا ماخذ عام طور سے وزر بتایا جاتا ہے چونکہ انتظام سلطنت کا تمام بار اسی عہدہ دار کے ذمہ ہوتا تھا اس لئے اُسے وزیر (بوجھ اُٹھانے والا ذمہ دار) کہتے تھے۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ معرب ہے پہلوی لفظ وچیر کا جو مشتق ہے وی چر (فیصلہ کرنا) سے یا گزیر کا جو تالمود میں پایا جاتا ہے، علامہ فخری کا بیان ہے کہ وزیر کا اشتقاق وزر سے بھی ممکن ہے جس کے معنے ہیں جائے پناہ کے۔

ایران کی پاسداری ظاہر ہوتی ہے"

خالد یہ سُن کر خاموش ہو گیا اور منصور نے مسماری کا حکم دیدیا، لیکن چند دن بعد ہی منصور کو معلوم ہو گیا کہ اسکے توڑنے میں اندازہ سے زیادہ صرف ہو رہا ہے اور خالد کا خیال صحیح تھا۔ اس لئے ایک دن اُس نے خالد سے کہا کہ میں بھی تمھاری رائے سے متفق ہوں اور ایوان کسریٰ کی مسماری کو میں نے بند کرا دیا ہے۔" خالد نے یہ سُن کر کہا کہ "امیر المومنین۔ اب اس کا مٹا دینا ہی مناسب ہے، کیونکہ جب آئندہ قومیں اسے نیم شکستہ حالت میں دیکھیں گی تو کہیں گی کہ خلیفہ منصور اُس چیز کو بگاڑ بھی نہ سکا جس کو ایک قوم نے بنایا تھا۔" ہر چند خالد کی دونوں رائیں صائب تھیں لیکن منصور نے کسی پر عمل نہیں کیا۔

الغرض عہدۂ وزارت اُس زمانہ میں سب سے انتہا نازک تھا لیکن باوجود خطرات و خدشات کے ایرانیوں نے اس جگہ کو ہاتھ سے نہیں دیا اور آہستہ آہستہ اُن کی تہذیب و معاشرت نے عربوں میں رسوخ حاصل کر لیا۔ پہلے مسلمانوں میں جشن نوروز کا رواج نہیں تھا، لیکن عہد عباسیہ میں ہر شمسی سال کے پہلے دن جب آفتاب برج حمل میں جاتا ہے، یہ جشن منایا جاتا تھا۔

خلیفہ ہادی، ہارون اور مامون کے عہد میں ایرانیوں کے اثرات انتہائے عروج تک پہونچ گئے تھے اور مامون کے تو اکثر وزراء ایرانی یا ایرانی النسل تھے۔ بغداد میں ایرانی وضع عام ہوتی جاتی تھی۔ نوروز، مہرگان وغیرہ ایرانی تقریبات نہایت اہتمام سے عمل میں آتی تھیں۔ درباری لباس بھی ایرانی تھا حتیٰ کہ کوئی شخص بغیر قلنسوہ (مخروطی شکل کی لانبی سیاہ ٹوپی) کے خلیفہ کے حضور میں آ ہی نہ سکتا تھا۔ ساسانی بادشاہوں کے بہت سے آداب داخل دربار ہو گئے تھے۔ خلیفہ المتوکل کا ایک سکّہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل ساسانی لباس میں رہا کرتا تھا۔

پھر یہ ایرانی اثر صرف انتظامی معاملات سلطنت تک محدود نہ تھا بلکہ علوم مذہبیہ میں بھی یہ لوگ صف اول میں شمار کئے جاتے تھے۔

عہد جاہلیت میں، عرب لکھنے پڑھنے سے بالکل ناواقف تھے اور انھیں اپنے اُمّی ہونے پر ناز بھی تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی شاعری اور فخر انساب اتنی بڑی دولت اُن کے پاس ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے دُنیا میں پھر کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اُن کا خیال تھا کہ جو شخص شاعری کے علاوہ کسی اور فن یا علم کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ اپنے حقیقی فرض کو ضائع کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ جو قوم اپنے تیر و کمان، نیزہ و تلوار سے کام لینا جانتی ہے اُسے کسی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے اور اگر ہے تو صرف اس قدر کہ وہ اپنے قوم کی پُرانی تاریخ اور اپنے خاندان کے قدیم انساب کو محفوظ رکھے۔

فدالرمہ (جو قدیم بدوی شعراء کی آخری کڑی تھا) لکھنا جانتا تھا، لیکن اس نے ہمیشہ اس حقیقت کو چھپایا، کیونکہ عربوں میں فن تحریر کا جاننے والا نگاہوں سے گر جاتا تھا۔

رسول اللہ کے مبعوث ہونے کے بعد بھی عربوں کا یہی حال تھا اور وہ مطلقاً تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ یہی کمی تھی، جس کا خیال کرکے رسول اللہ نے جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق یہ حکم دیا تھا کہ اُن میں جو لکھنا جانتے ہیں وہ آزاد ہیں، بشرطیکہ قریش کے بچّوں کو لکھنا سکھائیں۔ واقدی کے حوالہ سے بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ ابتدائے اسلام میں قریش کے امراء میں سے صرف ۱۷ آدمی لکھنا جانتے تھے جن میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عثمان، ابن الجراح، طلحہ، ابوسفیان اور امیر معاویہ بھی شامل تھے۔

برخلاف اس کے ایرانیوں کی یہ حالت تھی کہ قدیم ساسانی عہد میں بھی کوئی بادشاہ اس وقت تک مکمل طور پر سلطنت کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک وہ فنِ تحریر سے واقف نہ ہو۔ پھر یہی نہیں تھا کہ وہ صرف اپنی مادری زبان پر عبور رکھتے ہوں بلکہ (ظہورِ اسلام سے قبل ہی) وہ عربی زبان بھی حاصل کرتے تھے۔

چنانچہ بہرام گور جس کی تعلیم اعرابِ حیرہ کے درمیان ہوئی تھی، علاوہ عربی، فارسی کے یونانی زبان بھی جانتا تھا اور ان تمام زبانوں کو اچھی طرح لکھ بھی سکتا تھا۔ عوفی نے تو اس کے عربی شعر بھی اپنے تذکرہ میں درج کئے ہیں۔ اسی طرح ایرانی گورنر یمن کا (خرا خسرو) تو بالکل عرب ہی بن گیا تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنی جگہ سے ہٹا دیا گیا۔ الغرض ایرانی پہلے ہی سے عربی زبان سے مانوس تھے اور جب اسلام نے عرب و عجم کو ایک کر دیا، اور اختلاف مذہب بھی مٹ گیا تو پھر کثرت سے انھوں نے عربی زبان حاصل کی اور اس قدر تیزی کے ساتھ وہ عربی سانچہ میں ڈھل گئے کہ مشکل سے کوئی دوسری نظیر صفحاتِ تاریخ پر مل سکتی ہے۔

پہلی صدی ہجری ختم نہ ہوئی تھی کہ عجم نے عربی زبان کے نحوی اور صرفی پیدا کر دیئے، چنانچہ بُشکست، (ایرانی) سب سے پہلے وہ شخص تھا جس نے مدینہ میں بیٹھ کر عربی زبان کے قواعد مرتب کئے۔ اگر ان تابعی لوگوں کی فہرست مرتب کی جائے جو اسلام کے قرونِ اولیٰ میں پائے جاتے تھے تو اُس میں اکثر نام عجمی لوگوں کے ہوں گے جو جنگی قیدی کی صورت میں عرب آئے اور جنھوں نے موالی کی حیثیت سے اسلام کی نہایت عمدہ خدمات انجام دیں۔ ابو اسحاق کا دادا، جس کی سیرت نبوی، ابتدائے اسلام کی بہترین تاریخ ہے۔ ابو موسیٰ النصیر جو تاریخ اندلس کا خاص شخص ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ جنھوں نے ادب، حکمت، سیاست و مذہب کے علوم میں مخصوص شہرت حاصل کی، سب کے سب ایرانی یا ترکی نسل کے تھے، جو بہ حیثیت موالی کے عرب میں رہتے تھے۔ خلیفہ عبدالملک اور فقیہ الزہری کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ، یمن، مصر، شام، عراق، خراسان، کوفہ اور بصرہ میں ہر جگہ عہدۂ قضا موالی ہی کے ہاتھ میں تھا اور کسی عرب کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا۔ چنانچہ خلیفہ کو اس پر تعجب ہوا تو الزہری نے جواب دیا کہ "امیر المؤمنین یہ تو خدا اور اس کے مذہب کی پیروی کا نتیجہ ہے جو قرآنی احکام پر عامل ہوگا وہی ترقی کر سکے گا۔"

اس میں شک نہیں کہ عرب نے ہمیشہ عجم سے نفرت کی اور باوجود اس کے کہ مذہب نے ان دونوں کو ایک سطح پر لاکر

کھوکھلا کر دیا اور تفریقِ قومی کو یکسر مٹا کر رکھدیا تھا، تاہم اہلِ عرب نہ اہلِ عجم سے خوش تھے اور نہ اُن کے ساتھ اپنے تعلقات وسیع کرنا چاہتے تھے، لیکن اس کا کیا علاج کہ موالیِ عجم اپنے فہم و فراست، اپنی قابلیت و ذہانت سے آہستہ آہستہ ترقی کرتے جارہے تھے اور عہدِ بنو اُمیہ میں بھی جو خالص عربی حکومت کا دور تھا، انھوں نے نمایاں امتیاز حاصل کرلیا تھا اور زمانہ کی رفتار کہے دیتی تھی کہ وہ دن بہت جلد آنے والا ہے، جب عجم، عرب کو پس پشت ڈالکر خود بروئے کار آجائے گا چنانچہ عہدِ عباسیہ میں یہ نتیجہ ظاہر ہوکر رہا اور ایرانیوں کے غیر معمولی عروج نے عربوں کو آتشِ زیر پا کر دیا۔

چونکہ عرب کو اپنے نسب پر بڑا فخر تھا اور وہ غیر اعراب پر طعن و تشنیع سے باز نہ آتے تھے، اس لئے ان کے مخالف ایک اور گروہ شعوبیہ پیدا ہوگیا، جس نے نہ صرف یہ دعویٰ پیش کیا کہ مذہب اسلام نے تمام قوموں کو برابر کر دیا ہے بلکہ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عربوں کی قوم اکثر قوموں سے کمتر درجہ کی ہے۔

ایک بار ابو تمام نے خلیفہ کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا جس میں اُسے قبیلۂ طے کی مشہور ہستی حاتم سے تشبیہ دی تھی وزیر نے سنکر شاعر کو تنبیہ کی کہ آیندہ ایسی جرأت نہ کرنا کہ امیر المومنین کے مقابلہ میں وحشی عربوں کا ذکر کرو۔

شعوبیہ گروہ کی مختلف جماعتیں تھیں اور ہر جماعت اپنے اپنے ملک کی طرفداری کرتی تھی، لیکن ان میں سب سے زیادہ ذی اثر ایرانی جماعت تھی اس عہد کے امرائے ایران اپنے نسب ناموں کو بھی اسی طرح محفوظ رکھتے تھے جس طرح عرب۔ اور اسلئے شعوبیہ جماعت نے اس باب میں بھی عربوں پر حملہ کیا جو زیادہ بیجا نہ تھا اور اگر اس خصوصیت کو نگاہ رکھا جائے کہ وہ عربوں کے انساب کا بھی کافی علم رکھتے تھے بلکہ بعض اوقات عربوں کو اپنے آبا و اجداد کے تاریخی حالات ایرانیوں سے دریافت کرنے پڑتے تھے، تو ایرانیوں کا یہ فخر بالکل حق بجانب نظر آتا ہے۔

ایرانی بے انتہا ذہین تھے، وہ سمجھتے تھے کہ عربوں میں کیا کمزوریاں ہیں اور وہ اُن سے کس طرح فایدہ اُٹھا سکتے ہیں چنانچہ یہ ذوق اس قدر بڑھ گیا کہ مختلف کتابیں عربوں کی تحقیر و تذلیل میں لکھی گئیں اور شعوبیہ جماعت نے عربوں کو سخت پریشان کر دیا اسحاق بن حسان الخرمی، ابو عثمان، سعید بن حمید بن بختگان۔ ابو سعید الرستمی اور ابو ریحان بیرونی خاص خاص لوگ شعوبیہ جماعت کے تھے، جنھوں نے عربوں کے خلاف مستقل تصانیف مرتب کر دیں۔

شعوبیہ جماعت کی یہ جنگ صرف انساب اور زبان کے معاملے تک محدود تھی، کیونکہ ان ہی دونوں باتوں پر عربوں کو فخر حاصل تھا اور اگر انصاف کیا جائے تو اس جنگ میں بھی ایرانی ہی کامیاب ثابت ہوئے۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ایرانی عربوں کی قدیم تاریخ سے پوری طرح واقف تھے اور انھیں معلوم تھا کہ اس میں کہاں کہاں کمزوریاں پائی جاتی ہیں، چنانچہ انھیں کو وہ نمایاں کرکے دکھاتے تھے برخلاف عربوں کے کہ وہ ایرانیوں کی تاریخ سے بالکل ناواقف تھے اور اُن کے پاس کوئی ذریعہ ایرانیوں کو زک دینے کا نہ تھا۔

شعوبیہ میں ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ نہایت قابل اور مشہور شخص گزرا ہے جس نے بتایا ہے کہ عربوں کی زبان کس حد تک

ایران کی ممنون ہے، اور انھوں نے ایرانی فسانوں، ایرانی اُصولِ فصاحت و بلاغت سے کس قدر استفادہ کیا ہے۔ حمزہ اصفہانی نے تو اس میں اس قدر غلو کیا ہے کہ وہ بہت سے عربی شہروں کے ناموں کو بھی فارسی زبان سے ماخوذ بتاتا ہے مثلاً بصرہ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ اصل میں یہ بس راہ (دور کا راستہ) تھا اسی طرح صاحبِ دبستان نے مکہ کی حقیقت ماہ گاہ (چاند کی جگہ) ظاہر کی ہے۔

ہر چند اس قسم کی تاویلیں بالکل ساقط الاعتبار ہیں لیکن اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ شعوبیہ نے عربوں کے خلاف کس قدر شدتِ تعصب سے کام لیا اور یہ غالباً انتقام تھا عربوں کے اُس نخوت و پندار کا جو وہ عجمیوں کے مقابلہ میں ظاہر کیا کرتے تھے شعوبیوں کے خلاف عربوں نے بہت کچھ لکھا، کتابیں تصنیف کیں، اپنے دعاوی پیش کئے ایرانیوں کے الزامات کا جواب دیا اور پوری طرح اپنی قوتِ ہجو بازی صرف کر دی، لیکن جس قدر شہرت شعوبیہ کو حاصل ہوئی وہ انھیں حاصل نہ ہوئی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ایرانیوں میں علوم و فنون کا رواج تھا اور وہ اپنے وسیع معلومات کی وجہ سے مقابلتاً زیادہ کامیاب ہوئے۔

جب اسلام کی فتوحات میں وسعت پیدا ہونے لگی اور دیگر ممالک کے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے تو سب سے پہلے جس چیز کی طرف انھیں توجہ کرنے کی ضرورت ہوئی وہ عربی زبان تھی، کیونکہ جس قوم میں وہ آکر شامل ہوئے وہ کتاب جس کے ساتھ انھوں نے اپنی ساری زندگی وابستہ کر دی، عربی زبان سے متعلق تھی اور اس لئے ضروری تھا کہ وہ پہلے اس زبان میں پوری مہارت حاصل کرتے۔ پھر ظاہر ہے کہ ایک غیر قوم کو عربی زبان سیکھنے کے لئے صرف و نحو جاننے کی ضرورت تھی اور اس کے ساتھ اس کی لغات معلوم کرنے کی۔ لیکن چونکہ عربی زبان بہت وسیع زبان ہے اس لئے اسرار لغات و قواعد سیکھنے کے لئے قدیم اشعار کا فراہم کرکے یاد کرنا ضروری ہوا اور عربی شاعری سمجھنے کے لئے اُن کے انساب و اخبار اور ان کی گزشتہ تاریخ کا علم لابد تھا اس لئے زبان عربی سیکھنے کے ساتھ ہی ساتھ عجمیوں کو صرف و نحو، لغت، و تاریخ، علم الانساب و الایام، جغرافیہ و تاریخ کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی جس کی عربوں کو چنداں ضرورت نہ تھی۔

اسی کے ساتھ جب آپ مذہب کی طرف آئیں گے تو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلعم کے بعد قرآن سمجھنے اور احکام مذہب کے متعلق اقوال رسول اللہؐ کا استقصار کرنے کی غرض سے اصحاب رسول اللہ اور تابعین سے استمداد کی ضرورت تھی۔ تاکہ وہ عام معاشرت کے متعلق رسول اللہؐ کے فرمان بتائیں، لیکن چونکہ ہر حدیث کو حدیث نبوی ماننے میں تامل ہو سکتا تھا اس لئے ہر حدیث کی اسناد طلب کی جانے لگیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ اسماء الرجال کا فن مدون ہو گیا جس کا اضافہ شعبۂ تاریخ میں صرف مسلمانوں ہی نے اول بار کیا اور آج تک کسی مذہب و تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکی۔

پہلی صدی ہجری میں کوئی کتاب ایسی مرتب نہ ہوئی تھی جو زبان و تاریخ سیکھنے والوں کو مدد دے سکتی اس لئے جن کو عربی لٹریچر سیکھنا ہوتا تھا وہ بدویانِ صحرا نشین کے پاس جاتے تھے اور جنھیں احکام مذہب معلوم کرنا ہوتے تھے وہ اپنے

میں اصحاب رسول اللہ کی تلاش کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ طلب علم کے لئے مسلمانوں کو سفر و سیاحت زیادہ کرنی پڑتی اور آخرکار یہ ذوق و شوق اس قدر بڑھ گیا کہ مکحول نے جو ایک مصری غلام تھے، تمام حجاز، عراق اور شام کا سفر صرف اس لئے کیا کہ مال غنیمت کی تقسیم کے متعلق رسول اللہ کی کوئی صحیح حدیث معلوم کریں اور آخرکار زیاد بن جاریہ التمیمی سے انھیں ایک حدیث ایسی دستیاب ہوئی جو حبیب بن مسلمہ الفہری سے روایت کی گئی تھی۔

اس کے ساتھ ایک وقت یہ بھی تھی کہ تمام مذہبی علوم صرف زبانی حاصل کئے جاتے تھے۔ چنانچہ سب سے قدیم مذہبی کتاب نثر کی صرف ابن اسحاق کی سیرۃ نبوی تھی، جسے ابن ہشام نے زیادہ مہذب و مکمل صورت میں پیش کیا۔

پہلی صدی ہجری میں ابوہریرہ، عبداللہ بن عمر ابن العاص، الزہری، حسن بصری وغیرہ چند نفوس ایسے تھے جنھوں نے اپنی معلومات کو نوٹ کی شکل میں مرتب کیا تھا، لیکن مرتے وقت وہ انھیں بھی تلف کر گئے۔ احادیث کو ضبط تحریر میں لانے سے انحراف دوسری صدی ہجری تک برابر قائم رہا۔

چنانچہ عبدالرحمن بن سرملہ السلمی کو مشکل سے اُن کے اُستاد نے اجازت دی کہ وہ احادیث کو لکھیں۔ اس قدغن کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ لوگوں کا خیال تھا، ممکن ہے کتب احادیث کی ایسی عزت نہ کی جائے، جس کی وہ مستحق ہیں اور دوسرا سبب یہ تھا کہ کہیں لوگ صرف احادیث ہی کو اپنا معمول بنا کر کلام مجید کو نہ چھوڑ بیٹھیں۔

یہ خیال صرف مذہبی کتابوں سے متعلق تھا ورنہ دیگر فنون کی کتابیں عہد بنو امیہ میں مرتب ہو چکی تھیں اور اکثر لوگوں نے اس طرف کافی توجہ کی تھی۔ ان میں سے وہب بن منبہ (ایرانی النسل) عبید بن شریہ[1] ابوالمخنف بن یحییٰ[2] الزہری[3] ان کے شاگرد عبدالرحمن العامری موطا[4] کا مصنف اسد بن موسیٰ بن ابراہیم[5]: محمد بن شیریں کتاب الجامع کا مصنف محمد بن علی بن عمر السالمی کتاب الاشارہ کا جامع خالد بن یزید (اموی شاہزادہ) علم الکیمیا کا ماہر اور اس کا شاگرد جابر بن حیان خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

یہ مصنفین عہد بنو امیہ کے تھے لیکن عہد عباسیہ میں ان کی تعداد بڑھ گئی اور ان میں عنصر غالب ایرانی النسل لوگوں کا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عجم نے عرب کی کس قدر خدمت کی ہے، چنانچہ ابن المقفع (جو مجوسی النسل تھا اور ابن خلدون و ابن مقلہ کے نزدیک بھی عربی زبان کا بڑا ماہر تھا) عیسیٰ بن عمرو الثقفی (جس نے سب سے پہلے عربی قواعد کو مرتب کیا

---

[1] یہ دونوں صنعار کے رہنے والے تھے۔ عبید کا انتقال خلیفہ عبدالملک کے عہد میں ہوا اور وہب کا خلیفہ ہشام کے زمانہ میں۔

[2] اس کے تاریخی افسانے بہت مشہور ہیں، حکومت بنو امیہ اور اس کا خاتمہ ساتھ ہی ساتھ ہوا۔

[3] یہ بھی خلیفہ ہشام کے زمانہ میں تھے۔

[4] امام مالک کی موطا بعد کو لکھی گئی ہے۔

[5] یہ کتاب الزہد کا مصنف تھا۔

اور خلیل بن احمد اور سیبویہ کو درس دیا) امام ابو حنیفہ (جو ایرانی النسل تھے) حماد بن شاپور (سبعہ معلقہ کا جامع) بشار بن برد (ایرانی النسل اور عربی کا مشہور نابینا شاعر) سیبویہ (مشہور نحوی) علی بن حمزہ الکسائی (مامون و امین کا اتالیق) ابو نواس (دربار ہارون کا مشہور شاعر) الفرّا (کسائی کا مشہور شاگرد) ابن قتیبہ (مشہور مورخ) اخفش (سیبویہ کا مشہور شاگرد) قسطا بن لوقا (بعلبک کا عیسائی اور اپنے عہد کا بڑا زبردست ریاضی و ہیئت داں) وغیرہ سب غیر اعراب تھے جنھوں نے اپنی قابلیت اور فضل و کمال کے غیر فانی نقوش تاریخ میں ثبت کرکے، یہ حقیقت واضح کردی کہ اسلام کی مساوات نے عرب و عجم دونوں کو ایک سطح پر لاکر کھڑا کر دیا تھا اور شریعت حقہ کے نزدیک وہی شخص مستحق عزت تھا جس نے اپنے اندر کوئی کمال پیدا کیا اور صرف فخرِ انساب کو ذریعۂ امتیاز قرار نہیں دیا

ایک دن خلیفہ ہارون الرشید اور وزیر جعفر برمکی دونوں گھوڑوں پر سوار بغداد سے باہر جارہے تھے کہ راستہ میں انھیں اونٹوں کی ایک قطار ملی جن پر سونا لدا ہوا تھا جو خزانۂ خلافت میں داخل کیا جانے والا تھا

خلیفہ نے سالار قافلہ سے پوچھا "یہ اونٹ کہاں سے آرہے ہیں" اس نے جواب دیا کہ "یہ اونٹ خراسان سے آرہے ہیں اور علی ابن عیسیٰ عامل خراسان نے تحفتاً امیرالمومنین کی خدمت میں بھیجے ہیں

خراسان میں اس سے قبل جعفر برمکی کا بھائی فضل برمکی گورنر تھا، لیکن ہارون الرشید نے اسے معزول کرکے، علی ابن عیسیٰ کو اس کی جگہ مامور کر دیا تھا

بادشاہ نے سالار قافلہ کا یہ جواب سنکر جعفر سے طنزیہ انداز میں پوچھا کہ: "تمہارے بھائی فضل کے زمانہ میں یہ سونا کہاں تھا"

جعفر نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "ان لوگوں کے گھروں کے اندر جو اس کے جائز مالک و حقدار تھے"

شاہجہاں و اورنگ زیب کا ضبط اوقات

یورپ کے مکائد سیاسی نے مشرقی روایات کو جس بیدردی کے ساتھ تباہ و برباد کیا ہے، وہ تاریخ کا ایسا دردناک واقعہ ہے کہ اگر عہدِ حاضر کی برقی روشنی میں بھی اس کی نظیر تلاش کی جائے، تو شاید کسی کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔

ہمارے اخلاق، ہمارے اطوار، ہماری تہذیب، ہماری سیاست، ہماری حکومت حتیٰ کہ ہماری ہستی بھی مغرب کے نزدیک فطرت کی بدترین پیداوار سمجھی جاتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ حقیقت کو کس حد تک پامال کرنے کے بعد آسودہ ہو سکے گی۔

ایک یورپین مورخ، جس وقت ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں کی تصویر کھینچنے بیٹھ جاتا ہے تو اس کا مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ واقعاتِ تاریخ اور اقتضائے انصاف سے ہٹ کر جتنی ممکن صورتیں اس تصویر کے مسخ کرسکنے کی ہو سکتی ہیں، اُن سب کو بروئے کار لائے اور اس کے ہر روشن پہلو پر گہرے سے گہرا سیاہ پردہ ڈالنے میں سارا زورِ قلم صرف کر دے۔ ہرچند یہ ایسی کمزور اور بے بود کوشش ہے کہ ہر شخص بہ ادنیٰ تامل اس حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ خود ہم لوگ اپنے حالات سے واقف نہیں ہیں اور ہندوستان کا نزاعِ قومی خود باہمدگر دوسرے کی نکتہ چینی و عیب جوئی سے مسرور ہوتا ہے، اس لئے نہ ہم مغرب کی چالوں کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ وہ ہماری انشقاق و تفریق کی زریں فرصت کو ہاتھ سے جانے دیتا ہے، جس کا کھلا ہوا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم انھیں کے بیان پر یقین کریں اور اسی یقین کی بنا پر ایک دوسرے کے دشمن ہوتے چلے جائیں۔

یورپین مورخ کا قاعدہ ہے کہ جب وہ کسی مشرقی بادشاہ کا حال لکھتا ہے، تو اس کو اس قدر ہیبت ناک بنا دیتا ہے کہ ہر شخص دیکھ کر متنفر ہو جائے اور مشرق کے اخلاق سے بیزار۔ اس کے نزدیک مشرقی بادشاہ ایک ایسی جابر و ظالم ہستی ہے جس کو سوائے خونریزی اور ستم رانی کے کسی اور کام سے واسطہ ہی نہیں ہے یا پھر وہ حرم کے اندر ایک ایسا ہوس پرست دیوتا ہے جو حُسن کی قربانیوں میں کسی حال میں آسودہ نہیں ہوتا، وہ انتظامِ سلطنت سے بیزار ہے، رعایا کی طرف سے بے پروا و غافل ہے اور نے میں اپنا نظیر نہیں رکھتا، سفاکی و بیرحمی اُس کا شعارِ زندگی ہے اور قتل و غارت اس کی حیات کا تنہا نصب العین۔ آج محمود کی بُت شکنی اور اورنگ زیب کی عصبیت، اسکول کے ہر لڑکے کی زبان پر ہے اور یہ کسی کو نہیں معلوم کہ اسی محمود نے راجہ کالنجر کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اورنگ زیب کا طرزِ عمل ہندوؤں کے ساتھ کس قدر منصفانہ و روادارانہ تھا۔

پھر چونکہ اب یورپ کے دسائسِ سیاسی ایک ایک کر کے بے نقاب ہو رہے ہیں، چونکہ اب مشرق، مغرب کی سم آلود

تہذیب و شائستگی سے متنفر ہو چلا ہے، اس لئے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ خود بھی تنقید سے کام لے اور معلوم کرے کہ اسوقت تک کس مکر و فریب میں ہمیں مبتلا رکھا گیا ہے۔

آج یورپ اپنی پابندی اوقات پر ناز کرتا ہے اور کاہلی صرف شاہانِ مشرق کے لئے مخصوص سمجھتا ہے، لیکن اگر انصاف سے کام لیا جائے، تو معلوم ہو سکتا ہے کہ مسلم فرمانروایانِ ہند کا ضبطِ اوقات اس عہدِ روشن میں بھی قابلِ تقلید ہے اور کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک جابر و ظالم، کاہل و غافل اور ہوس پرست، سوئی ہوئی ہستی، کیونکر اس قدر صحیح تقسیم اپنے اوقات کی کر سکتی ہے

شاہجہاں

بیداری و نماز اس کا معمول تھا کہ صبح طلوعِ آفتاب سے دو گھنٹہ قبل بیدار ہوتا اور ضروریات سے فارغ ہو کر نمازِ تہجد ادا کرتا اس کے بعد وہ رو بہ قبلہ ہو کر کلام مجید پڑھنے میں مصروف ہو جاتا، یہاں تک کہ نمازِ فجر کا وقت آجاتا اور قلعہ کے اندر کی مسجد میں نماز پڑھ کر وظائف وغیرہ سے پونے سات بجے فارغ ہوتا۔

درشن نمازِ فجر سے فارغ ہو کر، سورج نکلنے کے پورے ۴۸ منٹ بعد وہ "جھروکۂ درشن" میں آجاتا، جو قلعۂ آگرہ کے شمالی دیوار میں اب بھی بنا ہوا ہے۔ قلعہ کے نیچے زائرین کا ہجوم ہوتا، جو بادشاہ کو دیکھ کر سلام کرتا اور ہر شخص نہایت آزادی سے اپنے معروضات پیش کر سکتا۔ اس لئے وہ لوگ جو نہایت ضروری شکایتیں خود بادشاہ کے حضور میں پیش کرنا چاہتے تھے، صبح کو "جھروکۂ درشن" کے نیچے کھڑے ہو جاتے تھے اور بادشاہ اُن کے عرائض پر اُسی وقت مناسب احکام لکھوا دیتا تھا۔ جھروکے پر ایک جماعت پنڈتوں کی حاضر رہتی تھی جنھیں درشنی کہتے تھے۔ یہ اس وقت تک نہ کچھ کھاتے تھے اور نہ کوئی کام کرتے تھے، جب تک بادشاہ کا چہرہ انھیں نظر نہیں آجاتا تھا۔ اس درشن کے بعد میدان صاف کر دیا جاتا تھا، افواجِ شاہی باقاعدہ قائم ہو جاتیں امراء و اراکین صف بستہ حاضر ہوتے اور مست ہاتھیوں کی جنگ کا نظارہ کیا جاتا۔ یہ تفریح صرف بادشاہ کے لئے مخصوص تھی اور ولیعہد بھی اُس کا مجاز نہ تھا۔ شاہجہاں اس تفریح کا مخصوص طور سے، نہایت شایق تھا۔ دریا کے ساحل پر فوجی ہاتھیوں اور سواروں کی باہم مصنوعی جنگ بھی اسی وقت ہوتی جسے بادشاہ نہایت دلچسپی سے معائنہ کرتا اور تقریباً ایک گھنٹہ اس میں صرف ہو جاتا

دیوانِ عام اس کے بعد پونے آٹھ بجے، بادشاہ، دیوانِ عام کی عمارت میں آتا۔ اکبر اور جہانگیر بھی دربارِ عام کیا کرتے تھے، لیکن شامیانہ کے نیچے۔ سنہ ۱۶۲۸ء میں شاہجہاں نے ایک چوبی عمارت اس غرض سے بنوا کر اس کو زرکار کرا دیا اور دس سال بعد ۱۶۳۸ء میں موجودہ دیوانِ عام کی عمارت طیار کرا دی۔ یہ عمارت سنگِ سرخ کی ہے اور چالیس ستونوں پر قائم ہے، تین طرف سے کھلی ہوئی ہے اور چوتھی جانب وسط میں سنگِ مرمر کا چبوترہ ہے، جہاں بادشاہ مخملی گدوں پر بیٹھا کرتا تھا۔

بادشاہ کے داہنے بائیں شہزادے ہوا کرتے تھے، جو بغیر اجازت بیٹھ نہیں سکتے تھے اور باقی اطراف میں امراء و اراکین وغیرہ صف بستہ کھڑے ہوتے تھے۔ وہ امراء جو بادشاہ کے ذاتِ خاص سے وابستہ تھے شہ نشین کے قریب داہنے بائیں ستونوں کے پاس

کھڑے ہوتے تھے اور اُن کا منہ بادشاہ کی طرف ہوتا تھا۔ الغرض اس طرح یہ ساری عمارت (۲۰۱ فٹ لانبی اور ۶۷ فٹ چوڑی) آدمیوں سے بھر جاتی تھی۔ دیوانِ عام کی عمارت کے آگے صحن میں زرکار خیمے نصب ہوتے تھے اور یہاں دوسرے درجہ کے امراء کھڑے ہوتے تھے۔

جب سب درباری حاضر ہو جاتے، تو سات بجکر چالیس منٹ پر بادشاہ شہ نشین پر برآمد ہوتا اور کام شروع ہو جاتا۔ سب سے پہلے میر بخشی افواج، افسران فوج کے (جنھیں منصبدار کہتے تھے) عرائض پیش کرتا اور ان پر اُسی وقت احکام صادر ہوتے۔ وہ افسران جو حال ہی میں کسی عہدہ پر یا باہر کے صوبوں میں متعین ہوئے ہیں، اپنے اپنے افسروں کے ذریعہ سے پیش ہوتے تھے۔ ان افسروں میں میر آتش (توپ خانہ کا افسر) تفنگ بردار سواروں کا بخشی، اور بخشی دستۂ احدیان (شرفاء کی فوج احدی کہلاتی تھی) ہوا کرتے تھے، جو بادشاہ کے حضور میں مناسب الفاظ کے ساتھ اپنے ماتحت افسروں کو پیش کیا کرتے تھے۔ جو افسر پیش ہوتا وہ جھک کر مجرا عرض کرتا اور بادشاہ کی طرف سے اسے خلعت، گھوڑا یا اسلحہ وغیرہ عطا ہوتے اس کے بعد شاہی جاگیر اور خزانۂ خاص کے افسران جنھیں میر ساماں اور دیوان بیوتات کہتے تھے اپنے اپنے کاغذات پیش کر کے احکام حاصل کرتے۔

اس سے فارغ ہونے کے بعد خاص خاص امراء اُن عرائض اور ہدایا کو پیش کرتے جو شاہزادوں، باہر کے فوجداروں، دیوانوں اور بخشیوں کی طرف سے موصول ہوتے تھے، شہزادوں اور خاص خاص امراء کے خطوط کو بادشاہ کبھی خود پڑھتا اور کبھی پڑھوا کر سنتا، باقی عرائض کا مفہوم بتا دیا جاتا، اس کے بعد صدر اعظم، صوبہ کے عاملوں (گورنروں) کے عرائض پیش کر کے خاص خاص معاملات پر توجہ دلاتا اور اسی وقت علماء، فضلاء، شیوخ، سادات وغیرہ کے مناصب و وظائف کے متعلق کاغذات پیش کر کے احکام مناسب حاصل کرتا۔

اس کے بعد وہ تمام احکام جو اس سے قبل مناصب و جاگیر عطائے نقد وغیرہ کے متعلق نافذ ہو چکے ہیں، بعد تحریر مکرر پیش پیش کئے جاتے۔ اس وقت ایک خاص افسر، جسے داروغۂ عرضِ مکرر کہتے تھے، ہر کاغذ کے پیش ہونے کے وقت بادشاہ کو یاد دلاتا جاتا۔

جب بادشاہ ان تمام کاموں سے فارغ ہو جاتا تو اصطبل شاہی کے افسران، گھوڑوں اور ہاتھیوں کو معہ اُن کے راتب کے پیش کرتے۔ (یہ رسم اکبر نے جاری کی تھی تاکہ ملازمین راتب میں کمی نہ کر سکیں) اگر کوئی جانور دُبلا نظر آتا، تو افسر کو سخت تنبیہ کیجاتی اسی طرح وہ، امراء کے تمام گھوڑے جو افواج شاہی میں داخل ہو کر داغے ہو چکے ہیں، پوری شان کے ساتھ سامنے لائے جاتے اور اس کے بعد دربار ختم ہو جاتا۔ اس میں کم و بیش دو گھنٹے صرف ہو جاتے تھے۔

دیوانِ خاص

دیوانِ عام کے فرائض سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ دس بجے سے کچھ قبل دیوانِ خاص میں آ جاتا (عام طور سے اسے غسل خانہ کہتے تھے کیونکہ اکبر کا غسل خانہ اسی کے قریب تھا) اور تخت پر جلوہ افروز ہوتا۔ سب سے پہلے وہ تمام اہم خطوط و عرائض کو پڑھ کر خود اپنے قلم سے جواب لکھتا۔ باقی عرائض وزیر یا دیگر امراء مخصوص کے ذریعہ سے پیش کیجاتیں

اور بادشاہ کے الفاظ میں فرامین کا مسودہ طیار کیا جاتا، ان مسودوں کو بادشاہ خود دیکھتا اور ان میں ضروری اصلاح کرتا، اسکے بعد جب وہ صاف ہو جاتے تو حرم کے اندر، اُزکِ شاہی (مُہر) ثبت ہونے کے لئے بھیجدئے جاتے۔ جو ممتاز محل کے پاس محفوظ رہتی تھی۔

تحریر فرامین کے بعد محکمۂ مال کے افسرانِ اعلیٰ، اپنے اپنے کاغذات پیش کرتے، اور اسکے بعد مصرف خیر کے کاغذات پیش ہوتے (سالگرہ کے دن سونا، چاندی، جواہرات وغیرہ بادشاہ کے ہموزن خیرات کے لئے نکالا جاتا تھا اور امرا بھی اپنی اپنی حیثیت سے مطابق تصدق کی رقم پیش کرتے تھے۔ اس کے لئے ایک محکمہ قائم کیا گیا تھا، جو محتاجوں اور مسکینوں کے لئے آذوقہ وغیرہ مقرر کرتا تھا)۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد دستکاروں کے کام پیش ہوتے اور پھر عمارات کے نقشے وغیرہ ملاحظہ کے لئے لائے جاتے اس وقت محکمۂ تعمیر کے خاص خاص افسران بھی موجود رہتے اور آصف خاں صدرِ اعظم ہدایت شاہانہ کے مطابق اُن پر نوٹ لکھتا۔ اس کے بعد بادشاہ، شکاری جانوروں (باز، چیتا وغیرہ) کا معائنہ کرتا اور خاص خاص گھوڑے سامنے صحن میں نکالے جاتے۔

شاہ برج دیوان خاص میں، بادشاہ کو تقریباً دو گھنٹے صرف ہو جاتے، اور اس کے بعد ساڑھے گیارہ بجے، بادشاہ شاہ برج میں آجاتا۔ یہ وہ مقام تھا، جہاں بادشاہ سارے دن کے معاملات طے کرتا اور سوائے مخصوص لوگوں کے کوئی شخص وہاں باریاب نہ ہوسکتا تھا۔ وزیر اعظم تمام اہم معاملات یہیں طے کیا کرتا تھا، جس میں کم و بیش ایک گھنٹہ صرف ہو جاتا تھا۔

حرم کے اندر اب دوپہر کا وقت ہو جاتا تھا اور بادشاہ، حرم میں داخل ہوکر کھانا کھاتا اور ایک گھنٹہ قیلولہ کرنے کے بعد ہمیں نماز سے بھی فارغ ہوتا۔ حرم کی زندگی معمولاً آرام و آسایش کی زندگی ہوتی ہے، لیکن شاہجہاں یہاں بھی کام کیا کرتا تھا۔ حرم کے اندر غریب عورتیں، بیوائیں، یتامیٰ، مفلس و نادار، علماء و فقہا کی لڑکیاں، ممتاز محل کے حضور میں ستی النسا کے ذریعہ سے پیش کی جاتیں، اور ممتاز محل، بادشاہ سے عرض کرکے اُن کے لئے وظائف، پنشن، انعامات، جاگیر، اور سامان جہیز وغیرہ کے احکام حاصل کرتی، الغرض حرم کے اندر بھی روزانہ مصرف خیر کا کام نہایت وسیع پیمانہ پر جاری رہتا تھا۔

سہ پہر کا دربار تین بجنے کے بعد، بادشاہ نماز عصر سے فارغ ہوکر کبھی دیوانِ عام میں پھر آجاتا، اور دن کے بقیہ کام یہاں پورے کرتا۔ اس وقت یہ محافظین قصر (جنھیں چوکیدار کہتے تھے) کی جماعت مسلح حاضر رہتی، اور بادشاہ انکا معاینہ کرتا۔ اس کے بعد بادشاہ نمازِ مغرب جماعت سے ادا کرتا۔

دیوانِ خاص اور شاہ برج مغرب کے بعد جواہر کار فانوس دیوانِ خاص میں روشن کئے جاتے اور دو گھنٹے تک عام انتظامات سلطنت کے مسایل طے کرنے کے بعد، بادشاہ گانا سنتا۔ اس صحبت میں صرف مخصوص لوگ شریک ہوتے تھے۔ ۸ بجے عشا کی نماز کے بعد پھر شاہ برج میں جاتا اور صدر اعظم و بخشی وغیرہ کو طلب کرکے بقیۂ دن کے کاغذات طے کئے جاتے، یہاں تک کہ سلطنت کا کوئی کام باقی نہ رہ جاتا۔

موسیقی اور خواب شب ساڑھے آٹھ بجے، وہ پھر حرم میں چلا جاتا اور ایک گھنٹہ تک یہاں گانا سنتا۔ اس کے بعد بستر پر جاتا اور پردہ کے باہر خاص خاص لوگ کتابیں پڑھ کر سناتے۔ یہ کتابیں زیادہ تر سیر و تاریخ کی ہوتی تھیں۔ دس بجنے کے بعد یہ لوگ رخصت کر دئے جاتے اور بادشاہ محوِ خواب ہو جا۔

یومِ انصاف یہ تھا شاہجہاں کا روزانہ معمول، لیکن جمعہ کو تعطیل ہوتی تھی اور کوئی دربار منعقد نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح بدھ کا دن انصاف کا دن تھا۔ اور بادشاہ "جھروکہ درشن" سے سیدھا دیوانِ عام میں آتا تھا اور ٹھیک آٹھ بجے تختِ عدالت پر متمکن ہو جاتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ شاہجہاں نے نہایت محتاط قاضی مقرر کئے تھے، لیکن وہ خود بھی انصاف کی طرف سے غافل نہیں تھا، اور ہفتہ میں ایک دن خود تمام شکایات سنتا تھا۔ اس وقت بڑے بڑے علماء، فقہا اس کے پاس ہوتے تھے، لوگ اپنی اپنی شکایات پیش کرتے تھے اور دور دور سے فریادی آکر جمع ہوتے تھے اور بادشاہ ایک ایک درخواست پر کامل غور و تحقیق کر کے انصاف کرتا تھا۔ بعض معاملات اگر اُلجھے ہوئے ہوتے تھے، تو صوبہ داروں کے نام تحقیق و تفتیش کا حکم نافذ کرتا اور ہدایت کرتا کہ بعد تحقیقات، فریقین ہمارے پاس بھیج دئے جائیں۔

اورنگ زیب

نمازِ صبح اورنگ زیب، طلوعِ آفتاب سے قبل بیدار ہو کر ضروریاتِ صباحی سے فارغ ہوتا اور ایوانِ خاص کی مسجد میں ذکر و شغل کرتا اور نمازِ فجر سے فارغ ہونے کے بعد وہ چاشت کے وقت (ساڑھے سات بجے) تک تلاوتِ قرآن میں مصروف رہتا۔

خلوت گاہ اور عدالت اس کے بعد وہ خلوت گاہ میں جاتا، جہاں مخصوص سردار باریاب ہوسکتے۔ یہاں وہ تخت پر متمکن ہوتا اور افسرِ عدالت گاہ، فریادیوں کو پیش کرتا۔ اورنگ زیب اُن کی شکایات سنتا اور خود اُن سے استفسارِ حال کرتا۔ فریادی جو بالکل نادار ہوتے اُن کو خزانۂ شاہی سے امداد دیجاتی اور تمام مقدمات کا فیصلہ شریعت کے مطابق کیا جاتا۔

درشن اور دربار ساڑھے آٹھ بجے تک اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ "جھروکہ درشن" میں جاتا اور یہیں سے فوج کا معاینہ وغیرہ کرتا، جو شاہجہاں کا دستور تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ اس میں صرف ہو جاتا اور دس و نو بجے دربارِ عام میں آکر قریب قریب وہی فرایض ادا کرتا جو آپ عہدِ شاہجہاں میں پڑھ چکے ہیں۔ اس میں تقریباً دو گھنٹے صرف ہو جاتے۔

دیوانِ خاص دوپہر سے قبل وہ دیوانِ خاص میں جاتا، یہاں اُس دن کے تمام معاملات طے پاتے اور تقسیم خلعت و انعام بھی ہوتی، خاص خاص امراء، حاجب، چوبدار، کاتب یہاں موجود رہتے تھے۔ صدرِ اعظم تمام گورنروں کے خطوط

پیش کرتا، اورنگ زیب اُن کو سنتا، احکام لکھواتا، کبھی کبھی وہ خود اپنے قلم سے ایک آدھ فقرہ لکھدیتا جس سے اعزاز بڑھانا یا کام کی اہمیت کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا۔ جو توقیعات و فرامین شاہی صاف ہو جاتے، وہ بھی اسی وقت پیش ہوتے تھے اور یہیں اُن پر مُہر شاہی ثبت ہوتی تھی۔

حرم اور نمازِ ظہر دیوان خاص میں کام کرتے کرتے دوپہر ہو جاتی اس لئے وہ یہاں سے اُٹھکر حرم میں جاتا اور کھانا کھاکر قیلولہ میں مصروف ہو جاتا۔ ٹھیک دو بجے بیدار ہوتا اور وضو کر کے حرم کی مسجد میں بیٹھ کر تسبیح و تہلیل کیا کرتا یہاں تک کہ ظہر کا مقررہ وقت آجاتا اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا، جماعت میں بڑے بڑے علماء فقراء شیوخ و سادات شامل ہوا کرتے تھے۔

خلوت خانہ اس کے بعد وہ خلوت خانہ میں جاتا، جو حرم اور دیوانِ خاص کے درمیان واقع تھا۔ پہلے وہ یہاں قرآن پڑھتا اسکی نقل کرتا، احادیث اور کتبِ فقہ وغیرہ کا مطالعہ کرتا اور پھر اُمورِ سلطنت کی طرف متوجہ ہوتا۔ اگر اس سے کچھ وقت بچتا تو پھر حرم کے اندر جاتا اور یہاں غریب و بیوہ عورتوں اور یتامیٰ وغیرہ کی درخواست سُن کر اُن پر احکام نافذ کرتا۔

اسی اثنا میں عصر کا وقت آجاتا اور نماز جماعت کے ساتھ ادا کر کے پھر انتظامی اُمور میں مشغول ہو جاتا۔

شام کا دربار غروب آفتاب سے نصف گھنٹہ قبل وہ پھر دیوان خاص میں آکر تختِ شاہانہ پر جلوہ افروز ہوتا امراء درباری لباس میں موجود ہوتے، میر تزک، ان سب کو ترتیب وار بٹھاتا اور بادشاہ ان درباریوں کا معائنہ کرتا یہاں تک کہ مغرب کی اذان ہو جاتی اور بادشاہ تمام حاضرین کے ساتھ اُسی وقت اُٹھ کر مسجد میں جاتا اور نماز ادا کرتا۔

دیوانِ خاص اور نمازِ عشاء نمازِ مغرب سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ پھر دیوانِ خاص میں آتا، یہاں وزیر، محکمۂ مال کے کاغذات لے آتا اور فرمان شاہی حاصل کرتا۔ چونکہ رقص و موسیقی شرعًا ناجایز ہے اس لئے وہ اس کی طرف متوجہ نہ تھا اور عشاء کے وقت تمام اُمورِ سلطنت دیوانِ خاص میں طے کرنے کے بعد، ۸ بجے نمازِ عشاء پڑھنے مسجد میں جاتا، اور دربار برخاست کر دیا جاتا۔ اورنگ زیب، نمازِ عشاء کے بعد عرصہ تک مسجد میں بیٹھا رہتا اور تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو جاتا اس کے بعد حرم میں جاتا اور سو رہتا۔

ہفتہ میں تین دن ایسے ہوتے جب اس معمول میں کچھ فرق ہو جاتا تھا، جمعہ کو بالکل دربار نہ ہوتا تھا اور بدھ کو عام دربار عدالت قایم ہوتا تھا، اس دن "جھروکۂ درشن" سے سیدھا دیوانِ عام میں جاتا، جہاں علماء، فضلاء، فقہاء، مفتی، قاضی جمع رہتے اور بادشاہ تمام فریادیوں کو اپنے حضور میں لائے جانے کی اجازت دیدیتا۔ جمعرات کو نصف دن تعطیل ہوتی، یعنی صرف دوپہر تک کام ہوتا اور اس کے بعد بادشاہ شام تک صرف عبادت میں مشغول رہتا۔

کیا آج دُنیا کا کوئی فرمانروا ایسا پیش کیا جا سکتا ہے، جس کا روزانہ معمول اس سے زیادہ دلسوزی و ہمدردی انصاف پسندی و جانفشانی کا مظہر ہو؟

اُندلس کے آثارِ علمیہ

(یورپ میں)

آج یورپ کی علمی ترقیوں نے دُنیا کو محوِ حیرت بنا رکھا ہے اور فطرت نے جس آزادی کے ساتھ اپنے پوشیدہ خزانے اہلِ مغرب کے سامنے کھول کر رکھدئے ہیں، اس پر سخت استعجاب ہوتا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترقی کوئی جدید ترقی نہیں ہے بلکہ یہی عہدِ ماضی کی ایک داستان ہے جو جدید اسلوب سے پیش کی جارہی ہے اور موجودہ تہذیب و مدنیت کی تاریخ انھیں نقوش پر مرتب ہوئی ہے جنھیں مشرق اس سے قبل مرتسم کر چکا تھا۔

اگر آج ہم مغرب کی حکومتوں کو علم و اہل کا قدر شناس پاتے ہیں، تو یاد ش بخیر ایک زمانہ وہ بھی تھا جب حکومت اسلام کا ایک ایک امیر اپنے فضل و کمال اور اپنی نکتہ نوازیوں سے ملک کے ہر گوشہ میں روح علم پھونک رہا تھا اور سلطنت کی کوئی مجلس ایسی نہ تھی جسکی ممتاز ترین خصوصیت آثارِ علم و ادب کی نگہداشت نہ ہو۔

سرزمین عرب میں بنو اُمیہ و بنو عباس، اشبیلیہ میں بنو عباد، غرناطہ میں ملوک بنی احمر اور مصر میں خلفاء بنی فاطمہ کے علمی کارنامے کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے، اور دنیا جانتی ہے کہ اُندلس میں اہل فکر و علم کے لئے عبدالرحمن نے کیا کیا، پھر یہی نہیں ہوا، کہ ملوک اسلام کی یہ مساعی انھیں کے ساتھ ختم ہوگئی ہوں، بلکہ وہ اسوقت بھی موجود ہیں کیونکہ یورپ کے خزائن علم و فنون کا اصل سرِ رشتہ اگر تلاش کیا جائے گا تو تمھیں معلوم ہوگا کہ اسکی ابتدا مسلمانوں ہی سے ہوئی اور انھیں کے ذہنی ارتقار کی بدولت علوم قدیمہ کے خزائن یورپ کو حاصل ہوئے۔

یوں تو سارے عہدِ اسلام کی ذہنی ترقیوں کی تاریخ ایک ایسی بسیط تاریخ ہے کہ اس کو ضبط کرنے کے لئے ایک عمر درکار ہے لیکن آؤ آج کی صحبت میں ایک نہایت ہی اجمالی و سرسری نگاہ تاریخ اُندلس پر ڈالیں اور دیکھیں کہ اُن کے وہ کون سے آثار علم و ادب ایسے ہیں جن سے یورپ نے اخذ و اقتباس کرکے اپنی موجودہ ترقیوں کی طرح دُنیا میں ڈالی۔

انیس خوری (بیروت کے جامعۂ امیرکیہ کے پروفیسر) نے ایک خطبہ میں فن شعر کے لحاظ سے بھی یورپ کے تاثر کو تسلیم کرایا ہے، اور اُس کے نزدیک یوروپین شاعری میں "روح فردسیتنہ" اسپین ہی کے عرب شاعری سے منتقل ہوئی چونکہ اطالیہ، اسپین سے قریب تر تھا، اس لئے سب سے پہلے یہاں کے شعرا متاثر ہوئے اور پھر فرانس و دیگر ممالک مغرب کے شاعروں نے اسے اختیار کیا

اس میں شک نہیں کہ عرب شاعری کی تاریخ اس قدر عجیب و غریب ہے کہ مشکل سے کوئی دوسرا ملک اس باب میں اس کا ہمسر ہو سکتا ہے اور یہ ذوق جس وسعت و بسط کے ساتھ جاہلیت و نیز حضارت اسلامیہ کے عہد میں پایا جاتا تھا اس کی نظیر کسی اور ملک میں نہیں پائی جاتی، اُن کی شاعری اُن کی اخلاق کی تاریخ تھی، اُن کے آداب و معاشرت کا آئینہ تھی اور اس بات کا ثبوت تھی کہ اہلِ عرب کے ناری طبائع ایک ایسی طبیعت کے مالک ہیں جو باوجود شجاعت و تہور کی تمام خود سر وحشی کیفیات رکھنے کے جذبۂ کالوچ بھی اپنے اندر رکھتی ہے، اور مناظر قدرت کے حُسن کا صحیح مطالعہ اس سے بہتر اور کوئی نہیں کر سکتا۔

پھر چونکہ یہ ذوق امیر سے لیکر غریب تک ہر دل میں جاگزین تھا اس لئے جب تم اسلام کے کسی عہد اور کسی ملک کی تاریخ اٹھاکر دیکھو گے، تو تمہیں ایک مستقل باب، شاعری کا بھی نظر آئے گا۔ اور تم محسوس کروگے کہ وہی فرمانروا جو ایک وقت تخت پر بیٹھکر مسائل سیاست کو طے کیا کرتا تھا اور جو میدان جنگ میں ایک شیر کی طرح نمودار ہوتا تھا جب بزم علوم و فنون آراستہ کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ بس صرف اسی کے لئے وضع ہوا ہے اور سوائے شاعری کے اسے کسی اور امر سے سروکار ہی نہیں، اس عہد کے احکام و فرامین، توقیعات و مکاتیب دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے کہ ان کی زبان سے جو لفظ نکلتا تھا شعر ہوتا تھا اور اُن کے قلم کا ہر ہر نقطہ نکتۂ شاعرانہ۔ اگر غرناطہ کے بادشاہ محمد خامس کی طرف سے ابن خلدون کو پروانۂ راہداری بھی مقفیٰ اور موزوں عبارت میں ملتا تھا تو حیرت نہ کرنی چاہئے کیونکہ کتب خانۂ قرطبہ میں بیسیوں جلدیں فہرست کی صرف دواوین سے متعلق تھیں۔

پھر چونکہ مسلمانوں میں یہ ذوق اخیر تک باقی رہا اور زوال سلطنت کے وقت بھی اس میں کوئی انحطاط پیدا نہیں ہوا، اس لئے اگر حکومت اُندلس (جس سے مغربی حکومت کا تعلق، نہایت قریب کا تعلق تھا) اپنے ادبی اثرات مغربی شاعری میں چھوڑ گئی ہے تو حیرت نہ کرنی چاہئے، کیونکہ جسوقت وہاں تہذیب و مدنیت اپنے انتہائی عروج پر تھی، مغرب بالکل وحشی و جاہل تھا اور حکومت اسلام ہی کے اُصول حضارت و شائستگی پر اپنی آیندہ ترقی کی بنیاد قایم کر رہا تھا۔

تاریخ و جغرافیہ میں اہل عرب کے جس قدر کارنامے ہیں اور ان سے جس قدر اہل مغرب نے فایدہ اُٹھایا ہے اس سے انکار کرنے کی گنجایش نہیں۔ ابن حوقل وغیرہ علمار جغرافیہ مشرق ہی کے لوگ تھے جن کی کتابوں اور نقشوں کے ترجمے مغربی زبان میں کئے گئے ہیں اور ابن حامد جس نے قلب ایشیا تک سفر کرکے مختلف ممالک کے حالات جغرافی و تاریخی جمع کئے اور ابن بطوطہ مشہور سیاح اندلس ہی کے سرزمین کے جوہر نابغہ تھے جن کی تحقیقات سے یورپ نے فایدہ اُٹھایا، اور ادریسی کا شمار علمار قرطبہ ہی میں کیا جاتا تھا، جس کی علمی سیاحتوں کی داستانیں اب بھی اہل مغرب کو یاد ہیں اور جس کا بنایا ہوا چاندی کا کرہ (جس کا وزن ۴۵۰ پونڈ تھا اور جسکے ایک طرف بروج و افلاک اور دوسری طرف کرۂ ارض کا نقشہ تھا) اب بھی شاید صقلیہ میں کہیں محفوظ ہو۔

تاریخ میں مسلمانوں کی جد و جہد کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے، کیونکہ اہل مغرب مشرق کی کوئی تاریخ مرتب نہیں کر سکتے تا وقتیکہ وہ ان کی کتابوں سے مدد نہ لیں۔ تمام مواد، تمام واقعات کا اقتباس وہ عربی کتابوں سے کرتے ہیں، اور یہی سبب ہے کہ آج عربی کی تمام مشہور تاریخیں یورپ کی تمام زبانوں میں منتقل ہو گئی ہیں۔ رہا فلسفۂ تاریخ جس پر یورپ کو بڑا ناز ہے سو اس کا حال یہ ہے

کہ جب تک ابن خلدون نے اپنا مقدمہ پیش نہیں کیا اسوقت تک یہ بات مغرب کی سمجھ ہی میں نہیں آئی کہ کن اصول پر تاریخ کو مرتب ہونا چاہئے اور اس کا صحیح معیار کیا ہو سکتا ہے۔

عربوں کے فلسفہ سے یورپ جس حد تک متاثر ہوا ہے اُسے استاذ انیس خوری ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ:۔

"نہ صرف فلاسفۂ یونان (فیثاغورس، ہیراکلیتوس، امپیدوکلیس، سقراط، افلاطون، ارسطو، دیمقریطوس وغیرہ) کے اصول کا مطالعہ کیا بلکہ فارسی، ہندی، عبرانی اور سریانی سے بھی انھوں نے فلسفہ کی کتابیں اپنی زبان میں منتقل کیں اور جس طرح عرب میں خلیفۂ مامون نے علوم قدیمہ کو عربی میں منتقل کرنے کے لئے اپنی شاہانہ فیاضیوں سے کام لیا، اسی طرح اُندلس میں عبدالرحمٰن اور اس کے خلفاء نے اہل علم کی قدردانی کرکے عربی زبان کو فلسفۂ قدیم سے مالا مال کر دیا"

چونکہ اہل عرب فطرتاً مبادی الطبیعۃ کی طرف مایل تھے، اس لئے انھوں نے ارسطو کی بڑی قدر کی اور اسے معلم اول کے لقب سے یاد کیا، دوسرے فلاسفہ میں چونکہ دہرییین اور لاادرییین زیادہ تھے اس لئے ان کے فلسفہ پر توجہ کرنا خطرہ سے خالی نہیں تھا لیکن پھر بھی ان کا شوق باز نہیں آیا، اور آخر کار مدارس اُندلس ہی کے ذریعہ سے تمام اسپین اور یورپ میں فلاسفۂ قدیم کی تعلیمات عام ہو گئیں۔

اُسوقت صرف اُندلس میں ۸۰۰ مدارس ایسے تھے جن کے دروازے بلا لحاظ ملت و ملک ہر شخص کے لئے کھلے ہوئے تھے اور اس وقت اہل یورپ اُندلس کے کالجوں کو اسی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، جس طرح آج یورپ و امریکہ کے کالجوں کو دیکھتے ہیں یہاں یورپ کے طلبہ اس قدر کثرت سے آتے تھے کہ صرف جامعۂ قرطبہ میں اُن کی تعداد گیارہ ہزار تھی۔

ان کالجوں کا نظام وہی تھا جو اس وقت کے مغربی کالجوں کا ہے اور بہت سی علمی اصطلاحیں جو آج یورپین زبانوں میں رائج ہیں اُندلس ہی کے کالجوں میں وضع کی گئی تھیں، پھر ان کالجوں کا کارنامہ صرف یہی نہیں تھا کہ وہ سالانہ چند ہزار طلبہ کو اپنے ہاں سے فارغ کرکے نکال دیں، بلکہ وہاں حریت فکر و آزادی رائے کی بھی تعلیم دیجاتی تھی، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جب اسپین میں علوم طبیعہ کا علاج ہوا اور اُندلس کے کالجوں سے وہ فرانس و اطالیہ اور جرمنی میں پھیلے تو ایک عام حرکت ترقی کی پیدا ہو گئی اور حکومت کنیسہ جو مظالم کر رہی تھی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرکے اس کے نظام کو بدل دیا گیا۔

دیگر علوم میں فلکیات و ریاضیات کی جس قدر خدمت عرب نے کی وہ بھی تاریخ کا روشن واقعہ ہے، کیونکہ سال کا انضباط و راس الشمس اور اس کے انحراف کی تحقیق، اعتدال ربیعی و خریفی کی حرکت کا تعیین اور اسی طرح اور مظاہر فلکی کی تفتیش سب سے پہلے اہل عرب ہی نے کی، انھوں نے بروج و افلاک کے نہایت نازک نقشے طیار کئے اور مطالعہ فلک کے لئے عجیب و غریب آلات ایجاد کئے، چنانچہ آلۂ سمت (Quadrant) جس سے ارتفاع سیارہ کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اسطرلاب اور اسی طرح کے اور نہایت دقیق آلے اہل عرب ہی کے دماغ کا نتیجہ تھے، اگر یہ لوگ بطلیموس کی مجسطی کا عربی میں ترجمہ نہ کرتے تو وہ کتاب بالکل فنا ہو گئی تھی اور اگر ارقام ہندی سے یہ لوگ یورپ کو آگاہ نہ کرتے تو معلوم نہیں وہاں ارقام رومانیہ کب تک جاری رہتے۔

ریاضیات میں جبر و ہندسہ کے متعلق اہل عرب کی جلیل القدر خدمات سے ہر شخص آگاہ ہے، اور یہ کس کو معلوم نہیں کہ تفاضل وتکامل (Calculus) اور مثلثات (Trigonometry) کی وضع کا سہرا انھیں کے سر ہے، پھر جب اہل یورپ نے ترقی کی تو ان علوم کو بجنسہٖ عربی سے اپنے ہاں لے لیا اور ان کو ترقی دیکر آج اس مرتبہ پر پہونچا دیا۔

السیکو تیہ نے سلطنت اُندلسیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ "طلیطلہ کے ایک عالم نے چار سو رصدگاہیں صرف اس لئے قائم کی تھیں کہ کرۂ ارض کے لحاظ سے آفتاب کا بعید ترین نقطہ دریافت کرے اور وہ اس میں اس قدر کامیاب ہوا کہ آج باوجود فلکیات کی اس قدر ترقی کے اس میں کوئی غلطی نہیں نکالی جا سکتی"۔

ابوالحسن علی نے بھی فلکیات کے متعلق متعدد تجربے کئے اور اس سلسلہ میں وہ ارتفاع قطب معلوم کرنے کے لئے بحر متوسط کی پیمائش اور اس کی وسعت کا اندازہ کرنے پر آمادہ ہو گیا، ابن سینا نے صرف ایک ہزار بائیس ستاروں کی فہرست طیار کی تھی لیکن علماء اُندلس نے اس میں اور اضافہ کیا۔

ابن رشد نے جب کہ وہ حرکت عطارد معلوم کرنے کے لئے مختلف تجربے کر رہا تھا، یہ معلوم کیا کہ سطح آفتاب میں داغ موجود ہے، اسی طرح بیسیوں علماء نے اعمال فلکی و ریاضی کے متعلق بہت سے تجربے پیش کئے ہیں، جن کے آثار کبھی محو نہیں ہو سکتے البتہ یہ افسوس ضرور ہے کہ اُن کے اکثر افکار و ماغ ضایع ہو گئے اور ہم تک بہت کم پہونچے، چنانچہ صرف مکتبۂ قاہرہ میں چھ ہزار جلدیں موجود تھیں اور سب کی سب فنا ہو گئیں۔

مسلمانوں کے آثارِ فلکی و ریاضی میں سے ایک رقاص ساعت (Pendulum) بھی ہے جس پر عہد حاضر کی گھڑیوں کی بنیاد قائم ہوئی، اسی کے ساتھ انھوں نے مختلف اجسام کے ثقل نوعی (Specific gravity) کو متعین کیا اور اور دلیل علمی سے ثابت کیا کہ شہاب ثاقب فی الاصل حجری مادہ کی چیزیں ہیں۔

انھوں نے ہوا کی بلندی کا اندازہ کیا اور ظواہر طبیعت کی علمی تفسیر کر کے یورپ سے اس خیال کو محو کیا، کہ ان کا تعلق عالم ارواح سے ہے، ان کا شغف اس باب میں اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ انھوں نے مسجد کے میناروں سے رصدگاہ کا کام لیا۔

ڈرامیس نور و مرئیات کو سب سے پہلے جس نے ظاہر کیا وہ ابوالحسن علی تھا، جسے اہل یورپ (Al-Hazen) کہتے ہیں۔ اسی نے اسباب تعکس کی وضاحت کی، اس نے ستاروں کے انعکاس نور کے مبادی کو وضع کیا، اسی نے اس غلط خیال کو دور کیا کہ نور کی شعاعیں آنکھ سے پیدا ہو کر مرئیات کی طرف بڑھتی ہیں اور یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے اثیر (Ether) کے وجود کو ثابت کیا، اس کی کتابیں اسپین کے کالجوں میں پڑھائی جاتی تھیں، جنھیں اہل یورپ نے اپنی زبان میں منتقل کر کے استفادہ کیا۔

اس امر کا قوی ترین ثبوت کہ یورپ نے عرب کے علماء فلکیات و ریاضیات کی تحقیق سے فائدہ اُٹھایا، وہ اصطلاحات ہیں جو یورپ میں آج بھی رائج ہیں مثلاً:- (Zenith)، (Nadir)، (Almanac) اور (Mukantar)، (Azimuth)، کہ اصل میں یہ عربی الفاظ سمت، نظیر، المناخ، المقنطر اور

السموات تھے۔

اسی طرح ستاروں کے اکثر نام براہ راست عربی سے لئے گئے ہیں مثلاً، سماک، سہیل، عقرب، دبران، جوزا، حوت، نطاق، ثور، الغول، الحمل، العیوق وغیرہ۔

اہل عرب کو علم الکیمیاء کے ساتھ بھی بڑا شغف تھا، یہ علم اول اول ساحل نیل سے پیدا ہوا تھا اور کاہنین مصر کے سینوں میں راز کی صورت سے پایا جاتا تھا، ان سے بطالسہ نے حاصل کیا اور پھر اہل عرب نے حاصل کر کے اس کو ترقی دیکر علم کے مرتبہ تک پہونچا دیا چنانچہ مورخین یورپ نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ علم الکیمیاء اور علم العقاقیر والادویہ کی وضع و بنیاد کا فخر اہل عرب کو حاصل ہے۔ ماء الفضہ (Nitric Acid) ماء الذہب (Nitro Hydro Chloric acid) زیت الزاج (sulphuric Acid) البوتاس یا روح النوشادر (Ammonia) حجر جہنم (Silver Nitrate) السلیمانی (mercuric chloride) الراسب الاحمر (mercuric oxide) ملح القلی (Alkali) البورق (Borax) الزرنیخ (arsenic) وغیرہ بہت سے ایسے مرکبات کیمیاوی ہیں جو اہل عرب اپنے بعد مکمل کر کے چھوڑ گئے۔

چونکہ بعض خلفاء اندلس کو علم الکیمیاء کی طرف خاص رغبت تھی، اس لئے اسپین میں کثرت سے کیمیائی معمل قایم کئے گئے جن کی حکومت کی طرف سے اکثر تحقیق و تفتیش ہوتی رہتی تھی اور اس بات کی بڑی جانچ ہوتی تھی کہ کوئی دواساز خراب دوائیں نہ فروخت کرے اور نہ قیمت زیادہ لے سکے، فریڈرک ثانی نے طب اور دواسازی کے اصول یہیں سے اخذ کر کے اپنے ملک میں جاری کئے۔ بارود کے متعلق بھی علماء کا اتفاق ہے کہ یورپ نے اُسے اہل اندلس ہی سے حاصل کیا۔

علم نباتات میں اہل عرب کی یہ فضیلت کبھی محو نہیں ہو سکتی کہ انھوں نے سب سے پہلے دیسقوریدس، جالینوس اور علماء ہند کی مولفات کو اپنی زبان میں منتقل کیا اور پھر ان میں اپنے ذاتی تجربات و تحقیقات سے سیکڑوں دواؤں کا اضافہ کر کے ان کے اشکال بتائے ابن البیطار المالقی نے شرق و غرب کا سفر کر کے خود اُن مقامات کو دیکھا جہاں نباتات اُگتے تھے اور پھر اُن کی پوری کیفیت اپنی کتاب میں درج کی ہے، جسے اہل یورپ نے اپنی زبانوں میں منتقل کر لیا۔

اُسوقت یورپ کا یہ حال تھا کہ کنیسہ اور سحر کی قوت سے ہر شخص مرعوب نظر آتا تھا، اہل کنیسہ کہا کرتے تھے کہ جتنے امراض لاحق ہوتے ہیں یہ سب آسمانی عذاب ہیں اور شریر روحیں ہیں جو گنہگاروں کے جسموں میں حلول کر کے تکلیف پہونچاتی ہیں اسلئے جب تک ارباب کنیسہ کی شفاعت حاصل نہ کی جائے ان امراض سے چھٹکارا پانا محال ہے، دوسری طرف سحر کے مدعی کہتے تھے کہ ہم اپنی قوت سحر سے امراض کو دور کر سکتے ہیں اور اس طرح یہ لوگ ارباب کنیسہ کے مقابل تھے اور ان دونوں میں باہم شدید مخالفت تھی، الغرض یورپ اس جہل و تاریکی میں مبتلا تھا، جب کہ اہل عرب تمام بلاد اسلامیہ میں علم طب و علم الادویہ کی ترقی کو اس کی انتہائی درجہ تک پہونچا چکے تھے، اور اس کے علم کے ماہرین کی اس قدر کثرت تھی کہ صرف بغداد میں ۹۰۰ طبیب موجود تھے۔

بعد کو جب یورپ نے دیگر علوم کے ساتھ علم طب کو بھی عربوں سے حاصل کیا تو بارھویں صدی سے لیکر سترھویں صدی تک جن کتابوں پر ان کا مدار رہا وہ رازی، ابن سینا اور ابن زہری کی تصانیف تھیں جنھوں نے اپنی ذاتی تحقیق و تفتیش سے قدیم علم طب کو بہت زیادہ وسیع و مفید بنا دیا تھا۔

عہد خلفاء میں اندلس اپنی تہذیب و مدنیت کے لحاظ سے لندن و پیرس سے ویسا ہی ممتاز تھا، جس طرح اہل اندلس مغربی اقوام سے یقیناً اسوقت جو تجارتی، علمی اور صنعتی ترقی اندلس کو حاصل تھی وہ آج بھی حیرت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اندلس کی آمدنی دسویں صدی یعنی عبدالرحمن الناصر کے عہد میں ۳۰۰ ملین ڈالر تھی اور آج حکومت انگلستان کی آمدنی ۱۸۰ ملین ڈالر سے زاید نہیں ہے، اسی طرح اندلس کی آبادی ۳۰ ملین تھی اور انگلستان کی آبادی ملکہ الزبتھ کے زمانہ تک چار ملین سے زیادہ نہ بڑھ سکی، اسی کے ساتھ اگر ترقی تجارت، زراعت، علوم و فنون کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یورپ باوجود ادعائے ترقی علوم و فنون کے آج بھی اندلس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اُس وقت کی علمی ترقی کا دوسرا ثبوت مکاتیب عمومیہ کی کثرت اور کتابوں کی تعداد سے مل سکتا ہے، مصر کے مکتبہ مستنصر میں ۸۰ ہزار جلدیں پائی جاتی تھیں اور مکتبہ طرابلس میں ۳۰ لاکھ۔ جب تاتاریوں نے بغداد کو تباہ کیا اور کتب خانے برباد ہوئے تو دجلہ کتابوں سے پٹا پڑا تھا، قرطبہ کے کتب خانے میں ۶ لاکھ کتابیں مختلف زبانوں کی موجود تھیں۔

یورپ اس وقت اور اس کے بعد عرصہ تک اس قدر جاہل رہا کہ گلیلو کو اپنے علمی اکتشافات پر بادشاہ کے سامنے اظہار ندامت کرنا پڑا، حالانکہ اس سے ۶ صدی قبل ابن یونس خلیفہ کے سامنے ریاضی اور فلکیات کے مسائل پیش کرتا تھا اور انعام پاتا تھا۔

یورپ کا عالم نباتات سرویتوس صرف اس امر کے اظہار پر کہ فلسطین خشک مقام ہے اور وہاں دودھ اور شہد کثرت سے نہیں پایا جاتا، مصیبت میں ڈالا جاتا ہے کیونکہ یہ بیان توراۃ کے خلاف تھا، لیکن جسوقت کوئی جغرافیہ کا عالم خلفاء عرب کے سامنے پیش کیا جاتا تھا تو اس کی عزت کی جاتی تھی۔۔ اسی طرح برونو فیلسوف تقلید کنیسہ کی مخالفت میں قتل کیا گیا حالانکہ اس سے سات صدی قبل اہل عرب حریت دینی کا اعلان کر چکے تھے۔۔ یورپ کے جن لوگوں نے علوم عرب کو اپنی زبانوں میں منتقل کیا، انکی فہرست طویل ہے لیکن ان میں سے بعض نے بہت شہرت حاصل کی، مثلاً راہب گربرٹ، یہ دسویں صدی میں کلیہ قرطبہ سے فارغ ہو کر نکلا اور اطالیہ و فرانس میں متعدد مدارس اس نے قایم کئے۔ یہ شخص بعد کو سلوسٹر ثانی کے نام سے پاپائے روم کی جگہ انتخاب کیا گیا، اس نے کنیسہ کی دیواروں کے اندر فضلاء عصر کو جمع کر کے ترجمہ کا کام جاری رکھا اور چار سو کتابوں سے زیادہ اس نے ترجمہ کرائیں، اس کے معاونین میں خاص خاص لوگ ریمونڈ فرانسیسی، ہرآن، میکائل اسکوتیھ اور یوحنا اشبیلی تھے۔۔ تیرھویں صدی میں پرٹوس مگنوس، روجر گروستھ، روجر باکن نے بھی بہت سی کتابیں عربی سے ترجمہ کیں، ان میں پہلا کیمیادی اور فیلسوف تھا اس نے بارود کی ترکیب اہل عرب سے حاصل کی، دوسرے نے اصلاح دینی کی طرف توجہ کر کے کنیسہ کی قوت کا مقابلہ، تیسرے نے ابن ہیثم کے مسئلہ نور کو حاصل کر کے عینک کی ساخت اسکی بنیاد پر جاری کی۔۔ اسی طرح اور بہت سے علماء مغرب تھے جنھوں نے اندلس کی ترقی علوم و فنون سے فایدہ اٹھا کر اپنے ملک میں ان کو رواج دیا اور اب بھی منصف مزاج مورخین اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ اور اسلام

آج کی صحبت میں ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ فن تصویر و تمثیل کا رواج مسلمانوں میں کس حد تک پایا جاتا تھا اور اس میں انھوں نے کوئی حصّہ لیا یا نہیں ؟ لیکن اس جگہ ہم کو واضح کر دینا چاہئے کہ فن تصویر سے ہماری مراد وہ نقوش ہیں جو کپڑے دیوار، ظروف اور کتابوں وغیرہ میں بنائے جاتے ہیں اور تمثیل سے مراد مجسمہ سازی یا بُت تراشی ہے خواہ پتھر سے ہو یا کسی اور جامد چیز سے، اس لئے سلسلۂ مضمون میں جہاں جہاں لفظ تصویر یا تمثیل ہو اس کو اس معنی میں لینا چاہئے جو ابھی ظاہر کئے گئے ہیں۔

کپڑوں پر تصویروں کا استعمال تو جاہلیت و اسلام دونوں زمانوں میں بہت معروف و مروج تھا اور شعرائے عرب کے کلام سے اس کا کافی ثبوت مل سکتا ہے، چنانچہ امرؤ القیس لکھتا ہے :-

خرجت بہا تمشی تجر وراءنا علی اثرینا ذیل مرط مرحل

"مرط مرحل" یعنی ایسی چادر جس پر محمل کی تصویریں بنی ہوں اور اگر اس کو "مرجل" پڑھا جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ اس پر آدمیوں کی صورتیں منقوش تھیں۔ خود رسول اللہ کا ایسی چادریں استعمال کرنا بعض احادیث سے ثابت ہے مثلاً :-

(۱) ان رسول اللہ صلعم خرج ذات یوم وعلیہ مرط مرحل

(۲) کان یصلی وعلیہ من ہذہ المرحلات

عربی زبان میں جو کپڑوں کے نام رائج تھے خود اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ کس کس قسم کے نقوش ان میں پائے جاتے تھے، مثلاً جب کسی کپڑے پر تیروں کے نقوش ہوتے تھے تو اُسے "مسہم" کہتے تھے (سہم تیر کو کہتے ہیں) اسی طرح جس کپڑے پر چڑیوں کی صورت ہوتی تھی اُسے مطیر، جس پر گھوڑے بنے ہوئے تھے اُسے مخیل جس پر درخت وغیرہ منقوش ہوتے تھے اُسے مشجر کہتے تھے اور اسی طرح کے اور بہت سے نام اسی نسبت سے رکھے گئے تھے مثلاً مسیف، مہلل، مکعب، معرض، معمد، معضد وغیرہ۔ جس کپڑے پر انگوٹھیاں بنی ہوتی تھیں اُسے مخلا اور جس پر ترنج بنے ہوتے تھے اُسے سینہ کہتے تھے۔

ایک شاعر معزؔ عضد الدولہ کی تعریف کرتا ہے کہ :

والجو ثوب بالنسور مطیر والارض فرش بالجیاد مخیل

یعنی فضا میں جو عقاب ہی عقاب اُڑ رہے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی کپڑا ہے جس پر پرندوں کی صورتیں منقوش ہیں اور زمین گھوڑوں کی

کثرت سے ایک ایسا فرش نظر آتی تھی جس پر گھوڑے ہی گھوڑے بنے ہوئے ہیں۔

عربوں کا خود اس صنعت کو اختیار کرنا لکڑی کے اُن تختوں سے ثابت ہوتا ہے جو بطور آثار کے قاہرہ کے میوزیم میں موجود ہیں' پردوں پر بھی تصاویر و نقوش کا رواج عربوں میں پایا جاتا تھا جس کی سب سے بڑی شہادت حضرت عائشہ کی یہ حدیث ہے :-

"قدم رسول اللہ صلعم من سفر وقد سترت سہوۃ لی بقرام فیہ تماثیل فلما راہ رسول اللہ صلعم تلون وجہہ وقال یا عائشۃ اشد الناس عذابًا عند اللہ یوم القیامۃ الذین یضاہون بخلق اللہ، فقطعناہ فجعلنا منہ وسادۃ او وسادتین"۔

یعنی رسول اللہ صلعم سفر سے تشریف لائے۔ میں نے ایک طاق پر پردہ ڈال رکھا تھا جس پر صورتیں منقوش تھیں' یہ دیکھ کر رسول اللہ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا اور فرمایا اے عائشہ قیامت کے دن ان لوگوں پر سخت عذاب ہوگا جو اللہ کے مخلوق کی شبیہیں بناتے ہیں' پس ہم نے اُس پردہ کو کاٹ کر ایک یا دو تکیہ کے غلاف بنائے' اسی بنا پر بعض فقہا نے فرش وغیرہ کے لئے جہاں تصویریں پامال یا غیر محترم پاشان حالت میں رہیں' تصویر دار کپڑوں یا اشیاء کا استعمال جائز قرار دیا ہے۔

اہل عرب صرف دروازوں ہی پر نہیں بلکہ زیبائش کے لئے دیواروں پر بھی پردے لٹکاتے تھے جنہیں حائطیہ کہتے تھے۔ صاحب نفح الطیب نے ان پردوں کے نقوش کی بہت تعریف کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں دیواروں اور دروازوں پر پردے آویزاں کرنے کا رواج اہل عرب ہی سے منتقل ہوا ہے۔

خیموں میں بھی تصویریں منقوش کرنے کا رواج عہد اسلام میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ متنبی نے سیف الدولہ کے خیمہ کی تعریف میں اسکے نقوش وغیرہ کی بڑی تعریف کی ہے۔ مقریزی نے بھی مصور خیموں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ ان میں سے بعض مفیّل، مسبّع، مخیّل، مطوّس، مُطیّر ہوتے تھے (یعنی ہاتھی، درندے، گھوڑے، طاؤس اور پرندوں کی تصویریں اُن پر منقوش ہوتی تھیں) اور بعض بعض آدمیوں کی بھی صورتیں ہوتی تھیں۔

دیواروں کے نقش و نگار کا حال بھی ابن حمدیس، ابو الصلت اور دیگر شعراء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ فاطمی خلیفہ آمر باحکام اللہ نے اپنے ایک قصر میں تمام شعراء کی تصویر دیواروں پر بنوائیں اور ہر شاعر سے ایک شعر اس منظر کی تعریف میں لکھوا کر درج کرایا اور ہر تصویر کے پاس طاق میں ایک ایک تھیلی، ۵ اشرفیوں کی سربمہر رکھوا دیں ہر شاعر آتا تھا اور اپنے حصہ کی تھیلی طاق سے اُٹھا کر لیجاتا تھا۔

جب اشرف خلیل قلعۃ الجبل پر قابض ہوا تو اُس نے اس کو بہت بلند کرایا، بہت بڑا گنبد بنوایا، دیواروں پر تمام امراء دولت کی تصویریں بنوائیں اور قبہ کو نہایت نفیس نقش و نگار سے آراستہ کرایا۔

وزیر شمس الدین جوینی کے بیٹے شرف الدین ہارون نے جو حمام بغداد میں تیار کرایا تھا وہ اپنی آرائش کے لحاظ سے عجیب و غریب چیز تھا، اس کی دیواریں صیقل کی ہوئی تھیں، اُن پر نہایت حسین تصویریں کی گئی تھیں، فرش رنگین ٹائل کا تھا، تمام برتنوں پر سونے چاندی کی قلعی تھی اور بعض فواروں پر چڑیاں قائم کی گئی تھیں جن سے پانی نکلتے وقت آواز پیدا ہوتی تھی۔

ظروف وغیرہ پر بھی اہل عرب عمدہ عمدہ نقوش و تصاویر کندہ کرتے تھے، چنانچہ اس زمانہ کے شمعدان، فانوس، عطردان پینے اور کھانے کے

برتن وغیرہ اب بھی ایسے موجود ہیں جن سے اُن کی اس صنعت پر کافی روشنی پڑتی ہے، فسطاط کے کھنڈروں میں سے حال ہی میں بعض چینی کے برتن نہایت صاف و رنگین دستیاب ہوئے ہیں اور ان پر انسانوں اور حیوانوں کی تصویریں منقوش ہیں۔ یہ برتن خالص عربی صنعت کے نمونے ہیں کیونکہ اُن پر صناعوں کے جو نام لکھے ہوئے ہیں وہ سب مصر و شام کے ہیں۔ قاہرہ کے دارالآثار میں ایک عطردان عربی صنعت کا ایسا پایا جاتا ہے جس پر چاندی کا ملمع ہے اور اربابِ نشاط کی تصویریں منقوش ہیں جو آلاتِ موسیقی بجا رہے ہیں، ایک برتن یہاں محمد بن فضل اللہ کا بنایا ہوا ہے جس میں چڑیوں کی صورتیں بنی ہوئی ہیں۔ دوسرے برتن میں ایک سوار کی تصویر ہے اسی طرح اور متعدد ظروف ہیں جن پر مختلف جانوروں اور چڑیوں کی تصویریں کندہ ہیں۔ کانچ کے فانوس اور شمعدان بھی اس صنعت کے پائے جاتے ہیں اور یہ سب کے سب اہلِ عرب کے بنائے ہوئے ہیں۔

ناصر خسرو نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ قصرِ فاطمین میں خلیفہ مستنصر کا ایک آفتابہ ہے جو خالص سونے چاندی کا ہے، اس پر چڑیوں اور شکاریوں کی نہایت نازک و پاکیزہ تصویریں منقوش ہیں، دارالآثار میں ایک لکڑی کی تختی ہے جس پر کسی طائر کی عجیب و غریب صورت کندہ ہے ایک لکڑی کے دروازہ کا بھی اسی سفر نامہ میں ذکر ہے جس میں نہایت نازک تصویریں جانوروں کی کندہ کی ہوئی ہیں۔

سکوں پر بھی تصاویر کا رواج عہدِ اسلام میں پایا جاتا تھا۔ سیف الدولہ نے جو دینار مسکوک کرائے تھے اس میں اسکا نام بھی تھا اور اسکی تصویر بھی سلطان ظاہر بیبرس نے شیر کی تصویر اپنے سکہ میں منقوش کرائی تھی۔ ترکی اور چرکسی بادشاہوں میں سے کسی نے شیر کی تصویر پسند کی کسی نے عقاب کی اور کسی نے پھول کی۔ امراء کے لئے اُن کے منصب کے لحاظ سے خاص خاص نشان ہوتے تھے، مثلاً افسر اسلحہ خانہ کا نشان تلوار اور آبدار خانہ کے افسر کا نشان پیالہ ہوا کرتا تھا۔ پتھر کی مُہروں پر بھی تصویروں کے کندہ کرنے کا رواج تھا۔ چنانچہ دارالآثار میں دو نگینے ایسے ہیں جن پر شیر کی تصویر کندہ ہے اور دو تختیاں سنگِ مرمر کی ایسی ہیں جن پر اُڑتے ہوئے عقاب کی صورت منقوش ہے۔ ایک اور تختی ہے جس پر چار مچھلیاں بنی ہوئی ہیں، ایک ٹائل کا ٹکڑا ہے جس پر دو تلواریں ہیں اور اُن پر ہلال منقول ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ اسلام تک تمام امراء کا ایک مخصوص نشان ہوا کرتا تھا جس کو آج کل کوٹ آف آرمس (Coat of arms) کہتے ہیں اور مختلف حکومتوں نے اختیار کر رکھا ہے، اسی طرح اُن کی مہریں بھی ہوتی تھیں اور ماٹو (motto) بھی ہوا کرتا تھا۔

کتابوں کے مصوّر کرنے کا رواج فارس میں بہت تھا لیکن عربوں میں بھی اس کا فقدان نہ تھا۔ چنانچہ احمد تیمور نے جن مصوّر کتابوں کا ذکر کیا ہے اُن میں سے بعض کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اُس نے علم قراءۃ کی بعض کتابوں کو دیکھا ہے جن میں مخارج حروف بتانے کے لئے حلق، مُنہ اور زبان کی تصویریں بنائی گئی ہیں اور بعض میں پورا چہرہ بھی دکھایا گیا ہے، اسی طرح بعض طب کی کتابیں ہیں جن میں آنکھ وغیرہ کی پوری تشریح تصویر کے ذریعہ سے بتائی گئی ہے اور سحر العیون ایسی ہی ایک کتاب ہے جو سنہ ۱۲۷۶ء میں مصر میں طبع ہوئی تھی۔ علم بیطرہ کی بھی بعض کتابیں ایسی نظر آئی ہیں جن میں گھوڑوں کی تصویریں ہیں اور اُن کے امراض کا حال بھی تصاویر کے ذریعہ سے بتایا گیا ہے علم نباتات کی بھی بعض کتابیں مصوّر تیار کی گئی تھیں، چنانچہ رشید الدین ابن الصوری کی نادر تصنیف کا ذکر عیون الانباء میں اس طرح کیا گیا ہے کہ "یہ کتاب اس طرح طیار کی گئی ہے کہ مؤلف خود ان مقامات پر جاتا تھا جہاں کوئی پودا دوا کا اُگتا تھا اور اُس کے ساتھ ایک مصوّر

ہوتا تھا جو پودے کے رنگ، پھول، پھل کی صورت، پتیوں کی تعداد، شاخوں کی حالت کو اسوقت دیکھ دیکھ کر کاغذ پر کھینچ لیتا تھا پھر یہ تصویریں ایک ہی حالت کی نہ ہوتی تھیں، بلکہ نشو و نما کے مختلف زمانوں میں جا جا کر پودے اور پھول کی مختلف حالتوں کی تصویر لیجاتی تھی یہاں تک کہ ابتدا نشو و نما سے لیکر اس کے مرجھانے کی حالت تک مختلف زمانوں کی کیفیت تصویر میں ضبط کرلی جاتی تھی۔

بعض ادبی کتابیں بھی (مثلاً مقامات حریری، کلیلہ دمنہ، مرزبان نامہ) رنگین و مصور طیار کی گئی تھیں۔ اسی طرح یاقوت کی معجم، تقویم ابی الفدا، نخبۃ الدہر بھی مصور طیار ہوئی تھیں جن میں شہروں کے نقشے، آلات، فلکی صورتیں رنگین تھیں۔

بلقینی کی نیل الرائد، سیوطی کی کوکب الروضہ بھی رنگین تھیں جن میں دریائے نیل کا منبع اور اس کی شاخیں دکھائی گئی تھیں اور تاریخ حجاز بھی مصور تھی، جس میں حرم اور کعبہ کا نقشہ رنگین تھا مسعودی نے التنبیہ والاشراف میں ذکر کیا ہے کہ میں نے بھی بہت سی تصویریں دیکھی ہیں لیکن عہد مامون کے وہ نقشے عجیب و غریب ہیں جن میں تمام ممالک اور جملہ قوموں کا حال معہ تمام نجوم، افلاک، دریاؤں سمندروں، صحراؤں اور شہروں کے رنگین تصویروں میں بتایا گیا ہے۔

مقدسی کی احسن التقاسیم اس طرح طیار ہوئی تھی کہ ہر ملک کے شہر اور قصبات مع اُن کے حدود کے علحدہ علحدہ دکھائے گئے تھے، اور راستے سُرخ لکیروں سے، ریگستان زرد رنگ سے، سمندر سبز رنگ سے، دریا نیلگوں رنگ سے اور پہاڑ سیاہ رنگ سے نمایاں کئے گئے تھے، ہیئت کی تو تقریباً تمام کتابیں تصویر دار ہوتی تھیں جن میں جملہ ثوابت و سیار کی صورتیں درج ہوتی تھیں، بعض میں آلات رصد کی صورتیں بھی منقوش کی گئی تھیں، اسی طرح ہندسہ کی کتابیں بھی نقشوں اور رسوم سے مزین ہوتی تھیں، اور موسیقی، علم الحیل، سپہ گری کی کتابیں بھی مصور طیار کی گئی تھیں، جن میں آلات موسیقی، آلات جر ثقیل، شمشیر زنی اور نیزہ بازی کی مختلف حالتوں کی تصویریں درج تھیں اور علم جفر و سحر کی کتابوں میں بہت سے جانوروں، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کی رنگین تصویریں بنائی جاتی تھیں، چنانچہ ایسی کتابوں میں شیخ محمد العطار الدمشقی کی کتاب موسیقی میں، ابن رازی کی کتاب الحیل فی العلم والعمل، رضوان بن محمد کی کتاب علم الساعات، کتاب السؤل والامینۃ فی تعلیم اعمال الفروستیۃ، علم سحر میں عیون الحقایق، ابن طلحہ کی جفر صغیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

چونکہ تصویر کی قسم میں مجسمہ سازی اور بت تراشی بھی شامل ہے، اس لئے اہل عرب نے اُس میں بھی کافی ترقی کی تھی، قبل اسلام عرب میں بت سازی کا رواج تو اُن بتوں سے ظاہر ہے جو خود کعبہ کے اندر سیکڑوں کی تعداد میں پائے جاتے تھے اور بعد اسلام بھی اس فن کا رواج مختلف صورتوں سے پایا جاتا تھا۔ یمن کے قصر غمدان میں شیروں کے بڑے بڑے مجسموں کا پایا جانا۔ شعراء کا عورتوں کو ہاتھی دانت کے ترشے ہوئے بتوں سے تشبیہ دینا اور بچوں کا سنگین گڑیوں سے کھیلنا اس امر کا ثبوت ہے کہ عرب میں تمثیل کا بھی رواج تھا — جب رسول اللہ صلعم غزوۂ تبوک سے تشریف لائے اور طاق میں حضرت عائشہ کی گُڑیاں رکھی ہوئی دیکھیں تو آپ نے دریافت کیا کہ "یہ کیا ہے" حضرت عائشہ نے جواب دیا "میری گڑیاں ہیں" انھیں میں ایک گھوڑا تھا جس کے دو پر تھے آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا کیا آپ کو نہیں معلوم کہ سلیمان کے پاس ایک گھوڑا تھا جس کے پر تھے یہ سُن کر رسول اللہ ہنس پڑے اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعد آغاز اسلام تماثیل کا رواج قایم رہا بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ محض لہو و لعب یا تفریح کے لئے

تماثیل کا استعمال جایز ہے۔

بعض تماثیل آٹے کے بھی طیار کئے جاتے تھے اور انھیں پکا کر قوام میں ڈالدیتے تھے اور کھاتے تھے، جس طرح یہاں بھی بچوں کے لئے آٹے کی چڑیاں وغیرہ بناکر آگ میں سینک دیتے ہیں۔ بعض مٹھائیاں بھی اسی قسم کی بنائی جاتی تھیں چنانچہ ابن جبیر نے اپنے سفرنامہ میں بعض ایسی مٹھائیوں کا ذکر کیا ہے جو بالکل انسانی شکل کی بنی ہوئی تھیں اور عبیداللہ بن خلکان نے متنبی شاعر کو شکر لوز کی ایسی مٹھائی تحفۃً دی تھی جو بالکل مچھلی کی طرح تھی اور شہد میں ڈوبی ہوئی تھی چنانچہ اُس نے اس ہدیہ کی تعریف میں متعدد شعر کہے۔ ان میں سے ایک شعر یہ ہے:۔

اقل مافی اقلہا سمک　　　بلعب فی برکۃ من العسل

کھیتوں میں بھی آدمیوں کی تماثیل قایم کی جاتی تھیں تاکہ جانور ڈر کر بھاگ جائیں۔

جب اسلام کا تمدن وسیع ہوا تو زینت قصور کے لئے تماثیل کا استعمال ہونے لگا اور سنگ مرمر، تانبہ، رانگ، اور چاندی وغیرہ کی مورتیں عجیب وغریب تفنن کے ساتھ بنائی جانے لگیں، چنانچہ متنبی نے مجلس ابن عمار کی ایک سنگین کنیز کا ذکر کیا ہے جس کے بال ایک طرف کو لٹکتے تھے، ہاتھ میں پھولوں کا ہار تھا اور وہ ایک کمانی پر گردش کیا کرتی تھی۔

اسی طرح مہیار الدیلمی شاعر کے ایک رئیس دوست نے جو ہشت پہل حوض بنوایا تھا اور جس کی صنعت کی اُس نے بہت تعریف کی ہے عجیب وغریب چیز تھا۔ اس حوض کے چاروں طرف چار منبر قایم تھے جو کھوکھلے تھے۔ اس کے درمیان ایک عمود تھا اور مکان کی چھت پر ایک حوض تھا۔ اُس سے یہاں پانی آتا تھا۔ کئی مجسمے تھے جو مختلف ناموں سے پکارے جاتے تھے اور عمود پر قایم کرنے سے عجیب وغریب حرکات اُن سے سرزد ہوتی تھیں، اُن میں سے ایک کا نام خرکار تھا، یہ جس وقت قایم کردیا جاتا تھا تو گردش کرنے لگتا تھا اور اس کے اوپر سے پانی بالکل اس طرح گزرتا تھا، جیسے خیمہ قایم ہوگیا ہو اس کے چاروں طرف شمعیں بھی رکھدی جاتی تھیں جو ساتھ ساتھ گردش کرتی تھیں اور گل نہیں ہوتی تھیں۔ دوسرے مجسمے کا نام عروس تھا، یہ عمود کے اوپر رقص کرتا تھا اور دوران رقص میں پانی اُس کے سر سے ہاتھوں تک پہونچتا تھا، تیسرے مجسمے کا نام جمل (اونٹ) تھا اور چوتھے کو طنبلنب کہتے تھے اُس کی صورت ایک تیرانداز کی تھی، اگر حاضرین میں سے اُس پر کوئی شخص تیر چلاتا تو اُس کے جواب میں اُدھر سے پانی کی ایک دھار چلتی اور بھگو دیتی۔

سدیدالدین شیبانی کے پاس ایک پیالہ تھا جس کے درمیان میں ایک چڑیا قایم تھی جب پانی اس پیالہ میں ڈالا جاتا تو وہ ناچنے لگتی اور بولنے لگتی نعیمی نے تنبیۃ الطالب والدارس میں دمشق کے جامع اموی کی اس گھڑی کا ذکر کیا ہے جس میں مجسمے عجیب وغریب حرکتیں کرتے تھے اُس نے بیان کیا ہے کہ اُس گھڑی میں چند چڑیاں، ایک سانپ اور کوا تانبے کے بنے ہوئے موجود تھے جب گھنٹہ ختم ہوتا تو سانپ نکلتا، چڑیاں چلانے لگتیں اور کوا چیخنے لگتا۔

ابن جبیر نے باب جیرون کی گھڑی کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس میں تانبہ کے دو باز تھے جب گھنٹہ ختم ہوتا تھا تو ان کے منھ سے دو جھانجھ پیدا ہوکر بجنے لگتی تھیں۔

سخاوی نے ۸۴۵ھ کے حوادث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسکندریہ سے کچھ تیرانداز آئے اُن کے ساتھ لکڑی کی بنی ہوئی ایک عمارت قلعہ کی صورت میں تھی، بادشاہ کے سامنے آکر انھوں نے اس پر تیراندازی کی تو قلعہ کے اندر سے ایک آدمی نکلا جو تلوار اور ڈھال لئے ہوئے تھا بادشاہ نے اُن کو بہت انعام دیا اور رخصت کر دیا۔

یمن کے بادشاہ نے سلطان الکامل ایوبی کے پاس ایک شمعدان تحفۃً بھیجا جو تانبہ کا بنا ہوا تھا، فجر کے وقت اُس کے اندر سے تانبے کی ایک مورت پیدا ہو کر سیٹی بجاتی تھی، کہا جاتا ہے کہ یہ شمعدان ناصر محمد بن قلادون کے زمانہ تک خزانۂ شاہی میں موجود تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف مورتیں ہی طیار نہ کرتے تھے، بلکہ پانی، کمانیوں، اور ہوا کے ذریعہ سے وہ اُن میں عجیب و غریب تفنن بھی پیدا کرتے تھے مقریزی نے ذکر کیا ہے کہ باب الصلاۃ پر جہاں سے احمد بن طولون نکل کر مسجد میں جایا کرتا تھا دو بڑے بڑے مجسمے شیروں کے قایم تھے۔ عنبر کی مورتیں خزانۂ شاہی میں ۲۲ ہزار کے قریب تھیں، جن میں چھوٹے سے چھوٹا مجسمہ ۱۲ سیر کا تھا، طاؤس کی تمثال کا حال لکھا ہے کہ خالص سونے کا تھا اور جسم میں قیمتی جواہر جڑے ہوئے تھے آنکھیں یاقوت کی تھیں، اسی طرح مُرغ اور ہرن کی تمثالیں تھیں، ایک باغ کی بھی مصنوعی نقل تھی۔ جس کی زمین چودی کی تھی اور درختوں کے پھل عنبر کے یہ بھی بالکل سونے چاندی کے کام سے لدا ہوا تھا۔ کشتیوں کے اگلے حصہ کو بھی مختلف حیوانوں کی صورت پر بنانے کا کثرت سے رواج تھا۔

اندلس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں تصاویر و تماثیل کا کثرت سے رواج تھا اور عجیب و غریب اختراع و تفنن سے کام لیا جاتا تھا، صاحب نفح الطیب نے سلطان تلمسان ابی تموکی ایک گھڑی کا ذکر کیا ہے کہ اُس میں چھوٹے چھوٹے دریچے تھے، اور جب گھنٹہ بجتا تھا تو اُس سے متعلق دریچہ کھلتا تھا اور ایک حسین کنیز نکلتی تھی جس کے ہاتھ میں ایک رقعہ ہوتا تھا اور اُس پر وقت درج ہوتا تھا۔ کنیز اس رقعہ کو بادشاہ کے ہاتھ پر نہایت نزاکت سے رکھ دیتی تھی۔

یہ تھا مختصر بیان اہل عرب کی صرف مصوری و تمثیل سازی کا جس کا تعلق فنون لطیفہ کے دیگر اصناف سے نہیں ہے حالانکہ نہیں بھی اُن کی ترقی اسی قدر حیرت انگیز تھی۔ حدادی۔ نجاری، پارچہ بافی اور آلات سازی میں بھی اُن کے کارنامے نہایت عجیب و غریب ہیں اور فن تعمیر کو تو انھوں نے اس قدر مکمل طور پر اختیار کر لیا تھا کہ مشکل سے اُس کی نظیر مل سکتی ہے۔

موسیقی دانی کے فسانے اُن کے مشہور ہی ہیں یہاں تک کہ بیس جلد کی ایک کتاب اغانی[1] ساری کی ساری اس فن کی تاریخ سے بحث کرتی ہے۔

---

[1] کتاب الاغانی کے مصنف کا نام علی بن الحسین بن محمد بن احمد القُراشی الاصبہانی تھا اور کنیت ابوالفرج۔ اس کا تعلق خاندان بنی امیہ سے تھا۔ ۲۸۴ھ میں پیدا ہوا اور بغداد میں تعلیم حاصل کی۔ اس کا انتقال ۳۵۶ھ میں ہوا۔ اس کی تصنیفات کتاب الاغانی بہت مشہور ہے۔ اس کتاب میں اسنے سب سے پہلے وہ ۱۰۰ نغمے نقل کئے ہیں جو عہد ہارون الرشید کے مشہور مغنیوں (ابراہیم موصلی، اسماعیل اور فلیح وغیرہ) نے وضع کئے تھے۔ ان کے علاوہ عہد خلفاء کے دوسرے مشہور گویوں کے گانے بھی اس نے جمع کئے۔ یہ کتاب بیس ضخیم جلدوں میں شایع ہوئی ہے۔

آلات اور تمدن

انسان کی جامع تعریف میں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ "وہ آلات بنانے والا حیوان ہے" اگرچہ بعض بندر بھی آلات کا استعمال کرتے ہیں، ایک دوسرے کو پتھروں سے مارتے ہیں، آپس میں لکڑیوں سے بھی لڑتے ہیں، لیکن آلات اُن کی صنعت سے طیار نہیں ہوئے، بخلاف انسان کے کہ وہ سوچ سمجھ کر آلات کو بناتا اور اُن کا استعمال کرتا ہے۔

اختراع آلات نے انسان کی گزشتہ تاریخ میں کیا کیا انقلابات پیدا کئے اور مستقبل میں اُن آلات کی بدولت کیا کچھ ہونے والا ہے، اس سوال کا جواب صرف اس وقت دیا جا سکتا ہے، جب انسان کے تمدنی ارتقاء پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے۔

ابتداء میں انسان بھی اور حیوانات کی طرح کسی قسم کے آلات و اوزار کا استعمال نہیں کرتا تھا لیکن جب رفتہ رفتہ اُسکے معلومات میں وسعت پیدا ہوئی اور تجربات سے اُس نے سبق لینا شروع کیا تو پہلے پتھر کے نہایت معمولی اور بھدے آلات بنائے اور ایک عرصہ تک انھیں استعمال کرتا رہا، چونکہ ابتداء میں صرف شکار پر اس کی گزر تھی، اس لئے شکار حاصل کرنے کے لئے ان حجری آلات سے مدد لیجاتی تھی (یہ حجری آلات آج کل علماء اثر نے زمین کھود کر نکالے ہیں اور دنیا کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں)

اس کے بعد انسان نے رفتہ رفتہ تمام دھاتیں دریافت کیں، لوہے سے مختلف قسم کے اوزار و آلات بنائے اور انھیں آلات کی بدولت تمام صنائع و فنون میں ترقی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ انسانی تمدن کی موجودہ حد تک پہونچ گیا، ٹیلیگراف، ٹیلیفون، لاسلکی، ریل، جہاز، طیارے اور اسی قسم کی ہزارہا مفید ایجادیں صرف آلات کی بدولت ہوئی ہیں اور یہ سب ایجادیں بھی خود آلات ہیں جنکو انسان اپنی ضروریات کے لئے استعمال کرتا ہے۔

سیاسی حریت بھی آلات کے ذریعہ سے حاصل ہوئی

چودھویں صدی عیسوی میں یورپ چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر مشتمل تھا، جن پر آزاد امراء کی سیادت تھی، یہ امراء بڑے بادشاہوں سے نہایت خفیف سا تعلق رکھتے تھے اور اپنے اپنے علاقوں اور جاگیروں میں خود مختار تھے، وہاں کے تمام انتظامات انھیں کے ہاتھ میں تھے اور وہ زمین کے مالک تھے، مزدوروں کو اپنا غلام سمجھتے تھے، فنون سپہ گری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ تلوار، نیزے، ڈھال اور زرہ وغیرہ قدیم ہتھیاروں سے لڑائی میں کام لیتے تھے۔ ان کی سکونت چھوٹے چھوٹے قلعوں میں ہوتی تھی، اگر کوئی فریق مغلوب ہو جاتا تھا تو وہ اپنے قلعہ میں پناہ لیتا تھا اور محاصرہ کرنے والوں پر اندر ہی سے تیر اندازی کرتا تھا یہاں تک کہ وہ آخر کار تنگ آ کر محاصرہ چھوڑ دیتے تھے۔

ایک مدت تک یورپ میں مالکان آراضی اور امرائے جاگیر کا دور رہا اور لوگ ان کے غلام بنے رہے۔ چودھویں عیسوی میں ایک عجیب و غریب آلہ جو نہایت خوفناک اور تباہ کن تھا میدانِ جنگ میں استعمال کیا گیا۔ یہ وہ آلہ ہے جسے ہم توپ کہتے ہیں۔ اس آلہ نے اس دور میں متعدد صورتیں اختیار کیں اور آج تک میدانِ جنگ میں اس سے کام لیا جا رہا ہے۔

اس آلہ نے آزادی و حریت کی خوشخبری سنائی، امرا کا زور گھٹ گیا، بادشاہوں نے اپنی توپوں سے امراء کے قلعے منہدم کر دئے یورپ میں تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں ٹوٹ کر بڑی سلطنتوں میں شامل ہوگئیں، لوگوں نے امراء کے طوق غلامی سے رہائی پائی اور مساوات و آزادی کے پہلے زینہ پر قدم رکھا، اگرچہ اس قدیم طرز کی بادشاہت میں بھی لوگوں پر ظلم ہوتے تھے، لیکن وہ قدیم مظالم کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ بادشاہ کی اگرچہ ایک جابر و قاہر شخصیت ہوتی تھی اور ہر شخص کی جان و مال کا مالک وہی سمجھا جاتا تھا، پھر بھی عام طبقہ کو پہلے کی بہ نسبت بہت کچھ آزادی حاصل ہوچکی تھی اور شاہی مظالم کا شکار صرف وہی لوگ ہوتے تھے جن کا بادشاہ کے شخصی اغراض سے تصادم ہو جاتا تھا۔

سولھویں صدی عیسوی میں مصر کی وہی حالت تھی جس میں پہلے یورپ گرفتار تھا، ممالک مصر، تمام ملک میں فتنہ و فساد برپا کرتے تھے، اور یہاں بھی اس زمانہ میں وہی اسلحہ استعمال کئے جاتے تھے جن سے یورپ ازمنہ وسطیٰ میں کام لیتا تھا۔ مصر اسی حالت میں تھا کہ وہاں یکایک یورپ کا سپہ سالار اعظم نپولین داخل ہوا۔ جس کے آگے آگے توپوں کے فیر ہوتے جاتے تھے اور ان کی مہیب آوازوں سے تمام سرزمین مصر ایک عظیم تزلزل کی حالت میں تھی ان ہی توپوں کی بدولت ممالیک کا زور ٹوٹ گیا اور مصر میں ایک عام تسلط اور شاہی اقتدار کا دور شروع ہوا۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مصری حریت سیاسی کا دور، نپولین اعظم سے شروع ہوتا ہے۔

آلات و تمدن کی سمت رفتار

ایک مشہور امریکن اجتماعی کا قول ہے کہ "تمدن گرم ملکوں سے سرد ملکوں کی طرف بڑھتا ہے"۔ سب سے پہلے آفتابِ تمدن، مصر جنوبی میں طلوع ہوا، پھر وہاں سے مصر شمالی میں پہونچا، مصر شمالی سے اس کی شعاعیں فنیشیا میں پہونچیں۔ پھر وہاں سے یہ نور یونان پر چمکا۔ یونان سے اس نے اٹلی کا رخ کیا، اٹلی سے فرانس نے کسب ضیاء کرکے اس کی روشنی انگلستان میں پہونچائی اور یہاں انیسویں صدی کے شروع ہونے سے پہلے جرمنی میں نہایت شان و شوکت سے نمودار ہوا۔ اگر اس رفتار کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تمدن نے اپنے ہر ہر مرحلہ میں صرف آلات کی بناء پر ترقی کی اور اس کی آخری منزل میں جرمنی نے جو عجیب و غریب آلات اختراع کئے ہیں وہ خود ہمارے دعوے کے زبردست دلائل ہیں۔

آفتاب تمدن نے بجائے شمال کے جنوب کا رخ کیوں نہیں اختیار کیا

عام قاعدہ ہے کہ جس قدر انسان تکلیف و مصیبت میں ہوتا ہے اسی قدر اس کے حواس معطل ہو جاتے ہیں۔ درستی عقل اور سلامتی حواس کے لئے اعتدالِ مزاج، شرط لازمی ہے، یہی وجہ ہے کہ تمدن جنوب کی طرف نہیں گیا کیونکہ مصر سے جس قدر جنوب کی طرف انسان جاتا ہے اسی قدر گرمی کی شدت بڑھتی جاتی ہے اور اعتدالِ مزاج فوت ہوتا جاتا ہے۔ باشندگانِ خطِ استوا کو آفتاب کی تیز اور محرق شعاعیں ان کے جسم کو جلائے ڈالتی ہیں ان کے مزاج میں وہ اعتدال اور لطافت کہاں سے آسکتی ہے جو ایک معتدل آب و ہوا میں پرورش پانے والے انسان میں

پائی جاتی ہے، اُن کی دماغی حالت اس قابل نہیں ہے کہ وہ غور و فکر کرکے کچھ ترقی کر سکیں اور اپنے دماغی نتائج سے انسانیت کو تہذیب و تمدن کے بلند ترین زینہ تک پہونچا دیں۔

جس طرح خطِ استوا کا رہنے والا ترقی نہیں کر سکتا اسی طرح اقطاعِ شمالی کا باشندہ جو برف کے مکانوں میں رہتا ہے ترقی سے محروم ہے دونوں کا اعتدالِ مزاج فوت ہو چکا ہے۔

قطب شمالی اور خطِ استوا کے درمیان جو ملک واقع ہے وہاں حرارت اور برودت اس قدر شدید نہیں ہے کہ انسان کو غور و فکر کی مہلت نہ دے، جس قدر انسان آرام و راحت سے رہتا ہے اسی قدر وہ اپنی ضرورتوں کو وسیع کر لیتا ہے اور جس قدر ضرورتیں زیادہ ہوتی ہیں آلات اور اختراعات میں بھی اسی نسبت سے ترقی ہوتی ہے۔

سرد ممالک میں بہ نسبت گرم ملکوں کے ضروریاتِ زندگی زیادہ ہیں، اس لئے وہاں بمقابلہ گرم ملکوں کے آلات و اختراعات کی بھی کثرت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس قدر آلات زیادہ ہوں گے اسی قدر تمدن میں ترقی ہوگی اور معاشرت بلند ہوتی جائے گی۔ آفتابِ تمدن مصر جنوبی کی سرزمین سے طلوع ہو کر چھ ہزار برس کی مدت میں جرمنی تک پہونچا ہے اور اس کا ہر اگلا منظر پچھلے سے زیادہ شاندار اور ترقی پذیر صورت میں نمایاں ہوا، آج کل تمدن کی روشنی جرمنی سے سوئیڈن اور ناروے میں پہونچ رہی ہے اور ایک زمانہ آئے گا جب یہ دونوں ملک جرمنی سے بھی کئی درجہ زیادہ متمدن اور صاحبِ آلات و اختراعات نظر آئیں گے۔

تمدن کی گزشتہ چھ ہزار سالہ رفتار کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمدن کی ترقی صرف آلات کی ترقیوں میں مضمر ہے۔ جسقدر آلات کثرت سے ہوتے ہیں اسی قدر انسان کو علوم و فنون میں ترقی کرنے کا زیادہ وقت ملتا ہے یعنی تمدن و علم کا عروج آلات کی کثرت پر ہے اور اُن کا انحطاط فقدانِ آلات کے سبب سے ہوتا ہے۔

آلات اور ہندوستان

ہندوستانیوں کی ضروریات بہ نسبت یوروپین اقوام کے بہت کم ہیں لیکن باوجود اسکے ہندوستانی مزدور کو یوروپین مزدور سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے کیونکہ جن آلات اور اوزار سے یوروپین مزدور کام لیتا ہے وہ ہندوستان کو نصیب نہیں، اس لئے ہندوستانی کو غور و فکر اور علوم و فنون حاصل کرنے کے لئے اتنی فرصت نہیں ملتی جو ایک یوروپین کو حاصل ہو سکتی ہے۔

باوجودیکہ ہم تعلیم کی اہمیت اور اس کی ضرورت کا پورا احساس رکھتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں تعلیم کو وہ ترقی حاصل نہیں ہو سکتی جو مغربی ممالک میں پائی جاتی ہے، کیونکہ فقدانِ آلات کی وجہ سے ہمارا کسان اور اس کی بیوی چھوٹے بڑے بچے سب کھیتی کے کام پر لگے رہتے ہیں اور پھر بھی وہ کام ختم نہیں ہوتا اس لئے انھیں علوم و فنون حاصل کرنے کے لئے کسی طرح فرصت نہیں مل سکتی، یہ آلات ہی کی برکت ہے کہ جس کھیت کو ہندوستان میں سو مزدور ایک مہینہ کی مدت میں کاٹتے ہیں اُسے یورپ میں آلات کی مدد سے دو دو روز میں کاٹ لیتے ہیں۔

اگر ہمارے پاس آلات نہیں ہیں تو ہم جبریہ تعلیم جاری کرنے کی صورت میں بھی نہیں پڑھ سکتے اور اگر پڑھیں گے تو ہمارے کام خراب ہو جائیں گے۔ کیونکہ مفید آلات نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا کسان اپنے پورے خاندان سے کام لینے پر مجبور ہے، اس کے پاس جو آلات اور

اوزار ہیں وہ بالکل اسی قسم کے ہیں جو مسیح علیہ السلام سے ہزاروں برس پہلے پائے جاتے تھے۔

جس ملک میں آلات زیادہ ہوتے ہیں وہاں تعلیم کو ترقی ہوتی ہے، اسی طرح صنعتی ملک میں بہ نسبت زراعتی ملک کے علوم و فنون کی اشاعت زیادہ ہوتی ہے۔ انگلستان اور جرمنی صنعتی ملک ہیں اس لئے وہاں فیصدی ایک بھی جاہل شخص نظر نہیں آتا، بخلاف اسکے اسپین زراعتی ملک ہے اس لئے وہاں فیصدی ستر جاہل پائے جاتے ہیں۔

آلات پر سلطنتوں کا قیام ہے

تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی قوم نے ترقی کر کے اپنے ہمسایہ ممالک پر قبضہ کر لیا ہے اور ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی ہے، تو جب تک سلطنت کے پاس وسایل نقل و حرکت اور ذرائع خبر رسانی اعلیٰ پیمانہ پر پائے گئے ہیں اس کا وجود قایم رہا ہے ورنہ سب سے پہلے پایۂ تخت سے دور کے ممالک نے استقلال کا دعویٰ کیا اور رفتہ رفتہ اس کے اعضا کٹتے گئے یہاں تک کہ وہ صفحۂ ہستی سے بالکل معدوم ہوگئی۔ ہم اس کی مثال میں صرف رومن سلطنت اور عربی حکومت کو پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ عربی حکومت سے سب سے پہلے اُندلس علٰحدہ ہوا پھر مصر پھر ایران نے استقلال کا دعویٰ کیا اور آخر میں تمام ممالک ایک دوسرے سے علٰحدہ ہو کر سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔

اس کا کیا سبب تھا، صرف آلات و وسایل کا فقدان، اگر اس زمانہ میں بھی، ریل، تار، ٹیلیفون، لاسلکی طیارے وغیرہ ہوتے اور ہر وقت کی خبریں تخت گاہ خلافت تک پہونچتی رہتیں تو اس قدر جلد سلطنت کا انحلال نہ ہوتا، بخلاف اس کے کہ اگر آج حکومت کے خلاف ہندوستان میں کوئی جلسہ ہوتا ہے تو لاسلکی کے ذریعہ سے ایک لمحہ میں اس کی خبر لندن پہونچ سکتی ہے جو ہندوستان سے تقریباً آٹھ ہزار میل کے فاصلہ پر ہے اور ہوائی جہاز کے ذریعہ سے یہ مسافت زیادہ سے زیادہ چار دن میں طے ہو سکتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں وسائل نقل و حرکت اور ذرائع خبر رسانی بہترین صورت میں پائے جاتے ہیں اور آیندہ اس سے زیادہ ترقی کی امید ہے، اس لئے موجودہ عہد میں جو متحدہ حکومت قایم ہوتی ہے اس کا شیرازہ منتشر نہیں ہو سکتا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی تعداد ۴۰ سے زیادہ ہے، مگر چونکہ یہ متحدہ سلطنت ترقی کے موجودہ زمانہ میں قایم ہوئی ہے اس لئے ریل، تار، ٹیلیفون، لاسلکی وغیرہ نے اُسے جسم واحد کر دیا ہے۔

جب تک کسی قوم نے دوسرے مقابلہ میں وہی آلات اور اختراعات فراہم نہیں کئے جو اس کے مقابل کے پاس ہیں تو اس کا آزاد ہونا تقریباً محال سمجھنا چاہئے خواہ اس میں آزادی و حریت کے جذبات کتنے ہی شدید کیوں نہ پائے جائیں۔

آیندہ زمانہ میں کیا ہوگا

زمانہ ترقی کر رہا ہے ہر ایک قوم بیدار ہو رہی ہے حریت و آزادی کے جذبات تمام محکوم قوموں میں پیدا ہو گئے ہیں، اس لئے جب وہ زمانہ آئے گا کہ تمام دنیا کے ممالک میں علوم و فنون پوری طرح ترقی کر چکیں گے اور تمام دنیا آلات کی برکت سے جسم واحد بن جائے گی، تو اس وقت تمام عالم میں ایک مشترک جمہوریت قایم ہوگی، ہر ملک بلکہ ہر صوبہ اپنے داخلی انتظامات میں خود مختار ہوگا اور مجلس عالیہ جس میں ہر قوم کے نمایندے ہوں گے تمام عالم پر حکومت کرے گی اور امریکہ کی طرح تمام دنیا ریاستہائے متحدہ کا مجموعہ بن جائے گی۔

آلات اور اشتراکیت

مزدوری پیشہ اور سرمایہ داروں کے درمیان اس وقت ایک زبردست اقتصادی تصادم قایم ہے۔ زعمائے عمال نے، روس میں عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے، فتنۂ عمال آہستہ آہستہ اور ممالک میں بھی نفوذ کرنا چاہتا ہے، اگرچہ لوگ اس کے عظیم خطرات کو محسوس کرتے ہیں وہ اس کے دفع کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر رہے ہیں کیونکہ اشتراکیت کا سب سے زیادہ مضرت رساں اثر اُن سرمایہ داروں پر پڑتا ہے جو ہر روز لاکھوں مزدوروں سے اپنے کارخانوں میں کام لیتے ہیں اور خود کوئی کام نہیں کرتے اور بلا کسی کاوش و محنت کے کروروں روپیہ کا نفع حاصل کرتے ہیں۔

اشتراکی خیالات کے محرک یہی آلات ہی ہیں انھیں کو دیکھ کر زعمائے اشتراکیت کے خیالات بدلے ہیں، پہلے زمانہ میں کپڑا بُننے والے اپنے ہاتھ سے سارا کام کرتے تھے اور خود ہی اس کپڑے کو لیجاکر بازار میں بیچتے تھے، یہی حال ہر ایک صانع اور کاریگر کا تھا۔ چونکہ یہ لوگ خود ہی صانع اور خود ہی تاجر تھے اس لئے وہ مزدور بھی تھے اور سرمایہ دار بھی اور اگر اس زمانہ میں کوئی شخص کسی مزدور سے کام لیتا تھا تو مزدور کی غایت یہی ہوتی تھی کہ وہ بھی کسی دن آزاد کاریگر بن جائے اور اکثر ان کی یہ امیدیں پوری بھی ہو جایا کرتی تھیں۔

لیکن اُنیسویں صدی کے آلاتِ عظیمہ اور اختراعاتِ ہائلہ نے نظامِ اجتماعی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا بیس بیس اور چالیس چالیس ہزار گھوڑوں کی طاقت کے کوہ پیکر انجن طیار ہو رہے ہیں، پس ظاہر ہے کہ ان عظیم الشان مشینوں کو ہر ایک کاریگر نہیں خرید سکتا، اس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی کہ وہ لاکھوں روپیہ کی مشین خریدے، اس لئے مالدار اور متمول طبقہ نے یہ آلات خریدے اور لاکھوں مزدوروں سے کام لینا شروع کر دیا۔ پہلے کاریگر اور صاحبِ مال ایک شخص تھا۔ لیکن اب دو فریق ہو گئے ایک سرمایہ دار اور دوسرا مزدور۔

چونکہ مزدوروں کی محنت سے سرمایہ دار کروروں روپیہ کماتے ہیں اور خود کچھ نہیں کرتے اور یہ صورت محض آلاتِ عظیمہ کی بدولت پیدا ہوئی ہے اس لئے اشتراکی خیالات کے محرک یہی آلات اور اُن کے نتائج ہیں۔

خلاصہ

ہمارا دعویٰ ہے کہ دنیا میں آج تک جس قدر سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور تمدنی تغیرات اور انقلابات ہوئے ہیں سب کا سببِ اولین آلات و اختراعات ہیں اور آیندہ بھی یہی چیزیں عظیم الشان انقلابات کا باعث ہوں گی اور یہ انقلابات اس قدر عظیم الشان ہوں گے کہ ان کی عظمت و اہمیت کا تصور بشر دماغ نہیں کر سکتا۔ سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشاکش جو آلاتِ عظیمہ کی بدولت وجود میں آئی ہے ضرور ایک روز اجتماعی نظام کو بدل دے گی اور اصحابِ املاک کے قہرمانی تسلط سے مزدور آزاد ہو جائیں گے۔ اور انسان اپنے ہم جنس کی ذلیل خدمات انجام دینے سے بے نیاز ہو جائے گا۔ لیکن سرمایہ داری کے تسلط میں ایسی تعدیل ہرگز نہ ہوگی جیسی آج کل روس میں جاری ہے۔ بلکہ ایک ایسی درمیانی راہ پیدا ہو جائے گی جو سرمایہ دار اور مزدور دونوں کے لئے بہتر ہوگی۔

یوروپ کی موسیقی پر عربوں کا اثر

پروفیسر ہاسکنس نے "انگلش ہسٹاریکل ریویو" میں ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ بارھویں صدی میں جب مغربی یوروپ کے اندر علوم عربیہ کی اشاعت ہونے لگی تو انگلستان نے بھی اس میں نہایت اہم حصہ لیا چنانچہ اُس زمانہ میں ہاتھ کار ہنے والا ایک شخص ایڈیلارڈ تھا جس نے علوم عربیہ کو بہت زیادہ انہماک سے حاصل کیا اس کے معاصرین اور علماء مابعد کی تحریر کردہ بہت سی کتابیں معہ تاریخ تصنیف ایسی موجود ہیں جن کے مطالعہ سے یہ بات نہایت وضاحت اور صحت کے ساتھ تحقیق کی جا سکتی ہے کہ ان علوم جدیدہ (عربیہ) کی اشاعت ملک انگلستان میں کس طرح حاصل ہوئی، اس میں کوئی شک نہیں کہ انگلستان کی علمی بیداری میں ان علوم عربیہ نے نہایت زبردست حصہ لیا تھا اور عربوں کے ذریعہ سے علوم ریاضی خاص طور پر اس قدر معراج ترقی پر پہونچ گئے تھے کہ اس سے قبل مغربی یوروپ کو کبھی دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا۔

عربوں میں لفظ "سائنس" کے اندر وہ جملہ علوم شامل تھے جو قرون وسطیٰ میں یوروپ کے اندر ریاضیات میں داخل تھے یعنی علم الحساب، علم المساحت، موسیقی اور فلکیات اور ان تمام علوم پر مستشرقین نے کافی توجہ کی، مگر بد قسمتی سے علم موسیقی پر کسی نے توجہ نہ کی۔ یعنی اب تک یہ بات ظاہر کرنے کی کسی شخص نے بھی کوشش نہ کی کہ عربوں نے فن موسیقی نے مغربی یوروپ پر کس قدر اثر ڈالا۔

یوروپ پر عربوں کے اثر کا یہ پہلو دو صورتوں میں تحقیق کیا جاتا ہے :-

(۱) عام موسیقی جو آٹھویں صدی میں یوروپ کے اندر بسلسلۂ تعلقات اشاعت پذیر ہوئی۔

(۲) فن موسیقی، جو دسویں اور گیارھویں صدیوں میں ادبی اور علمی تعلقات کے ساتھ ساتھ یوروپ میں آیا۔

عربوں کی عام موسیقی، مغربی یوروپ میں سفری قوالوں یا مغنیوں کے ذریعہ سے پھیلی جو اپنے ساتھ اہل عرب کے ایجاد کردہ آلات موسیقی لئے پھرتے تھے اور عربی طرز کے گیتوں سے گاتے تھے قرون وسطیٰ میں یوروپ کے مغنی اور گشتی قوال جو گیت گاتے تھے یا جن طریقوں سے رقص کرتے تھے، ان میں سے اکثر راگنیاں اور اکثر رقص عربوں کے رہین منت تھے۔ لیکن یہ گشت کرنے والے یا سفری مغنی، عربی علم موسیقی سے بہت کم واقفیت رکھتے تھے، کیونکہ یہ لوگ عموماً عطائی ہوتے تھے، جو عربی گویوں سے سُن سنا کر چیزیں اُڑا لیا کرتے تھے ۔ لیکن جو عربی سازہائے موسیقی یہ لوگ اپنے ساتھ لئے پھرا کرتے تھے وہ یوروپ کے نزدیک بالکل نئے اور انوکھے تھے اور ان میں سے بعض ساز اس ترکیب سے وضع کئے گئے تھے کہ ان میں سروں کا ٹھاٹھ زیادہ تر علمی طریقہ پر قایم تھا جس سے یوروپ بالکل ناواقف تھا

بعض ساز اور اصطلاحات موسیقی

اب ہم ذیل میں بعض عربی اور یوروپین سازوں کے نام درج کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ یوروپین سازوں کے نام عربی ناموں سے مشتق ہیں یا ان کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں

عربی نام	یوروپین
العود	A lute = (Al-ud)
قطار	Guitar = (qitar)
رباب	Rebec = (Rabab)
نقارہ	Naker = (Naqara)
صنوج (مجیرہ یا جھانجھ)	Sonajas = (Sunuj)
اَلدف (مربع)	A dufe = (Al duff)
بندیر (مدور)	Pandare = (Bandair)

قصعہ (ایک قسم کا عربی ڈھول) (qasa): سولھویں صدی میں فرانسیسی qaese Caisse ہوا اور اب فی زمانہ کہلاتا ہے۔

عربی نام	یوروپین	
طبل	Taber-Tabor-Tabel	(Tabl)
النفیر (نفیری)	Anafil	(Nafir)
انفار	(بہت سی نفیریوں کا یکدم بجنا) Fanafare	(Anfar)
السرنائی	Dulcaya	(Al-surnay)
قانون	Canon	(qanun)
الشقرہ	Esch aquiel	(Al-Shaqira)
زمر	Shawm	(Zamr)

معلوم ہوتا ہے کہ جلترنگ کا نام بھی کوئی نہ جانتا تھا۔ چنانچہ چھٹی صدی سے نویں صدی تک کا زمانہ ادبیات یورپ میں (جلترنگ) کے ذکر سے خالی ہے مگر نویں صدی سے بارھویں صدی تک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ عربوں نے واقعی آبی اور ہوائی دونوں قسم کے ارغنون بنائے تھے اور آبی ارگن سے مراد "جلترنگ" ہے۔

تان اور برہیت

عربوں کے ساتھ یورپ کا تعلق پیدا ہونے کے بعد جو سب سے پہلا اثر پڑا وہ "زائدۃ" تھا یعنی کوئی چیز گاتے گاتے تان یا مینڈ لگانا جسے انگریزی اصطلاح میں gloss (چمک) یا ornament (راگنی کا زیور یا سنگھار) کہتے ہیں۔

عربی اثر پڑنے سے قبل یوروپین موسیقی بالکل سادہ ہوا کرتی تھی جسے "نغمۂ گریگوری" کہتے تھے اس میں سروں کا کوئی اُتار چڑھاؤ

نہیں ہوتا تھا۔ مگر عربی اثر پڑتے ہی تمام یوروپین موسیقی کا رنگ بدل گیا۔ اگر دو یا دو سے زیادہ مغنی گانے بیٹھتے تھے تو ان میں ایک آدمی سیدھی استائی گاتا تھا اور دوسرا درمیان میں گلے بازی کرتا جاتا تھا۔ اس تان اور مینڈ وغیرہ کی اصطلاح کو یورپ میں " oppoggiatura " کہتے تھے۔

سُر ملانا جس چیز کو انگریزی زبان میں " Harmony " (ہم آہنگی) کہتے ہیں وہ یورپ میں دسویں صدی سے پیشتر بالکل مفقود تھی، لیکن پروفیسر ووليريچ لکھتے ہیں کہ دسویں صدی میں فن موسیقی کے اس اسلوب کا ذکر پایا جاتا ہے، جسے organising (ٹھاٹھ ملانا) کہتے ہیں۔ یہ فن سروں کے ملانے پر مشتمل تھا اور اُس زمانہ میں اُس کو " Organum " یا " Diaphony " کہتے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یورپ میں یہ خیال کیونکر پیدا ہوا بعض مورخین مثلاً امیل نوماں (Emil Naumann.) کا یہ قول ہے کہ دین عیسوی کی ترقی کے ساتھ یہ بات بھی پیدا ہو گئی تھی، مگر اس قول کی تردید پادری سر الیف اے گور آوسلے جیسے عالم و فاضل نے بخوبی کر دی ہے۔ حقیقت کا اظہار دراصل پروفیسر ودلریچ نے کیا ہے جو تحریر فرماتے ہیں کہ "ارغنوم" (organum) کا اصول اساسی قدیم یونانیوں کے اس طریقہ میں پایا جاتا ہے جسے " magadizing " کہتے تھے۔ اس میں "اکیٹو" (octave) کو اکیٹو سے ڈبل کیا جاتا تھا۔ اور " organising " میں چوتھے یا پانچویں سر (مدھم یا پنچم) سے ڈبل کیا جاتا تھا اور بقول ڈاکٹر ریمان (Riemann) اس کے بعد " magadising " سے " organising " کی طرف قدم اُٹھانا ایک قدرتی بات تھی۔ لیکن یہ پہلا قدم کس نے اُٹھایا ؟

سب سے پہلا عرب مصنف جس کی کتابیں ہم تک پہونچی ہیں وہ الکندی (المتوفی ۸۷۴ء) ہے مگر جو اوراق پریشاں اس شخص کے ہم کو دستیاب ہوئے ہیں ان میں "ارغنوم" کا کوئی واضح ذکر نہیں ہے اور نہ الفارابی (المتوفی ۹۵۰ء) کی تصانیف میں اس کا کہیں اشارہ پایا جاتا ہے۔ لیکن بوعلی سینا (المتوفی ۱۰۳۷ء) کی کتاب "شفا" میں دونوں باتوں یعنی " magadising " اور " organising " پر "تضعیف" اور "ترکیب" کے ناموں سے بحث کی گئی ہے[1] لیکن چونکہ یہ باتیں بوعلی سینا میں پائی جاتی ہیں اس لئے گمان غالب ہے کہ الفارابی نے بھی ضرور ان کا ذکر کیا ہوگا۔ اسی سلسلہ میں واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فن "ترکیب" (organising) دراصل عربی فن نہیں ہے بلکہ یونانی ہے اور غالباً ارسطو سے لیا گیا تھا۔

ایک ہسپانوی مورخ ورجیلیس قرطبائی کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اندلس کے مدارس موسیقی میں فن "ترکیب" کی

---

[1] ویقرب من ہذا الباب الترکیبات وھوان یحدث بنقرۃ واحدۃ تشتمل علی وترین النغمۃ المطلوبۃ والتی معہا نسبۃ الذی بالاربعۃ اوالذی بالخمسۃ وغیرذالک کانہما یقعان فی زمان واحد والتضعیفات وقد علمتہا من جملۃ الترکیبات الا انہا فی الذی بالکل۔

دی جاتی تھی۔ اہل یورپ عرصہ دراز تک یونانیوں کی تقلید میں یہ بات مانتے رہے کہ صرف آٹھویں، پانچویں اور چوتھے سر ہی میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ تیسرا سُر کسی سے نہیں ملتا۔ مگر الفارابی (دسویں صدی) اور ابن سینا گیارھویں صدی) نے سر نمبر ۴ و نمبر ۵ کو ۱لکر "ثالث کبیر" (چڑھی گندھار[۱]) اور سر نمبر ۵ و نمبر ۶ کو "ثالث صغیر" (اُتری گندھار[۲]) تسلیم کر لیا تھا۔ اور ٹھیک اسوقت جبکہ یورپ بہ تقلید فیثاغورث تیسرے سُر کو غیر آہنگ خیال کر رہا تھا، عربوں کا ساز "طنبورہ خراسانی" نہایت اچھی طرح سے "ثالث کبیر" کے سر پیدا کرتا تھا۔

الغرض رفتہ رفتہ یورپ نے نظریۂ فیثاغورث ترک کر کے عربوں کے ایجاد کردہ جدید طریقے اختیار کر لئے جن میں سے ایک تیسرے، چوتھے، پانچویں اور آٹھویں میں دوگن پیدا کرنا تھا اور جس کا ذکر ابن سینا نے کیا تھا۔

سرگم ٹھاٹھ

اسی سلسلہ میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے اندر سازہائے موسیقی کا "ٹھاٹھ" قایم کرنا بھی عربوں ہی سے آیا تھا، چنانچہ لوئی شانزدہم شاہ فرانس کے ترجمان السنۂ مشرقیہ موسیو، ہیپن دی سینٹ پیرٹن، نے اس قول کی تائید میں ایک عربی مخطوطہ پیش کیا تھا۔ اور یہ بات تو زمانۂ دراز سے تسلیم کی جا چکی ہے کہ یورپ میں سرگم کی تعلیم عربوں ہی نے جاری کی تھی۔ یورپ کی اصطلاح میں سرگم کو "Solfeggio" اور گت یا ٹھاٹھ کو "Tablature" کہتے ہیں۔

اگر ہم عربی اور یوروپین سرگموں کے ناموں کا مقابلہ کریں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں کے نام اور حروف ایک ہی ہیں مثلاً:-

عربی سرگم:-	میم	فا	صاد	لام	سین	دال، را
یوروپین سرگم:-	می	فا	سول	لا	سی	دو یا اٹ، ری

سب سے زیادہ دلچسپ عربی اثر وہ ہے جو یورپ کے سازہائے موسیقی کے "ٹھاٹھ" یا "گتوں" پر پڑا۔ اور عربوں کے اس احسان کو یورپ کے محققین عام طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ایک طریقہ تھا جس میں حرفوں یا علامتوں کے ذریعہ سے "گتیں" قایم کی جاتی تھیں یا پردوں اور سپتکوں کے اُتار چڑھاؤ سے "ٹھاٹھ" بنایا جاتا تھا۔ یورپ والوں کو اس سے قبل یہ فن قطعی معلوم نہ تھا۔ عربوں کے اس احسان کا کھلم کھلا اعتراف پندرھویں صدی کے ایک راہب مصنف جائے ویلا نووا نے ایک مخطوطہ میں کیا ہے۔ مخطوطۂ مذکور کی ابتداء یوں الفاظ ہوتی ہے:-

"یہ امر حیرت انگیز ہے کہ روح القدس کے فیوض و برکات کفار پر اس قدر نازل ہوں۔ میں یہ بات اسوجہ سے کہتا ہوں کہ

---

[۱] انگریزی میں اسے (Major Third) کہتے ہیں۔

[۲] انگریزی میں اسے (Minor Third) کہتے ہیں۔

سلطنت غرناطہ کے ایک عرب (مُور) نے جس کی ماہرین فن ہسپانیہ بیحد تعریف کرتے ہیں، سازوں کے بجانے کا نہایت عمدہ فن ایجاد کیا تھا؛ اس کے بعد ناہد مذکور نے سروں کے متعین کرنے کا وہ طریقہ بیان کیا ہے جو یوروپ میں اٹھارھویں صدی میں رائج تھا اور اس طریقہ کا نام اس نے "ٹیبلیچر" (Tabal atura) لکھا ہے۔

معاشرتی علمی وادبی تعلقات

یہاں تک تو ہم نے یوروپ کے فن موسیقی پر عربوں کے اس اثر کا حال بیان کیا ہے جو سیاسی تعلقات کے ذریعہ سے پڑا۔ اب ہم اس معاشرتی اثر کا کچھ حال بیان کرتے ہیں جو اس زمانہ سے بھی قبل یوروپ پر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ پروفیسر ہاسکن نے بیان کیا ہے کہ بارھویں صدی کے اوائل ہی میں رفتہ رفتہ بہت سی عربی اصطلاحیں اور الفاظ یوروپ میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے مگر جب یوروپ سے عربوں کا علمی و ادبی تعلق بھی قائم ہو گیا تو یہ اثر بہت زیادہ ہو گیا۔ انگلستان پر اس تعلقات کا اثر بقول پروفیسر ہاسکن، والچر راہب مالورن (المتوفی ۱۱۳۵ء) کے ذریعہ سے پیدا ہوا، جس نے علوم عربیہ ایک یہودی المذہب عرب مسمی پطرس الفونزی سے حاصل کئے تھے۔ یہ یہودی عرب اس زمانہ میں انگلستان آیا تھا اور یہی وہ زمانہ تھا (۱۱۰۰ الغایۃ ۱۱۱۲ عیسوی) جبکہ یوروپ میں عربوں کا جدید علم الہیئت پہونچا۔

اسی زمانہ میں عربوں کا فن موسیقی مغربی یوروپ میں داخل ہوا، جس کی اشاعت میں انگلستان نے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ اور گیارھویں صدی کے درمیان عربوں نے قدیم یونان کی ایسی بہت کتب موسیقی کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا تھا جن کا نام تک مغربی یوروپ کو معلوم نہ تھا۔ ان میں سے مندرجۂ ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:-

موضوع کتاب		نام کتاب یونانی	نام مصنف یونانی
سر اور تال	Harmonics and Rhythmics	اسطاکزینوس	Aristoxenus
گیتیں	Problems	ارسطو	Aristotle
لحنیات و قانون	Harmonics and Canon	اقلیدس	Euclid
لحنیات	Harmonics	بطلیموس	Ptolemy
لحنیات	Harmonics	نیقوماکوس	Nichomachus

مندرجہ بالا کتب کے تراجم کے علاوہ اکثر عرب مصنفین کے قلم سے طبع زاد کتابیں نکلیں۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر مصنفین یہ تھے:- (۱) الکندی - (۲) السرخسی - (۳) بنو موسیٰ - (۴) ثابت ابن قرہ - (۵) [illegible] الرازی - (۶) قسطا ابن لوقا - (۷) الفارابی (۸) بو علی ابن سینا - (۹) ابن باجہ -

مسٹر ہنری جارج فارمر ایم۔ اے کا قول [illegible] یوروپ [illegible] موسیقی کا مقابلہ عرب معاصرین سے کرتے ہیں تو ہم شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔ اس زمانہ کی موسیقیات ایک صحرائے بے آب و گیاہ تھا جس میں الفارابی کی "کتاب الموسیقی" اور ابن سینا کی کتاب "الشفا" سرسبز و شاداب نخلستان دکھائی دیتی ہیں۔

الغرض یورپ نے بہت جلد عربوں کی علمی و دماغی فوقیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا شروع کر دیا اور طلبار فرنگ اندلس کی یونیورسٹیوں اور ہسپانیہ کے مدرسوں میں عرب اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے لگے جہاں نہ صرف یونانی موسیقیات کے عربی تراجم پڑھائے جاتے تھے۔ بلکہ خالص عربی کتب موسیقی میں بھی درس دیا جاتا تھا۔ ان یونیورسٹیوں اور مدارس سے فارغ التحصیل ہو کر جو مشہور طلبار مغربی یورپ کو گئے وہ جربرٹ، ہرمان کانٹرکٹ، قسطنطین افریقی، جان سیوائلی، گندیسالوی، جیرارڈ قریمونوی اور فلاطون طفالوی تھے۔ اسی قسم کے انگریز طلبار میں الفریڈ، ایڈیلارڈ ساکن باتھ نے اپنی ایک کتاب میں تحریر کیا ہے کہ اس نے فن موسیقی کی تعلیم فرانس میں پائی تھی اور بلکہ فرانس کے حضور میں قطار (ستار) بھی بجایا تھا (۱۱۰۹ء سے قبل) علاوہ ازیں اس شخص کی تصنیف کردہ ایک دوسری کتاب بھی شہر میلان کی ایمبروزین لائبریری میں موجود ہے، جس کا ایک حصہ علم موسیقی کے لئے مخصوص ہے۔ اسی کتاب میں مصنف مذکور نے ایک عرب ماہر فن کا حوالہ دیا ہے جس کا نام اس نے الخوارزمی (Alchoarismus) تحریر کیا ہے۔ یہ شخص مشہور و معروف "حکیم ابو عبداللہ خوارزمی تو ہو نہیں سکتا کیونکہ حکیم مذکور کی کتاب موسیقی کا ذکر عرب مصنفین نے نہیں کیا ہے۔ مگر گمان غالب ہے کہ یہ محمد ابن احمد خوارزمی ہوگا جس کی کتاب "مفاتیح العلوم" میں ایک فصل موسیقی کے لئے مخصوص کی گئی ہے۔ بہر حال بارھویں صدی عیسوی میں جدید علم موسیقی یورپ کے اندر داخل ہوا۔ اور یہ شعبہ موسیقی "ایقاعات" (mensural music یعنی تال اور سم) سے تعلق رکھتا تھا۔

قیاس یہ بھی کہتا ہے کہ جب ۱۱۳۰ء میں ہسپانیہ کے "موحدین" نے ازراہ تعصب غیر مسلموں پر زیادتیاں کرنا شروع کیں تو وہاں سے بہت سے یہودی دیگر ممالک میں منتشر ہو گئے۔ انہی میں مشہور و معروف یہودی "ابراہام ابن عذیر" اور دیگر یہودی بھی تھے جو اپنے ہم مذہبوں سے ملنے انگلستان آئے تھے۔ ابراہام لندن میں ۱۱۵۸-۵۹ء میں تھا اور یہیں اس نے اپنی کتاب موسیقی کا کچھ حصہ قلمبند کیا اور اسی زمانہ میں اسکی کتاب ایک انگریز یہودی نے نقل کی۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی میں جب کتاب "سعدیہ" لکھی گئی تو یہودیوں نے عربوں سے علم موسیقی حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اسٹین شینڈر نے اپنی کتاب "یہودی لٹریچر" صفحہ ۱۴۵ میں لکھا ہے کہ "یہودیوں کا علم و فن موسیقی، دیگر علوم کی طرح، عربوں سے حاصل کیا گیا تھا" اسی زمانہ میں یہودی لوگ عربی کتب موسیقی کا ترجمہ اپنی عبرانی زبان میں کر رہے تھے۔ یہودی انسائکلوپیڈیا، جلد اول صفحہ ۱۰۸ پر لکھا ہے کہ "ابن عقنین نے جن کتابوں کے پڑھنے کی سفارش کی ہے۔ ان کی فہرست میں الفارابی کی "کتاب الموسیقی" کا بھی نام ہے۔ علاوہ ازیں الفارابی کی دوسری کتاب "احصاء العلوم" کا ترجمہ بھی عبرانی زبان میں موجود ہے۔ پاپائے اعظم کے کتب خانے میں ایک عربی کتاب موسیقی کا عبرانی ترجمہ موجود ہے۔ جو ابراہام ابن حجیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس شخص نے جو ۱۱۳۶ء میں فوت ہوا، عربی کتابوں کا لاطینی ترجمہ کرنے میں بہت مدد دی تھی۔ یہ ابراہام ابن عذیر کا بڑا دوست تھا اور اس کے ساتھ ملکر کام کیا کرتا تھا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور امر قابل توجہ ہے اور وہ کہ عربوں کے بہت پڑانے یوروپین شاگردوں میں ایک شخص مسمی ہرمان کانٹرکٹ (متوفی ۱۰۵۴ء) تھا جس نے فن موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس رسالہ میں اس شخص نے سروں کی تعین میں ایک

عجیب و غریب طریقہ علامات یا حروف کا استعمال کیا ہے اس سے قبل یورپ میں ایسا کوئی طریقہ موجود نہ تھا۔ مثلاً ہران کا کنگ ہلیکٹ نے حسب ذیل طریقہ سے مختلف سروں کو ظاہر کیا ہے:-

علامت	نام سُر
e	AEquat (برابر کا سُر = Unison)
t	Tonus (لَے = Tone)
S	Semitonium (اُدھر = Half - tone)
ts	Tonus Cum Semitonio (اتری گندھار = Minor Third)

ہران کا کنگ ہلیکٹ نے یہ طریقہ عربوں سے لیا ہے۔ اور جو الکندی (المتوفی ۸۷۴ء) کے زمانہ میں وہاں موجود تھا۔

تال، سم Mensural Music

تال، سم کا فن عربوں کو بہت قدیم زمانہ سے معلوم تھا چنانچہ الخلیل (المتوفی ۷۹۱ء) کی تصنیف الموسوم "کتاب الایقاع" (Rhythmics) میں یہ فن موجود ہے۔ یہ فن الکندی (المتوفی ۸۷۴ء) کو بھی معلوم تھا جیسا کہ مخطوطات الکندی سے ثابت ہوتا ہے جو برٹش میوزیم اور برلن میوزیم میں محفوظ ہیں۔ الفارابی بھی اس فن سے بخوبی واقف تھا اور اس پر اس نے اپنی تصنیف "کتاب الموسیقی" میں پوری بحث کی ہے۔ جو لیڈن، میڈرڈ اور میلان کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ الفارابی نے ۹۵۰ء میں وفات پائی تھی۔ اخوان الصفا کے رسایل میں بھی اس فن پر خوب بحث کی گئی ہے جو ۱۸۸۸ء میں بمقام بمبئی اور ۱۳۰۶ھ میں بمقام قاہرہ طبع ہو چکے ہیں۔ بوعلی سینا (المتوفی ۱۰۳۷ء) نے بھی اپنی کتاب "الشفا" اور "نجات" میں اس فن پر بحث کی ہے۔ پہلی کتاب انڈیا آفس اور بوڈلین لائبریری اور دوسری کتاب صرف بوڈلین لائبریری میں پائی جاتی ہے۔ اندلس کی یونیورسٹیوں نے فارابی اور ابن سینا دونوں کی کتابیں گیارھویں صدی میں اپنے یہاں جاری رکھی تھیں۔ (المقری جلد سوم)

اپنے زمانہ میں جامعہ قرطبہ کا مدرسۂ موسیقی تمام دنیا میں مشہور تھا۔ دور دراز سے طلبہ آ کر اندلس کی یونیورسٹیوں میں داخل ہوتے تھے۔ اور وہاں وہ الخوارزمی، ابن الہیثم، البطانی، الفارابی اور بوعلی سینا وغیرہ کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کا ترجمہ یورپ کی زبانوں میں کیا کرتے تھے یہ مسلم مصنفین اور ماہرین فن مغربی یورپ میں جن ناموں سے مشہور تھے وہ حسب ذیل ہیں:-

عربی نام	یورپین نام
الخوارزمی	Algaurizim, Alchoarismus
الہیثم	Alhazen
البطانی	Albategnius
الفارابی	Alpharabius

ابن سینا Avicenna

ابن باجہ Avenpace

الفارابی کی کتاب "احصاء العلوم" کا پہلا لاطینی ترجمہ سنہ ۱۱۳۰ء اور سنہ ۱۱۵۰ء کے درمیان ہوا اور اس کی دوسری کتاب "کتاب الموسیقی" کا اصل نسخہ (جو ابن باجہ سے نقل کیا گیا ہے) کتب خانہ میڈرڈ میں محفوظ ہے۔ مگر لاطینی زبان میں اس کا کوئی ترجمہ نہیں ہوا۔ ابن سینا کی کتاب موسیقی کا بھی اس وقت کوئی لاطینی ترجمہ موجود نہیں مگر یہ ظاہر ہے کہ اس کا ترجمہ لاطینی میں ضرور ہوا تھا۔ کیونکہ یوروپین مصنفین اس کی عبارتیں اکثر نقل کرتے چلے آتے ہیں۔ ابن سینا کی کتاب "نجات" کا لاطینی ترجمہ موجود ہے مگر اس ترجمہ میں یہ عجیب بات ہے کہ اس کی جو فصل موسیقی کے متعلق تھی وہی ندارد ہے۔

قدیم یوروپین ماہرین موسیقی کی کتابوں میں "تال سم" کا کہیں پتہ نہیں کیونکہ یہ فن وہ جانتے ہی نہ تھے سب سے پہلا یوروپین ماہر موسیقی فرانکو سا کن کولون (سنہ ۱۱۹۰ء) جس کی کتاب ہم تک پہونچی ہے، ایسا شخص ہے جس نے "تال سم" کے متعلق کچھ لکھا ہے مگر کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فن مغربی یوروپ کی ایجاد نہ تھا بلکہ کسی اور جگہ سے لیا گیا تھا جہاں وہ پوری طرح ترقی پا چکا تھا اور یہ فن "ایقاعات" کے نام سے عربوں میں بہت پیشتر سے موجود تھا۔ الغرض یوروپ میں تال سم کا فن عربوں کے ذریعے سے پہونچا یوروپین اصطلاح میں "تال" کو "Hoquetus" یا "Hoketus" "Ochetus" اور ماہرین علم الالسنہ خوب جانتے ہیں کہ یہ لفظ لفظ "ایقاعات" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

برٹش میوزیم میں ایک نہایت اہم مخطوطہ موجود ہے جس کا نام "لامعلوم الاسم نمبر ۴" (Anonymous IV) ہے اور اس کی تاریخ سنہ ۱۲۰۳ء بتائی جاتی ہے۔ بلحاظ مضمون اس مخطوطہ کا نام (De mensuris et discantu) ہے۔ اس کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یوروپ کا علم موسیقی عربی علم موسیقی کا زیر بار احسان ہے مخطوطہ مذکور میں جو بزبان لاطینی ہے سُروں کے متعلق دو اصطلاحات "Elmuahym" اور "Elmuarifa" استعمال کی گئی ہیں جو کھلی ہوئی عربی اصطلاحیں ہیں گیارھویں صدی کی ایک لاطینی و عربی لغت میں جس کا نام "Glossarium Latino Arabicum" ہے۔ دو اصطلاحیں بیان کی گئی ہیں۔ جن کا تعلق علم موسیقی سے ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں "Elmuarifa" اور "Elmuahym" ہیں جو عربی اصطلاحات معلومہ و معروفہ کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔

فرانسیسی ونسنٹ دی بووے (سنہ ۱۱۹۰ء لغایت سنہ ۱۲۶۴ء) کی کتاب "Speculum Doctrinale" جلد اول فصل ۱۷ میں جگہ جگہ الفارابی سے استناد کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یوروپ کے نظریۂ موسیقی پر عربوں کا کس قدر زبردست اثر پڑا تھا۔ راجر بیکن ایک مشہور انگریز ماہر موسیقی (سنہ ۱۲۱۴ء لغایت سنہ ۱۲۹۲ء) گزرا ہے یہ بھی اپنے فن میں عربوں کا زیر بار احسان تھا۔ اپنی کتاب موسیقی "Opus Tertium" میں اس نے

بطلیموس اور اقلیدس کے ساتھ الفارابی کی عبارتیں نقل کی ہیں اور اس کی کتاب "احصاء العلوم" سے بار بار حوالہ دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے اپنی کتاب میں ابن سینا کی یہ رائے بھی نقل کی ہے کہ راگ راگنیوں کے ذریعہ سے امراض کا علاج کیا جا سکتا ہے اور دانٹر آڈنگٹن (سنہ ۱۲۰۰ء) تو عرب اساتذۂ فن کا اس قدر معتقد تھا کہ اس نے ابن سینا کو فن موسیقی میں سینٹ گریگوری، سینٹ برنارڈ حتیٰ کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے برابر بٹھا دیا ہے۔ اسی طرح جیروم نے جو الفارابی کا نہایت ارادتمند ہے اپنی کتاب "De musica" میں الفارابی کے بہت سے اقوال درج کئے ہیں۔

سائمن ٹنسٹڈ (سنہ ۱۳۰۰ء لغایۃ ۱۳۶۹ء) جولس ڈی میوریز (سنہ ۱۳۲۵ء) اور ہان بوائز (سنہ ۱۴۰۰ء) تک فن ایقاعات انگلستان کے ماہرین فن موسیقی کو بخوبی معلوم ہو چکا تھا ڈی ہینڈلو نے لکھا ہے کہ دو اصوات وادقاف کے اجتماع سے "ایقاعات" (Hockets) پیدا ہوتے ہیں۔ اور آگے چل کر لکھا ہے کہ "جب راگنی یا لحن (melody) میں تان توڑ دی جاتی ہے تو اُسے ہم یا "Hocket" کہتے ہیں اور جولس ڈی میوریز نے عنوان "Hockets" کے ذیل میں عرب ماہرین موسیقی کے ایک دوسرے فن کا حال لکھا ہے جو اس کے زمانہ تک موجود تھا اور جسے "Alenhade" کہتے تھے۔ یہ اصطلاح بھی عربی اصطلاح "طرد" سے نکلی ہے جس کے معنی ہیں "آواز کو کھینچنا"

خاتمہ پندرھویں صدی کے بعد مغربی یورپ کی موسیقی سے عربی اثر زائل ہو گیا۔ کیونکہ مسلمانان اُندلس کے سیاسی زوال کے ساتھ ہی ان کا علمی و دماغی انحطاط بھی شروع ہو گیا تھا۔ مگر باینہمہ سولھویں صدی تک یورپ میں عربوں کی زبردست شہرت قایم رہی حتیٰ کہ جارج والا نے سنہ ۱۵۰۱ء میں اور جارج ریش نے سنہ ۱۵۰۸ء میں بھی جب علم موسیقی پر اپنی مشہور کتابیں لکھیں تو انھوں نے جگہ جگہ الفارابی کے حوالے دئے ہیں۔ الفارابی اور ابن سینا کے بعد تیرھویں صدی میں صفی الدین عبدالمومن نے بھی فن موسیقی میں بیحد شہرت حاصل کی۔ اس زمانہ میں ایک جدید حلقۂ درس (schools) قایم ہو گیا تھا۔ جنھیں "اُصولی" (systematists) کہتے تھے۔ اس حلقۂ درس کا امام یہی شخص صفی الدین عبدالمومن تھا۔ سر ہیوبرٹ پیری نے ان اصولیین کی سرگم (scale) کے متعلق اپنی کتاب فن موسیقی (Hist of music) میں لکھا ہے کہ "یہ سرگم سب سے زیادہ مکمل تھی" ہیلمہولٹز کا بھی یہی خیال ہے کہ اصولیین کا یورپ پر بہت اثر پڑا۔ اور یہ لوگ جو اپنے سرگم میں "چڑھتی کھاد" (major 7th) کا استعمال کیا کرتے تھے، یہ گویا شاہراہ ترقی میں ایک خاص نشان تھا جہاں سے علم موسیقی نے آگے ترقی کی۔

عہدِ وسطیٰ کے فنونِ لطیفہ اور اسلام

فرانسیسی زبان (Elie Faure) کی ایک کتاب آرٹ کی تاریخ پر چار جلدوں میں شایع ہوئی ہے، جس کا ترجمہ انگریزی میں (Walter Pach) نے کیا ہے۔

پہلی جلد قدیم آرٹ پر ہے، دوسری عہدِ وسطیٰ سے متعلق ہے، تیسری میں عہدِ نہضت سے بحث کی گئی ہے اور چوتھی میں موجودہ دور کا ذکر ہے۔

یہ تصنیف انشار کی بلندی، جوشِ تحریر اور نزاکتِ خیال کے لحاظ سے بجائے خود ایک بے مثل نمونہ آرٹ کا ہے اور اس کے دیکھنے کے بعد ماننا پڑتا ہے کہ ایسی چیز صرف ایک فرانسیسی دماغ ہی پیش کر سکتا ہے۔

میں نے اس کتاب کے بعض ابواب کو بیسیوں مرتبہ دیکھا اور ہمیشہ اس نیت سے کہ اس کا ترجمہ اُردو میں کیا جائے، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سارا وقت اس کی لذتِ انشا میں صرف نہ ہو گیا ہو اور اسے اپنی زبان میں ظاہر کر سکنے کی ہمت پیدا ہوئی ہو۔ اس کے خوبصورت و شاندار الفاظ، اس کی نازک ترکیبیں جو فرانسیسی و ترکی انشار کی خصوصیات میں داخل ہیں یقیناً کسی اور زبان میں منتقل نہیں ہو سکتیں اور اس لئے اگر میں آج کی صحبت میں اس کے ایک باب کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں تو اس خیال سے نہیں کہ میں اس کا ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوا ہوں بلکہ صرف اس لئے کہ جو لوگ مجھ سے زیادہ اہل ہیں وہ اس کا مطالعہ کریں اور اگر اُردو میں بھی ان کی انشار کی خصوصیات کو قایم رکھنا ممکن ہے تو ضرور اس کی کوشش کریں کیونکہ اگر یہ کتاب تمام و کمال اُردو میں آجائے تو میں اس کو معجزۂ ادب سمجھوں گا۔

نیاز

دو مذہب باہم متقابل ہو جاتے ہیں اور ڈرامہ شروع ہو جاتا ہے، لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں ہو سکتی کہ اسلام جن خیالات کو مغربی تہذیب و تمدن کے سامنے پیش کر رہا تھا وہ بہ لحاظ نتائج اُن خیالات سے کہیں زیادہ تھے جنھیں مسیحیت اس وقت تک مشرقی تہذیب کے سامنے پیش کر چکی تھی

اسلام، جس نے ایک بے لاگ مذہب کا بدویانہ جوش پیدا کر کے غریب لیکن آزاد عربوں کو کرۂ زمین کی تسخیر پر آمادہ کر دیا تھا۔

وہ اسلام، جس کے پیرو خیموں کے سوا کوئی گھر نہ رکھتے تھے اور جن کا منتہائے نظر خواب کی سی لانہایت دنیا کو اپنے بادپا گھوڑوں کی ٹاپ اور گرد و غبار کا طوفان لے آنے والی ہوا کے ساتھ مسخر کرنا تھا۔ ہاں وہی اسلام عہدِ وسطیٰ میں اس آرزوئے ناتمام کو لیکر نمودار ہوا جسے سمجھنے کی جتنی کوشش کی جاتی ہے اسی قدر وہ ہمیں عنانِ مستقبل میں غرق کرتی چلی جاتی ہے۔

جب فرمانروائے روم، جسٹی نین نے پایۂ تخت یونان کی درسگاہوں کو بند کرکے ماہرینِ فنون اور علما کو سلطنت سے نکال دیا (یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جبکہ گریگوری اعظم نے پلاطینی کتب خانہ جلاکر خاک کر دیا تھا) تو وہ ایران کی دولت ساسانی ہی کی آغوش تھی جس نے ان تمام خانماں برباد یونانیوں کو پناہ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یاوری قسمت کی بھی بعض عجیب و غریب شاندار مثالیں ملتی ہیں۔ جب سرزمین رستم و اسفندیار پر اہل عرب کا استیلا ہوا اور وہ گنج بادآورد کے مالک ہوگئے تو یہی عرب تھے جنھوں نے قدیم تہذیب کے اندر جدید یوروپ کی بنیاد ڈالی یعنی جس وقت فضلائے مغرب پر ظلمت کی گھٹائیں چھا رہی تھیں اُس وقت خلفائے اسلام یونیورسٹیاں کھول رہے تھے۔ نہریں جاری کر رہے تھے، "جناتِ عدن" کی داغ بیلیں ڈال رہے تھے، مساحت و ریاضی، جغرافیہ و طب کا احیاء کر رہے تھے اور مفتوحہ ممالک کو کاروانسراؤں، مساجد اور محلات کی تعمیر سے آراستہ بنا رہے تھے۔ گویا ایک تاریک پس منظر میں الف لیلہ کی کہانی داستان طیار کی جا رہی تھی۔

عرب ذہنیت کا محیر العقول کمال یہ تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی گئی اپنی خصوصیت ہاتھ سے نہیں دی اور باوجود اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیدا نہ کرنے کے تمام اقوام پر غالب رہا۔ عرب کی یہ ہنگامہ آرا بدویانہ لیکن متحد ذہنیت جو اخلاقی حدود سے بے نیاز اور مادی قیود سے مبرا تھی محض اسی خصوصیت کی وجہ سے اپنے اور مفتوح اقوام کے خصائص میں ربط پیدا کرکے مغلوب قوموں کو انھیں متحدہ خصائص میں جذب کر لیتی تھی۔ مصر میں قبطی، مغربِ اقصیٰ اور ہسپانیہ میں بربر، ایران میں عجمی اور ہند میں ہندوستانی بنکر اسلام نے نو مسلم قوموں کو اپنی اپنی طبیعت کے موافق اس جوش و خروش کے اظہار سے کبھی باز نہ رکھا جو وہ ان قوموں میں پیدا کر دیتا تھا، الغرض اسلام جہاں کہیں بھی پہونچا وہ لوگوں کے دلوں کا مالک بن کر رہا۔

جب رسول اللہ کی وفات کے بعد ابوبکر نے اعلانِ جہاد کیا تو مصر و شام کے فاتحین نے بازنطینی اور قبطی کنائس میں جو بھی ان کے سامنے آئے ان پر اپنے مذہب کے اثرات قایم کرنے میں کبھی تامل نہ کیا۔ انھیں اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ پہلے کون مقام کتنا مقدس اور کس قدر متبرک تھا۔ وہ جہاں پہونچے مخلی بالطبع ہوکر پہونچے اور کنائس کے در و دیوار پر جو تصاویر نظر آئیں ان پر انھوں نے رنگ پھیر کر، قبلہ رُخ دیوار میں ایک محراب کھود دی اور اسی جگہ عبادت میں مشغول ہوگئے۔ مصری، یونانی یا رومی محرابوں میں جہاں کہیں ان کو پُرانے ستون یا فیلپائے ملے انھوں نے جمع کرکے سر اور پایہ کا خیال کئے بغیر قطار اندر قطار نصب کر دیا اور اندرونی صحن کے چاروں گرد وضو کے لئے متوازی قطاروں پر مخروطی شکل کی محرابیں قایم کر دیں۔

اس حال پر تین صدیاں گزر جاتی ہیں اور دورِ فتوحات ختم ہو جاتا ہے، یعنی اسلام حدودِ ایران سے کوہستان پیری نیز تک پھیل جاتا ہے اور خانہ بدوش عرب اپنی ولایات مفتوحہ میں جو طاقتیں ان میں سست پڑ گئی تھیں انھیں از سر نو بیدار کرتا ہے اور اس بات پر آمادہ ہو

ہے کہ اپنی روحِ عمل سے مفتوحہ اقوام و ملل کے قوائے عمل میں بیداری پیدا کر دے۔ تمام نخلستان جو افریقہ کے، ریگستانوں اور ہسپانیہ میں پھیلے ہوئے تھے، سفید سفید شہروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو کنگورے دار فصیلوں سے محصور ہیں، جا بجا خوش وضع محلات و قصور مع سایہ دار درختوں کے پیدا ہوتے جاتے ہیں، جن کی راحت بخش ٹھنڈ میں آرام و آسایش حاصل کرنے کے لئے دیگزاروں کا سفر کر کے امراء آتے ہیں۔ اور جو فوج یا قافلہ ریگ زاروں کے بے پایاں سمندر کو عبور کر کے آتا ہے تو اُسے سرابی منظر کے بجائے ایک گلابی یا نیلگوں دھندلکا نظر آتا ہے جس کے ہلکے پردہ میں مکانوں کی کرسیاں، محلوں کے پشتے، گول ستون اور مینار جھلملاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

مسلم روح عین اُسوقت بھی جبکہ وہ بزعم خود اپنی مالک آپ تھی، کبھی اس قابل نہیں ہوئی کہ سراب یا ٹھنڈے سایہ سے زیادہ کسی چیز پر قابض ہو سکے۔ یہ سایہ بھی وہ سایہ تھا جو ایک ساعت کے لئے شعاعوں کے دو چادروں کے درمیان جس پر سے فاتحین اسلام گزرتے پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

جب مسلمانوں کے سیلاب عظیم کی رو ختم ہو گئی۔ جب وہ آرزوئیں جو ہمیشہ ان کے آگے آگے موجِ دریا کی طرح چلتی تھیں کسی سخت خطہ یا سلسلۂ کوہستان یا بازنطیم کی دیواروں یا فرنگی فوجوں کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکیں تو انھیں کسی اور راستہ کی تلاش ہوئی اور چونکہ افق بھی مسدود ہو گیا تھا، اس لئے انھوں نے آسمان کی طرف سر اُٹھایا اور اس طرح وہ بھی بازنطینی گنبدوں کی صورت میں نمودار ہوئیں اور کبھی سری محلات کی چھتوں کی شکل میں۔ محلات شاہی کے جلو خانوں کی بھاری بھاری نیم دائرہ محرابیں ٹوٹ چکی تھیں اور ان کی جگہ اوپر کی طرف رخ کرنے والی شکستہ محرابوں نے لے لی تھی۔ اسی طرح گنبد کے دائرہ نے بھی مخروطی صورت اختیار کر لی تھی اس کی وضع قدیم آشوری طرز کی ہو گئی تھی جو قبل اسلام آل ساسان کے ایران میں رائج تھی۔ یہ سبک بیضوی وضع کے گنبد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بنانے والوں کی آرزوئیں ہیں جو فضا میں بلند ہو کر غائب ہو جانا چاہتی ہیں، گنبد کے نچلے حصہ کو تنگ کر دیا گیا یہاں تک کہ یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ وہ کہاں سے شروع ہوا ہے اور اس طرح گویا غیر محدود کائنات کے معلق ہونے کا راز سمجھ میں آجائے، چودھویں صدی کی ابتدا میں ستون غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ گرجاؤں کی غنیم سادگی کو دیکھ کر ان کے دل میں ریگستان کا تصور پیدا ہوتا تھا اور قدرتاً انھیں اس طرف مائل ہو جانا چاہئے تھا، چنانچہ اس کے بعد ہی گنبد کے ساتھ ساتھ گرجا کی شکل کے بلند مینار بھی قائم ہو گئے جن سے موذنوں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ ترکوں نے جن کا ذوق ایرانی طرزوں کے سوزش سے زیادہ وابستہ تھا، پھیلے ہوئے گنبدوں کی بازنطینی گولائی قائم رکھی جو خود تو سیاہی مائل سرو کے جھنڈ میں چھپے ہوئے ہوتے تھے لیکن ان کے بلند مینار فضا میں ابھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ اسی طرح ترک گویا غیر شعوری طور پر بازنطیم کے جاہ و جلال اور شان و شوکت کا وارث بن گیا اور اس نے ان رنگین پتھروں کے سلسلہ کو دیکھا جو نورِ صبح کے ساتھ جگمگا اُٹھتے اور ظلمت شب کے ساتھ ماند پڑ جاتے ہیں نہ ان کی نظر ان طلائی گنبدوں پر پڑی جن کی سطح پر رات ہونے تک آتش شفق کے شعلے کھیلتے رہتے ہیں۔ لیکن ترکوں کو چھوڑ کر تمام مسلم ماہرین فن تعمیر مصر سے لیکر ہسپانیہ تک سر بلند غرفوں اور لمبوترے گنبدوں کی طرف فطرتاً مائل رہے اور جو اظہار ہنرمندی کے لئے گنبدوں کی تقسیم وسطی حصص مساجد کی ترتیب اور ستونوں کی وضع قطع بھی بدل دیتے تھے چنانچہ انھیں کبھی گول بناتے تھے کبھی چوکور۔ کبھی ہشت پہلو کبھی صاف اور کبھی ابر و دار بناتے تھے ——— مصری مساجد البتہ روحِ صحرا کی طرح ہمیشہ سادہ اور صاف

دیں۔ لیکن مغرب اقصیٰ اور (ہسپانیہ) کی مساجد میں سیاہ و سفید پتھروں کے بنے ہوئے محرابدار چھتے رائج ہوئے اور گول ستونوں کی بلندی بھی دگنی ہو گئی گویا وہ کھجور کے درخت تھے جن کی چوٹیوں سے ان کے لمبے لمبے پتے نکلتے ہیں۔ قرطبہ کی عالیشان مسجد جو اس زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی، جب مسلمان اپنے دین پر سختی کے ساتھ قایم تھے، قریب قریب ایسی معلوم ہوتی ہے جیسا کوئی گنجان جنگل۔ اس کے سایہ میں بیٹھ کر جو خاموش روشندانوں کی مسلسل قطاروں کے باعث اور بھی زیادہ تاریک ہو گئے ہیں انسان کو خیال گزرتا ہے کہ وہ کسی ایسی ہیبت ناک دنیا میں پہونچ گیا ہے جس کا ادراک محال ہے۔

(۲)

مغرب اقصیٰ کے ماہرین فن تعمیر اپنے محرابدار چھتوں کی وضع قطع میں کافی تفریق پیدا کر دیتے تھے۔ ایک ایوان سے دوسرے ایوان کا منظر، ایک حجرہ سے دوسرے حجرہ کی صورت و شکل، مسجدوں کی تعمیر، قصور شاہی کا نقشہ باہدگر مختلف ہوا کرتا تھا۔ اندلس کے محلات الحمراء ایسی تعمیریں ہیں جہاں انسان کو سرخ، سنہرے، سیاہ، زمردیں یا فیروزی ایوان بھی نظر آتے ہیں اور ستونوں پر قایم ہونے والے عظیم الشان دالان بھی اور جہاں آراستہ باغات بھی ہیں اور شفاف مرمریں حوض بھی۔ ذیروح چیزوں کی تعداد سے اقتصار نے عرب کے ماہرین تعمیرات کا ذہن قطعی خالی تھا لیکن وہ یکسانیت رفع کرنے کے لئے اس امر کی سخت کوشش کرتے تھے کہ خطوط کے اختلاف سے خوبصورتی و دلکشی پیدا کی جائے، چنانچہ قوسی محرابوں کے گوشے اندر کی طرف جھکنے لگے اور جھکتے جھکتے محراب کی صورت ایسی ہو گئی جیسے گھوڑے کے نعل پھر محراب کو تنگ کیا گیا اور سامنے کا حصہ کم کر کے اس کے خطوط منحنی کر دئے گئے۔ کناروں پر محراب در محراب بنائی گئی۔ شہد کی مکھی کے چھتہ کی طرح چھوٹے چھوٹے خانے بنائے گئے اور حاشیوں پر استرکاری کر کے بیل بوٹوں سے مزین کر دیا گیا۔ جب یہ کام ختم ہو گیا تو پچی کاری کا رواج ہوا اور پتھروں کو کھود کھود کر پتیاں نصب کی گئیں۔

جب خطوط کے ذریعہ سے نقش و نگار بنانے کا کام کمال کو پہونچ گیا تو اس کی دسترس سے مسجد بھی نہ بچیں اور یہاں بھی فرش سے لیکر گنبد کی چوٹی تک نقش و نگار نظر آنے لگے۔ اور عربوں کو کافی فرصت مل گئی کہ وہ اپنے بیل بوٹوں میں نئی نئی باتیں پیدا کرتے، پیچ در پیچ و خم کھاتی بیلوں، مختلف ہندسی شکلوں، خوبصورت کتبوں اور ظروف میں انھوں نے اپنے ذوق آرائش کو صرف کر دیا اور خطوط کے انداز اس کی عمودیت اور پیچ و خم کو اس قدر ترقی دی گئی کہ وہ مربعوں، دائروں، مثلثوں، لکیروں، بیضوی شکلوں سے جیومیٹری کی مختلف اور صحیح شکلوں تک پہونچ گئے اور وہ چیزیں جو دیوار سے علٰحدہ ہو سکتی ہیں مثلاً منبر وغیرہ ان پر بھی جالیوں اور پیچ و خم خطوط کے ذریعہ سے نقش و نگار بنائے گئے گویا معلوم ہوتا تھا کہ دیواروں اور محرابوں پر کسی نے غرفوں سے آنے والی روشنی کو تقسیم کرنے اور بعض اوقات گنبدوں اور گاؤدم میناروں کو ڈھانکنے کے لئے مشجر اور چکن کے تھان پھیلا دئے ہیں۔۔ جیومیٹری کی شکلوں کے ذریعہ سے آرائش و زیبائش کا فن خود بخود کبھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا بلکہ وہ نتیجہ تھا مظاہر قدرت کے مطالعہ کا اور یقیناً اس نے اول اول کوئی نہایت سادہ شکل اختیار کی ہوگی چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ گلکاری کا کام پھول پتیوں کا گلدستہ بنانے سے پیدا ہوا۔ جیسا کہ قاہرہ کی جامع ابن طولون کی محرابوں کے اطراف میں بنے ہوئے پھول بوٹوں سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ وہ وقت تھا جبکہ فتوحات کے بعد عربوں کا تخیل کسی قدر

راحت پسند ہو گیا تھا اور اسے نازک ہونے کی فرصت ملگئی تھی جب چودھویں صدی نے اپنا ضابطۂ آرائش وزیبائش وضع کیا تو اسوقت تمدّنِ عرب بہت بلند ہو چکی تھی۔ جب لوازم فنِ آرائش و زیبائش میں کثیر الاضلاع وکثیر الزوایا اشکال کا استعمال رائج ہوا تو عرب جیومیٹری دانوں نے اس امر کی کوشش کی کہ اس سے ایسے عام اصول اخذ کئے جائیں کہ وہ ان اشکال سے عام زیبائش وتزئین کا کام لے سکیں۔ چنانچہ اسوقت سے عربی فنِ نقاشی ایک صحیح ومستقل فن بن گیا اور اس نے اتنی ترقی کی کہ تصوراتِ ربانی کو بھی انھیں اشکال میں متشکل کر کے دکھا دیا۔

عربی روحانیت ریگستان میں پیدا ہوئی جہاں صرف فضائے لبعید کی حکومت ہے اور جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انتہا اس لئے انھوں نے بیل بوٹوں میں بڑی ترقی کی کیونکہ ان بیلوں کی بھی نہ کہیں ابتدا ہے نہ انتہا۔ اور ان کو دیکھ کر نگاہ کا کسی ایک جگہ جا کر رک جانا محال ہے۔ یہ بیل بوٹے گویا ہیں گویا عالمِ ملکوت کی وہ آوازیں ہیں جن کو اول اول ہم کسی اور جگہ سے پیدا ہوتے ہوئے محسوس کرتے ہیں لیکن جب غور کرتے ہیں تو وہ اپنی ہی آواز معلوم ہوتی ہے۔ فن بھی خود زندگی کی طرح سے اصول ارتقار کا پابند ہے، اگر تکمیلِ فن کی خواہش کے بجائے سائنٹفک تحقیق کا ذوق رکھدیا جائے تو اس کے اندر جد وجہد فنا ہو جائے گی اور اس کا جوش وخروش سرد پڑ جائے گا اگر ریاضیات کو آرٹسٹ کے حلقۂ عمل میں داخل کیا جائے گا تو وہ ماہرینِ فن کے ہاتھوں میں صرف ایسا اوزار بن کر رہے گا جس کا مقصد فنِ تعمیر کی منطقی حیثیت نمایاں کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر کسی قوم کا فنِ تعمیر اسے سنگ تراشی یا بت تراشی سے روکتا ہے تو اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ بے معنی خطوط کا غلام رہے گا اور اس کے اندر کبھی زندگی پیدا نہ ہوگی۔

(۳)

یہ سچ ہے کہ عربوں نے آرٹسٹ کو کبھی مجبور نہیں کیا کہ وہ ذی روح مخلوق کی تصویریں بنانے سے قطعی پرہیز کرے۔ اور بعض اوقات اس قسم کی تصویریں ہسپانیہ اور مراکش کے مساجد وقصور کی دیواروں پر نظر بھی آتی ہیں تاہم تمام موحد قوموں کی طرح جو ریگستانوں میں پیدا ہوئیں قومِ عرب بھی ذیحیات چیزوں کی اشکال وصور سے متنفر ہونے میں صرف اپنی جبلت کی متابعت کرتی تھی۔ مذہب جبلت کو صرف دورِ انحطاط وزوال میں دبا تا ہے۔ لیکن جب طاقتیں عروج پر ہوتی ہیں تو جبلت مذہب کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لے جاتی ہے مصر وشام کے فنونِ اسلامیہ میں وہی ریگستان کی عریانیت، وہی ریگستان کی اُداسی اور وہی ریگستان کی شان وشوکت پائی جاتی تھی، مغربِ اقصیٰ اور ہسپانیہ کے ٹھنڈے محرموں کی گہرائیوں میں خلفاء اکثر حکماء وفلاسفہ کی باتیں سنتے تھے اور جب ان کے فوجی رسالے فتوحاتِ ملکی اور تاخت وتاراج کے بعد واپس آتے تھے تو یہ اکثر لیموں کے درختوں کی خوشبو سے متمتع ہوا کرتے تھے۔ اسلامی فن ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تپے ہوئے نوحوں میں سونے کی اینٹیں رگڑ رگڑ کر اس سے کام لیا گیا ہے۔ ہندوستان میں اس فن نے مادی دنیا کی تمام موجودات کو حکم دیدیا کہ وہ سیلاب کی طرح چاروں طرف سے امڈ کر آئے اور اس میں شامل ہو جائے۔ اور ایران میں تو یہ فن گویا ایک خیابانِ گل وریاحین تھا۔ سرزمینِ ایران کو مشرقی سواحل بحیرۂ روم کے ریتیلے میدانوں یا اُندلس ومراکش کی وادیوں سے کوئی مشابہت نہیں جہاں سخت ظلمت ... آگ کے شعلوں میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہتی ہے۔ جانب غرب ان بالائی علاقوں میں جو وسطی ریگستان کے حدود پر واقع ہیں اور

سطحِ آب سے تین ہزار میٹر بلند ہونے کی وجہ سے گرد و غبار سے بہت دور (اسی قدر ستاروں سے قریب ہیں)، ہوا میں بلور کی سی صفائی پائی جاتی ہے۔ نسیمِ جانفزا کے جھونکوں میں یہاں کے سفید مرغزار اور گلابی سبزہ زار ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ایسے نظر آتے ہیں جیسے نم آلود ریشم کے تھان اور فصلِ بہار سے موسمِ خزاں تک یہاں کے کشادہ لالہ زاروں اور کھیتوں میں ہلکے سبز رنگ سے لیکر سنہرے زرد رنگ تک تمام قسم کے موہوم رنگوں کا ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ آسمانوں میں جہاں کبوتر اڑتے رہتے ہیں اور بادلوں میں وہ تمام ہلکے اور نازک رنگ موجود ہوتے ہیں جو اوایل فصلِ بہار میں نظر آتے ہیں۔

جب کوئی ان شہروں کے قریب پہونچتا ہے تو وہاں کے بیضوی یا بلار گرخی گنبد- اور ان کے بلند مینار جو سرو اور سال کے درختوں میں سے ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں- عجیب و غریب مناظر پیش کرتے ہیں گویا نیلے، فیروزی، پیازی، سبز اور زرد رنگوں کو شبنم میں گھول کر افق کی سطح پر تصویریں بنائی گئی ہیں- اس نظارہ کا لطف اس آرٹسٹ کو خوب معلوم ہے جس نے قافلوں کے ساتھ صحرا کے نخلستانوں کی سیر کی ہے۔ شکستہ دیواریں پھٹے ہوئے گنبد اور مینار جن پر سیاہ سفید خطوط کے نقش و نگار ہیں، محو ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن جو روغن ان پر چڑھایا گیا ہے وہی قدیم کلدانی روغن ہے جو ایرانِ قدیم نے چین کو بتایا اور جو تاتاری ترکتازوں کے ساتھ پھر ایران میں آگیا- یہ البتہ ابھی تک شیشہ کی طرح پوری آب و تاب کے ساتھ درخشاں ہے۔ سنہری گلکاریوں اور سفید کتبوں پر جو مختلف قسم کے پھول بوٹے بنے ہوئے ہیں ان میں ہفت شئی، نیلے، سفید، اودے اور زرد رنگوں کی جھلک عجیب لطف پیدا کرتی ہے۔ روغنی مسالہ کی تہ میں جڑے ہوئے دروازوں کی بلند چوٹیوں کے نیچے فیروزوں، نیلم پاروں اور لاجورد کے مدہم رنگوں کی چمک کے باعث ایک متحرک خطِ شعاعی دکھائی دیتا ہے اندر کی جانب گنبدوں کی دور دور خوشنمائی میں بیل بوٹوں کا جال بچھا کر اس میں ایسے شاخسانے نکالے گئے ہیں گویا آویزے لٹک رہے ہیں بعض گنبدوں کے اندر شیشہ کی ایسی لوحیں نصب کی گئی جن سے چاروں طرف کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔

قدیم زمانہ میں لوگ عجمی قالین دیواروں پر آویزاں کیا کرتے تھے جو ایسے معلوم ہوتے تھے گویا قلبہ رانی کرنے کے بعد سیاہی مائل زمین میں سبد ہائے گل منتشر کر دئے گئے ہیں، لیکن سولھویں صدی کے آخر میں جب شاہ عباس اعظم صفوی نے اصفہان کی تعمیر کا حکم دیا تو ان قالینوں کی جگہ چمکدار روغنی اینٹوں نے لے لی۔ اسوقت ایران میں جو طبقہ اہلِ فن کا پیدا ہوا اسے اُن لوگوں کی ہدایت اور مشوروں پر چلنا پڑا جنھوں نے مساجد کو تمام روغنی زینت و زیبائش بخشی تھی۔ تاکہ جہانگیر اور مانی اور خصوصاً بہزاد کے موقلم کی جنبشوں سے اسلامی فن کو غیر معمولی علوئے مرتبت و رفعت حاصل ہو جائے، حرفتِ کوزہ گراں نے بھی جو دنیا میں سب سے قدیم اور پائدار پیشہ ہے فنِ اسلامی کو اپنی طرف سے ضروری حصہ دیا۔ اس کی آراستگی جس میں ذی روح کی تصویریں زیادہ نہیں ہوتیں اپنی دلکش نوعیت کے لحاظ سے یقیناً بہت بلند ہے۔ ان ظروف پر گل و ریاحین لہلہاتے ہوتے ہیں، آسمان کی وسعتیں مع اپنے مرواریدی امواجِ سحاب کے نظر آتی ہیں اور سمندر کی پہنائیاں مع اپنی درخشاں سطح کے منقوش ہوتی ہیں۔ رنگین خطوط، رنگ کے چھینٹوں، پھولوں کے دستوں اور مختلف رنگوں کے اختلاطِ باہمی سے ایسے ایسے مناظر نقش کئے جاتے ہیں کہ تصور مسحور ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ نقاشانِ عجم کا یہ چمنستان جس طرح اچانک وجود میں آیا تھا اسی طرح وہ بہت جلد افسردہ ہو گیا کیونکہ اس نے ضرورت سے زیادہ خوشبو اور درخشانی صرف کر دی تھی۔

یہ گویا ایک طلسمی خواب تھا جس کی مختصر سی فرصت میں ہندوستان کے تمام جذبات نفسانی، عجم کے تمام سلیقے اور تکلفات، بیلون کا تمام بطلِ السیر سائنس اور عرب کے تمام شاندار پرستانی خواب شامل ہو گئے تھے۔

عرب کے ریگستانوں سے لیکر جزائر جاپان تک اور مغرب اقصیٰ سے لیکر ہندوستان تک عجمی مصوری کے خزانوں کو لٹے ہوئے ایرانی نقاشی ایک بحر عمیق کے مانند ہے جو تمام خواہشات نفسانی جذ کیفیات نشہ و سرور اور قدیم اقوام و ملل کی تمام آزاد و موثر خیال آرائیوں کا معجون مرکب ہے۔ وہ ایک باغ عدن تھا جہاں پھولوں بھرے مرغزاروں میں شیر پھرتے تھے۔ جہاں سبز سرخ اور نیلگوں ریشمی پوشاکوں میں مرد و عورت کے نقوش قالینوں پر نظر آتے تھے۔ عجمیوں کے لئے تو جس قدر بھی پھول ہوں اتنے ہی کم ہیں۔ تمام چمن ہرا بھرا پھول ہیں۔ تمام قالینوں میں۔ جہاں دیکھو وہاں پھول ہی پھول ہیں۔ بڑے بڑے پھول جن کے نقوش ان کاسہ ہائے چینی میں بھی موجود ہیں جن میں خواتین عجم طلائی چمچوں سے قند و گل کھایا کرتے تھے۔ میدانی مناظر کی تصاویر ہیں جہاں سرخ، سبز اور سنہرے رنگ ایسی قدرتی ہم آہنگی پیدا کر دیتے ہیں کہ فرش تصویر پر نرم فرش مخملیں کا گمان ہوتا ہے شوخ و طناز خوبصورت رہوار گردنیں خم کئے سرپٹ دوڑتے نظر آتے ہیں۔ ہر مرکب پر ایک صاحب فخر و ناز راکب سوار ہے۔ کلائی پر ایک باز ہے اور ایک درخشاں طرۂ دستار ہوا میں لہرا رہا ہے۔ محلات و قصور کے جلوہ خانے فرطِ گل و ریاحین سے مشجر بنے ہوئے ہیں۔ ان کی روغنی ابردار دیواروں پر جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ ان کی چھتیں بلوریں ہیں فرش رنگیں قالینوں کا ہے، جہاں طلائی طاؤس اپنی زمردیں دمیں پھیلائے ہوئے ہیں۔ باغات ہیں جن میں جگہ جگہ سنگ سماق اور سنگ یشب کے گملے نصب ہیں۔ آب شفاف کے فوارے ہیں جو فضا میں موتی اچھال رہے درجہ بدرجہ پشتے ہیں، نیا بانیں ہیں اور بروج ہیں جن کے رنگ گلابی، آسمانی یا دودھیا ہیں۔ شب کی تاریک گہرائیوں میں بھی یہ ایسے چمکتے ہیں، جیسے طلوع آفتاب کے وقت برف۔ جب شام ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طائفۂ ارباب نشاط کنار آب بیٹھا ہوا نغمہ و سرود میں مصروف ہے، پختہ پھلوں کی فرحت بخش خوشبوئیں دماغ میں پہونچتی ہیں جو درختوں میں پتوں کے اندر چھپے ہوئے چمکتے ہیں اور نکلتا ہوا چاند تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ستاروں کے ہار سے کوئی سچا موتی ٹوٹ گرا ہے۔ یہ تمام دلفریب مناظر موئے قلم سے کھینچے گئے ہیں اور ان میں چمکدار رنگ بھرے گئے ہیں۔ ان میں تاریک رات کی معصومیت اور دن کی روشنی موجود ہے یہاں الف لیلہ کے تمام وہ قصے موجود ہیں جو داستان گویان پاستانی کے خواب و خیال میں آئے تھے اور جنھیں وہ شام سے صبح تک خیمہ کے کے نیچے حلقہ جما کر بیٹھے ہوئے خوشمزاج مسافروں کو سنایا کرتے تھے۔

یہاں عجیب و غریب قومیں ہیں جو بحیثیت مجموعی ایک دوسرے کی ضد ہیں بعض وہ ہیں جو پشمینہ کی سفید عباؤں اور چغوں کے نیچے سرخ و سبز ریشم کی پوشاکیں پہنتے ہیں اور جو اپنے گھوڑوں کے ساز کو زر و جواہر سے مزین کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلحہ بناتے ہیں اور ان میں جواہرات جڑتے ہیں۔ وہ ابردار اور منقش ظروف مسی میں اپنا پانی رکھتے ہیں۔ ان کو صرف خاموشی و سکوت میں غور و خوض کرنا آتا ہے جو کبھی ہنسنے پر آتے ہیں تو قہقہوں سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں اور جو کبھی کھانے پینے کا دور آتا ہے تو نوشا نوش میں اپنی فطری متانت و سنجیدگی کو بھی بالائے طاق رکھدیتے ہیں۔ ان کو نہ موت کی پروا ہے نہ زندگی کی فکر۔ ان کے استغراق و تصور کی بہشت میں حوریں

آباد ہیں۔ ان کے شدید جوش مذہبی کا سوائے ان کی سخت کاہلی اور جمود کے اور کوئی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وقت ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ اور وہ اپنے معابد کو اسی لاپروائی سے منہدم ہو جانے دیتے ہیں جس قدر جوش و خروش سے انھوں نے ان کو تعمیر کیا تھا۔ موسم کی شدتوں، فطرتوں کے زبردست تضاد اور بدویانہ زندگی نے ان کو توازن روحی سے جس کو ہم اس قدر عزیز رکھتے ہیں بے پروا کر دیا ہے۔ دولتمند آدمی سو سو عورتیں رکھ سکتا ہے مفلس و نادار کے پاس چاہے ایک بھی نہ ہو۔ اس طرح گویا نفسیاتی تجرید اور بدترین بہیمیت کے مابین ایک زبردست فصل ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکتا۔ لیکن مغربی قومیں اس خلا کو اس طرح پُر کر لیتی ہیں کہ وہ ان تمام شاہراہوں کو طے کر جاتی ہیں، جن پر بہیمانہ زندگی سے آگے بڑھ کر شجاعانہ زندگی کی منزل تک پہونچنا لازم ہے۔ ان مغربی اقوام میں ہم کو وہ مشرقی قومیں بھی شمار کر لینا چاہئے جو بلحاظ نسل اسی جماعت سے تعلق رکھتی ہیں جس سے یوروپین قومیں متعلق ہیں۔

بیشک یہی وجہ ہے کہ ایرانیوں نے جن کے ذہن غالباً اس قدر وسیع نہیں تھے جتنے سامی النسل قوموں کے اپنے تاریخی کارناموں سے کبھی انحراف نہ کیا اور ہمیشہ ارض النہرین کے قدیم تمدنوں کا کچھ نہ کچھ اثر مستقبل میں پیدا کرتے رہے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ساسانی اور اسلامی ایران کے درمیان فنون عجم کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک روحانی مذہب بغیر بت پرستی ہی کے کام چلا سکتا ہے اور بجائے بتوں کو ترقی دینے کے معصوم روح کو ترقی دینا بہتر ہے مگر بت شکن شہنشاہوں کی حمایت میں جو یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر تصاویر کا تعلق مذہب سے نہیں تھا تو فنون لطیفہ سے تو تھا اور وہ انکو ترقی دیا کرتے تھے، بہت کمزور ہے۔ کیونکہ فن کو فن کے لحاظ سے اختیار کرنا چاہئے اور اس کو اس امر کا پابند کرنا کہ وہ ایک ہی سرچشمہ سے سیراب ہو ایسا ہے جیسے تمام سرچشموں کا پانی دفعتاً خشک کر دیا جائے۔

اگر بُت پرستی بائزنطیم کو نہیں بچا سکی تو اس کا باعث یہ تھا کہ بائزنطیم تجزیہ نان کا ایک سڑا ہوا پھل تھا۔ مگر وہ بت پرستی ہی تھی جسنے مصر و یونان اور ہندوستان کو بنا دیا، جس نے قوم قوطہ کے انقلاب سیاسی کی زنجیریں کھول دیں۔ اطالیہ اور فلینڈرس میں دور بیداری پیدا کر دیا اور جو یوروپ میں تمام گزشتہ صدی کے قابل تعریف اور اہم دور تحقیق و تدقیق کو وجود میں لائی۔ تمام پائدار تمدن، بت پرستی ہی کے بطن سے پیدا ہوئے اور یہ مطالبہ ہرگز درست نہیں ہو سکتا کہ انسان ہمیشہ ریگستان میں رہا کرے، جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود ریگستان کے لوگ نخلستانوں کی پناہ تلاش کرتے ہیں۔

یہ خیال درست نہیں کہ بت پرست قوموں نے خود کو اصنام پرستی سے آزاد کر لیا تھا بلکہ فی الحقیقت انھوں نے بت پرستی ہی کے ذریعہ سے نجات حاصل کی تھی، یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے اصنام پرستی کے ذریعہ سے دنیا میں منقولات کا سلسلہ جاری کیا۔ کیونکہ وہ تجزیہ و تحلیل کا ایک بے نظیر ذریعہ تھا۔ جو لوگ سوائے روح کے اور کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتے وہ بھی اپنے آپ کو نفسیاتی بتوں سے علٰحدہ نہیں کر سکے اور اس لئے یہ کہنا کہ انھوں نے بت پرستی نہیں کی غلط ہے ۔ بت سازی خیال انسانی کے لئے ایک سہارا ہے اور یہ سہارا اس خیال کو حدود حقیقت کے اندر قائم رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ تخیل انسانی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ بت پرستی تجربہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اس کے ذریعہ سے عمل کی طرف لے جاتی ہے۔ جب ہمارا قوازن متزلزل ہو جاتا ہے تو ہم بتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان سے دعائیں مانگتے ہیں کہ وہ ہم کو نظم و ضابطہ سکھائیں تاکہ ہم پھر از سر نو زندہ ہو جائیں، اور جب صحرا میں پیدا ہونے والے انبیاؤ رسل کا بتایا ہوا خیال گرد و غبار کے سوا کچھ باقی نہ رہنے دیگا تو اس وقت بت پرستی ہی دنیا کو بچا سکے گی

باشندگانِ قاف کی خودداری وشجاعت

(مسلمانوں کی اوّلین جمہوریت کا قیام)

سنہ ۱۹۱۸ء کی جنگ ختم ہونے کے بعد جس قدر پیچیدگیاں مملکتِ روس میں پیدا ہوئیں اور جو سیاسی اختلافات سلطنت زار میں پیدا ہوئے، ان کی مثال کسی دوسرے ملک میں مشکل سے نظر آسکتی ہے۔

ہم نہیں کہتے کہ بالشویت دنیا میں صرف امن وسکون ہی کا پیغام لائی اور نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس کا کوئی تاریک پہلو نہیں ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ زاریت کی مستبد وجابر حکومت نے جو صدیوں سے وہاں کی قوموں کو پامال رکھا تھا، اس کا جواب صرف بالشویت ہی ہوسکتی تھی اور اسی کی برکت تھی کہ وہاں کا ایک ایک فرد جذبات آزادی سے سرشار نظر آنے لگا۔

بہت سے لوگ وہاں اُصول بالشویت کے مخالفت پر بھی آمادہ ہوگئے اور بالشویک حکومت نے بھی ان کی سرکوبی میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا، اسی کے ساتھ وہاں مختلف خیالات کی مختلف جماعتوں نے عام برہمی بھی پیدا کردی، لیکن حریت وآزادی کے خیال سے کوئی غافل نہ تھا اور چھوٹی سی چھوٹی ریاست بھی اپنی جگہ خود مختار ہوجانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

اسی سلسلہ میں صوبۂ قاف نے بھی بالشویت کے مظالم وقتلِ عام کا نہایت دلیری سے مقابلہ کیا اور یہ فخر غالباً مسلمانوں کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے انھوں ہی نے وہاں اپنی جمہوریت قایم کی اور شدید ترین مخالف اسباب کی موجودگی میں انھوں نے اپنی خودداری کا ثبوت دیکر آخرکار آزادی حاصل کرلی۔

جب زار معزول ہوا اور بالشویک حکومت قایم ہوئی تو اہلِ قاف نے محسوس کیا کہ ان کی غلامی ہنوز باقی ہے اور انقلاب روس سے درد کی دوا نہیں ہوسکتا۔ اس احساس میں جارجیا اور آذر بائیجان نے بھی ان کا ساتھ دیا اور ایک "اتحادی جمہوریت ماوراء قاف" قایم کرکے طفلس میں جلسہ کیا، اس میں تین ممبر ہر ہر قوم کے شامل ہوئے اور چونکہ اس حصۂ ملک میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے اس لئے ان کے نمایندے کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ لیکن قبل اس کے کہ آپ قیام جمہوریت کی داستان سنیں، مختصراً یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس وقت اہلِ قاف اور بالشیوکوں کے باہمی تعلقات کیسے تھے، اس وقت باکو کا صوبہ (جس کا صدر مقام طفلس تھا) نہایت کشمکش میں مبتلا تھا اور یہاں کی مسلمان آبادی عیسائیوں کی غداری سے جو در پردہ زیتن کی حکومت سے ملکر مسلمانوں کو بالکل خارج البلد کردینا چاہتی تھی، بہت پریشان تھی۔ دوسری طرف بالشیوک حکومت بھی سخت درپے آزار تھی اور اُسنے مسلمانوں کی تمام دولت پر قابض ہوکر انھیں عملاً

بیدست و پا کر دیا تھا۔

جب حالت ناقابل برداشت ہوگئی اور جارجیا و آرمینیا میں بھی احساس حریت پیدا ہوا تو ایک قومی فوج مرتب کی گئی مسلمانوں نے جنھیں عہد زار میں فوجی خدمت نہ دی جاتی تھی بلکہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا، فوج کی ترتیب میں معقول حصہ لیا اور باکو والزبتھ پول کو عسکری مرکز قرار دیا گیا۔

بالشیوکوں نے یہ طیاری دیکھ کر اپنی تدابیر میں زیادہ شدت پیدا کر دی اور مسلمان سپاہیوں کے ساتھ جو ان کی فوج میں شامل تھے بُرا سلوک شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دستے برہم ہو گئے۔ بالشیوکوں نے جہازوں سے شہر پر گولے گرانے شروع کئے اور ۱۸ مارچ ۱۹۱۸ء سے لیکر ۲۲ تک مسلمانوں کا قتل عام کر کے ان کی دولت کو لوٹ لیا اس قتل و غارت گری میں بڑا حصہ آرمینیوں نے لیا اور باوجودیکہ آرمینیوں کی قومی کونسل اس سے قبل مسلمانوں کے ساتھ مفاہمت کر چکی تھی، لیکن پھر بھی انھوں نے اپنی بغض و تعصب کو نہ چھوڑا اور مسلمانوں کے تباہ کرنے میں انھوں نے غیر معمولی سختی سے کام لیا۔

بارہ ہزار اسلامی نفوس شہید ہوئے اور ان کے مکانات، مسجدیں، خانقاہیں، مدرسے اور کتب خانے مسمار کر دئے گئے، تمام بڑے بڑے سیاسی رہنما گرفتار کئے گئے اور بعض جان بچا کر نکل گئے اگر اسی زمانہ میں ترکستان کی روسی رجمنٹ بگڑ کر مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ نہ ہو جاتی تو معلوم نہیں اس قتل عام کا سلسلہ کہاں تک وسیع ہوتا، بہرحال اس طرح سوویٹ اثر تمام صوبۂ باکو میں قائم ہو گیا اور وہاں کے تمام بنکوں، باغوں، زمینوں اور مال و اسباب پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ اسی کے ساتھ کوبا اور شماخا میں آگ لگا دی گئی، داغستان پر تسلط قائم ہوا اور عام طور پر مسلمانوں سے بیگار لی جانے لگی۔

پھر چونکہ برسٹ لٹوسک معاہدہ کی رو سے قارس، باطوم اور اردہان روسی حکومت نے ترکوں کو دے دیا تھا اور وہ اپنی فوجیں یہاں قبضہ کرنے کے لئے بھیج رہے تھے اس لئے جارجیا نے جرمنی سے گفتگو شروع کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور ۲۸ مارچ ۱۹۱۸ء کو آذر بیجان نے بھی اس کا تتبع کیا۔ فتح علی خاں جو مجلس وزراء کا صدر تھا کابینہ متعین کرنے کے لئے مامور ہوا اور چھ ماہ کی مہلت دی گئی تاکہ اسکے اندر دستوری حکومت کا نظام متعین کیا جائے۔

یوں ۲۸ مارچ ۱۹۱۸ء کو الزبتھ پول میں جمہوریت آذربائیجان کا اعلان ہو گیا اور نئی شرطی حکومت قائم ہو کر کونسل کے پریسیڈنٹ نے ان تمام ریاستوں کے متعلق اپنے فرائض انجام دینے شروع کر دئے جو آذربائیجان کی خود مختار جمہوریت کے تحت میں قائم ہو گئی تھیں لیکن اس میں شک نہیں کہ نئی حکومت کے سامنے بہت سے مشکلات حائل تھے۔ آرمینیا کی بالشیوک جماعت باکو کی اب تک مالک بنی ہوئی تھی اور اپنے اقتدار کو چاروں طرف وسیع کر کے آذربائیجان، جارجیا اور آرمینیا کی حکومت کو تباہ کر دینا چاہتی تھی تاکہ سارا علاقہ قاف سوویٹ اثر کے ماتحت آجائے۔ لینن نے اس جماعت کے سردار کا لقب اسی لئے ہائی کمشنر قاف رکھا تاکہ وہ زیادہ قوت کے ساتھ کام کر سکے۔ دوسری طرف مشہور جنرل اینڈرنیک نے جو بظاہر ائتلاف ثلاثہ کا دوست بنا ہوا تھا، ترکوں سے شکست کھا کر اضلاع نار ہشرل اور زنگزور کو تباہ کرنا شروع کر دیا اور اپنے آپ کو ہائی کمشنر قاف کا ماتحت ظاہر کیا، اس کے بعد وہ آرمینین بالشیوک افواج کے ساتھ اپنے

کے لئے آگے بڑھا جو الالاچ کی طرف بڑھتی آرہی تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمر خان شورہ (داغستان) سے لیکر موسوی تک (۲۴۰ کیلومیٹر) ریلوے لائن روسی افواج کے قبضہ میں آگئی اور سیکڑوں گاؤں تباہ کرنے کے بعد وہاں کے آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔

باکو کے جنوب میں بالشویک بیڑہ ساحل پر گولہ باری کر رہا تھا، تاکہ سلیم اور لنکوران پر قبضہ ہو جائے اور اس طرح پچاس سے زائد گاؤں اس نواح کے بھی آگ کے نذر ہوگئے، اس سول وار کا مقصود سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ مسلمان آبادی کو فنا کر دیا جائے اور جمہوریت آذربائیجان کو تباہ و برباد۔ چونکہ حکومت آذربائیجان اس فتنہ کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی اس لئے اس نے ترکوں سے مدد طلب کی جن کی فوجیں سرحد پر پڑی ہوئی تھیں ترکوں نے اسکو منظور کرکے ایک معاہدہ کیا، جس کی رو سے آذربائیجان کی آزادی کو تسلیم کیا گیا اور اپنے لئے وہاں کچھ اقتصادی رعایتیں مخصوص کرالیں، ترکوں کی اس مدد سے ان کی ہمت بڑھ گئی اور انھوں نے جارحانہ پہلو اختیار کرکے ۱۵ ستمبر ۱۹۱۸ء کو باکو پر قبضہ کر لیا، جب فوج باکو میں داخل ہوئی تو سخت جنگ ہوئی اور آرمینیوں نے شدید مخالفت کی، لیکن بہرحال باکو پر قبضہ ہوگیا اور کشت و خون کسی نہ کسی طرح بند کیا گیا۔

اسی وقت ایک اور جدید خلش پیدا ہوگئی یعنی جرمنی نے بالشویکوں کی طرفداری شروع کر دی اور تفلس و باکو کے درمیان ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے سلسلۂ مراسلت جاری ہوگیا جس سے صرف بالشویک سردار واقف تھے، جرمنی اہل آذربائیجان کا سخت مخالف تھا کیونکہ ان لوگوں نے جرمنی کی پیشقدمی کو روک کر اس کی مدد کو نامنظور کیا تھا، اور چونکہ باکو میں پٹرول کے چشمے ہیں اس لئے جرمنی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کا اثر یہاں قایم ہو جائے۔

جب باکو پر اہل آذربائیجان کا قبضہ ہوگیا تو پھر جرمنی نے ایک سیاسی مشن کے بہانے سے فوجی آدمیوں کی بڑی تعداد وہاں بھیجنی چاہی لیکن سرحد پر انھیں روک دیا گیا اور جن جن لوگوں کی جائدادیں بالشویکوں نے ضبط کر لی تھیں انھیں واپس کر دیا گیا۔ اسکے بعد ایک قومی مجلس قایم کی گئی اور اس میں گیارہ نمایندے روسیوں کے، اکیس آرمینیا کے، ایک جارجیا کا، ایک پولینڈ کا، ایک اہل جرمنی کا، ایک یہودیوں کا، اور ۸۰ نمایندے مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں کے مقرر کئے گئے، کابینہ کے چودہ عہدہ داروں میں ۴ عہدے عیسائیوں کے لئے مخصوص کئے اور غیر مسلم اقلیت کا پورا لحاظ کیا گیا۔ حالانکہ جارجیا اور آرمینیا نے باوجودیکہ وہاں مسلمانوں کی آبادی ۳ لاکھ ہے ایک عہدہ بھی اپنے کابینہ میں مسلمانوں کو نہیں دیا۔

نومبر ۱۹۱۸ء میں پریسیڈنٹ ولسن کے مشہور پیام امن پر آذربائیجان کی حکومت کے تار کے ذریعہ سے درخواست کی کہ اس کی آزاد جمہوریت کو تسلیم کیا جائے۔ چونکہ سرزمین قفقاز اپنی زرخیزی اور تیل کے چشموں کی وجہ سے بہت مشہور ہے اس لئے تمام دول یورپ اس پر اپنا اپنا اثر قایم کرنے کے لئے بیتاب تھے، بالشویکوں نے تو اس مسئلہ میں اپنی انتہائی کوششوں سے کام لیا اور جرمنی نے بھی اپنی پوری قوت صرف کر دی، لیکن برطانیہ ابھی تک موقعہ کا منتظر تھا اور قریب کے دیران علاقہ پر اپنی فوجیں جمع کئے ہوئے مناسب وقت و محل کا انتظار کر رہا تھا۔ چنانچہ جب اس نے دیکھا کہ اہل آذربائیجان کو امداد کی ضرورت ہے تو بالشویکوں کے خلاف ان کی مدد کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب اتحادیین اور ترکی کے درمیان التوائے جنگ کا اعلان ہوا تو اتحادی افواج کے کمانڈر جنرل طامسن

ملے جو ایران میں مقیم تھا، حکومت آذربائیجان کو اطلاع دی کہ حسب شرائط اب ترکی کو قاف کا علاقہ چھوڑنا پڑے گا اور اس صورت میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم عارضی طور پر باکو میں آکر بالشویکوں کو حدود قفقاز سے نکال دیں۔

چونکہ حکومت آذربیجان حقیقی معنی میں امن و سکون چاہتی تھی، اور جنرل طامسن نے اس کو یقین دلا دیا تھا کہ جمہوریت کے خارجی معاملات میں وہ بالکل دخل نہ دے گا۔ اس لئے یہ درخواست منظور کی گئی اور ۱۷ نومبر ۱۹۱۸ء کو جنرل طامسن اتحادی افواج کو لیکر باکو میں داخل ہو گیا جہاں اس کا بہت پرجوش خیر مقدم عمل میں آیا۔ اس کے بعد اُن لوگوں نے جو جمہوریت آذربیجان کے مخالف تھے سازشیں شروع کیں، لیکن جنرل طامسن اور نمایندگان فرانس و امریکہ نے ان سازشوں کی اصل روح کو سمجھ کر جمہوریت آذربیجان کو مستقل حکومت تسلیم کرلیا۔

اس جدید حکومت نے جس رواداری سے کام لیکر روسیوں اور آرمینیوں کی جاں بخشی کی، اور ان کی خونریزیوں کو جس فیاضی سے نظرانداز کیا۔ اس کی مثال تاریخ میں مشکل سے نظر آتی ہے، لیکن انھوں نے اپنی شرارت کسی طرح نہ چھوڑی اور آبادی کے آرمینی عنصر نے اپنی تمام قوت مسلمانوں کے خلاف جاری رکھی۔

جس زمانہ میں حکومت آذربائیجان باکو کو آزاد کرانے کی فکر میں مبتلا تھی، اینڈرینک شہر چارچا یا شادشا کے محاصرہ میں مصروف تھا اور یہاں کی مسلمان آبادی اس قدر پریشان ہوگئی تھی کہ پانی اسے میسر نہ آتا تھا، لیکن جب باکو کے مسئلہ سے فرصت ہوئی تو حکومت آذربائیجان نے شادشا کا رخ کیا، اور قبضہ کرنے کے بعد امن و سکون قائم کیا، لیکن اس کے بعد جب فوجیں یہاں سے چلی گئیں تو آرمینیوں کی شرارتیں عود کر آئیں اور غریب مسلمانوں پر پھر ظلم توڑے جانے لگے۔

آخرکار حکومت آذربائیجان نے جنرل طامسن کو اس طرف توجہ دلائی۔ جنرل طامسن نے ایک تار کے ذریعہ سے اینڈرینک کو تنبیہ کی کہ اسے اپنی شرارتیں ترک کردینی چاہئے لیکن وہ باز نہیں آیا اور جب تک اس نے حدود آذربائیجان کو چھوڑ نہیں دیا اس کا انسداد نہ ہو سکا۔

چونکہ جمہوریت آذربائیجان تمام دول عظمیٰ سے اپنی حکومت کو تسلیم کرانا چاہتی تھی اس لئے وہاں کی پارلیمنٹ نے جنوری ۱۹۱۹ء میں ایک وفد صلح کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے پیرس روانہ کرنا چاہا لیکن قسطنطنیہ پہونچکر پاسپورٹ حاصل کرنے میں اسے بہت دیر لگ گئی اور ۲۲ اپریل سے پہلے وہاں نہ پہونچ سکا۔ لیکن اس کی یہ محنت بیکار نہ گئی اور آخرکار ۱۲ جنوری ۱۹۲۰ء کو تمام دول یورپ نے آذربائیجان کی آزادی کو تسلیم کرلیا۔

قدیم تمدن اسلام کی تازگی

جدید و قدیم تمدن کا موازنہ

تمدن حاضر کی فضا میں سانس لینے والا انسان، عہد موجودہ کو ترقی تمدن کے لحاظ سے بہترین عہد خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جو ترقیاں معیشت و معاشرت کی اس وقت نظر آتی ہیں، وہ اس سے قبل بالکل مفقود تھیں۔ اگر ہم اسے تھوڑی دیر کے لئے صحیح باور کر لیں تو بھی گزشتہ تمدن پر کوئی الزام عاید نہیں ہوتا، کیونکہ انسان نے ہمیشہ تدریج کے ساتھ زینہ بزینہ ترقی حاصل کی ہے اور اس کے لئے ناممکن تھا کہ جو نتائج مسلسل تجربوں کے ہو سکتے ہیں، انھیں دفعتاً حاصل کر لیتا، خود اسی دور ترقی کی ابتداء کو موجودہ حالات سے مقابلہ کر کے دیکھیں گے تو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا لیکن کیا وہ شخص جس نے پہلے قوتِ کہربا کو دریافت کیا، مارکونی سے کم مرتبہ کا ہو سکتا ہے۔ کیا آلۂ بخار کے موجد اول کی عزت عہد حاضر کے میکانکی علماء سے کم کی جاتی ہے۔ بلکہ اگر ہم انصاف سے کام لیں تو ہمیں عہد قدیم کے مخترعین و مصلحین آداب کی زیادہ وقعت کرنی چاہئے کیونکہ جدید حضارت و تمدن کی تعمیر انھیں کی قایم کی ہوئی بنیاد پر استوار کی گئی ہے۔

یہ امر مسلمات تاریخی میں سے ہے کہ موجودہ اصول تہذیب بڑی حد تک اسلامی تمدن کے ممنون ہیں، لیکن آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ موجودہ نظام معاشرت کی بہت سی وہ باتیں بھی جنھیں اختراعات عہد جدید سمجھا جاتا ہے، حقیقتاً عہد اسلام کی یادگار رہیں اور اب سے بہت پہلے بالکل اسی طرح رائج تھیں اور جس کو عبدالفتاح عبادہ نے حضارت اسلامی کے ان مناظر پر روشنی ڈال کر پوری طرح ثابت کر دیا ہے۔

دندان سازی کہا جاتا ہے کہ سونے کے دانت بنانا مغربی تمدن کی اختراع ہے اور صرف دور حاضر کی چیز ہے، لیکن واقعات کی شہادت اس کے خلاف ہے، کیونکہ اہل عرب کے ہاں ابتداء عہد حضارت میں اس کا رواج تھا اور تاریخ کے لئے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، صاحب عقد الفرید نے لکھا ہے کہ "امیر المومنین حضرت عثمان غنی جب زیادہ سن رسیدہ ہو گئے تو آپ نے دانتوں کو سونے کے تار سے بندھوایا بعض کا قول ہے کہ ایک دانت پورا سونے کا تھا" اسی طرح حسب روایت جاحظ، عبدالملک بن مروان کا اپنے دانتوں کو سونے کے تاروں سے مستحکم کرانا ثابت ہے (البیان والتبیین - جلد ا - صفحہ ۲۴)۔

اس وقت سونے کے دانت بنانا یا طلائی تاروں سے دانتوں کو مستحکم کرانا خاص فن ہے اور اسی کے لئے بڑی مہارت و مشاقی کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن تاریخ قدیم میں متعدد مثالیں ایسی ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فن کی تکمیل اس سے بہت پہلے ہو چکی تھی،

مسلمانوں میں مردوں کے لئے سونے چاندی کا استعمال ناجائز ہے اور اس لئے بعض زاہد معترض ہوں کہ حضرت عثمان غنی نے کیونکر اسے جائز رکھا۔ لیکن انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ مذہب اسلام نے دانت، مصحف اور تلوار کے لئے سونے چاندی کا استعمال جائز رکھا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف دندان سازی کی یہ مخصوص صنعت اس وقت رائج تھی بلکہ لوہے اور چمڑے پر بھی سونے کا کام کیا جاتا تھا۔

اظہار تحسین تالیاں بجاکر

اس وقت جب کوئی بات پسند آتی ہے اور اس کی تکرار چاہی جاتی ہے تو تالیاں بجائی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے (once more) فرانس میں اس کے لئے لفظ " Bis " مستعمل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بالکل جدید طریقۂ تحسین ہے، حالانکہ حضارت اسلام میں اس کا رواج موجود تھا، صاحب یتیمۃ الدہر نے لکھا ہے کہ "صاحب ابن عباد کے سامنے ابو محمد خازن اس کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھ رہا تھا اور ابن عباد مع تمام اہل بزم کے نہایت غور سے سُن رہا تھا، جب نصف قصیدہ تک شاعر پہونچا، ابن عباد فرط مسرت سے اُچھل پڑا اور جب وہ ختم ہوا تو اس نے تالیاں بجائیں اور کہا کہ "أعد" یعنی "تکرار کر" یہ لفظ مترادف ہے (once more) کا (یتیمۃ الدہر جلد ۳ صفحہ ۳۵)

ابن خطیب کی روایت ہے کہ جب ولید اندلسی حج کرنے کے بعد واپس ہوا تو مصر آیا اور یہاں متنبی شاعر سے ملا۔ دوران گفتگو میں متنبی نے کہا کہ "الا تنشدنی شیئاً للملیح الاندلس" یعنی کچھ کلام ملیح اندلس کا بھی سنائیے۔ (ملیح اندلس سے ابن عبد ربہ صاحب عقد الفرید مراد ہے) چنانچہ ولید نے کچھ شعر اس کے سُنائے اور متنبی نے اظہار تحسین میں تالیاں بجائیں اور کہا "یا ابن عبد ربہ لقد تاتیک العراق حبواً"

طریق طعام

اہل عرب کے ہاں دسترخوان کا طول ۵۰ ذراع (۲۵ گز) ہوا کرتا تھا اور نشست کا انتظام ہر شخص کے مرتبہ و حیثیت کے لحاظ سے کیا جاتا تھا۔ جو شخص ان میں سے سب سے بڑا ہوتا تھا، وہ صدر دسترخوان ہوا کرتا تھا، جیسے آج کل یورپ میں عام دستور ہے۔ (معجم الادباء - جلد ۲ - صفحہ ۳۰۶)

آج کل فہرست طعام (menu) مرتب کرنے کی تہذیب عہد حاضر کی اختراع سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ اہل عرب میں اس کا رواج عام تھا، جب امام شافعیؒ بغداد میں زعفرانی کے مہمان تھے، تو زعفرانی روزانہ کھانوں کی تفصیل کنیز کو بتا دیا کرتا تھا اور وہ اسی کے مطابق ایک فہرست جسے انگریزی میں (menu) اور عربی میں خریطۃ الطعام یا ورقۃ الطعام کہتے ہیں امام شافعی کے سامنے کھانے سے قبل پیش کر دیا کرتی تھی اور ایک دن امام شافعی نے وہ فہرست کنیز کے ہاتھ سے لیلی اور اس میں ایک کھانے کا اضافہ اور کر دیا، جب زعفرانی کو یہ معلوم ہوا تو فرط مسرت سے اس نے کنیز کو آزاد کر دیا۔ (المستطرف جلد ۱ صفحہ ۱۴۹)

صاحب عقد الفرید نے لکھا ہے کہ "ایک مرتبہ بلال بن ابی بردہ نے جو بصرہ کا امیر تھا، جارود سے جو عبدالاعلیٰ بن عبداللہ کا جلیس تھا، دریافت کیا کہ جب کھانا آتا ہے تو تمہارا سردار (یعنی عبدالاعلیٰ) کیا کرتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ جب دسترخوان بچھا دیئے کے بعد لوگ بیٹھ جاتے ہیں تو ایک شخص آتا ہے اور ان کھانوں کی فہرست بناتا ہے جو طیار کئے گئے ہیں، اور ہر شخص اپنی اپنی خواہش کے مطابق کم و بیش طلب کرتا ہے۔

کھانے کے وقت موسیقی

اس وقت نہ صرف یورپ ہی کے امرا کے ہاں بلکہ بڑے بڑے ہوٹلوں میں بھی یہ دستور ہے کہ

کھانے کے وقت موسیقی کا شغل بھی رکھا ہے اور بینڈ یا آرکسٹرا (orchestra) قایم کیا جاتا ہے۔ بالکل یہی دستور ملوک عرب اور خلفاء اسلام کے ہاں بھی پایا جاتا تھا کہ جس وقت وہ کھانے پر بیٹھتے تھے تو ارباب نشاط اپنے آلات طرب لیکر موسیقی چھیڑ دیتے تھے۔

نماز کے بعد موسیقی جب فاطمیین کی سلطنت عروج پر تھی تو نماز کے بعد نقارہ و طبل بجایا جاتا تھا اور اسی کے ساتھ موسیقی بھی ہوتی تھی، مقریزی نے لکھا ہے کہ عشاء کے وقت جب قصر خلیفہ کے اندر نماز ہوتی تھی تو فارغ ہونے کے بعد نقارہ وغیرہ بجانے کا حکم دیا جاتا تھا (المقریزی جلد ۲- صفحہ ۲۷ و ۲۸)

فاطمیین سے قبل اخشیدیین کے زمانہ میں بھی ہر نماز کے بعد ملوک و امراء کے آستانوں پر نوبت و نقارہ بجائے جانے کا رواج تھا۔ چنانچہ مقریزی نے بیان کیا ہے کہ "جب کافور اخشیدی دمشق کو واپس لینے کے ارادہ سے نکلا تو اس نے ان نقاروں کو بجوایا جو ہر نماز کے وقت بجائے جاتے تھے، یہ نقارے تانبے کے تھے ان کی تعداد ایک سو تھی۔" (المقریزی جلد ۲- صفحہ ۲۷ و ۲۸)

اس سے ثابت ہوا کہ عہد حاضر میں کلیسا کے اندر یا باہر نماز کے وقت موسیقی کا رواج کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ اس کا بھی حضارت اسلام سے استعارہ کیا گیا ہے۔

مجالس شراب میں موسیقی محافل عیش و مسرت اہل عرب جس تفنن اور جدت طرازی سے کام لیتے تھے، اس کی کوئی نظیر عہد حاضر کی طرف سے پیش نہیں کی جاسکتی مثلاً ایک محفل بادہ کا منظر ہے کہ ایک نہایت آباد و پُرگل باغ کے وسط میں ایک خوبصورت نہر دایرہ دار جاری ہے، اس کے کنارے رندان مے آشام بیٹھے ہیں۔ ساقی ایک جام میں شراب بھر کر جس کو دینا مقصود ہوتا ہے اس کو "کاسک یا بن فلاں" کہکر مخاطب کرتا ہے اور پانی کی لہروں پر جام چھوڑ دیتا ہے۔ جب وہ پینے والے کے قریب پہونچتا ہے تو اسے اُٹھا کر پی لیتا ہے اور پھر پانی میں چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ گھوم کر پھر ساقی کے پاس پہونچ جائے۔

ایسی ہی ایک مجلس کا حال ابو محمد عبد الجبار بن حمدیس الصقلی نے اپنی ایک نظم میں بیان کیا ہے۔ لکھتا ہے:-

وساقیۃ تسقی الندامی بکفہا　　کووسا من الصہباء طاغیۃ الکر
یعوم فیہا کل جام کانما　　تضمن روح الشمس فی جسد البدر
اذا قصدت منا ندیما زجاجۃ　　تناولہا رفقا بانملہ العشر
فیشرب منہا سکرہ عنیۃ　　تنوم عین الصحو منہ و مایدری
ویرسلہا فی مائہا فیعیدہا　　الی راحتی ساقٍ علی حکمہ تجری

(یعنے ایک [illegible] میخواروں کو نہایت تیز و تند شراب کے جام اپنی روانی کے ہاتھوں سے پلاتی ہے، اس میں ہر لبریز جام تیرتا ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے گویا چاند کے جسم میں آفتاب کی روح ڈالدی گئی ہو جب وہ ہم میں سے کسی بادہ خوار کی طرف جام بڑھاتی ہے تو وہ دسوں اُنگلیوں سے نرمی کے ساتھ اُٹھا کر اس کا وہ جرعہ انگوری پی جاتا ہے جس سے بیداری و ہوشیاری کی آنکھ محو خواب ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ جام کو پانی پر چھوڑ دیتا ہے اور وہ پھر اس ساقی کے پاس پہونچ جاتا ہے جس کے حکم پر وہ آتا جاتا ہے)

جانوروں کے پانی پینے کے حوض

آج کل جانوروں کے ساتھ بہت نرمی کا طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے اور ان کے لئے میدانوں اور سڑکوں پر صاف ستھرے پانی کے حوض بنائے جاتے ہیں، لیکن یہ بھی اہل مغرب کی جدت نہیں ہے، بلکہ اس سے بہت قبل بغداد، دمشق، قاہرہ، قرطبہ، غرناطہ وغیرہ میں اس کا رواج پایا جاتا تھا، جیسا کہ صاحب نفح الطیب المقریزی اور ابن عساکر کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے۔ مقریزی نے لکھا ہے کہ قاہرہ کی سڑکوں پر متعدد اس قسم کے حوض تھے جنھیں حکومت یا افراد قوم طیار کراتے تھے۔

سڑکوں کی روشنی، صفائی، چھڑکاؤ اور کتوں کی ہلاکت وغیرہ

میونسپلٹی کا نظام بھی عہد جدید کی برکت خیال کیا جاتا ہے، لیکن اہل عرب میں بھی ایک نظام اجتماعی ایسا تھا جو شہر کی حفظان صحت اور آبادی کی سہولت کا لحاظ سے قایم کیا گیا تھا، مثلاً آوارہ کتوں کا ہلاک کرنا جیسا آج کل پایا جاتا ہے، اس وقت بھی رائج تھا۔ چنانچہ حجاج کا واسط اور اس کے قرب و جوار سے کتوں کو زہر دلوا کر دفع کر دینا مشہور واقعہ ہے، یہی عمل تمام امصار و ولایات کے امرا کا تھا کہ جب آوارہ کتے بڑھ جاتے تو زہر دیکر انھیں ہلاک کرا دیتے۔

آگ بجھانا، شہر میں روشنی کرنا، سڑکوں کو صاف رکھنا، پانی چھڑکنا اور رات کو آبادی کی حفاظت کرنا اُس وقت بھی رائج تھا اور ان اُمور کے متعلق مخصوص قواعد وضع کئے گئے تھے جن کی پابندی ہر شخص پر فرض تھی۔ مثلاً ہر دوکاندار کا فرض تھا کہ ہر دوکان کے قریب پانی کا ایک بڑا مٹکہ ہر وقت لبریز رکھے تاکہ اگر آگ لگ جائے تو آسانی سے بجھائی جا سکے، اسی طرح اس کا یہ بھی فرض تھا کہ وہ اپنی دوکان کے سامنے ایک قندیل معلق کرے اور شام سے صبح تک اسے روشن رکھے، اسی طرح ایک جماعت ملازموں کی تھی جو سڑکوں کو ہر وقت صاف رکھتی اور روزانہ پانی چھڑکتی۔ ایک جماعت حکومت کی طرف سے ایسی بھی مقرر تھی جو رات کو بازاروں اور سڑکوں کا گشت کیا کرتی تاکہ دوکانیں محفوظ رہیں۔

خلفاء فاطمیین میں سے العزیز باللہ اور الحاکم بامر اللہ نے خصوصیت کے ساتھ اس طرف بہت اعتنا کیا، ان کے زمانہ میں تمام شہروں کے اندر روزانہ چراغاں ہوا کرتا تھا اور ہر وقت خرید و فروخت کا ہنگامہ قایم رہتا تھا۔ (المقریزی جلد صفحہ ۱۰۷ و ۱۰۸)

بلند اور وسیع عمارتیں اور بازار کا ازدحام

اہل عرب کی تمدنی ترقی کے دور میں دیگر امور کے ساتھ عمارتوں کی طرف بھی بہت توجہ کی گئی۔ چنانچہ اُس وقت بعض عمارتیں سات سات منزل کی ہوا کرتی تھیں جن میں دو دو سو آدمی رہ سکتے تھے (الخطط، جلد ا صفحہ ۳۴۴)

بازار کی رونق اور وہاں کے ازدحام کا یہ حال تھا کہ اب سے تقریباً ۷۰۰ سال قبل جب قاضی القضاۃ عماد الدین احمد قاہرہ میں داخل ہوا تو دیکھ کر ششدر ہو گیا اور اس کے بیٹے محب الدین محمد نے کسی سے پوچھا کہ کیا کوئی بارات ہے یا بڑے آدمی کے جنازہ جو آدمیوں کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا لیکن جواب دینے والے نے کہا کہ "نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ یہاں ہر وقت یہی حال رہتا ہے"۔

بائیں طرف چلنے کا دستور

المقریزی لکھتا ہے کہ "مجھے اول مرتبہ ہجوم کے ساتھ چلنے میں بڑی زحمت ہوئی۔ لیکن دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہر شخص کو اپنے بائیں جانب ہٹ کر چلنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے اس پر عمل کیا اور کبھی زحمت نہیں اٹھائی، لیکن بین القصرین پر مجھے ضرور رک جانا پڑتا تھا کیونکہ وہاں آنے جانے والوں لوگوں کی قطاروں کا یہ عالم ہوتا تھا جیسے کوئی سیل ہے کہ آ جا رہا ہے" بھیڑ ہجوم وازدحام کی یہ حالت صرف قاہرہ میں نہ تھی، بلکہ بغداد، دمشق، غرناطہ وغیرہ ہر جگہ یہی عالم تھا، اور ان میں سے ہر ایک اُس وقت کا نیویارک، لندن، اور پیرس بنا ہوا تھا۔

وسیع میدان

تمدن جدید اس امر پر بڑا ناز کرتا ہے کہ اس نے آباد شہروں کے اندر جا بجا میدان (Park) بنا کر تفریح اور کھلی ہوئی ہوا کا بھی انتظام کیا ہے، لیکن آپ یہ سُن کر تعجب کریں گے کہ عہد اسلام میں اس کا بھی پورا اہتمام تھا اسوقت قاہرہ میں جہاں بین القصرین کی سڑک ہے، دولت فاطمیہ کے زمانہ میں یہاں بڑا وسیع میدان تھا جس میں دس ہزار سپاہ کھڑی ہو سکتی تھی اور دولت ایوبی کے عہد میں یہ ایک بڑا بازار بن گیا تھا جہاں ضرورت کی تمام چیزیں ملتی تھیں اور ہر درجہ ذوق نظر کا سامان فراہم رہتا تھا۔ اسی طرح تمام بڑے شہروں میں آبادی کے اندر جا بجا وسیع میدان تھے جہاں لوگ جمع ہوتے تھے اور مختلف تفریحوں میں مشغول رہتے تھے۔ (الخطط جلد ۲ صفحہ ۲۳-۲۹)

کلبوں اور سوسائٹیوں کا قیام

کلبوں سے مراد وہ مقامات ہیں جہاں تعلیم یافتہ طبقہ کے ہم مذاق افراد جمع ہوتے ہیں اور باہم تبادلۂ خیالات کرتے ہیں رسایل وجراید کے مطالعہ میں مصروف ہوتے ہیں اور مشاغل تفریح میں شرکت کرتے ہیں، عہد حاضر میں مختلف اغراض ومقاصد کے کلب کثرت سے قایم ہیں، یہاں تک کہ کنواروں کا کلب، شراب وتمباکو سے احتراز کرنے والوں کا کلب بھی علحدہ ہے، جاپان میں نکاح طلب لڑکیوں کا ایک کلب ہے جس کے ذریعہ سے ہر ہفتہ دو سو شادیاں ہوتی ہیں۔ بظاہر اس نوع کے کلبوں اور سوسائٹیوں کا قیام بھی عہد حاضر کی اختراع معلوم ہوتی ہے۔ لیکن تاریخ اسلام کے مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں کہ اہل عرب میں اس سے بہت پہلے اس نوع کے مجامع قایم تھے اور مختلف اغراض ومقاصد کے لئے مختلف کلب انھوں نے بھی برپا کر رکھے تھے۔

ادب، سیاست، ریاضی اور فنون لطیفہ میں سے ہر ایک کے لئے علحدہ علحدہ کلب قایم تھے جہاں ترقی علوم وفنون کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوتا تھا، مجالس ادب وموسیقی تو اہل عرب کے ہاں بہت قدیم چیز ہے اور ایام جاہلیت میں بھی پائی جاتی تھیں سیاسی کلب کا نام اُن کے ہاں دار الندوہ تھا، جہاں سیاسی واجتماعی حالات پر بحث کرنے کے لئے اشراف قریش جمع ہوتے تھے۔

صدر اسلام میں ایسے کلبوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ خود مکہ میں ایک کلب موسیقی کا تھا جہاں ماہرین فن جمع ہوتے تھے اور اس فن کے متعلق بحث کیا کرتے تھے، ابو الفرج الاصفہانی ابن سریج مغنی اور الغریض کے باہمی مباحثوں کے متعلق لکھتا ہے کہ:-

"وکانت ببعض اطراف مکۃ دار یاتیانہا فی کل جمعۃ یجمعہا بہا ناس کثیر فیہ صنع لکل واحد منہا کرسی یجلس علیہ ثم یتناقضان الغناء" (الاغانی جلد ۱ صفحہ ۱۰۸) ---- (یعنے بعض اطراف مکہ میں ایک مکان تھا جہاں ہر جمعہ کو لوگ جمع ہوتے تھے

ابن سریج مغنی اور الغریض کے لئے کرسیاں بچھا دی جاتیں اور یہ دونوں فن موسیقی میں مقابلہ اور بحث کرتے)

لہو و لعب، مطالعہ و تفریح کے لئے بھی ایک جگہ مقرر تھی، جہاں شطرنج اور نرد وغیرہ کے ساتھ مختلف علوم و فنون کی کتابیں بھی رکھی رہتی تھیں۔ صاحب آغانی لکھتا ہے :-

"کان عبدالحکم بن عمرو بن عبداللہ بن صفوان الجمی قد اتخذ بیتاً فجعل فیہ شطرنجات و نردات و قرقات و دفاتر فیہا من کل علم و جعل فی الدار اوتاداً فمن جاء علق ثیابہ علی وتد منہا ثم جر دفتراً فقرأہ و بعض ما یلعب بہ فلعب بہ مع بعضہم"۔ (یعنے عبدالحکم نے ایک گھر ٹھیکر اس میں شطرنج، نرد اور مختلف علوم کی کتابوں کا انتظام کیا تھا ہر کمرہ میں کھونٹیاں نصب کی گئی تھیں، جو آتا تھا اپنے کپڑے اُتار کر کھونٹی پر لٹکا دیتا تھا اور پھر ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے مطابق کتب بینی یا لہو لعب میں مشغول ہو جاتا تھا)۔ (آغانی جلد ۴۔ صفحہ ۲۵)

اسی سلسلہ میں اخوان الصفا، مجلس الوزیر المہلبی اور مجلس الوزیر ابن فرات بھی قابل ذکر ہیں، مجلس وزیر مہلبی میں قاضی تنوخی وغیرہ ایسے معمر اور سفید ریش کے بزرگ ہفتہ میں دو مرتبہ اور وہ بھی رات کو جمع ہوا کرتے تھے۔ مجلس اخوان الصفا کے علمی کارناموں سے دنیا واقف ہے، تمام مجالس میں، چاء، قہوہ اور نبیذ کا دور چلتا تھا۔ نفح الطیب، آغانی، عقد الفرید، یتیمۃ الدہر میں کثرت سے ایسی مجالس کا ذکر موجود ہے۔

موسیقی عہد نبوی و خلفاءِ راشدین میں

قبل عہد اسلام ایام جاہلیت میں موسیقی عربستان کے تمام بڑے بڑے مقامات میں رائج تھی۔ مکہ، یثرب، طائف، خیبر، وادی القریٰ دومۃ الجندل، مسقط، عدن، حضرموت، حیرہ، انبار، اہواز، دمشق، بعلبک اور بصرہ وغیرہ میں ہر جگہ مختلف لحن و لہجہ کے ساتھ گانے کا رواج پایا جاتا تھا۔ لیکن جب ظہور اسلام ہوا تو لوگوں کا ذوق موسیقی کی طرف سے ہٹ کر قرآن مجید کی طرف منتقل ہو گیا اور بجائے شعر و غنا کے اصلاح اجتماعی اور فتوحات ملکی کی طرف مایل ہو گیا۔ رسول اللہ کے سامنے جب شعر و شاعری کا ذکر آتا تھا یا کوئی شاعر اپنا کلام سناتا تھا تو آپ اس کے جواب میں صرف قرآن پاک کی آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ طفیل بن عمرو السدوسی (مشہور شاعر) جب رسول اللہ کے پاس آیا اور اسلام اس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا کہ میں مرد شاعر ہوں جو کچھ میں کہتا ہوں پہلے اسے سن لو۔ رسول اللہ نے فرمایا کہو اس نے چند شعر[1] عربی کے پڑھے۔ رسول اللہ نے سن کر سورۂ اخلاص پڑھی اور آخر کار یہ مسلمان ہو گیا۔ اسی طرح جب خلیفۂ ثانی نے کوفہ میں مغیرہ بن شعبہ کی طرف اپنے عامل کو بھیجا اس نے کہا کہ تمہارے شہر کے شعراء نے اسلام کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اسے سناؤ۔ پس مغیرہ نے اصحاب تعلقات میں سے کسی کو لبید العامری کے پاس بھیجا جو اس وقت کوفہ میں موجود تھا۔ اس سے کہا گیا کہ اسلام کے بارہ میں جو کچھ تم نے لکھا ہے سناؤ۔ یہ سن کر لبید نے سورۂ بقر پیش کر دی اور کہا کہ اسلام نے شعر و شاعری کی جگہ ہم کو یہ چیز دی ہے۔ لبید بڑا مشہور شاعر عہد جاہلیت کا تھا لیکن اسلام لانے کے بعد اس نے شاعری ترک کر دی تھی اور سوائے ایک شعر[2] کے دوسرا شعر نہیں کہا۔

---

[1] وہ اشعار یہ ہیں :-

لاہ الہ ان نسس تالم حرمہم	ولو حارتنا مسهب وبنوهم
ولمایکن یوم تزول نجومه	تطیر به الرکبان ذو بنیار ضخم،
اسلما علی خسف ولست بخالد	ومالی من ورق اذا جاء فی خصمی
فلاسلم حتی تحفز الناس خیفته	ویصبح طیر کا نسات علی لحمی،

[2] وہ شعر یہ ہے :-

الحمد للہ اذلم یاتنی اجل	حتی اکتسیت من الاسلام سربالا

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ رسول اللہ کو موسیقی سے نفرت تھی یا غناء کو آپ نے حرام کر دیا تھا کیونکہ ولیمۂ عرس کے موقعہ پر خود آپ نے عورتوں کو گاتے ہوئے سنا اور منع نہیں فرمایا۔

اسی طرح آپ مکہ سے یثرب کی طرف ہجرت کرکے تشریف لے گئے تو انصار کی عورتوں نے آپ کے استقبال میں دف بجا بجا کر گانا گایا اور آپ نے اسے سنا[1] ـــــ رسول اللہ اچھی آواز کو بہت پسند فرماتے تھے اور بلالؓ حبشی کو اذان کی خدمت پر مامور کرنا محض ان کے حُسن آواز کی وجہ سے تھا۔ آپ بلالؓ سے اکثر قرآن سنا کرتے تھے اور آپ کو بہت لطف آتا تھا۔

خود فن قرأت و تجوید کو ملاحظہ کیجئے کہ وہ لحن کے مختلف طریقوں اور رتال کے منظم وقفوں سے پیدا ہوا ہے اور اس فن کی اصطلاحیں اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً صرف ایک مدّ کو لیجئے کہ فن تجوید میں اس کی چار قسمیں کر دی گئی ہیں طبعی، متصل، منفصل، لازم اور یہ قسمیں حقیقتاً موسیقی کے گھٹاؤ بڑھاؤ ہیں جن کا علٰحدہ نام رکھ دیا گیا ہے۔ اسی طرح اصطلاحات ادغام، اظہار، اخفاء، اقلاب، غنہ، حروف ہمس و جہر، استفالہ و ترقیق تفخیم و رخو، شدت و توسط، صفیرہ اطباق، انفتاح و اذلاق، قلقلہ و وقف وغیرہ کو دیکھئے کہ فی الحقیقت ان سب کا تعلق لحن و موسیقی سے ہے لیکن اس خیال سے کہ یہ فن لہو و لعب میں نہ داخل ہو جائے موسیقی سے علٰحدہ اس کی اصطلاحیں مقرر کی گئیں۔

خود قرآن کو بھی ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا حکم ہے اور ترتیل کی تفسیر میں امام نیشاپوری نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مخصوص وقفوں کے خوش الحانی سے الفاظ کو ادا کرنا ہی ترتیل ہے۔ بہرحال جس حد تک نفس خوش الحانی و حُسنِ صوت کا تعلق ہے اسلام نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ بلکہ بعض حالات میں رسول اللہ نے غناء کی طرف ترغیب بھی دلائی ہے۔ چنانچہ ایک بار انصار میں سے کسی کی لڑکی شادی ہوئی تو رسول اللہ نے جناب عائشہؓ سے دریافت فرمایا کہ کیا تم لوگوں نے اسے رخصت کر دیا، جواب دیا ہاں، آپ نے پوچھا کہ تم لوگوں کے ساتھ کوئی گانے والا بھی تھا۔ آپ بولیں نہیں۔ رسول اللہ نے فرمایا کیا تمہیں نہیں معلوم کہ انصار کی قوم گانے کو بہت پسند کرتی ہے، کیا تم میں سے کوئی اس کے ساتھ ایسا نہ تھا جو کہتا :-

اتیناکم اتیناکم فحیونا نحییکم ولولا الحبة السمراء لم نحلل بواديكم

ایک بار رسول اللہ ایک کنیز کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ وہ گا رہی تھی :

ہل علیّ ویحکمون ان لهوت من حرج

---

[1] گیت یہ تھا۔

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

ایہا المبعوث فینا جئت بالامر المطاع

تو آپ نے یہ سنکر فرمایا: " لاحرج انشاء اللہ"

ایک مرتبہ رسول اللہ نے رات کے وقت بلال کو یہ اشعار گاتے سنا اور پسند فرمایا۔

الا لیت شعری ہل ابیتن لیلۃ	بمکۃ حولی اذخر و جلیل
وہل اردن یوما میاہ مجنۃ	وہل یبدون لی شامۃ وطفیل

حضرت عمر بن الخطاب اور عبد اللہ بن رواحۃ رسول اللہ کے ساتھ ساتھ سفر میں ہیں۔ چونکہ منزل طویل تھی اس لئے رسول اللہ نے چاہا کہ اونٹ کو تیز چلایا جائے اور عبد اللہ بن رواحۃ سے کہا کہ اگر اونٹ "حدی خوانی" سے تیز چل سکتا ہو تو شروع کرو۔ وہ فرط حیا سے خاموش رہے، لیکن حضرت عمر نے کہا کہ تم رسول اللہ کا کہنا نہیں مانتے اس پر عبد اللہ نے یہ شعر گانے شروع کئے:۔

واللہ لولا اللہ ما اہتدینا	ولا تصدقنا ولا صلینا
الکافرون قد بغوا علینا	اذا ارادوا فتنۃ ابینا
ونحن عن فضلک ما استغنینا	فثبت الاقدام ان لاقینا

وانزلن سکینۃ علینا

ایک بار کسی اعرابیہ نے نذر مانی کہ اگر رسول اللہ غزوہ سے صحیح و سلامت واپس آجائیں گے تو میں دف پر گانا گاؤں گی، چنانچہ جب آپ تشریف لائے تو آپ نے اس کو حضوری کی اجازت دی اور اس کا گانا سنا۔

اسلم، حضرت عمر کا غلام تھا اس سے روایت ہے کہ "ایک بار میں اور عاصم دونوں گا رہے تھے کہ حضرت عمر اس طرف سے گزرے اور ٹھہر کر سننے لگے۔ جب گانا ختم ہوا تو فرمایا کہ پھر گاؤ، چنانچہ ہم نے پھر اعادہ کیا اور پوچھا:۔ "اے امیر المؤمنین ہم میں سے کون بہتر گاتا ہے" جواب دیا کہ تم دونوں گدھے ہو، پوچھا کہ ہم میں کون گدھا بر تر ہے۔ آپ نے فرمایا "یہ بھی وہ بھی"۔ میں نے کہا کہ "میں ان گدھوں میں غالباً اول گدھا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں تمہارا درجہ دوسرا ہے"۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ موسیقی کے نقاد بھی تھے اور برا گانے والوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔

مدینہ منورہ میں سعد بن ابی وقاص صحابی کا ایک غلام "قند" تھا جو نہایت اچھا گانے والا تھا۔ اور جناب عائشہ محض گانے کی وجہ سے اس کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ ایک بار سعد بن وقاص نے اسے مارا تو آپ خفا ہوگئیں اور کہا کہ جب تک سعد بن وقاص قند کو راضی نہ کرلیں گے میں ان سے بولوں گی نہیں ۔۔۔ چنانچہ سعد بن وقاص نے اس کو راضی کیا اور اس کے بعد آپ اُن سے ہمکلام ہوئیں۔

الغرض جس حد تک گانے کا تعلق ہے موسیقی و غناء اسلام میں حرام نہیں ہے بعض نے اس کی حرمت کا فتویٰ دیتے ہوئے اس آیت کو استدلالاً پیش کیا ہے:۔

"ومن الناس من یشتری لہو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم ویتخذہا ہزوا اولئک لہم عذاب مہین"

کیونکہ ان کے نزدیک غناء لہو الحدیث میں داخل ہے، حالانکہ یہ آیت نضر بن حارث کے حق میں نازل ہوئی تھی جو فارس سے

قدیم سیر و تاریخ کی کتابیں لاکر ترجمہ کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ یہ قرآن سے بہتر ہیں - گانے سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں ——
لیکن اس میں کلام نہیں کہ ابتداء عہد اسلام میں، چونکہ صرف اجتماعی و اخلاقی اصلاح پیش نظر تھی اس لئے اس فن کی ترقی کا کوئی موقعہ نہ تھا —— فنون لطیفہ از خود ایک قوم کی تمدنی ترقی کے ساتھ نشوونما پاتے ہیں - اس لئے ابتدائی حالت میں کسی ملک یا قوم کا ان کی طرف متوجہ ہونا کبھی فنی لحاظ سے مفید نہیں ہو سکتا —— خود تاریخ اسلام کو اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جب رسول اللہ کے بعد فتوحات ہونے لگیں اور تمدنی ترقی کے آثار پیدا ہونے لگے تو ساتھ ہی ساتھ موسیقی کو بھی ترقی ہوئی -

عہد بنی امیہ میں عود، طنبورہ اور دف کے ساتھ قصاید و اشعار گانے کا رواج عام ہو گیا تھا - اور عہد بنی عباس میں تو موسیقی نے ایک مستقل علم و فن کی حیثیت اختیار کر لی تھی - نئی نئی راگنیاں ایجاد ہو رہی تھیں، گانے کے مختلف طریقے سوچے جا رہے تھے اور ماہرین کی ایک جماعت مستقلاً اسی فن کی خدمت کر رہی تھی، چنانچہ یونس، احمد ابن المکی، عمرو بن بانہ، بذل المغنیہ، اسحاق موصلی، اس عہد کے خاص ماہرین موسیقی تھے اور مؤلفین میں جو شہرت یعقوب بن اسحاق الکندی، ابونصر فارابی اور بو علی بن سینا کو حاصل تھی وہ بھی ارباب تاریخ سے مخفی نہیں -

---

فنِ رقص اور تاریخ اسلام

"یہاں سے چلے جاؤ، اگر تم ہم آہنگی (Harmony) سے ناآشنا ہو"

(افلاطون)

تمہید اس وقت دُنیا میں جتنے فنون رائج ہیں، اُن میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کا سُراغ عہد قدیم تک نہ پہونچتا ہو، فرق یہ ہے کہ بعض فنون کی موجودہ ترقی یافتہ صورت اس قدر بدل گئی ہے کہ درمیان کی ارتقائی کڑیوں کا علم نہ ہونے کی وجہ سے انکا سلسلہ عہد قدیم ہماری سمجھ میں نہیں آتا، اور بعض میں ایسا زیادہ تغیر نہیں ہوا ہے اور ہم آسانی سے معلوم کرسکتے ہیں کہ یہ اسلاف قدیم کی یادگار ہے۔

موسیقی و رقص، اور تعمیر و نقاشی ان ہی فنون میں سے ہیں جن کا عہد قدیم سے واسطہ بواسطہ ہم تک منتقل ہو کر آنا نہایت روشن طور پر واضح ہے اور اس کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں۔

موسیقی و رقص میں، باعتبار زمانہ کس کو تفوق حاصل ہے، یہ بتانا مشکل ہے، لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ رقص کی بنیاد موسیقی سے پہلے قایم ہوئی ہوگی، کیونکہ انسانی اعضا میں اس وقت بھی حرکت پائی جاتی تھی جب اس نے کوئی زبان ایجاد نہ کی تھی اور رقص نام ہو صرف اعضاء انسانی کی حرکت کا۔

رقص کی تاریخی قدامت قدیم ترین اقوام میں رقص کے رواج کا سبب کیا ہوا، اس کی تحقیق مشکل ہے لیکن بظاہر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس کا تعلق صرف تفریح سے تھا اور دیوتاؤں کے سامنے رقص کرنا بھی اُن کے خوش کرنے کے لئے تھا، لیکن بعد کو جب عظمت و احترام کے حقیقی مفہوم سے انسان آشنا ہوا تو وہ رقص جو دیوتاؤں کے سامنے بھی محض تفریح کے لئے کیا جاتا تھا اس میں ایک دینی اہمیت پیدا ہوگئی اور تفریح کا خیال محو ہو کر عبادت کا جذبہ اس سے متعلق ہوگیا جس نے رقص کی دو قسمیں (دینی و دنیاوی) علٰحدہ علٰحدہ کردیں۔ امم قدیمہ میں بنو اسرائیل رقص میں بہت مشہور تھے جس کا سبب غالباً حمایت دینی تھا۔

یہ ہیکل اور شلیم میں عبادت کے وقت رقص کے عادی تھے جیسا کہ کتب مقدس سے ثابت ہوتا ہے خود داؤد نبی کا رقص کرنا اور لوگوں کو رقص کے ذریعہ سے خدا کی عبادت کرنے کی ہدایت کرنا بھی ان ہی مقدس کتابوں سے پایا جاتا ہے۔

یونانیوں کے یہاں رقص کی دو قسمیں تھیں ایک دینوی جو ان کے گھر کی محفلوں میں رائج تھا اور دوسرا دینی جو جیوپیٹر کے مندروں میں کیا جاتا تھا۔ منروا دیوتا کے سامنے جو رقص ہوا کرتا تھا وہ مسلح ہوا کرتا تھا اور یہی بنیاد رقص عسکری کی تھی۔ زہرہ اور باخوس

(شراب کا دیوتا) کے مندروں میں جو رقص ہوتا تھا اس کی شان دوسری تھی۔ اسپارٹا میں جو ایک اور قسم کا رقص رائج تھا جو کسٹورو پکس کی ایجاد تھی۔ تالیکرتوس نے جو رقص ایجاد کیا تھا اس میں جوان مرد اور جوان عورتیں سب شریک ہوتی تھیں، یہ رقص دینی و اخلاقی فرائض میں شامل تھا اور قضاۃ و حکام بھی اس کی مشق کیا کرتے تھے۔

ایتھنس اور اسپارٹا کے لشکر جب میدان جنگ میں جاتے تھے تو چنگ و رباب پر رقص کرتے تھے اور یہ رقص اس قدر معزز سمجھا جاتا تھا کہ انھوں نے ایلاتون (رقص عسکری کے موجد) کا مجسمہ قائم کیا تھا۔ اعیاد و ولیوس کے موقع پر اور قربانگاہ اپلون کے گرد طرباں رقص کیا جاتا تھا۔

روما میں بھی رقص کی دو قسمیں تھیں حربی و دینی، حربی رقص کا موجد رومولس تھا اور رقص دینی میں وہ رقص بہت مشہور تھا جسے بُت مریم کے پوجاریوں نے ایجاد کیا تھا، چنانچہ قدیم عیسوی کلیساؤں میں اس رقص کا رواج کثرت سے تھا اور رومن کیتھولک ممالک میں اب بھی رائج ہے۔

مملکت اشور کے آثار سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ دینی رقص اُن کے ہاں پایا جاتا تھا اور ساز کے ساتھ رقص کرتے تھے۔ رہا ہندوستان سو یہ شعر و موسیقی کا ملک ہی تھا اور یہاں پرستش کا مفہوم ہی صرف رقص و موسیقی قرار دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے قدیم روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی کا موجد برہما اور اس کی بیوی سرستی نے ساز ایجاد کیا تھا۔ اس کے علاوہ گندھرب وغیرہ دیوتاؤں کا گانا بجانا اور دعوتوں میں رقص کرنا بھی ان کے مذہبی لٹریچر سے ثابت ہے۔

ہندوستان کے قدیم موسیقی داں، شاعر بھی ہوا کرتے تھے اور رقاص بھی، کیونکہ آواز، ساز اور حرکت جسم کا ہم آہنگ ہونا مذہبی مراسم کی جان سمجھی جاتی تھی۔ ان کے ہاں موسیقی کے سات حصے کئے ہیں جن میں چوتھا نمبر رقص کا ہے۔ الغرض دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں رقص کا رواج ازمنۂ قدیم میں نہ رہا ہو اور جس کی یادگار اب بھی وحشی اور متمدن اقوام میں پائی جاتی ہو۔ حبشیوں کا حلقہ بنا کر رقص کرنا، ہندوستان کے گونڈوں کا دو دو مل کر ناچنا، سنتھال عورتوں کا دائرہ بنا کر رقص کرنا، اسی طرح تمام دیگر ممالک کے وحشی باشندوں میں رقص کا پایا جانا اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ عادت موجودہ انسان کو اس کے اسلاف سے ملی ہے اور کبھی اس کو معیوب قرار نہیں دیا گیا

اس وقت دنیا میں ایک مسلمانوں ہی کی قوم ایسی ہے جو رقص کو معیوب سمجھتی ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو اس خیال میں مسلمان مذہبی قیود سے بھی بہت آگے بڑھ گئے ہیں اور انھوں نے اس فن جمیل کے محاسن کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

عبدالفتاح عبادہ نے عربی میں ایک دلچسپ مضمون "فن رقص اور عہد اسلام" کے موضوع پر لکھا ہے اور بہت محنت سے اس نے عرب و اسلام کی تاریخی و مذہبی روشنی میں اس پر غور کیا ہے، اس لئے ہم یہاں اس کا ملخص درج کرتے ہیں۔

فاضل مضمون نگار نے پہلے مصریوں کے فن رقص سے بحث کی ہے کہ اُن کے ہاں یہ کس قدر رائج تھا اور اُنھوں نے اس میں کس قدر ترقی کی، اس کے بعد اس نے عربوں کے رقص کو لیا ہے اور پھر عہد اسلام میں اس کی کس قدر ترقی ہوئی اس کا ذکر کر کے مضمون کو نہایت خوبی کے ساتھ ختم کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

رقص عرب جاہلیت میں

دوسری قدیم قوموں کی طرح عرب جاہلیت میں بھی رقص کا رواج پایا جاتا تھا یہاں تک کہ بعض علماء نے اس کو ترجیح دی ہے کہ کعبہ کا طواف جو زمانۂ جاہلیت میں ہوتا تھا وہ بھی ایک قسم کا رقص تھا۔

آیت۔ "وما کان صلوٰتہم عند البیت الا مکاءً و تصدیۃً" کی تفسیر میں زمخشری اور بیضاوی لکھتے ہیں کہ "عورتیں اور مرد ایک دوسرے کی انگلیوں میں انگلیاں ڈالکر سیٹیاں اور تالیاں بجاتے ہوئے برہنہ طواف کرتے تھے[1]، ان کے علاوہ اور مفسرین نے اس سے بھی زیادہ لکھا ہے[2] جو آپ کو مختلف تفاسیر میں ملے گا اور یہ عربوں ہی پر موقوف نہیں بلکہ تمام قدیم قومیں اپنے معابد و ہیاکل میں رقص کیا کرتی تھیں، ہیاکل منف، طیبہ، ہیلیوپولیس، ہیاکل اورشلیم، نینوا، بابل اور معابد بعل، عشتاروت، زردشت، جوپیٹر، زہرہ (Venus) وغیرہ رقص کا مرکز تھے، توریت میں آیا ہے کہ یہودی رقص کے ذریعہ سے عبادت کیا کرتے تھے، غرض اس میں شک نہیں کہ "مذہبی رقص" قدیم قوموں کا نہایت ترقی یافتہ اور مقدس رقص تھا۔

تمام قوموں میں رقص کا وجود ایک ہی اسلوب پر ہوا ہے، یعنی رقص بطور ریاضت جسمانی اور مرد عورت اس میں برابر حصہ لیتے تھے، بدوی اقوام جو اپنی فطرت اولی پر باقی تھیں وہ سب رقاص تھیں، مثلاً عرب ایام جاہلیت اور بدویت میں رقص کرتے تھے، مرد حلقۂ رقص میں کھڑا ہو کر، اچھلتا تھا، کودتا تھا، تلوار سے کھیلتا تھا اور ایسی حرکات کرتا تھا، جو اس کی شجاعت اور شدت قوت پر دلالت کرتی تھیں، اسی طرح عورت اسی حلقہ میں کھڑی ہو کر اپنی حرکات رقص سے اپنے اعضاء کی رعنائی، جسم کی شادابی، قامت کا اعتدال، التفات و توجہ جسمانی لوچ کا حسن مردوں پر ظاہر کرتی تھی۔

عرب ایام جاہلیت میں اپنے تیوہاروں اور بت پرستی کے مراسم میں دوسری قوموں کی طرح رقص کیا کرتے تھے اور شاید جاہلیت کا طواف کعبہ ان مذہبی مراسم میں سب سے مقدم تھا، جن میں رقص کیا جاتا تھا، تاریخ سے ثابت ہے کہ رقص ان قوموں کے نزدیک دینی مراسم میں شامل تھا، بلکہ بعض کے مذہبی فرائض اور عبادت میں داخل تھا[3]، ان اقوام کے نظام زندگی پر غور کرنے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رقص ان کے ہاں حربی مظاہر میں داخل تھا اور حالت جنگ میں جذبات حماست کو برانگیختہ کرنے کے لئے اسی طرح کیا جاتا تھا جس طرح معابد و ہیاکل میں جذباتِ عبودیت کے اظہار کے لئے مستعمل تھا۔ جاہلیت کے شہسواروں کے جو قصے منقول ہیں، اور ان کے اشعار جو لڑائیوں کے وقت گائے جاتے تھے، اس حقیقت کی پوری پوری تائید کرتے ہیں۔

عرب ایام جاہلیت اور عہد اسلام میں نغماتِ اشعار پر رقص کرتے تھے اور سب سے پہلا لحن جو خاص طور پر اسکے لئے بنایا گیا تھا "لحن خفیف تھا"، مرد اور عورت دف اور مزامیر کے ساتھ چلتے تھے، اور نغمات شعری سے پرنشاط ہو کر ابن خلدون کی رائے کے مطابق رقص کرنے لگتے تھے[3]، اسکے بعد رقص کی مناسبت سے خاص قسم کے لحن اور بحروں کا اضافہ ہوا جن میں ہزج، رمل اور خفیف الرمل داخل ہیں۔

الغرض رقص عربوں کے ہاں ایام جاہلیت اور اسلام دونوں میں پایا جاتا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ اسلامی دور میں جو رقص ہوتا تھا وہ بہ اقتضائے

---

[1] کشاف جلد ا صفحہ ۳۰۲ مطبوعہ بولاق سنہ ۱۳۱۸ھ۔ بیضاوی جلد ا صفحہ ۳۲۹ مطبوعہ قسطنطنیہ سنہ ۱۳۰۵ھ۔ [2] تفسیر فخرالدین رازی جلد ۴ صفحہ ۳۲۹ مطبوعہ طبع شرف سنہ ۱۳۰۸ھ۔ [3] دائرۃ المعارف مادہ رقص۔

ترقی و تمدن زیادہ بہتر اور ترقی یافتہ تھا۔

رقص اور مذہب

اس سے پہلے کہ ہم عہد اسلام کے رقص پر تاریخی روشنی ڈالیں یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ کے متعلق مذہبی نقطۂ نظر سے بحث کی جائے۔ اور دیکھا جائے کہ اسلام کا مذہب اسکے متعلق کیا حکم دیتا ہے۔

جب ہم اسلامی احکام پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو کوئی ایسا حکم نہیں ملتا جو رقص کی حرمت پر دلالت کرے، سوائے اُس صورت کے جبکہ رقص معیوب، خلاف ادب اور بہیمی خواہشوں کو برانگیختہ کرنے والا ہو۔ ابن حجر اور ان کے علاوہ دوسرے جلیل القدر مسلمان علماء نے تصریح کی ہے، کہ رقص اس صورت میں حرام ہے جبکہ اس میں لچک اور مٹک پائی جائے۔ اس لئے کہ لچک اور مٹک اس فعل کو خواہش سے ملادیتی ہیں۔ لیکن مطلق رقص حرام نہیں ہے، کیونکہ یہ حدیث میں وارد ہے کہ حبشیوں نے رسول اللہؐ کی مسجد میں آنحضرتؐ کے سامنے رقص کیا ہے، اور آنحضرتؐ نے بڑی دیر تک کھڑے ہو کر اس رقص کو دیکھا اور حضرت عائشہ کو دکھایا۔

علما اور فقہا کے اقوال بالاتفاق اس حکم کو ثابت کرتے ہیں۔ امام نووی منہاج میں لکھتے ہیں کہ رقص مباح ہے بشرطیکہ اُس میں لچک اور مٹک نہ ہو، امام الحرمین کہتے ہیں کہ رقص حرام نہیں، کیونکہ وہ چند سیدھی اور ٹیڑھی حرکتوں سے عبارت ہے البتہ اسکی کثرت تہذیب کے منافی ہے، اسی طرح صاحب العمدہ نے جو شوافع میں سے ہیں، کہا ہے کہ اصل رقص مباح ہے، العماد سہروردی اماثنی اور حلبی نے اپنی کتاب منہاج میں رقص کو مباح لکھا ہے بشرطیکہ اُس میں مٹک نہ ہو لیکن شیخ الاسلام عزالدین عبدالسلام نے تو رقص کو علی الاطلاق جائز قرار دیا ہے، اور وہ خود بھی رقص کرتے تھے۔ اسی طرح امام سیوطی، سراج الدین بلقینی، عبدالوہاب شعرانی وغیرہ علماء نے لکھا ہے کہ امام غزالی نے اس کے جواز پر یقین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رقص، سرور و نشاط کی تحریک کا سبب ہے، اور ہر سرور مباح ہو لہٰذا اس کی تحریک بھی جایز ہے اور اگر وہ حرام ہوتا تو عائشہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حبشیوں کا رقص نہ دیکھتیں۔

صحابہ کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے کہ جب وہ مسرور ہوئے ہیں تو انھوں نے رقص کیا ہے جس کا سبب ان کی مسرت تھی اور یہ حضرت حمزہ کی بیٹی کے قصہ[1] میں وارد ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ کیا تم حبش کے رقص کو دیکھنا چاہتی ہو۔ اور بخاری شریف میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ عید کا دن تھا اور اہل سودان ڈھال اور چھوٹے نیزوں کے ساتھ رقص کرتے تھے تو آنحضرتؐ نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تم اسے دیکھنا نہیں چاہتیں، میں نے کہا ہاں چاہتی ہوں۔ آپ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کیا میرا رُخسار آپ کے رُخسار پر تھا اور آپ نے فرمایا کہ "شروع کردو اے بنی ارفدہ" یہاں تک کہ جب میں تھک گئی، تو آپ نے فرمایا کہ بس؟ میں نے کہا کہ جی ہاں، آپ نے فرمایا اچھا اب جاؤ۔[2]

امام غزالی کہتے ہیں کہ یہ تمام احادیث صحیحین میں وارد ہیں، اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ غنا اور رقص حرام نہیں ہیں اولاً کھیل کی اباحت دوسرے اس کا مسجد میں کیا جانا، تیسرے آنحضرتؐ کا فرمانا کہ شروع کردو اے بنی ارفدہ اور کھیل کا حکم دینا، چوتھے

---

[1] اس قصہ کی تفصیل بخاری اور احیاء العلوم جلد ۲ صفحہ ۲۵۰ میں دیکھو۔ [2] بخاری باب العیدین

دیر تک کھڑے رہکر اسے دیکھنا اور سننا، پانچویں آنحضرتؐ کا ابتدا میں حضرت عائشہ سے یہ فرمانا کہ کیا تم دیکھنے کی خواہش رکھتی ہو۔ اور یہ کوئی اضطراری فعل نہ تھا، یہ تمام قیاسات اور نصوص غنا اور رقص وغیرہ کی اباحت اور جواز پر دلالت کرتے ہیں۔

لہذا ہر ملک کے مسلمان علما نے باوجود اختلاف مذاہب و حالات، جملہ اقسام رقص کے متعلق یہی کہا ہے، اور اسی خیال کی اکثر فقہا تائید کرتے ہیں جو غنا کے جواز کے قایل ہیں اور یہی حضرات صوفیا کا مذہب ہے لیکن فن رقص تشدد پسند، اور دین میں سختی پیدا کرنے والے فقہا کے حملوں سے محفوظ نہیں رہا، یہ فقہا ہر ایسے شخص کو ساقط العدالت سمجھتے تھے، جو غنا سے اشتغال رکھتا ہو۔ اور جو شخص تصویر بناتا، یا کوئی مجسمہ طیار کرتا وہ ان کی نظر میں مشرک سمجھا جاتا تھا۔ لہذا اس مخالفت سے اس فن کو بھی وہی نقصان پہونچا جو دوسرے فنون جمیلہ کو پہونچا ہے

ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان علماء نے رقص کے جواز پر سنت اور قیاس سے دلایل پیش کئے ہیں سنت تو وہی حضرت عائشہ کی حدیث ہے جو صحیحین میں مسجد کے اندر رقص حبش کے متعلق وارد ہے اور قیاس یہ کہ فرع اپنی اصل کے ساتھ علت حکم میں مساوی ہونا چاہئے لہذا یہاں بھی اصل فصل اہل حبش اور حضرت علی اور ان کے شریک صحابہ پر قیاس کیا جا سکتا ہے، لہذا ثابت ہوا کہ اسلام نے رقص کو حرام قرار نہیں دیا جب تک کہ اس میں مٹک اور لچک کی حرکتیں نہ پائی جایئں جو شہوات بہیمی کو برانگیختہ کرتی ہوں اور یہ اس ترقی یافتہ شریعت کا حکم ہے جو اخلاق کی پاکیزگی اور رفعت کی حمایت کرتی ہے اور یہی حمایت اقوام کے ناموس اور ادب کی حمایت کے لئے مطلوب ہے۔

مسئلہ رقص کے متعلق جو کہ ہم نے بیان کیا ہے یہ ایک منصف مزاج طالب حق اور ایک کج رو متعصب دونوں کے لئے کافی ہے اور ہم اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ آگے یہ ثابت کریں گے کہ مسلمانوں نے رقص کے بارہ میں صرف اسی حد تک اظہار خیال نہیں کیا ہے بلکہ علمی حیثیت سے اس میں بہت کچھ رقص کیا ہے۔

رقص کی تاریخ اسلامی تمدن میں

مسلمانوں نے رقص کا شمار منجملہ علوم و فنون کیا ہے اور جس کو ہم ذلیل چیز خیال کرتے ہیں۔ اُسے ہمارے عرب اسلاف ایک بڑا فن سمجھتے تھے اُنھوں نے اس کو اظہار عواطف اور وجدانیات کا ذریعہ، اور ہوشیاری اور کمال کا سبب قرار دیا تھا۔ انھوں نے رقص کو صرف کھیل اور دل بہلانے کی چیز تصور نہیں کیا، بلکہ اسکے متعلق لکھا ہے:۔ "رقص ایک علم ہے جو حرکات موزوں کی کیفیت سے بحث کرتا ہے اس حیثیت سے کہ وہ حرکات دیکھنے والے کی طبیعت میں نشاط و سرور پیدا کریں"۔ عربوں نے اس فن کے اقسام اور احکام کے متعلق متعدد کتابیں لکھی ہیں[1]۔

عربوں کی اقسام رقص

جو ممالک اسلامی حکومتوں کے زیر نگیں تھے، اُن کے مختلف حصوں میں مختلف قسم کے رقص پائے جاتے تھے، اہل خراسان، فارس، مصر، مغرب اور اندلس سب کا طرز رقص ایک دوسرے سے مختلف تھا، بلکہ ایک حکومت میں جو رقص تھا وہ دوسری حکومت کے رقص سے اختلاف رکھتا تھا۔ دولت اموی اور عباسی میں جو رقص کی قسمیں اور شکلیں تھیں وہ حکومتہائے اندلس، مغرب، فارس اور ترکوں سے علحدہ تھیں، اسی طرح فاطمیین اور ممالیک کے عہد حکومت کے رقصوں میں اختلاف تھا۔ اسی طرح عورتوں، اور مردوں کا رقص ایک دوسرے سے علحدہ صورت رکھتا تھا۔ ان تمام حکومتوں کے اقسام رقص کو چھوڑ کر صرف سلطنت عباسیہ کے رقص کو لیتے ہیں جس نے ایک طویل عرصہ تک حکومت کی ہے، اور اسکا تمدن بھی بلحاظ اپنے اثرات اور وسعت کے بہت شاندار تھا۔

---

[1] [illegible] کشف الظنون [illegible]

ہم ذیل میں اُن تمام انواع رقص کا ذکر کرتے ہیں جو عباسیوں کے دور حکومت میں عروج پر پہونچی تھیں۔

اس عہد میں اقسام رقص آٹھ تھے، خفیف، ہزج، رمل، خفیف الرمل، ثقیل الثانی، خفیف الثانی، خفیف الثقیل الاول اور ثقیل الاول، لیکن افسوس ہے کہ اب ان اقسام رقص کا صرف نام باقی رہ گیا ہے اور انکی تفصیلات زمانۂ ماضی کی تاریکیوں میں پوشیدہ ہوگئیں[1]۔

رقص کے قواعد اور شرائط

عربوں نے فن رقص میں چند شرطیں مقرر کی تھیں، جن کی تکمیل ضروری تھی مثلاً خفت روح، حرکات رقص کو بہترین طریقہ پر ادا کرنا، رقص کی مختلف حرکات میں حرکت کی لطافت اور رعنائی کو شامل کرنا، گردن کا طول کمر کی باریکی، جسم کی خوبصورتی۔ دامن کا گول ہونا۔ پیروں کی لچک، انگلیوں کی نرمی، اور ان کا ہر طریقہ سے مڑنے کے قابل ہونا۔ جوڑوں کی نرمی حالت رقص میں سرعت انتقال، خوش خرامی، کمر کی لچک، نظام تنفس کی درستی، دیر تک عمل رقص میں مشغول رہنے کی طاقت انواع رقص میں ایک حسین تصرف کرنا، اور ہر ایک جزئی حرکت کے احکام و قواعد کا لحاظ رکھنا، رقص میں گھوم جانے کی لطافت، قدموں کا اپنے مدار پر قایم رہنا، دائیں اور بائیں پیر کے عمل کا ایک ہی طریقہ پر برابر ہونا وغیرہ وغیرہ۔

عربوں کے رقص میں قدموں کے اُٹھانے اور رکھنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہر قدم کا اوپر نیچے جانا اور آنا آہنگ موسیقی کے ساتھ اور دوسری صورت یہ ہے کہ تال کے ساتھ قدم زمین پر جائے اور خالی پر اُٹھ جائے یا بالکل برعکس۔

علامہ ابن خلدون نے اس تناسب کو اس طرح لکھا ہے کہ تناسب رقص کبھی بسیط ہوتا ہے اور اکثر لوگوں میں فطری طور پر پایا جاتا ہے، ان کو اس کے حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

رقاص جماعت کے آداب

جس طرح ایک رقاص فرد کے لئے خاص قواعد اور قوانین ہیں اسی طرح ایک رقص کرنے والی جماعت کو بعض اُصول کا پابند ہونا پڑتا ہے اور نہایت سختی سے ان قواعد کا لحاظ کیا جاتا ہے، جیسا کہ آجکل اہل یورپ کی مجالس رقص میں اس قسم کے آداب کی رعایت ضروری خیال کی جاتی ہے، ان شرایط میں اہم ترین شرط یہ ہے کہ رقاص جماعت میں بدنظمی اور بے ترتیبی پیدا نہ ہو اور ان کی حرکات میں رقص کی نوعیت تبدیل نہ ہوجائے اور رقاص جماعت میں وہ شخص داخل نہیں ہوسکتا جو بمقابلہ دوسرے رقاصین کے مہارت کم رکھتا ہو۔ یا اس میں سرعت انتقال کا وصف نہ پایا جائے۔ یا دیکھنے والے اس میں تصنع محسوس کریں۔ ان قواعد کی رعایت رقص صوفیہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ غزالی اور نویری لکھتے ہیں کہ آداب رقص میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ رقص کرنے والی جماعت کے ساتھ محفل رقص میں ایسا شخص شامل نہ ہو جس کے رقص میں ثقل پایا جائے اور اس کی وجہ سے رقص کے نظام میں بے ترتیبی پیدا ہو اس لئے کہ وہ رقص جس میں تکلف نہ پایا جائے مباح ہے اور جو شخص سچائی سے رقص کے لئے کھڑا ہو (یعنی اس کا جذبۂ رقص سچا ہو) تو وہ حاضرین پر بھاری نہیں ہوتا۔ بشرطیکہ اُن کے قلوب صداقت اور تکلف کا صحیح معیار ہوں[2]۔

مشہور رقاص

تاریخ اسلام میں بہت سے مشہور رقاصوں کے نام محفوظ ہیں، دولت عباسیہ کے زمانۂ عروج میں کیش اور عبدالسلام فن رقص میں بڑے کامل ماہر گزرے ہیں، صاحب آغانی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ یہ دونوں نہایت باکمال رقاص تھے

---

[1] مسعودی جلد ۸ صفحہ ۳۲۵ — [2] احیاء العلوم جلد ۲ صفحہ ۲۵۱ — نہایت الارب نویری جلد ۴ صفحہ ۲۰۸ —

لیکن اسحاق موصلی جو عربی موسیقی میں زبردست ماہر گزرا ہے رقص میں ان دونوں پر سبقت لے گیا ہے، ابوالفرج اصفہانی اسحاق موصلی کے اس رقص کا تذکرہ کرتے ہوئے جو واثق باللہ کے سامنے اُس نے کیا تھا لکھتا ہے، "اسحاق کھڑا ہوا اور اس نے نہایت طرب انگیز رقص کیا" اس کا رقص کبیش اور عبدالسلام سے بھی بہتر تھا حالانکہ وہ دونوں نہایت اچھا رقص کرنے والے شمار کئے جاتے ہیں"۔ اس پر واثق باللہ نے کہا "اسحاق سے زیادہ کوئی اس فن میں کمال نہیں رکھتا"[1]

مصر و اندلس میں تمدنِ اسلامی کے عہد عروج میں فنِ رقص میں بہت سے لوگوں نے کمال پیدا کیا تھا اس دور کے مشہور رقاص جنھوں نے تمام اسلامی ممالک میں شہرت حاصل کی تھی اور وہ بادشاہوں کے حضور میں رقص کرتے تھے حیدر بن احمد بن ابراہیم ابوالحسن اور ان کے بھائی ابراہیم تھے یہ دونوں ملک اشرف شاہ مصر کے دربار میں حاضر ہوئے اور رقص اور موسیقی کا کمال دکھایا۔ ابن حجر نے "دررِ کامنہ" میں اس کا تذکرہ کیا ہے[2] ان کے علاوہ مشہور رقص کرنے والوں میں جعفر رقاص بھی تھا۔ جس کا تذکرہ آیندہ ہوگا۔

حالتِ رقص میں پیروں کی حرکت کو مصعب ہندی نے ایک رقاص کی تعریف میں کس خوبی سے بیان کیا ہے:

"عجبت من رجلین یتباہ۔ یعلوھما طوراً و تعلوانہ کان افعیین یلسعانہ"[3] یعنی میں اس کے دونوں پاؤں دیکھ کر بہت متعجب ہوا جو اس کے بالکل قابو میں ہیں کبھی وہ ان دونوں کو اٹھاتا ہے اور کبھی وہ دونوں اسے اٹھاتے ہیں۔ گویا کہ دو سانپ پے در پے اس کو کاٹ رہے ہیں"۔

ایک خوبصورت رقاص کے وصف میں ابن خروف اندلسی کا قول بھی خوب ہے جس سے رقص کے متعلق اندلسی ذوق کا پتہ چلتا ہے ملاحظہ ہو:۔

ومنوع الحرکات یلعب بالنہی	اپنے حرکات رقص میں تنوع پیدا کرکے دلوں کے ساتھ کھیلتا ہے
لبس المحاسن عند خلع لباسہ	جو لباس سے عریاں ہو کر سراپا حسن نظر آتا ہے
متاوداً کالغصن وسط ریاضہ	وہ لچکتا ہے مثل اس شاخ کے جو باغ کے درمیان ہو
متلاعباً کالظبی عند کناسہ	اور اس طرح کھیلتا ہو جس طرح ہرن اپنے مستقر کے پاس کھیلتا ہے
بالعقل یلعب مقبلاً او مدبراً	وہ پیٹھ پھیر کر اور مقابل ہو کر لوگوں کی عقلوں سے اس طرح کھیلتا ہے
کالدہر یلعب کیف شاء بناسہ	جس طرح کہ زمانہ لوگوں سے جیسا وہ چاہے کھیلتا ہے، وہ
ویضیم المقدمین منہ راسہ	اپنے دونوں پاؤں سے اپنے سر کو ملا دیتا ہے
کالسیف ضم ذبابہ لریاسہ[4]	جس طرح تلوار وسطے اور نوک سے دوہری ہو کر مل جاتی ہے

اور مصری رفا ایک رقاص کے متعلق کہتا ہے:۔

اذا اختلجت انامہ لرقص	جب اُس کی انگلیاں رقص کے لئے حرکت کرتی ہیں

---

[1] اغانی جلد ۵ صفحہ ۹۲۔ [2] درر کامنہ ابن حجر قلمی جلد ۲ حرف ح۔ [3] محاضرات الراغب اصفہانی جلد ۱ صفحہ ۲۲۴۔ [4] نفح الطیب جلد ۲ صفحہ ۱۳۸

تری حب القلوب الیہ تزدی	تو قلوب کی محبت اُس کی طرف کھنچتی چلی جاتی ہے۔
حبیبی انت احسن من تثنی	اے میرے دوست تو اُن سب میں زیادہ حسین ہو جو لچک کر
علی وتر واحسن من تلوی	نغمۂ ساز پر تھرکا کرتے ہیں اور اُن سب سے خوبصورت ہے جو رقص کے لئے حرکت کرتے ہیں

رقص کرنے والی عورتوں کا شمار مردوں سے بہت زیادہ ہے اور عربوں کے زمانۂ تمدن میں جو رقص کرنے والی کمال پیدا کرتی تھی اُسکی شہرت تمام ملک میں ہو جایا کرتی تھی، نازنین خوبصورت عورتیں جو بلحاظ رعنائی کے رقص کے لئے موزوں ہوتی تھیں اور اُن میں وہ تمام شرطیں پائی جاتی تھیں جو رقص میں کمال حاصل کرنے کے لئے ضروری تھیں، اُنھیں یہ فن خاص طریقہ سے سکھایا جاتا تھا۔ ایسی لڑکیاں خاص طور پر تلاش کی جاتی تھیں جن کی کمر باریک، اعضاء سڈول، پیر نازک، اُنگلیاں اور جوڑ نرم ہوں اور یہی وہ شرطیں جو عربوں کے نزدیک رقاص میں ضروری خیال کی جاتی تھیں۔ ایسی جامع الشروط لڑکیوں کو فنِ رقص کے ساتھ موسیقی کی بھی تعلیم دیجاتی تھی تاکہ اُن کے حُسن و جمال اور حرکاتِ رقص اور نغماتِ موسیقی سے ذوقِ سماعت و بصارت دونوں لطف اندوز ہوں اور حیات کی مسرت تکمیل کو پہونچے۔ خلفاء، شاہانِ اسلام اور امراء نے مجالس رقص میں شرکت کی ہے اور مشہور صاحبِ فن ماہرین کا رقص دیکھا ہے۔

بغداد کے آلاتِ رقص

دولتِ عباسیہ کے زمانۂ ترقی میں اس فن سے اس درجہ دلچسپی لی جاتی تھی کہ بغداد و عراق کے دوسرے شہروں میں رقص کے لئے خاص قسم کے آلات ایجاد کئے تھے۔ ابن خلدون، ابن مہدی اور دوسرے اہل بغداد و عراق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ رقص کے لئے خاص قسم کا لباس اور آلات بنائے گئے تھے اور وہ اشعار بھی خاص اوزان کے ہوتے تھے جن کے ترنم پر رقص کیا جاتا تھا۔ لوازمِ رقص میں سے لکڑی کے بنے ہوئے گھوڑے ہوتے تھے ------------------ جن پر زین کسا ہوا ہوتا تھا اور چھت سے معلق کر دئے جاتے تھے

عورتیں اثنائے رقص میں مختلف حرکات کرتی ہوئی ایک دوسرے کی طرف دوڑتی پیچھے ہٹتی اور گھوڑوں پر کود کر سوار ہو جاتی تھیں۔ اس کا بغداد اور عراق کے تمام شہروں میں رواج تھا اور وہاں سے اور ممالک میں بھی پھیل گیا"[1]

اندلس کے آلاتِ رقص، اور ناچنے والیاں

ابن خلدون کی تاریخ پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ عربی شاعری میں رقص کیلئے مخصوص اوزان تھے جو رقص کے وقت گائے جاتے تھے اور عباسیوں کے زمانہ میں جبکہ رقص کو بڑی ترقی ہوئی تھی، اشعار رقص ایک مستقل حیثیت رکھتے تھے۔ اسی طرح لباس اور بعض آلات بھی ناچنے کے لئے مخصوص تھے۔ آلاتِ رقص جن کو کرج کہتے ہیں اور فرانسیسی میں (Carrousal chevaux de bois) کہلاتے ہیں، بغداد کی عورتوں کی ایجاد تھے، یہ چیزیں عراق سے براہ اندلس تک پہونچیں۔ شقندی اپنے رسالہ تفضیل الاندلس علی بر العدوہ میں لکھتا ہے اہل اندلس کو رقص سے خاص دلچسپی تھی۔ منجملہ لوازم رقص کرج کا شمار کیا گیا ہے، اُس نے اشبیلیہ میں آلاتِ رقص و سرود میں خیال، کرج، وطہ، موقس، کثیرہ، زلامی، شقرہ، نفار، عود، قانون، رباب وغیرہ کو دیکھا ہے۔[2]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۵۴ مطبوعہ مصر۔ [2] مقری جلد اصفحہ ۲۰۴، ۲۲۸، تاریخ الطب جلد ۱ صفحہ ۲۲۳، ۲۲۴، مجلہ عرب ۱۹۵۵ء

اگرچہ یہ آلات اندلس کے دوسرے شہروں میں بھی پائے جاتے تھے مگر اشبیلیہ میں ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ابن رشد کہتا ہے کہ جب کسی عالم کی وفات ہوتی تھی اور اُسی کی کتابیں بیچی جاتی تھیں تو اُنھیں قرطبہ بھیجا جاتا تھا اور اگر کوئی مطرب مرتا تھا تو اُسکے آلات طرب اشبیلیہ میں فروخت ہوتے تھے۔ ابن رشد کے اس بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بمقابلہ دوسرے شہروں کے اشبیلیہ میں فنونِ جمیلہ کا زیادہ رواج تھا۔

اس کے بعد شقندی نے اندلس کے دوسرے شہروں کا حال لکھتے ہوئے شہر عابدہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہاں کی رقاصہ عورتیں اپنے فن کے لحاظ سے مشہور تھیں اور تلوار سے کھیلنے میں بھی خاص مہارت رکھتی تھیں۔

خیال، رقص وطرب کا ایک مشہور آلہ ہے۔ اس کا تذکرہ شقندی نے کیا ہے۔ اس کو خیال الظل، خیالِ رقص اور خیالِ جعفر رقص بھی کہتے ہیں۔ جعفر اس کے موجد کا نام تھا۔ خفاجی نے شفاء العلیل میں لکھا ہے کہ جعفر خیال کے موجد کا نام ہے جیسا کہ ابن عبد ربہ کہتا ہے:-

ایاکم ان تنکروا جعفراً	خبردار جعفر اور اس کے ساتھیوں کے کمال کا ہرگز انکار نکرو
ذالک الخیالی واصحابہ	وہ جعفر جو خیالی یعنی موجد "خیال" ہے
فنیل مصرکم لہ جعفراً	مصر کا دریائے نیل بھی ایک جعفر ان سب سے
مختلف یخرج فی بابہ	علحدہ رکھتا ہے۔

صرف اندلس کی رقاصہ عورتیں خیالِ رقص کو استعمال نہیں کرتی تھیں، جیسا کہ شقندی نے ذکر کیا ہے بلکہ یہ کھیل مصر و عراق وغیرہ کی مشرقی عورتوں میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ وجیہہ منابی کے اشعار جو اس نے خیال سے کھیلنے والی ایک لڑکی کے متعلق لکھے ہیں اس بات پر دلالت کرتے ہیں، اشعار یہ ہیں:-

وجاریۃ معشوقۃ اللھو اقبلت	اور بہت سی لڑکیاں جنکا کھیل دلنشین ہے کس طرح سامنے آتی ہیں۔
بحسن کزہر الروض تحت کمام	حسن کے ساتھ جس طرح پھول شگوفوں کے نیچے،
اذا انغنت قلت شکوی صبابتہ	اگر وہ نغمہ ریز ہو تو میں کہونگا اس کا نغمہ شکوۂ محبت ہے
وان رقصت قلنا حباب مدام	اور اگر رقص کرے تو ہم کہیں گے کہ وہ (اپنی لطافت تحرک میں) شراب کا حباب ہے
ارتنا خیال الظل والستر دونھا	اس نے خیال الظل ہم کو دکھایا اور وہ پردہ کے پیچھے تھی:
فابدت خیال الشمس خلف غمام	تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا ہم آفتاب کو ابر کے پیچھے دیکھ رہے ہیں۔
تلعب اشخاصاً لہا خلف سترھا	وہ اپنے خاص لوگوں سے پس پردہ کھیل رہی ہے۔
کما لعبت افعالھا بانام	جس طرح اپنے افعال سے ایک مخلوق کے ساتھ کھیلتی ہے۔

لہ شفاء العلیل ۔۔۔ مطبعہ مصر لہ مطالع البدور فی ۔۔۔ صفحہ ۲۲

"وکز" ایک خاص قسم کا رقص تھا جس میں شہر عابدہ کی عورتوں نے مہارت حاصل کی تھی اور اسوقت تک بصرہ میں زنگی یکھیل کھیلتے ہیں۔ اسی طرح "اخراج النفری" "مرابط" "قنوفہ" بھی خاص کھیل تھے، جن میں جسم کی سبکی اور مشق اور مہارت کی ضرورت تھی ابن خلدون کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اندلس کی عورتیں مردوں کی طرح تلواروں کے ساتھ رقص کرتی تھیں، کاٹھ کے گھوڑے پر سواری کرنا ایکدوسرے پر حملہ کرنا بھاگنا کودنا یہ سب مردانہ کھیل کھیلا کرتی تھیں۔

عورتوں کے رقص میں اہل اندلس کا خیال

فن رقص کو اہل اندلس نے نہایت مکمل اور باقاعدہ کرلیا تھا۔ جیسا کہ ابن خلدون لکھتا ہے کہ اندلس کی رقاصہ عورتوں کے متعلق ابن حمدیس شاعر سے اندلس کے ایک ادیب نے استدعا کی کہ وہ اندلس کی کسی رقاصہ کا وصف اپنے کلام میں اس طرح بیان کرے کہ اہل اندلس کے ذوق رقاصی اور رعنائی کی پوری تشریح ہو۔ اندلس کی رقاصہ اپنی انگلیوں سے ہر عضو کی طرف اشارہ کرتی ہے جس پر محبت نے اپنا اثر ڈالا ہو۔ اگر آنسو کا ذکر آتا ہے تو اپنی آنکھ کی طرف اشارہ کرتی ہے اگر وجد و محبت کی تکلیف بیان کی جاتی ہے تو دل پر ہاتھ رکھتی ہے اسی طرح محبوب کے ناز و ادا عاشق کے تذلل و پرستاری کو اپنے اشارات و حرکات سے اس طرح ظاہر کرتی ہے کہ اصل واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اس پر ابن حمدیس نے یہ شعر کہے :-

وراقصتہ بالسحر فی حرکاتھا	اور بہت سی رقص کرنے والیاں ایسی ہیں کہ اپنی ساحرانہ حرکات سے
تقیم بہ وزن الغناء علے عدّ	غنا کے اوزان کو اپنی حد پر قایم رکھتی ہیں۔
منغمتہ الفاظھا بترنم ۔	اپنے الفاظ کے نغموں سے ایسا ترنم پیدا کرتی ہیں کہ
کسا معبدا من عزہ ذلتہ العبد	غلاموں کے مالک باعزت شخص ان کی محبت میں ذلیل ہیں
تدوس قلوب السامعین بزخمتہ	سامعین کے دلوں کو اپنی سریلی آواز سے پامال کرتی ہیں
بہا لقلت مالمحون من العد	اور کوئی لحن ایسا نہیں ہے جو اس آواز میں نہ پایا جائے
بقد یموت الغصن من حرکات	انکا قد ایسا ہو کہ انکے مقابلہ میں لچکنے والی شاخ شرم سے ساکن اور پژمردہ ہے
سکونا وابن الغصن من نزہتہ القد	اور واقعہ یہ ہے کہ شاخ میں وہ لطافت کہاں جو قد میں پائی جاتی ہے
وتحسبہا عا تشیر بانمل	تم انھیں دیکھ کر یہ خیال کروگے کہ وہ اپنی انگلیوں سے
الی ایلاتی کل عضو من لوجد	اپنے ہر اس عضو کی طرف اشارہ کرتی ہے جو محبت کی مصیبتیں جھیل رہا ہے
بنالا بہا ماتشتکی من جوی الہوی	اور سوزش قلب اور آلام محبت کی جو شکایت وہ کرتی ہیں وہ حقیقت میں انکی ذات میں نہیں بلکہ ہماری ذات میں پائی جاتی ہے ۔
وما دمع اشواق مخدودۃ الخد[1]	اور شوق کے ایسے آنسو پائے جاتے ہیں جنھوں نے رخساروں میں گڑھے ڈالدیے ہیں

[1] دیوان ابن حمدیس صفحہ ۱۱ و صفحہ ۹۰ مطبوعہ روما ۱۸۹۷ء

ابن حمدیس ایک طویل قصیدہ میں موسیقی پر رقص کرنے والی عورتوں کے متعلق کہتا ہے :-

وسود الذوائب یسحبنہا	اور ایک سیاہ گیسوؤں والی اپنی گیسوؤں سے اس طرح کھینچتی ہے
کسعی الاساود فوق الکثیب	جس طرح کالے ناگ کسی پر دوڑ رہے ہوں
توافق بالرقص اقدامہن	حالت رقص میں ان کے قدم اس قدر ہم آہنگ ہوتے ہیں
بطأن بہن نغمات الذنوب	کہ ان سے نغمہ کا غیر معصوم پہلو محو ہوجاتا ہے
یشرن الی کل عضو بہا	وہ اپنے ہر عضو کی طرف اشارہ کرتی ہے
یحل بہ فی الہوی من کروب	اور بتاتی ہے کہ اس میں آلام محبت جائز ہیں
بسطنا لہا وھی مثل الغصون	ہم اُسکے لئے فرش ہوگئے اور وہ تروتازہ شاخ کی مانند ہے
تمیس بہن الصبا والجنوب	جس کے ساتھ بادِ صبا اور جنوبی ہوا اٹکھیلیاں کرتی ہو۔
علی الارض مناخدود الوجوہ	زمین پر اس کے لئے ہمارے رخسار فرش ہیں۔
وبین الضلوع خدود القلوب[1]	اور پہلو میں دل کے رخسار فرش ہو چکے ہیں۔

اور رقاص عورتوں کی دراز دامنی کا وصف اس طرح کرتا ہے :-

ومن راقصات ساحبات ذیولہا	اور بعض رقص کرنے والیاں
شواذ بمسک فی العبیر تضمخ	اپنے مشک و عنبر سے رنگین دامنوں کو لٹکائے ہوئے ہیں۔
کما جررت اذیالہا فی ہدیلہا	جب وہ رقص میں دامن کشاں ہوتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتی ہیں
حمایم ایک اوطواویس تبذخ[2]	جیسے جنگل کی مست کبوتریاں یا اترانے والے طاؤس

اقسام مذکورہ کے علاوہ اہل اندلس میں اور مختلف انواع رقص کا رواج تھا چنانچہ جماعت شفائیہ (Sarabande) کا خاص رقص مشہور تھا اور ان سے اس رقص کو اہل یورپ نے سیکھا چنانچہ وہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں اُنھوں نے متعدد اقسام کے رقص سیکھے ہیں اور اب بھی اسپین والوں کے رقص میں عربی آثار پائے جاتے ہیں۔

عرب کی شاعری میں رقاصوں کا وصف ناظرین کو تعجب نہ کرنا چاہئے کہ ہم نے اس مسئلہ میں کثرت سے شعرائے عرب کے اشعار نقل کئے ہیں۔ اس لئے کہ اس موضوع کے لئے شاعروں سے بہتر کوئی شاہد پیش نہیں کیا جاسکتا۔ شعرائے عرب نے راقصین اور راقصات کے وصف میں بڑے تفنن سے کام لیا ہے ابن رومی ایک رقاصہ کی تعریف میں کہتا ہے جو ایک باریک کپڑا پہنتی تھی۔

---

[1] دیوان ابن حمدیس صفحہ ۱۱ و صفحہ ۹۳ مطبوعہ روما ۱۸۹۷ء۔ [2] دیوان ابن حمدیس صفحہ ۱۱۱ و صفحہ ۹۳ مطبوعہ روما ۱۸۹۷ء

اذا ھی قامت فی الشفوف اضاءہا　　جب وہ باریک کپڑے پہنکر کھڑی ہوتی ہے تو وہ کپڑے
سناہا فشفت عن سبیکۃ سابک　　اسکے نورِ حسن سے منور ہو جاتے ہیں اور اسکا جسم پگھلی ہوئی چاندی کی طرح نظر آتا ہے

ایک دوسرا شاعر حرکات رقص کے متعلق کہتا ہے کہ رقاص کے حرکات کو دیکھنے والا بہ سبب اُن کی تیزی کے سکون سمجھتا ہے اور حالت رقص میں اس کی حرکت آفتاب کی طرح ہے جو نظروں کو محسوس نہیں ہوتی۔

تری الحرکات منہ بلا سکون　　تو اس رقاص کے حرکات سریع کو جن میں سکون ہے دیکھے گا
فتحسبہا لخفتہا سکونا　　تو بہ سبب غایت سرعت کے حرکت کو سکون سمجھے گا
کسیر الشمس لیس بمستقر　　اور یہ مثل حرکت آفتاب کے ہے جو ساکن نہیں ہے
ولیس بممکن ان یستبینا　　لیکن یہ ممکن نہیں کہ اس کی حرکت ظاہر ہو۔

ایک دوسرا شاعر رقص کے کمالِ فن کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ گویا زمین ایک بڑے جابر اور قاہر بادشاہ کا سر ہے جس کو وہ لوگ جس کے چھونے سے ڈرتی ہیں۔

یحاذرن وطء الارض حتی کانما　　وہ زمین پر قدم رکھنے سے حذر کرتی ہیں۔
یطان بظہر الارض ھامۃ اصید　　گویا وہ زمین پر نہیں بلکہ کسی جابر و قاہر بادشاہ کے سر پر پاؤں رکھتی ہیں۔

صفی الدین حلی اوزانِ شعر اور نغمات موسیقی کے ساتھ رقاصہ کے ہاتھ پاؤں کی حرکت اور اسکے تناسب کو اس طرح بیان کرتا ہے

والراقصات وقد شدت مآزرہا　　رقص کرنے والیوں نے پٹکے باندھے ہیں،
علی خصور کاوساط الزنابیر　　ایسی کمروں پر جو اپنی باریکی میں زنبوروں کے مثل ہیں
ترعی الضروب بکفیہا وارجلہا　　ان کے ہاتھ اور پاؤں کی حرکت اوزانِ شعر کی مناسبت سے ہوتی ہے
وتحفظ الاصل من نقص وتغییر　　وہ شعر کی اصل کو نقص اور تغیر سے محفوظ رکھتی ہیں۔

ابن محاسن نے ایک پرلطف قصیدہ ایک رقاصہ کی تعریف میں لکھا ہے جس کے بعض اشعار یہ ہیں:-

اذا ہزت معاطفہا لرقص　　جب وہ اپنی کمر کو رقص کے لئے حرکت دیتی ہے،
وحرکت الانامل والنہودا　　اور انگلیوں اور سینہ کو بھی جنبش دیتی ہے،
ومالت والتوت دلاً وظرفاً　　جھکتی ہے، بل کھاتی ہے، ناز و انداز سے
ورنحت الشمائل والقدودا　　اور اپنے اعضا اور قد کو بھی حرکت میں لاتی ہے،
ورمت بقسی حاجبہا الینا　　اور اپنے کمان ابرو سے ہماری طرف تیر چلاتی ہے،
بنبال فتتت منا الکبودا　　تو ہمارے کلیجہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے

جمال الدین ابن حسن بن علی بن داؤد فاروقی حرکات رقص کی سبکی اور سرعتِ انتقال کو اس طرح بیان کرتا ہے:-

للّٰہ راقصۃ تمیل کا نہا	کیا خوب ہے وہ رقاصہ جب وہ جھکتی ہے
ظل القضیب اذا تمایل مزہرا	تو گویا وہ سایہ ہے ایک ایسی شاخ کا جو اپنے پھولوں کو لئے ہوئے لچکتی ہو
تزہو و ترجع کالخیال فلا تری	ظاہر ہوتی ہے اور واپس ہوتی ہے سرعت خیال کی طرح اسلئے اسکے ترکات دکھائی نہیں دیتے
حرکاتھا الا الطارقۃ الکری	مگر اس طرح جیسے خواب شیریں کا خیال آجائے۔
لانت معاطفہا فکیف تلفتت	اُس کے جوڑ نرم ہیں۔ اس لئے وہ دسرعت سے مڑ سکتی ہے۔
وتفلتت لا الیستطاع بان تری	اور مڑتی ہے اس طرح کہ کوئی دیکھ نہیں سکتا۔

ابوالحسن علی بن ابوالسیر اور عزالدین موصلی وغیرہ علی الخصوص شعرائے اندلس نے رقاصہ عورتوں اور رقاص مردوں کے اوصاف میں بہت کچھ اشعار لکھے ہیں جو اس مختصر مضمون میں درج نہیں کئے جاسکتے۔

فن تصویر و رقص

جس طرح فن رقص نے عراق اور اندلس میں ترقی کی تھی اسی طرح جب اسلامی تمدن عراق سے مصر میں عہد فاطمیین میں منتقل ہوا، تو اس فن کو وہاں بھی عروج ہوا۔ مقریزی نے "خطط" میں اس امر کی تصریح کی ہے کہ خلیفہ ظاہر بن الحاکم بامر اللہ کے عہد میں رقص کو کمال ہوا۔ رقاصہ عورتیں ناچتی تھیں اور اس میں بڑی دلچسپی لیجاتی تھی۔ رقص اس پر منحصر نہیں بلکہ تمامتر روحانی لذتیں اس زمانہ میں تکمیل کو پہونچ گئی تھیں، جس طرح رقص مصر میں شعرا کی طبع آزمائی اور مضمون آفرینی کا موضوع تھا، اسی طرح مصورین کے واسطے بھی ایک خاص موضوع کا حکم رکھتا تھا، خلافت فاطمیہ کے زمانہ میں، مصور اور نقاش رقص کے تمام حصّات کی بہترین تصویر کھینچتے تھے۔ قاہرہ اس وقت فنون جمیلہ کا مرکز تھا۔ مشہور مصور قصیر اور ابن عزیز استاد کا مناظرہ مصر میں بڑے زور شور سے ہوا تھا جس کا موضوع رقاصہ عورتوں کا رقص تھا۔ یہ مناظرہ قاضی القضاۃ وزیر یازوری کے سامنے ہوا تھا۔ وزیر مذکور نے قصیر کے مقابلہ کے لئے ابن عزیز کو عراق سے مصر میں بلایا تھا۔ کیونکہ قصیر تصویر کی اُجرت بہت زیادہ لیتا تھا اور اُسے اپنے کمال پر بڑا ناز تھا۔ اس مناظرہ میں قصیر نے ایک رقاصہ کی تصویر سیاہ لباس میں کھینچی۔ رقاصہ صفیہ کی صورت پر تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیوار کے اندر داخل ہو رہی ہے، اور ابن عزیز نے سرخ لباس میں ایک رقاصہ کی تصویر بنائی یہ بھی صفیہ کی صورت پر تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیوار سے نکل رہی ہے۔

مصر کا تمدن جب عروج پر پہونچا ہوا تھا۔ تو اس فن سے مصریوں کی دلچسپی اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ رقص کی تعلیم کے لئے خاص معلم ہوتے تھے، جیسا کہ آج کل ہمارے زمانہ میں ہوتے ہیں اور رقص ایک باقاعدہ پیشہ ہوگیا تھا جس کے متعلق ابن خلدون کہتا ہے کہ "مصر میں بعض ذرایع معاش کو اس درجہ ترقی ہوگئی ہے کہ بمقابلہ دوسرے پیشوں کے اُن سے بہت زیادہ فایدہ اُٹھایا جاتا ہے، کیونکہ ایسے پیشے تمدن کی زیادتی اور تنعم کی فراوانی سے پیدا ہوا کرتے ہیں، ان کی مثال میں غنا اور رقص کے معلمین کو پیش کیا جاسکتا ہے اور جب تمدن معمولی حد سے بھی متجاوز ہوجاتا ہے (تو اس قسم کے مکاسب کی اور بھی کثرت ہوتی ہے) جیسا کہ ہم کو مصر کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہاں پرندوں اور گدھوں کو تعلیم دیکر سدھایا جاتا ہے، اور ماتم اور رقص کی باضابطہ تعلیم ہوتی ہے۔"

امرا اور خواص کا رقص

تمدن اسلام کے دور ترقی میں رقص صرف عورتوں اور عام مردوں میں محدود نہ تھا بلکہ خاص لوگوں میں بھی پایا جاتا تھا۔ مصر میں شاہان ممالیک کے زمانہ میں بادشاہ کی مجالس اور تقریبات میں امرا رقص کرتے تھے، چنانچہ بادشاہ اشرف خلیل بن قلاوون نے جب سنہ [illegible]ھ میں اپنے مشہور محل "الاشرفی" کی عمارت مکمل کی، تو نئے محل میں ایک عظیم الشان جشن کیا اس کے متعلق مقریزی لکھتا ہے، "جب امرا رقص کے لئے کھڑے ہوئے تو شاہی خزانچی نے ان پر اشرفیاں برسائیں" بلکہ عراق، مصر، اندلس اور فارس وغیرہ میں جب عربی تمدن انتہائے عروج پر تھا تو بڑے طبقہ کے لوگ بھی رقص سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ رقص و سرود و خناہ و آلات موسیقی سے خود بھی انہوں نے شغلہ کیا ہے، فقیہ، محدث، طبیب اور بڑے صاحب وقار قاضی اور صوبوں کے گورنروں نے اس میں حصہ لیا ہے چنانچہ وزیر مہلبی کی مجلس میں بہت سے قاضی اور دیگر اکابر قوم جن میں قاضی التنوخی بھی ہوتے تھے ہفتہ وار جمع ہوتے تھے ان میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو سفید ریش بزرگ نہ ہو۔ اسی طرح وزیر مہلبی بھی ایک معمر اور با وقار شخص تھا۔ اس اجتماع کی مسرت اس طرح تکمیل کو پہونچائی جاتی تھی کہ ہر ایک شراب سے لبریز پیالہ اپنے ہاتھ میں لیتا تھا اور داڑھی کو اس میں غوطہ دیکر ایک دوسرے پر چھڑکتا تھا اس شغل کے بعد سب کے سب رقص کرنے لگتے تھے رقص کے ساتھ آلات طرب اور گانا بھی ہوتا تھا۔

خلفا اور شاہان اسلام کی سب سے زیادہ عجیب مجلس رقص جس میں بڑے بڑے ارباب دولت اور خاص عہدہ دار باری باری سے رقص کرتے تھے منصور بن ابی عامر کی مجلس اندلس میں تھی جس کے متعلق صاحب نفح الطیب لکھتا ہے "منصور بن عامر کی مجلس میں کثرت سے لوگ جمع ہوتے تھے اور باری باری رقص کرتے تھے جب ابن شہید کی نوبت آتی تھی تو وہ رقص کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھتا تھا۔

ھاک شیخاً قادہ السکر لکا،	اس بڈھے کو دیکھو جسے شکر نے بدمست کر دیا ہے
قام فی رقصتہ مستہلکا	وہ اپنے رقص میں جاہ و مال پر دریغ نہیں کرتا
لم یطق یرقصہا مستثبتاً	وہ حالت رقص میں ذہنی مسرت کے اضطراب سے ٹھہر نہیں سکتا
فانثنی یرقصہا مستمسکا	وہ جھک جاتا ہے اور کسی شے کو پکڑ کر رقص کرتا ہے۔
من وزیر فیہم رقاصتہ	اور ایک وزیر بھی اس زمانہ میں رقص کرنے والا ہے۔
قام للسکر ینا غی الملکا۔	جو بدمست ہو کر کھڑا ہے اور بادشاہ سے ہمسری کرتا ہے

خلاصہ

یہ تمام روایات عرب کے حسن ذوق اور لطافت طبع پر دلالت کرتی ہیں، تاریخی واقعات جو اوپر ذکر کئے گئے عرب اور دوسری اسلامی سلطنتوں کی حالت پر روشنی ڈالنے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کس درجہ فن رقص سے دلچسپی لیجاتی تھی، رقص غنا اور موسیقی سے اُن کی حیات اجتماعی کی مسرت مکمل ہوتی تھی (جیسا کہ آجکل یورپ اور امریکہ میں ہوتا ہے) یہ طبعی اور فطری مسرتیں ہیں جو وقار و متانت کے ہرگز منافی نہیں بلکہ اسباب خلافت اور مسرت میں شمار کی جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مسرتیں اس وقت تک اُن میں پائی گئیں جب تک کہ اُن کا تمدن عروج پر رہا اور اُن کے وہ اخلاق عالیہ سے محروم ہوئے جو اپنے تاریک عہد میں ان فنون جمیلہ کی طرف حقارت و عداوت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کو نہایت ذلیل یا اقسام کفر سے شمار کرتے تھے۔

تاریخ عرب کی ایک روایت جمیل

پہلی صدی ہجری کا ایک واقعۂ حسن و عشق

اور

معاویہ و حسین کے کردار کا فرق

وہ روایت جو اس مختصر مضمون کی بنیاد ہے، کوئی فرضی واقعہ نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے مسعودی صاحب آغانی، ابن قتیبہ، حموی اور ابن بدرون وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

اس واقعہ سے غوامض تاریخ عرب کا اگر ایک یہ باب سامنے آتا ہے کہ خلفاء راشدین کے بعد امویین کی حکومت کیا اسلوب اختیار کر رہی تھی اور ان کی حیات اجتماعی میں کن اخلاق کا نشوونما ہو رہا تھا، تو دوسری طرف معاویہ کے بالکل برعکس حسین کی سیرت کا وہ نمونہ بھی سامنے آتا ہے، جو بعد کو "ذبح عظیم" کی صورت میں حکومت بنی امیہ پر ایک ایسی بے لاگ تنقید کر گیا جس کی نظیر دنیائے حق و صداقت میں مشکل سے دوسری مل سکتی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں اہل عرب کی "روح ادب" کس ذوق سے وابستہ تھی اور ان کے ہاں ایک "عورت" کی تکمیل نسائیت کا صحیح معیار کیا تھا۔

افراد :-

حسین	=	ابن علی مرتضیٰ
معاویہ	=	ابن ابی سفیان (امیر وقت)
یزید	=	معاویہ کا بیٹا اور ولی عہد
رفیق	=	معاویہ کا معتمد علیہ نوجوان غلام
عبداللہ بن سلام	=	والیٔ عراق
ارینب	=	عبداللہ بن سلام کی بیوی اور اپنے عہد کی بے مثل جمیل عورت

ابوہریرہ = صحابی رسول

ابوالدرداء = صحابی رسول

معاویہ کی ایک جوان لڑکی

(رات کا وقت - یزید اپنے کمرہ میں مسند زرنگار پر مغموم سا بیٹھا ہوا ہے، عود وعنبر کا دھواں فضا کو معطر کئے ہوئے ہے سامنے اسباب بادہ خواری مہیا ہے، اور رفیق (معاویہ کا غلام) سامنے خاموش حکم کا منتظر ہے)

یزید (جام شراب ہاتھ میں لیکر) "اے رفیق، میں نے تجھے اس لئے یاد کیا کہ آج ترک نشاط کا عہد کرنے والا ہوں اور شاید تجھ سے بہتر شاہد اس کا اور کوئی نہ ہو سکتا (جام رفیق کی طرف بڑھاکر) لے، اس کو باہر جاکر کہیں دور پھینک آ اور یہ سارا سامان چور چور کر ڈال، رفیق، جلدی کر، یہ خون کے گھونٹ کب تک پیوں گا، اور دل کی آگ کو کہاں تک اس طرح اور بھڑکاتا رہوں گا"

رفیق (دو زانو ہو کر یزید کے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے) "اے خاندان امیہ کے چشم و چراغ، تعمیل حکم مجھ پر فرض ہے، لیکن اگر کبھی کبھی غلام کی گستاخیاں معاف کی جا سکتی ہیں، تو مجھے پوچھنے دیجئے کہ اس وقت سرزمین عرب کی وہ کونسی دولت و لذت ہے جو آپ کے قدموں تک پہونچنے کی آرزومند نہیں اور وہ کیا آزار ہو سکتا ہے جس نے ایسے حسین و جمیل شاہزادہ کو اسدرجہ ملول بنا رکھا ہے؟

یزید - (منہ پھیر کر) "رفیق، جا، اصرار نہ کر، دل کا چھالا پھوٹتا ہے، تو زہراب بہتا ہے، بہتر یہی ہے کہ میرا آزار، راز ہی رہے، ورنہ ممکن ہے کہ اس کا اظہار خود میرے لئے اور زیادہ باعث تکلیف ثابت ہو"

رفیق - (کمر سے پیش قبض نکال کر یزید کے سامنے رکھتے ہوئے سر جھکاکر) "لاعلمی کی حالت میں اصرار کئے جانا اور ہلاک ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ زندہ رہوں اور اس علم کے ساتھ کہ آپ نے مجھے رازداری کا اہل نہ سمجھا۔ اگر آپ کو اتنا پراسرار ہے تو مجھے اس بے اعتباری کی زندگی بسر کرنے سے انکار۔ رفیق اب اپنا سر لیکر یہاں سے واپس نہیں جا سکتا۔ اس لئے میں ادھر جام پھینکتا ہوں اُدھر آپ اس پیش قبض کو میری گردن پر پھیر دیجئے"

یزید - (پیش قبض کو لیکر دور فرش پر پھینکتے ہوئے) "رفیق، کیوں مجھے مجبور کرتا ہے کہ اپنے غم میں تجھے بھی شریک کروں جبکہ اس کا داد ادُنیا میں کوئی نہیں، امیرالمومنین (امیر معاویہ) کی پدرانہ شفقت، امیرانہ مرحمت کونسی ایسی ہے جو مجھے حاصل نہیں، لیکن یہ میری بدقسمتی کی انتہا ہے کہ با وجود ان تمام الطاف خسروانہ کے میری بے نوائی کا وہی عالم ہے اور میری مجبوریاں علی حالہا قائم"

"اگر زندگی کی حقیقی راحت و مسرت، اگر حیات کی سچی لذت و عذوبت کا تعلق کبھی قلب و روح سے بھی ہو سکتا ہے تو مجھ سے زیادہ ماتم گسار اور کون ہو سکتا ہے کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ میرا جسم ملبوس زرنگار سے آراستہ نظر آتا ہے، میری روح ایک گدا کی طرح محتاج ہے اور جس وقت دنیا حشم و خدم کے ساتھ مجھے دیکھتی ہے تو میرا قلب ایک ویرانہ کی طرح سنسان ہوتا ہے"

"میری یہ امیرانہ زندگی، یہ شاہانہ سطوت، یہ ملوکانہ اقتدار، یہ خسروانہ جاہ و جلال، حقیقتاً یہ سب ایسے پردہ کے نقش و نگار ہیں جس کے اُٹھ جانے کے بعد سوائے سوگ اور ماتم کے کچھ نظر نہیں آ سکتا"

جسم سے نہیں میرے قلب سے پوچھ کر اس نرم سند سے زیادہ سنگ خارا کوئی اور ہو سکتا ہے، کام و دہن نہیں روح سے دریافت کر کہ ان نعایم و لذائذ سے زیادہ گرسنگی کوئی اور ہو سکتی ہے۔ دنیا جس وقت مجھے نشۂ شراب میں بدمست دیکھتی ہے۔ اس وقت مجھ پر خود دنیا ہی خون پینے کا جنون ہوتا ہے اور زمانہ جب مجھ کو محو نغمہ و موسیقی دیکھتا ہے، تو اس وقت میری ہستی یکسر فریاد و آہ ہوتی ہے، لیکن کس سے کہوں کہ کوئی راز داں نہیں، اور کیوں کہوں جب میرے درد کا کوئی درماں نہیں۔"

رفیق - "سچ ہے، مجھ میں نہ راز داں بننے کی اہلیت اور نہ تلاش درماں کا سلیقہ، لیکن یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ آپ کے ساتھ اپنا دل دکھانے اور آپ کے قدموں پر اپنی جان دیدینے کی تمیز مجھ میں ضرور ہے، اس لئے مجھے اس کا موقعہ دیجئے، اس کی اجازت دیجئے، حیران ہوں کہ معاویہ کا بیٹا، سفیان کا پوتا، جس کا مردانہ عزم سنگین سے سنگین قلعہ فتح کر سکتا ہے، وہ ایک عورت کے نرم و نازک دل کی طرف سے اس درجہ خائف ہو، ذرا میں بھی تو سنوں کہ حرم کی کنیزوں، امرا کی بیٹیوں میں وہ کون ایسی بدنصیب ہے جو آپ کی پُرجوش محبت کی قدر کرنا نہیں جانتی۔ حُسن و شباب ہر چند نہایت بیش بہا دولت ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس سے زیادہ ارزاں سودا بھی کسی اور چیز کا نہیں ہوتا۔ کچھ کہئے تو سہی کیا یہ عتاب حبابہ و عذرا، رباب و سلمہ پر ہے، یا کوئی اور سرزمین نجد کی لڑکی ہے جس نے آپ کو اس قدر دیوانۂ محبت بنا رکھا ہے۔"

یزید - (ایک آہ سرد کے ساتھ) "نہ وہ میری کنیزانِ حرم میں سے حبابہ و عذرا ہے نہ نجد کی کوئی لیلیٰ، بلکہ وہ عراق کی تاکستان کی شراب ہے، وہاں کے باغ کی بہار ہے، وہ اریب ہے اور خوش نصیب عبداللہ بن سلام، والی عراق کی بیوی، جس کے حصول کے لئے میں صرف وہ ایک لمحہ چھوڑ کر جس میں اس کے لب میرے لب سے متصل ہوں، اپنی ساری زندگی دیدینے کے لئے آمادہ ہوں۔ اے رفیق تو نے اُسے نہیں دیکھا اس لئے شاید مجھ پر ہنسے لیکن باور کر کہ صحرائے عرب آج تک کوئی ایسا غزال رعنا پیدا نہیں کر سکا، اور نہ سرزمین شام نے ایسی سیہ چشم نازنین آج تک کبھی دیکھی۔ اس کی رعنائی ایک ایسا تیر ہے جو ایک بار دل میں پیوست ہو جانے کے بعد نکالا نہیں جا سکتا، اس کی چشم شہلا کی ہر نگاہ غلط انداز ایک ایسا کرشمہ ہے جس میں بیک وقت سحر بھی ہے اور شراب بھی جو سحور بھی کر دیتا ہے اور مخمور بھی۔ اس کی لانبی سیاہ پلکیں جن کی جنبش بہ حالت التفات رگِ جاں ہے اور بہ صورت عتاب نوکِ سناں، اس حریر سے بنائی گئی ہیں، جسے نازنینان روما کی نرم و لچیلی انگلیاں طیار کرتی ہیں۔ وہ اس کے نازک لب جن کے دیکھنے کے بعد ہی گلاب کی ملفوف پنکھڑی کا مفہوم ذہن میں آ سکتا ہے، ایک ایسا سرچشمۂ حیات ہیں جس سے سیراب ہونے کے لئے جان کی قربانی حد درجہ اقلِ تعبیر شوق ہے۔ وہ اس کا صبیح رنگ، جس سے آفتاب طلوعِ صباح کا استعفا کرتا ہے، وہ اس کے سیاہ بال، جن سے برسات اپنی بھیگی ہوئی خنک رات طلب کرتی ہے، وہ خوبصورت دانت جس سے الماس اپنے سرمایۂ ضیا کا آرزو مند ہے، وہ رخسار جن سے شمع محفل کسب نور کرتی ہے، اور اسی طرح اس کے جسم کا ہر ہر حصہ، اس کی خوش ادائیوں کا ایک کرشمہ، اس کی عشوہ فرمائیوں کا ایک ایک رمز، اک مستقل دنیائے لذت و نشاط ہے، جس کے اظہار کے لئے عالم و نقش شعر میں اس وقت تک کوئی نقاش و شاعر پیدا ہی نہیں ہوا۔ میں بتاؤں کہ میں نے کب اور کس عالم میں اول اول اسے دیکھا تھا۔ آہ، کلیجہ شق ہو جانا چاہتا ہے۔ وہ ابھی دوشیزہ تھی اس کی شراب حسن ناچشیدہ تھی اور کیف و مستی رمیدہ، ایک رات، وہ ایک ظالم رات جب میں نے اسے دیکھا، تو اپنے

تمام ملکوتی جمال کے ساتھ، وہ زینت و آرائش کا بھی مجسمہ تھی اور ایک تقریب میں اپنی بہت سی ہمسن لڑکیوں کے ساتھ مصروف نشاط تھی میں نے پوشیدہ طور پر ساری رات اس کو محو لہو ولعب دیکھا اور نہیں کہہ سکتا کہ کھیلتے ہی کھیلتے اس نے کتنی بار اور کس کس طرح، میری روح اور میری حیات کا سودا کر لیا، اس عمر میں خدا معلوم کتنی حسین لڑکیاں میری نگاہ سے گزر چکی ہیں جن کے حسن جمال جن کے شاعرانہ ذوق اور نغمہ و موسیقی نے مجھے مالوف کیا اور میں ان کی قدر کرنے پر مجبور ہو گیا، لیکن میرا ذرہ ان کے سامنے جھک جاتا اس وقت تک تھا جب تک اُرینب کے آفتاب حسن نے میرے سامنے طلوع نہ کیا تھا۔ لیکن جس وقت اس نے طلوع کیا تو میں اس کے سامنے جھک گیا، اس کو پوجنے لگا اور عہد کر لیا کہ ساری عمر اس کی پرستش میں صرف کر دوں گا۔

اس رات اس نے جن کمالات نسائی کو پیش کیا ان کا اظہار بالکل محال ہے، وہ اس کا بلند ذوق شعری، وہ برجستہ و برمحل فصیح و بلیغ فقروں کا استعمال، وہ اس کا جاں نواز لحن، وہ اس کا رعشہ براندام کرنے والا رقص، الغرض اس کی وہ تمام دلربائیاں، جنھیں مشکل سے ایک تصور انسانی ایک جگہ فراہم کر سکتا ہے، حقیقی صورت میں میرے سامنے تھیں اور میں زندہ تھا!

رقیق، تو یقین کر کہ اس واقعہ کے بعد ایک ہفتہ تک مجھ پر مدہوشی کی سی کیفیت طاری رہی اور اس کے بعد جب میں نے دریافت حال کیا تو معلوم ہوا کہ اس درمیان میں عبداللہ بن سلام سے اس کا عقد ہو چکا ہے۔ تو اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ خبر سُن کر مجھ پر کیا گزری ہوگی اور اب میں کیونکر دنیا میں مسرور زندگی بسر کر سکتا ہوں۔ اے رقیق اگر تیری کوئی تدبیر اس باب میں کامیاب ہو گئی تو میرے اور تیرے درمیان خدا ہے کہ مجھ سے زیادہ انعامات کی بارش کرنے والا تجھے کوئی نہ ملیگا۔

رقیق۔ "آپ پر میری جان فدا ہو۔ کیا مجھے اس سے زیادہ کسی انعام کی خواہش ہو سکتی ہے کہ آپ نے مجھے اپنا راز دار بنایا اور کیا میں حصول تمنا کے لئے کوئی دقیقہ کوشش کا اُٹھا رکھوں گا۔"

(یزید سر پکڑ کر رہ جاتا ہے اور رقیق پردہ کھول کر باہر نکل جاتا ہے)

(۲)

(صبح کا وقت، معاویہ کی خلوت گاہ، معاویہ ٹہل رہا ہے اور رقیق اُن سے باتیں کر رہا ہے)

معاویہ۔ "یقیناً میں نے یزید کو اپنا جانشین نامزد کرنے میں غلطی کی، اور جو دن گزرتا ہے مجھے اپنی اس غلطی کا احساس زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ غضب خدا کا، شب و روز میخواری، رات دن فسق و فجور اور ہر لمحہ ایک نئی معصیت کی جستجو، میں نہیں سمجھتا کہ اگر یہ میرے بعد خلیفہ ہو بھی گیا تو کون اس کی عزت کرے گا اور عباس و علی کا خاندان کب اس کو حکومت کی مہلت دیگا۔"

رقیق۔ "امیر المومنین کا ارشاد بجا و درست ہے، لیکن غلام کا خیال یہی ہے کہ یزید کی موجودہ زندگی کی ذمہ داری بڑی حد تک ان لوگوں پر بھی ہے جو اپنے آپ کو اس کا بزرگ سمجھتے ہیں۔"

معاویہ۔ (غصہ کی حالت میں کھڑے ہو کر) "رقیق یہ تو نے کیا کہا، کیا تیرا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کو معصیت میں مبتلا کیا، میں نے اس کو شراب کا عادی بنا دیا، میں نے اس کے بیوقوف دماغ میں گناہ کا خیال پیدا کیا؟"

رقیق ۔ (ہاتھ جوڑکر) "نہیں، اے امیرالمومنین، نہیں ۔ یہ کون کہہ سکتا ہے، اس خلاف حقیقت بات کو کون مان سکتا ہے، لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات انسان حالات سے مجبور ہونے کے بعد بھی بعض گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ اسباب نہ پیدا ہوتے تو شاید وہ گمراہ نہ ہوتا۔ اور مجھے یقین ہے کہ یزید کی میخواری اس کی فطرت نہیں بلکہ مجبوری ہے"

معاویہ ۔ "مجبوری! مجبوری کیا ہو سکتی ہے ۔ میں کبھی اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں"

رقیق ۔ "امیرالمومنین، جب انسان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے تو وہ اپنی جانبری کی ہر ممکن تدبیر کرتا ہے ۔ اگر یزید ارنیب کی طرف سے مایوس ہو کر ان مشاغل تفریح سے اپنے نفس کو دھوکا نہ دیتا تو وہ غریب کب کا ہلاک ہو گیا ہوتا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اگر آج ارنیب حاصل ہو جائے تو کل یزید سے زیادہ متقی، کوئی ہو نہیں سکتا"۔

(معاویہ خاموش، سر پکڑ کر رہ جاتے ہیں اور دیر تک یہی عالم رہتا ہے، رقیق باہر جانا چاہتا ہے، معاویہ اس کو روک لیتے ہیں)

معاویہ ۔ "رقیق، تجھ کو یقین ہے کہ یزید کی زندگی میں انقلاب ہو جائے گا اگر ارنیب مل گئی"

رقیق ۔ "اے امیرالمومنین، ایسا ہی یقین ہے، جیسے اس وقت طلوع آفتاب کا"

معاویہ ۔ "اچھا، کاتب کو بلالا"

(کاتب آتا ہے)

معاویہ ۔ "عبداللہ بن سلام والی عراق کے نام میری طرف سے ایک خط لکھو کہ جس قدر جلد آسکتے ہو میرے پاس آجاؤ، کیونکہ ایک امر تمہارے ہی فلاح و بہبود کا سامنے ہے"

(۳)

(عبداللہ بن سلام، معاویہ کا مہمان ہے اور نہایت عزت و اکرام کے ساتھ ایک جگہ ٹھہرا دیا گیا ہے ۔ معاویہ، ابوہریرہ اور ابوالدرداء کے ساتھ اپنے مکان میں بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے ہیں)

معاویہ ۔ (ابوہریرہ اور ابوالدرداء سے) "آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ میری بیٹی جوان ہو گئی ہے اور میں اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں ۔ میں نے عبداللہ بن سلام کو پسند کیا ہے ۔ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے"

دونوں ۔ "انتخاب اچھا ہے اور آپ کی رائے بہت مناسب معلوم ہوتی ہے"

معاویہ ۔ "تو پھر آپ جاکر عبداللہ بن سلام کو میری طرف سے یہ پیغام دیجئے، یقین تو ہے کہ وہ منظور کرے گا"

(وہ دونوں جاتے ہیں ۔ امیر معاویہ کنیز کے ذریعہ سے اپنی لڑکی کو طلب کرتے ہیں ۔ لڑکی اندر داخل ہوتی ہے)

معاویہ ۔ "جس وقت ابوہریرہ اور ابوالدرداء تیرے پاس آکر عبداللہ بن سلام کے ساتھ شادی کرنے کا پیغام تجھ کو دیں تو اس پیغام کو مسرت سے سننا اور جواب دینا کہ مجھے کوئی عذر نہیں، سوا اس کے کہ فی الحال ارنیب اس کے پاس موجود ہے اور ایسی صورت میں میری غیرت شادی کی اجازت نہیں دیتی، اگر وہ اس کو طلاق دیدے تو بیشک میں راضی ہوں"

(۴)

(عبداللہ بن سلام اپنے خیمہ میں منتظر بیٹھا ہوا ہے اور ابوالدرداء اور ابوہریرہ پردہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہیں۔)

ابوہریرہ۔ "معاویہ بہت مسرور ہے کہ تم نے اس تعلق کو خوشی کے ساتھ قبول کیا اور حقیقت یہ ہے کہ معاویہ نہ صرف امیر وقت ہے بلکہ صحابیِ رسول اور کاتبِ رسول ہونے کا بھی فخر اُسے حاصل ہے، پھر یوں بھی شرافت و سیادت، نجابت و امارت ہمیشہ سے اس خاندان میں چلی آرہی ہے، اس لئے یقیناً تم کو خوش ہونا چاہیے کہ اس نے اپنے خاندان میں تم کو شامل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن اس کی لڑکی کو یہ امر واضح ہے کہ ارینب کے ہوتے ہوئے وہ تمہارے ساتھ مسرت کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتی، اسلئے اب صورت صرف یہ رہجاتی ہے کہ تم ارینب کو طلاق دو، یا اس رشتہ سے ہاتھ دھو۔"

(عبداللہ یہ سُن کر گھبرا جاتا ہے اور افسردگی اس کے چہرہ پر چھا جاتی ہے)

ابوالدرداء۔ "یقیناً تم کو ارینب کا چھوڑ دینا بہت شاق ہوگا، کیونکہ علاوہ حسن و جمال، تہذیب و شائستگی کے محبت دیرینہ کا خیال بھی اسکے منافی ہے، لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ معاویہ کے خاندان میں شامل ہونا تمہارے لئے باعث فلاح ہو سکتا ہے تو تم کو چار و ناچار ارینب کو طلاق دینا پڑے گی۔"

عبداللہ۔ "یہ صحیح ہے کہ ارینب ایسی بیوی کا ملجانا میرے لئے انتہائی خوش قسمتی ہے، لیکن ارینب کے لئے یہ امر باعث فخر نہیں ہو سکتا کہ میں اس کا شوہر ہوں۔ اس لئے میرا اس کو چھوڑ دینا اس کے لئے باعث تکلیف نہیں ہو سکتا۔ جو تکلیف ہوگی مجھی کو ہوگی اس لئے اب جبکہ میں اتنا سفر کرکے یہاں آیا ہوں، اور معاویہ کی خود یہ خواہش ہے اور میں اس پر راضی بھی ہوں، تو اب میرا انکار کر دینا صرف جذبات محبت کی بنا پر غالباً سیاست کے خلاف ہے۔ اس لئے میں اس وقت آپ لوگوں کو شاہد بناکر ارینب کو طلاق دیتا ہوں، آپ جائیے اور امیر معاویہ اور ان کی صاحبزادی کو اطلاع دیجئے کہ میں نے ان کی یہ خواہش پوری کردی۔"

(عبداللہ بن سلام باقاعدہ طور پر ارینب کو طلاق شرعی دیتا ہے اور ابوالدرداء ابوہریرہ طلاق کے شاہد ہو کر باہر چلے جاتے ہیں۔)

(۵)

(عراق میں عبداللہ بن سلام کا مکان ۔ امام حسینؑ، ارینب کے یہاں فرش پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ارینب اندر حجرہ میں بیٹھی ہوئی ہے، ابوالدرداء داخل ہوتے ہیں)۔

ابوالدرداء۔ "السلام علیکم"

حسین ۔ "وعلیکم السلام اے صحابیِ رسول"

ابوالدرداء۔ (آنکھوں میں آنسو لاکر) "اے حسین تمھیں دیکھ کر میرے سامنے عہدِ نبوی آگیا، آہ! وہ بھی کیا مسعود و متبرک زمانہ تھا کہ ہمارا جو قدم اٹھتا تھا خدا کی راہ میں اُٹھتا تھا اور آج میں دیکھتا ہوں کہ میری ہر سانس ناراستی کی فضا میں نکلتی ہے۔ خیر، خدا کی مرضی یہی ہے۔ میں یہاں ارینب کو معاویہ کی طرف سے یزید کا پیغام نکاح دینے آیا ہوں۔ لیکن اے جگر گوشۂ رسول آپ یہاں کیسے تشریف لائے؟"

حسین ۔ "میں بھی اسی غرض سے آیا ہوں کہ اریب کو اپنا پیام دوں"

ابوالدرداء ۔ "افسوس ہے مجھے وہ خدمت انجام دینا پڑتی ہے جس کو میرا دل نہیں چاہتا، عبداللہ بن سلام اریب کو طلاق دینے کے بعد معاویہ کی بیٹی کو بھی حاصل نہ کر سکا کیونکہ اس نے انکار کر دیا۔ غالباً آپ نے سُنا ہوگا اور چونکہ عبداللہ بن سلام کو بھی یقین ہوگیا کہ یہ سب مکر و فریب تھا صرف اس لئے کہ کسی طرح اریب کو طلاق دلوا کر یزید سے اس کی شادی کرا دی جائے اور ہر جگہ اس کا چرچا ہوگیا، اس لئے معاویہ نے برہم ہو کر اسے معزول بھی کر دیا اور اب وہ غریب کسی طرف کا نہ رہا"

حسینؑ ۔ "ہاں، یہ ساری خبریں مجھے پہونچ چکی ہیں اور چونکہ آپ بھی اس غرض کو لیکر آئے ہیں اس لئے اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے، کہ اریب سے دریافت کر لیجئے وہ مجھ میں اور یزید میں کس کو پسند کرتی ہے"

(ابوالدرداء حجرہ کے پاس جاکر اریب کو مخاطب کرتے ہیں)

ابوالدرداء ۔ "اے اریب، مجھ کو تیرے حال سے بہت ہمدردی ہے، لیکن اب جبکہ عبداللہ بن سلام مجھے طلاق دے چکا ہے اس لئے کوئی چارہ نہیں سوا اس کے کہ تو کسی اور سے نکاح کرے۔ اس وقت دو شخص تیرے خواہشمند ہیں، ایک یزید، معاویہ کا بیٹا، اور اس کا ولی عہد اور دوسرا حسین ابن علی۔ ان میں سے تو جس کو مناسب سمجھے اپنے لئے اختیار کرے"

اریب ۔ (دیر تک سکوت کرنے کے بعد) "اے ابوالدرداء، اگر آپ اس وقت یہاں نہ ہوتے اور یہ مسئلہ میرے سامنے آتا تو میں اسوقت بھی آپ ہی پر اس کا انحصار کرتی، اس لئے میں آپ سے دریافت کرتی ہوں کہ مجھے اس صورت میں کیا کرنا چاہئے اور میرے لئے فلاح کس کے انتخاب میں ہے"

ابوالدرداء ۔ "میرا اس باب میں کوئی مشورہ دینا مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم خود فیصلہ کرو"

اریب ۔ "ابوالدرداء، میں تمہارے بھائی کی بیٹی ہوں۔ اس لئے یوں بھی تمہیں مشورہ دینا چاہئے تعجب ہے کہ تم صحابی رسول ہو کر دین امر حق کے ظاہر کرنے سے احتراز کرتے ہو"

ابوالدرداء ۔ "اگر تجھے اصرار ہے تو میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ حسین ابن علی میرے نزدیک زیادہ قابل ترجیح ہیں، کیونکہ میں نے رسول اللہ کو حسین کے لب چومتے ہوئے دیکھا ہے"

اریب ۔ "تو بہتر ہے میں حسین کو پسند کرتی ہوں"

(اسی جگہ اور اسی وقت حسین کا عقد اریب سے ہو جاتا ہے اور ابوالدرداء چلے جاتے ہیں)

(۶)

(کچھ زمانے کے بعد امام حسین اپنے مکان میں بیٹھے ہیں اور عبداللہ بن سلام داخل ہوتا ہے۔ اس حال میں کہ اس کا چہرہ بہت مغموم ہے اور غربت و افلاس اس کے کپڑوں سے ظاہر ہے)

حسینؑ ۔ "عبداللہ بن سلام، آؤ، مبارک ہو تمہارا یہاں آنا، کہو، معاویہ کو تم نے کیسا پایا"

عبداللہ بن سلام ۔ (آہ سرد بھر کر) "معاویہ وہ ہے جس نے دھوکا دیکر میری زندگی کی بہترین لذت و نعمت مجھ سے چھین لی، میری امارت و سرداری کو غربت و افلاس سے بدلدیا اور میرا یہ حال ہے کہ دنیا میں کوئی ہستی ایسی نظر نہیں آتی جو میرے حال پر رحم کرے اور اپنی محبت سے میرے مصائب کو قابلِ برداشت بنادے"۔

حسین ۔ "اے عبداللہ بن سلام، اللہ تجھ پر رحم کرے اور تیری تکلیفوں کو دور کرے ۔ اگر میرے لایق کوئی خدمت ہو تو بلا پس و پیش بتاؤ، میں اس کے انجام دینے کے لئے ہر وقت آمادہ ہوں"۔

عبداللہ بن سلام ۔ "ہاں، میں اسی لئے آیا ہوں کہ آپ کے ذریعہ سے ارینب سے اپنی ایک امانت طلب کروں جو میں نے اسکو دی تھی اور ہمیشہ کے لئے اس سے رخصت ہولوں"۔

حسین ۔ (اوٹ کے اندر ارینب سے) "عبداللہ بن سلام اپنی امانت تم سے طلب کرنے آئے ہیں ۔ وہ کیا چیز ہے؟"

ارینب ۔ "مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا چیز ہے ۔ کیونکہ وہ تھیلی میں سربمُہر ہے اور میں نے اسے کھولا نہیں"۔

حسین ۔ "تو بہتر یہی ہے کہ جس شخص نے امانت رکھی ہے خود اس کو اپنے ہاتھ سے واپس کردو"۔

(حسین باہر چلے جاتے ہیں اور ارینب پردہ سے باہر آکر عبداللہ بن سلام کے سامنے آجاتی ہے ۔ عبداللہ متحیرانہ اس کو دیکھنے لگتا ہے اور پھر دونوں رونے لگتے ہیں ۔ کچھ دیر بعد)

عبداللہ بن سلام ۔ (آنسو پونچھتے ہوئے) "اے ارینب، مجھے تیری جدائی کا اتنا ڈر نہیں، جتنا اس امر کا کہ میں اپنے آپ کو تیرے قابل نہ ثابت کرسکا، میں نے جس طرح سے تجھے طلاق دی اس کی سزا اگر کوئی ہوسکتی ہے تو صرف یہ احساس کہ میں نے تجھ سے بیوفائی کی اور اس احساس کے ساتھ تمام عمر بے چین رہنا ۔ اے ارینب مجھے شرم آتی ہے کہ میں تجھ سے ہمکلام ہوں، اور غالباً میں کبھی نہ آتا اگر میری موجودہ سقیم حالت امانت واپس لینے پر مجبور نہ کرتی، کیونکہ اس تھیلی میں ایک قیمتی موتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کو فروخت کرکے کسی جگہ گوشۂ گمنامی میں اپنی زندگی بسر کروں"۔

ارینب ۔ (دامن سے آنسو خشک کرتے ہوئے) "یہ آپ کی امانت حاضر ہے، اور اگر کوئی اور چیز ایسی ہے جو میں پیش کرسکتی ہوں تو اسے بھی بتادیجئے، آپ نے جس محبت و عزت کے ساتھ میرے حقوق ادا کئے ہیں، وہ مجھ سے بہت زیادہ قربانی طلب کرسکتے، چہ جائیکہ مال و زر جو نہایت حقیر چیز ہے"۔

عبداللہ بن سلام ۔ "میں نے تجھے دیا ہی کیا ہے جو طلب کروں، البتہ اگر مجھے یہ معلوم ہوجاتا کہ تو نے میرے اس قصور کو معاف کردیا ہے تو غالباً میں ایک حد تک سکون کے ساتھ زندگی بسر کرسکتا"۔

ارینب ۔ "اللہ اور اس کا رسول شاہد ہے کہ میں آپ کی ہر غلطی کو سچے دل سے معاف کرتی ہوں اور آپ سے بھی یہی استدعا ہے کہ میری طرف سے اگر کوئی فروگزاشت ہوئی ہو جس کا مجھے علم نہیں ہے تو آپ بھی درگزر کیجئے"۔

(عبداللہ بن سلام کا دل یہ سنکر بھر بھر آتا ہے اور اُٹھکر روتا ہوا باہر جانا چاہتا ہے ۔ حسین اندر داخل ہوتے ہیں)

حسین ۔ "اے عبداللہ، تم کو اپنی امانت واپس مل گئی"۔

عبداللہ ۔ "ہاں، مل گئی اور اب میں جاتا ہوں، آپ کی اس عنایت کا شکریہ"۔

حسین ۔ "لیکن ابھی ایک امانت اور ہے جو تم کو ملنا چاہئے"۔

عبداللہ ۔ "وہ کیا، میں نے تو اور کوئی چیز ارنیب کے پاس امانت نہیں رکھوائی تھی"۔

حسین ۔ "لیکن میرے پاس تو ہے"۔

عبداللہ ۔ "وہ کیا ہے، اے میرے سردار"۔

حسین ۔ "وہ ارنیب بنت اسحاق ہے، جس سے میں نے صرف اس لئے شادی کی تھی کہ طلاق دیکر پھر تمہارے ساتھ شادی کر دوں ظاہر ہے کہ اس شدید طلاق کے بعد جو تم نے دی تھی ارنیب تمہاری نہیں ہو سکتی تھی تاوقتیکہ کوئی دوسرا شخص اس سے عقد کر کے طلاق نہ دے اور میں نے مناسب سمجھا کہ یہ خدمت میں ہی انجام دوں"۔

(حسین یہ کہکر باہر چلے جاتے ہیں اور عبداللہ بن سلام اور ارنیب دونوں ایک ایسی حالت کے ساتھ جس میں مسرت کا غیر معمولی جذبہ انسان کو گنگ بنا دیتا ہے، ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں)

خواتینِ عرب کی فیشن طرازیاں

(عہد جاہلیتہ و اسلام میں)

عورت، ہر جگہ عورت ہے، خواہ وہ کشمیر کے مرغزاروں میں پیدا ہوئی ہو، یا صحرائے عرب کے ریگزاروں میں۔ عورت کی یہ جس کہ وہ حسین ہے، جاذب قلب و نظر ہے اور یہ کہ "زیب دیتا ہے اُسے دشمنِ ایماں ہونا" یوروپ و ایشیا ہر جگہ یکساں فرق ہو فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ اگر ایک اپنا دامن مرد کے ہاتھ سے نہیں چھڑا سکتی تو دوسری بگڑ کر یہ کہ گزرتی ہے کہ:

میرا دامن چھوڑئے اپنا گریباں پھاڑئے

الغرض عورت حسین ہو یا نہ ہو وہ اپنے آپ کو ایسا ضرور سمجھتی ہے اور یہی وہ حس ہے جو اس میں جذبۂ آرائش و زیبائش پیدا کرتی ہے۔ پھر یہ حس جو آج مغرب کی عورت میں اس قدر نمایاں طور پر پائی جاتی ہے وہ اس سے قبل ایشیا کی عورت میں بھی پائی جاتی تھی اور جن اسباب غمزہ و ناز سے آج مغرب کی عورتیں آراستہ نظر آتی ہیں، انھیں اسباب سے خواتین ایشیا بھی کسی وقت آراستہ تھیں۔

خواتین یوروپ کی ابداع و اختراعِ وضع و ملبوس آج ضرب المثل ہے لیکن تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ایشیاء کی عورت بھی یہی ذہنیت رکھتی تھی اور ماحول کے اختلاف کے لحاظ سے ہر جگہ اور ہمیشہ اس نے اس ابداع و اختراع سے کام لیا۔

بعض کا خیال ہے کہ خواتینِ عرب عہد جاہلیت میں اپنے وضع و ملبوس کے لحاظ سے سخت وحشی تھیں اور ان میں زیبائش و آرائش کا خیال بڑی حد تک معدوم تھا حالانکہ حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے۔ وہ آرائش و زیبائش کے مختلف طریقوں سے واقف تھیں، ملبوس کی تراش خراش میں بھی اختراع سے کام لیتی تھیں اور وضع میں رنگینیاں پیدا کرنا بھی انھیں معلوم تھا۔ پھر چونکہ اُن کا نہ کوئی دین تھا، نہ قانون اس لئے اس ذوقِ آرائش میں اعتدال قائم رکھنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی اور اسی لئے جب ظہور اسلام ہوا اور اس نے خواتین عرب کے شوقِ تجمیل و آرائش میں نامناسب افراط کو محسوس کیا، تو اس نے "تبرج جاہلیت" (یعنی عہد جاہلیت کی زینت و آرائش) کو ممنوع قرار دیا۔

عہد جاہلیت کا لٹریچر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت عورتیں صرف اُون اور سوت ہی کا لباس استعمال نہ کرتی تھیں بلکہ مختلف رنگ کے دیبا و حریر بھی حسب استطاعت پہنتی تھیں اور جب کسی جگہ اجتماع ہوتا تھا تو بہترین لباس و آرائش کے ساتھ

شریک ہوا کرتی تھیں ۔ المنخل الیشکری لکھتا ہے :۔

الکاعب الحسناء ترفل   فی الدمقس والحریر

(نوجوان حسین لڑکی دیبا و حریر کا ملبوس پہنے ہوئے اترا رہی ہے)

کپڑوں کے زریں نقش و نگار کا حال سلمیٰ بن ربیعہ اس طرح بیان کرتا ہے :۔

والبیض یرفن کالدمی   فی الربیط والمذہب المصون

ربیط سے مراد ڈھیلے ڈھالے کپڑے ہیں اور المذہب المصون سے زریں نقش و نگار رکھنے والے ملبوس اسی طرح کے ہزاروں اشعار عہد جاہلیت کے ایسے پائے جاتے ہیں جن سے وہاں کی عورتوں کی رنگینی طبع و تزئین و تجمیل پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

اس وقت یوروپ میں خاص تقریبات کے وقت امیر گھرانوں کی عورتیں ایسے ملبوس پہنتی ہیں جن کے دامن فرش پر گھسٹتے رہتے ہیں اور غالباً یہی وضع ہے جس کو فارسی میں "دامن کشاں گزشتن" سے ظاہر کرتے ہیں۔ قدیم عربی عورتیں بھی بالکل اسی طرح کے لباس پہنکر مجالس و محافل میں شریک ہوتی تھیں جسے "جرذیول" کہتے ہیں اس فیشن کے متعلق مورخین عرب کا بیان ہے کہ سب سے پہلے اس کو جناب ابراہیم کی بیوی ہاجرہ نے وضع کیا تاکہ دامن کے گھسٹ کر چلنے سے اُن کے نشان قدم مٹتے جائیں اور اُن کی سوکن سارہ کو پتہ نہ چلے اس کے بعد اور عورتوں نے بھی یہی وضع اختیار کی، چنانچہ عرب عورتوں کے اس طرح "دامن کشاں" چلنے کا ذکر کثرت سے وہاں کے اشعار میں پایا جاتا ہے ۔ امرء القیس لکھتا ہے :۔

خرجت بہا امشی تجر ورارنا   علی اثرینا ذیل مرط مرحل

اس شعر میں شاعر اپنی معشوقہ فاطمہ کا ذکر کرتا ہے کہ جب وہ خلوتگاہ سے نکل کر چلی اور عاشق بھی ساتھ ساتھ چلا تو وہ اپنے ملبوس کا دامن گھسیٹتی ہوئی گزری تاکہ دونوں کے نشان قدم مٹتے جائیں اور کسی کو پتہ نہ چلے۔

"مرط مرحل" سے مراد وہ ریشمی کپڑا ہے جس کے اوپر محمل کی تصویریں منقوش ہوں۔

یہ وضع عرب عورتوں میں بہت مقبول تھی اور عہد اسلام میں پائی جاتی تھی چنانچہ عمر بن ابی ربیعہ لکھتا ہے :۔

کتب القتل و القتال علینا   وعلی الغانیات جر الذیول

یوروپ کے عہد وسطےٰ کے بعد بھی عورتوں میں رسم تھی کہ وہ اپنے کولوں کو بڑا دکھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے گدے یا تکیے کمر سے نیچے دونوں طرف باندھ لیتی تھیں۔ اور پھر اس کے اوپر دوسرا ملبوس پہن لیتی تھیں۔

یہ وضع بھی عہد جاہلیت کی عورت نے اختراع کی تھی جسے عظامہ، حشیہ اور رفاعہ کہتے تھے اور اہل لغت نے اس کے معنی لکھے ہیں کہ وہ تکئے کی طرح کپڑے کی گدی ہوتی ہے جس کو باندھ کر عورتیں اپنے کولوں کو بڑا ظاہر کرتی ہیں۔

استعمال زیور:- وہاں کی عورتوں کو بہت شغف تھا اور لباس سے زیادہ اس طرف توجہ تھی۔ اور ایک ایک حصۂ جسم کے لئے متعدد زیور استعمال کرتی تھیں۔ مثلاً ہاتھ کی انگلیوں میں انگوٹھیاں، کلائی میں کنگن، بازو میں جوشن اور پہونچے میں دست بند استعمال کرتی تھیں جنکا

نام علی الترتیب خاتم، سوار، دملج اور جبرۃ تھا۔ دست بند استعمال کرنے کی رسم بعد کو متمدن یوروپ میں جاری ہوئی اور اسوقت تک پائی جاتی ہے۔ انگوٹھیاں وہ دسوں انگلیوں میں پہنتی تھیں اور یہ رسم عہد اسلام میں بھی پائی جاتی تھی چنانچہ عمر بن ابی ربیعہ کا ذکر کرتے ہوئے صاحب آغانی لکھتے ہیں کہ :-

"وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ معشوقہ (ثریا) کے پاس گیا اور جب وہ کپڑے اتار کر اس کے پاس آئی تو اسکے دوست کو دیکھکر لوٹ گئی۔ اس نے کہا کہ شرم کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ میرا دوست ہے اور اس سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ یہ کہکر وہ ہنسنے لگا۔ ثریا کو غصہ معلوم ہوا تو اس نے نکل کر ایسا دوہتڑ مارا کہ دسوں انگوٹھیوں کے نشان اس کی پیشانی پر پڑ گئے"

جب ظہور اسلام ہوا تو عورتوں کا یہ ذوقِ آرائش حد کو پہنچا ہوا تھا، قمیص کا گریبان کھلا رہتا تھا اور دوپٹہ پیچھے لٹکتا رہتا تھا جس سے سینہ و گردن دونوں عریاں نظر آتے تھے۔ اسلام نے اس وضع کو فتنہ سے خالی نہ دیکھ کر حکم دیا کہ عورتیں اپنے دوپٹہ کا پلو سینہ پر دُہرا لیا کریں (ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن و آبائھن)

اس حکم سے ان کو سخت صدمہ ہوا، لیکن چونکہ دینی روح ان میں پوری طرح رچ چکی تھی اس لئے سوائے تعمیل کے کوئی چارہ نہ تھا مگر کچھ زمانہ بعد ایک اور وضع انھوں نے ایجاد کی جو ان کے گمان میں خلاف مذہب نہ ہو سکتی تھی، یعنی تنگ کپڑا استعمال کرنا شروع کیا جسے "وضع قباطی" کہتے تھے۔ ابن رشد نے لکھا ہے کہ قباطی ان تنگ و چست کپڑوں کو کہتے ہیں جو جسم کے نشیب و فراز اور اعضاء کے اُتار چڑھاؤ کو نمایاں کر دیتے ہیں، خلیفۂ ثانی نے اس وضع کو بھی ممنوع قرار دیا کیونکہ اس میں بھی کافی عریانی تھی۔

عرب کی عورتوں کا ملبوس بعض مرتبہ شاعری سے بھی کافی متاثر ہوا ہے اس سلسلہ میں ایک ادبی واقعہ کا بیان کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔ خواتین عرب سیاہ رنگ کا ملبوس اور خاصکر سیاہ دوپٹہ پسند نہ کرتی تھیں۔ ایک بار عراق کا کوئی سوداگر مدینہ آیا جس کے پاس مختلف رنگوں کے دوپٹے تھے۔ یہاں پہونچتے ہی اس کا تمام مال فروخت ہو گیا لیکن سیاہ دوپٹہ کسی نے نہ لیا۔ سوداگر مسکین الدارمی کے پاس گیا جو اپنے زمانہ کا مشہور رنگین مزاج شاعر تھا اور کچھ دنوں سے مسجد کے گوشہ میں بیٹھ رہا تھا۔ مسکین کو اس پر رحم آیا اور خرقۂ زہد اتار کر مسجد سے باہر آگیا۔ اب اس کی وہی شانِ رندی تھی اور وہی ادائے رنگیں۔ اس نے چند شعر لکھکر اپنے ایک دوست کو جو مغنی تھا دئے تاکہ وہ کسی جگہ جاکر گنگنائے۔ وہ اشعار یہ تھے

قل للملیحۃ فی الخمار الاسود	ماذا فعلت براھب متعبد
قد کان شمر للصلاۃ ثیابہ	حتی خطرت لہ بباب المسجد
ردی علیہ صلاتہ وصیامہ	لا تقتلیہ بحق دین محمد [1]

ان اشعار کا مدینہ میں مشہور ہونا تھا کہ گوشہ گوشہ تک یہ خبر پہونچ گئی کہ دارمی کسی سانولی لڑکی کے عشق میں جو سیاہ دوپٹہ اوڑھتی ہے مسجد

---

[1] ان اشعار کا مفہوم یہ ہے:- اس سانولے رنگ کی لڑکی سے جو سیاہ دوپٹہ اوڑھتی ہے جاکر کہو کہ تو نے ایک زاہد شب زندہ دار کا کیا حال کر دیا وہ تو اپنی تمام عمر عبادت و نیایش کے لئے وقف کر چکا تھا کہ ناگہاں تو نظر آگئی اور نماز و روزہ سب خاک میں ملا دیا۔ پھر سمجھ اپنے دین و مذہب کا واسطہ، سچ بتا کیا تو واقعی اس کو قتل کر دیگی

سے باہر آگیا ہے اور مدینہ کی کوئی شیخ لڑکی ایسی نہ تھی جو سیاہ رنگ کی اوڑھنی کی طرف مائل نہ ہوگئی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوداگر نے بہت کافی نفع سے سیاہ رنگ کے دوپٹے فروخت کیے اور اس وقت سے سیاہ دوپٹوں کا رواج شروع ہوگیا۔

سکے بعد سنہرے رنگ کے دوپٹوں کا رواج ہوا، جیسا کہ قاضی کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے جو دارمی کے رنگ میں لکھے گئے تھے:۔

قل للمليحة فی الخمار المذهب افسدت نسک اخی التقی المترهب

نورالخمار و نور وجهک تحته عجبا لوجهک کیف لم یلتهب

وجمعت بین المذهبین فلم یکن للحسن عن ذهبیهما من مذهب

واذا اتت عین لتسرق نظرة قال الشعاع اذهبی لا تذهبی

بالوں کی آرائش کے سلسلہ میں وہاں مناہرہ کا بھی رواج تھا جو عہد جاہلیت میں بھی پایا جاتا تھا اور عہد اسلام میں بھی عرصہ تک باقی رہا۔ مناہرہ کی صورت یہ تھی کہ بالوں کی مینڈھیاں گوندھ کر سر کے اوپر اس طرح باندھ لیتی تھیں کہ خراسانی اونٹ کی دو کوہانوں کی طرح وہ حصہ دو جگہ سے بلند نظر آتا تھا۔ رسول اللہ نے اس سے بھی عورتوں کو باز رکھا کیونکہ اس وضع میں پہلے سر پر دوپٹہ وغیرہ پیشانی تک لپیٹا جاتا تھا اور اس سے صحت کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا۔

بالوں کی ایک وضع جناب سکینہ بنت حسین کے نام پر "طرۂ سکینہ" کے نام سے رائج ہوئی۔ جناب سکینہ نہ صرف اپنے حسن و جمال بلکہ بالوں کی خوبصورتی کے لحاظ سے بھی اپنے زمانہ کی نہایت مشہور خاتون تھیں۔ آپ کو تزئین و آرائش کا خاص ذوق فطرت سے ودیعت ہوا تھا اور بالوں کی زیبائش میں آپ نے ایک خاص اختراع کی جسے "طرۂ سکینہ" کہتے ہیں۔ یہ وضع خواتین عرب میں بہت مقبول ہوئی یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیز نے نہایت سختی سے اسے روکا۔

ایک وضع خلیفہ مہدی کی بیٹی علیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ نہایت حسین و جمیل تھی اور فن شعر و موسیقی کی بھی بڑی ماہر تھی، لیکن پیشانی بدنمائی کی حد تک وسیع و کشادہ پائی تھی۔ اس عیب کو چھپانے کے لئے اس نے جڑاؤ سربند وضع کیا جس سے پیشانی ڈھک جاتی تھی۔ یہ وضع اتنی مقبول ہوئی کہ جس عورت کو دیکھئے سربند سے پیشانی کو چھپائے ہوئے ہے۔

بالکل اسی طرح فرانس کی ایک مشہور امیر زادی نے کیا جس کا نام (La Belle Froniere) تھا۔ اس کے وسط پیشانی میں آگ سے جل جانے کا داغ تھا۔ اس کو چھپانے کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ داغ کی جگہ ہیرا رکھکر دونوں طرف ریشمی دھاگے سے باندھ کر سر میں لپیٹ لیا۔ اسپین کی ایک امیر زادی کی رانیں بہت موٹی تھیں اس نے ایک خاص لباس ایجاد کیا جس سے یہ عیب چھپا رہتا تھا، اسی طرح لوئی نہم شاہ فرانس کی ایک لڑکی کے پاؤں بہت بھدے تھے اور ان کے چھپانے کے لئے اس نے لانبا گون اختراع کیا جس کا دامن زمین تک لٹکتا رہتا تھا اور پاؤں کو چھپائے رکھتا تھا۔ بعد کو یہ اوضاع تمام ملک میں رائج ہوگئیں۔

دور عباسیہ ترقی تمدن اور تہذیب مجلس و معاشرت کے لحاظ سے اسلام کا عہد زرین کہلاتا ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں

اس قسم کی اختراعیں کثرت سے ہوئیں اور عورتوں کو اپنی تجمیل و تحسین کی طرف بہت توجہ ہوئی۔ علی ابن ہشام کی ایک کنیز ریتم، تھی جو بے انتہا خوبصورت و وضعدار تھی۔ اس نے سر کی ٹوپی میں فیتہ باندھنے کی وضع ایجاد کی تاکہ سر کے بال نہیں۔ اور پھر یہ وضع عام ہوگئی یہ کنیز ابن ہشام (اپنے مالک) کے قتل کا بھی باعث ہوئی، کیونکہ خلیفہ مامون نے یہ لونڈی علی ابن ہشام سے طلب کی تھی اور اس نے دینے سے انکار کر دیا تھا۔

عہد بنی امیہ میں دستی پنکھوں میں اشعار لکھنے کا رواج عام تھا، لیکن عہد عباسیہ میں کپڑوں پر بھی عمدہ عمدہ فقرے اور اشعار لکھے جاتے تھے کمر اور سر کی مرصع پٹیوں، قمیص کے دامنوں اور ٹوپیوں وغیرہ پر بھی سونے کے ورق لگا کر اشعار نمایاں کئے جاتے تھے اور ایسا بھی عورتوں ہی نے کیا تھا پھر یہ وضع صرف طبقۂ امراء ہی تک محدود نہ تھی بلکہ کلیساؤں کی کنواریاں بھی اپنی چادروں، پٹیوں اور ملبوسوں میں اشعار منقوش کراتی تھیں۔ چنانچہ وشاء لکھتا ہے کہ میں نے کلیسائے مریم میں ایک کنواری کو دیکھا کہ چاند کی طرح ہیکل سے باہر نکلی۔ اس کی کمر میں مرصع پیٹی تھی اور اس پر یہ اشعار منقوش تھے:-

زنارہا فی خصرہا لیضطرب — وریحہا من طیبہا اطیب

ووجہہا احسن من حلیہا — ولونہا من لونہا اعجب[1]

وضع کی ایجاد پر حوادث سیاسی اور اکتشافات اثری بھی متاثر ہوا کرتے تھے، چنانچہ قاہرہ کی عورتیں ہر تاریخی واقعہ کی یادگار اپنے کپڑوں پر منقوش کر لیا کرتی تھیں۔ جب آٹھویں ہجری میں سنگ مرمر کے دو ستون (عہد فاطمی کے) دریافت ہوئے تو عورتوں نے اپنے ملبوس کی تراش میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی جو طول میں دو ستونوں سے مشابہ تھی۔ بعد کو یہ طرز بہت مقبول ہوئی اور اس کا نام جرالعمود پڑ گیا۔

مصر کی عورتوں نے ایک اور وضع قمیص کی ایجاد کی جس کو بہطلہ کہتے تھے اور چونکہ اس میں بہت زیادہ صرف ہوتا تھا اس لئے حکومت نے بمشکل تمام اس سے عورتوں کو باز رکھا۔ مقریزی کا بیان ہے کہ عورتیں اتنی بڑی بڑی قمیص بناتی تھیں کہ زمین تک لٹکتی رہتی تھی اور آستین تین تین گز کی ہوتی تھیں، ایک ایک ہزار درہم ایک قمیص پر صرف ہو جاتے تھے، پاجامہ یا ازار کا بھی یہی حال تھا، چنانچہ وزیر منجک نے نہایت سختی سے اس کے خلاف کارروائی شروع کی۔ ان کی آستینیں کاٹ کاٹ دیں، انکے کپڑے پھاڑ پھاڑ ڈالے اور بعض کو تو اس نے قتل بھی کرا دیا جب کہیں جا کر یہ رسم وہاں سے اٹھی لیکن اس کے مرنے پر چند دن بعد پھر اس کا رواج ہو گیا چنانچہ سیوطی نے لکھا ہے کہ ۹۲۰ھ میں بڑی آستین والی قمیصوں کے خلاف پھر احکام جاری کئے گئے۔ —— یہ آستینیں اتنی بڑی ہوتی تھیں کہ ہاتھ اٹھانے سے تمام گردن و شانہ، بلکہ سینہ اور پیٹ تک نظر آنے لگتا تھا۔

---

[1] مفہوم یہ ہے کہ اس کی کمر کی پیٹی کتنی خوشنما ہے اور اس کے چہرہ کا حسن اس کے زیوروں سے زیادہ جاذب نظر ہے۔

عرب شعراء کا اثر جمہور پر

مکہ کی ایک نوجوان لڑکی مدینہ آتی ہے اور سُنتی ہے کہ "عمر بن ابی ربیعہ" کا انتقال ہو گیا ———— واضح رہے کہ جرمنی کے شاعر "شیلر" کی طرح "عمر بن ابی ربیعہ" بھی صرف عورتوں کا شاعر کہلاتا تھا، اس نے اپنی ساری عمر اس جمیل ونازک جنس کی مدح و توصیف میں بسر کر دی تھی اور عرب کی کوئی عورت ایسی نہ تھی جو اس کے شعر کی دیوانہ نہ ہو ———— ہاں، تو جب اس لڑکی کو ابن ربیعہ کی موت کا حال معلوم ہوا تو بری طرح رونے پیٹنے لگی اور عربوں کی رسم کے مطابق اپنے نالۂ و شیون سے گویا اس نے صف ماتم بچھا دی، وہ روتی تھی اور کہتی جاتی تھی - کہ اب کون ہے جو ہماری جنس کے حسن و جمال کا راگ گائے گا - وہ سینہ کوبی کرتی تھی - اور چیخ چیخ کر کہتی جاتی تھی کہ اب کون ہے جو ہمارے صنف کی رعنائیوں اور دلربائیوں کی توصیف کرے گا -

لوگ جمع ہو گئے اور اس سے کہا کہ "اس قدر غم نہ کر، عثمان بن عفان کا ایک پوتا موجود ہے - جو ابن ابی ربیعہ کے نقش قدم پر چل رہا ہے وہ اس کمی کو پورا کرے گا" لڑکی نے یہ سن کر لوگوں سے کہا کہ "اس کا کوئی شعر تو مجھے سناؤ" جب لوگوں نے اس کے اشعار سنائے تو اس نے آنکھیں پونچھیں اور مسکرا کر بولی - "خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنی یادگار قائم کئے بغیر اس دُنیا سے نہیں گیا"

جاہلیۃ اور اوائل اسلام میں عورت و مرد دونوں آزادی سے باہم ملتے جُلتے تھے، محافل و مجالس میں دونوں شرکت کرتے تھے تبادلۂ نظر کے ساتھ، تبادلۂ جذبات و خیالات میں بھی آزاد تھے - اور ان کی قومی فطرت، ملکی افتاد اور معاشری خصوصیت کے لحاظ سے یہ میل جول خطرہ سے خالی ہوا کرتا - یہاں تک کہ حطیم کعبہ میں بھی دونوں دوش بدوش نظر آتے تھے - اور طواف میں بھی ایک کا شانہ دوسرے کے شانہ سے رگڑ کھاتا تھا - جب ان میں تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ امارت و خودداری، غیرت اخلاق و تفریق مراتب کا جذبہ پیدا ہوا تو خلفاء و امراء نے ایک کو دوسرے سے جُدا کر دیا - لیکن اس کی ابتدا کیونکر ہوئی - یہ واقعہ بھی سننے کے قابل ہے ———— سلیمان بن عبد الملک اموی کے خلافت کا زمانہ ہے، خالد بن عبداللہ القسری مکہ کا سردار ہے - کہ اس کے کانوں تک کسی شاعر کے یہ اشعار پہونچے ہیں :-

یا حبذا الموسم من موقف — و حبذا الکعبۃ من مسجد

و حبذا اللاتی یزاحمننا — عند استلام الحجر الاسود

(کیسا پیارا ہے یہ موسم کیسی پیاری ہے مسجد کعبہ اور کیسی پیاری ہیں یہ عورتیں جو حجر اسود کو بوسہ دینے کے وقت ہم کو گھیر لیتی ہیں)

خالد نے یہ اشعار سنکر کہا کہ خیر اب آیندہ سے وہ تم کو نہیں گھیریں گی - اور حکم دیا کہ مرد و عورت میں تفریق کر دیجائے اور سپاہی متعین کر دئے کہ کوڑے مار مار کر دونوں کو علیٰحدہ کیا جائے - چنانچہ یہ جدائی جو اُسوقت قایم ہوئی تھی اب تک باقی ہے اور مرد و عورت دونوں ساتھ مل کر یہ فریضۂ حج ادا نہیں کر سکتے -

---

ایک غریب عرب کی تین لڑکیاں ہیں جو شکل و صورت کے لحاظ سے بھی قابل لحاظ نہیں اور ذہن و دماغ کے اعتبار سے بھی لائق اعتناء نہیں - گھر میں اتنا سرمایہ نہیں کہ سب کو بیٹھ کر کھلائے، شوہر ملتے نہیں کہ ان کے سپرد کر کے اس مصیبت سے نجات پائے - مجبوراً وہ ایک شاعر (اعشیٰ) کے پاس جاتا ہے اور اپنی داستانِ غم سُناتا ہے - یہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور سوق عکاظ میں جاکر ایک قصیدہ ان لڑکیوں کی تعریف میں سُناتا ہے - جس کا پہلا شعر یہ ہے :-

لعمری لقد لاحت عیون کثیرۃ　　　　الیٰ ضوء نار بالبقاع تحرق

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر قصیدہ ختم بھی نہیں کر چکتا کہ تینوں لڑکیاں شوہر حاصل کر لیتی ہیں -

ایک طرف ان کی مدح و توصیف کا یہ اثر ہے اور دوسری طرف ان کی ہجو و مذمت کا وہ رعب کہ خلیفۂ وقت بھی ہزار درہم دے کر ایک شاعر سے اس کی ہجو خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے -

---

عراق کا ایک تاجر مدینہ آتا ہے اور جتنے نقاب اس کے پاس ہیں سب فروخت کر دیتا ہے، صرف سیاہ نقاب باقی رہجاتے ہیں - جن کا کوئی پوچھنے والا نہیں - یہ مسکین الدارمی شاعر کے پاس گیا جو کسی وقت اپنی عیش پرستیوں اور رنگ رلیوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا لیکن اب تائب ہو کر مسجد میں زاویہ نشین ہو گیا تھا - مسکین الدارمی نے کہا میں کیا تیری مدد کر سکتا ہوں - تاجر نے کہا کہ "جس طرح ممکن ہو کوئی نہ کوئی تدبیر نکالئے ورنہ میرا تمام مال پڑا رہے گا اور مجھے سخت نقصان ہوگا" مسکین الدارمی نے تھوڑی دیر تامل کیا اور پھر اپنا لباسِ زہد و تقویٰ اُتار کر وہی رندانہ وضع اختیار کی اسی حال میں وہ مسجد سے باہر آگیا اور اپنے ایک دوست کو یہ تین شعر یاد کرا کے کہا کہ شہر کے مغنیوں کو جاکر سنا دو :-

قل للملیحۃ فی الخمار الاسود　　　　ماذا فعلت براھب متعبد

قد کان شمر للصلاۃ ثیابہ　　　　حتیٰ خطرت لہ بباب المسجد

ردی علیہ صلاتہ و صیامہ　　　　لا تقتلیہ بحق دین محمد

(اُس معشوقۂ ملیح رنگ سے جو سیاہ نقاب ڈالے ہوئے ہے کہدو کہ یہ تو نے ایک فقیر گوشہ نشین کا کیا حال کر دیا - وہ تو اپنا دامن سمیٹ کر عبادت کے لئے ایک گوشۂ مسجد میں بیٹھ رہا تھا کہ دفعتاً سامنے آگئی اور نماز و روزہ سب غارت کر کے رکھ دیا - پھر اے حسینہ تجھے واسطہ ہے دین محمد کا، کہیں ایسا نہ کرنا کہ تو اس کو قتل کر دے -)

جس وقت یہ اشعار مدینہ کے گلی کوچوں میں پہونچے تو سب کو یقین ہوگیا کہ دارمی واقعی کسی سیاہ نقاب والی پر عاشق ہوکر مسجد سے باہر آگیا ہے اور تمام مدینہ میں کوئی ملیح رنگ لڑکی ایسی نہ رہ گئی جس نے اس تاجر سے سیاہ نقاب خرید کر اپنے چہرہ پر نہ ڈالا ہو۔ اس کے بعد سے سیاہ نقاب اس وقت کے فیشن میں داخل ہوگیا۔

ہشام بن عبدالملک کی خلافت کا زمانہ ہے۔ اور خالد القسری عراق و خراسان کا حاکم ہے، اس وقت تک عام دستور تھا کہ مسجدوں میں بلند مینار ہوتے تھے۔ اور ان پر کھڑے ہوکر موذن اذان دیا کرتے تھے۔ اتفاق سے خالد کے کانوں تک کسی شاعر کے یہ اشعار پہونچ گئے:

لیتنی فی الموذنین حیاتی — انھم یبصرون من فی السطوح

فیشیرون او تشیر الیھم — بالھوی کل ذات دل ملیح

(کاش میں بھی ان موذنوں میں سے ہوتا جو اونچے مناروں پر کھڑے ہوکر آس پاس کے چھتوں پر نگاہ ڈالتے ہیں اور وہیں سے عشوہ فروش ملیح لڑکیوں سے اشارہ بازی کرتے ہیں)

ان اشعار کے سننے کے بعد ہی خالد نے حکم دیا کہ تمام مساجد کے مینار منہدم کر دئے جائیں۔

امیر معاویہ مصروف جنگ ہیں اور دشمن کے ہجوم نے اس قدر تنگ کر رکھا ہے کہ سوائے فرار کے کوئی صورت نظر نہیں آتی لیکن ٹھیک اس وقت ابن الاطنابہ انصاری کا یہ شعر ان کے کانوں تک پہونچتا ہے:۔

ابت لی عفتی وابی بلائی — واخذی الحمد بالثمن الربیح

اور وہ نئے جوش و خروش کے ساتھ حملہ کرکے دشمن کو شکست دیتے ہیں۔

رشید کو جس چیز نے نقفور ملک روم کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ وہ صرف یہ شعر تھا:۔

غدر الذی اعطاک نقفور — فعلیہ دائرۃ البوار تدور

خلیفہ سفاح ستر امراء بنی امیہ کے ساتھ بیٹھا ہوا، کھانے کا انتظار کر رہا ہے کہ دفعتہً ایک شاعر اندر آتا ہے اور مظالم بنی امیہ کا ذکر کرکے یہ شعر پڑھتا ہے:۔

اذکروا مصرع الحسین وزیدا

وقتیلا بجانب المہراس

سفاح یہ سنتے ہی برہم ہوجاتا ہے اور تمام امراء بنی امیہ کو قتل کرا دیتا ہے۔

ایکبار اسی خلیفہ سفاح کے پاس سلیمان بن ہشام اموی بیٹھا ہوتا ہے۔ کہ سدیف شاعر آتا ہے اور کہتا ہے:-

لایغرنک ماتری من رجال، ان تحت الضلوع داء دویا

فضع السیف وارفع السوط حتی لاتری فوق ظہرھا امویا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سفاح فوراً سلیمان کو قتل کرا دیتا ہے۔

رشید، مالک بن طوق کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ جس وقت جلاد اس کو قتل کے لئے سامنے لاتا ہے اور گردن جھکا دیتا ہے۔ تو اس کی زبان سے یہ اشعار نکلتے ہیں:-

اری الموت بین النطع والسیف کامنا یلاحظنی من حیثما اتلفت

وما بی من خوف اموت واننی لاعلم ان الموت شی موقت

ولکن خوفی صبیۃ قد ترکتہم واکبادہم من حسرۃ تتفتت

رشید رونے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ "میں نے تیری لڑکی کا صدقہ تجھے معاف کر دیا۔ جا اور اب پھر لوٹ کر یہاں نہ آنا"

عرب میں قبیلہ نمیر نہایت ہی معزز قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اس قبیلہ کے افراد نہایت فخرور سے اپنی نسبت اس قبیلہ سے ظاہر کرتے تھے، لیکن جب شاعر جریر نے اس قبیلہ کی ہجو میں یہ شعر کہا کہ:-

فغض الطرف انک من نمیر فلا کعبا بلغت ولا کلابا

تو تمام ملک میں رسوائی کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر لوگ اس قبیلہ کے کسی آدمی سے اس کا نام پوچھتے تو وہ نمیر کا نام چھوڑ کر کئی اوپر کی پشتوں کے نام بتاتا یہاں تک کہ آخرکار اس قبیلہ کا نام ہی دنیا سے محو ہو گیا۔

ہر ملک کی آب و ہوا کا خاص اثر ہوتا ہے، ہر قوم کی سیاسیات کا مخصوص اقتضا ہوتا ہے اور ہر سرزمین اپنی معیشت و معاشرت کے احوال کے لحاظ سے ذہن انسانی کی تربیت کرتی ہے۔ ہندوستان جو ہمیشہ سے غیر ملکی تاخت کا مرکز بنا رہا یقیناً یہاں کے لوگوں میں کوئی جذبۂ حماست پیدا نہیں کر سکتا تھا، اس لئے شاعری کا یہ قہرمانی عنصر جو دنیا میں انسان کو سکندر ذہنی بال بنانے میں مدد دیتا ہے یوں ختم ہو گیا، لیکن مغلوبیت و مظلومیت سے جو کیفیت پیدا ہو سکتی تھی وہ ضرور انتہا کو پہونچ گئی۔ اور یہ نکبت و ذلت، انحطاط وادبار قومی زندگی کا ایک ضروری جزو ہو کر رہ گیا حتیٰ کہ یہاں کا بہترین تغزل وہی مانا گیا۔ جس میں سب سے زیادہ یاس و حرماں کا اظہار تھا۔ چنانچہ میر کو خدائے متغزلین کہنے کی علت یہی ہے کہ ان سے زیادہ کسی نے اپنی بیکسی و بیچارگی، محرومی و مایوسی کا اظہار نہیں کیا۔ یہاں کی حماسی شاعری کا بڑا سرمایہ مراثی کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن آپ کسی بہترین مرثیہ گو کا کلام اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کا قابل ذکر حصہ وہی ہے جہاں اس نے فریاد و شیون سے کام لیا ہے۔ ورنہ جہاں اس نے جوش مردانہ سے کام لینے کی کوشش

کی وہیں وہ منہ کے بل آرہا۔ یہاں تک کہ اگر وہ تلوار و اسپ کی تعریف کرتا ہے تو اس طرح گویا کسی عروس کا حال بیان ہو رہا ہے اور جب وہ حرب و دفاع کا بیان کرتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے، بٹیروں کی پالی کا ذکر ہو رہا ہے۔

آپ مراثی کا تمام ذخیرہ ڈھونڈھ ڈالئے۔ لیکن آپ کو عربی کے اس ایک شعر کا بھی جواب کہیں نہ ملے گا۔

کان مثار النقع فوق رؤسنا — واسیافنا لیل تھاوی کواکبہ

(یعنی میدانِ جنگ میں جو گرد و غبار سروں پر اٹ کر رہ گیا تھا تو اس میں تلواروں کی چمک ایسی نظر آتی تھی جیسے رات کو ستارے ٹوٹ رہے ہیں)

اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں کے لوگ جنگ کی حقیقت سے واقف تھے، قبایلی غیرت و خودداری ان کو ہمیشہ حرب و دفاع کے لئے آمادہ رکھتی تھی اور یہ وہاں روز کا منظر تھا کہ اگر کوئی خاتون واتغلباہ کہہ کر ایکبار چیخ پڑی، تو سارا قبیلہ تلواریں سوت سوت کر باہر آگیا اور جب تک انتقام نہیں لے لیا واپس نہیں گئے۔ پھر یہی وہ حقیقت تھی جو اُن سے یہ شعر کہلوا دیتی تھی کہ

فابوا بالرماح مکسرات — وابنا بالسیوف قد انحینا

(وہ لوگ واپس گئے اس طرح کہ ان کے نیزے ٹوٹے ہوئے تھے اور ہم واپس ہوئے اس حال میں کہ ہماری تلواریں خم ہو گئی تھیں)

اور اسی حقیقت کا فقدان تھا جو ہندوستان میں حماسی شاعری پیدا نہ کر سکا۔

عہدِ اسلام میں کنیزوں کا اثر و اقتدار

ایک انسان کا دوسرے انسان کو غلام بنا کر رکھنا تاریخ انسانی کی نہایت قدیم یادگار ہے اور اس کی ابتداء کا سراغ اسوقت سے چلتا ہے۔ جب دو افرادِ انسانی میں سے ایک نے اپنے کو قوی اور دوسرے نے ضعیف محسوس کرنا شروع کیا۔ غلامی نام ہے صرف قوت کے اعتراف کا اور قوت کا محبوب ترین مشغلہ یہی ہے کہ وہ مغلوب و کمزور پر حکومت کرے، اس کو ستائے اور خدمت و چاکری کی صورت میں برابر اس سے اپنی قوت کا اعتراف کراتا رہے۔

اس لئے دُنیا میں غلامی کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی۔ جب اول اول انسان میں قبائلی زندگی کا آغاز ہوا اور سرداران قبیلہ نے جنگ و مقابلہ کے بعد فتح و نصرت کا خراج انسانی خدمت کو قرار دیا۔ پھر چونکہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ حرب و جنگ بھی ترقی کرتی رہی، اس لئے دنیا میں اسی نسبت سے غلامی کا رواج بھی وسیع ہوتا گیا۔ اول اول اسیرانِ جنگ کو غلام نہیں بناتے تھے۔ بلکہ قتل کر ڈالتے تھے، البتہ عورتیں محفوظ رکھی جاتی تھیں اور ان سے ہر طرح کی خدمت لی جاتی تھی۔ بعد کو یہ رواج اس قدر وسیع ہوا کہ زمانۂ صلح میں بھی لوگ غلام بنائے جانے لگے اور دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں تھا۔ جہاں یہ رسم قایم نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ قدیم مصریوں، اہل اشوریہ، ہندوؤں، چینیوں، یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں وغیرہ تمام اقوام مشرق و مغرب نے مستقل بازار بردہ فروشی کے قایم کئے جہاں دوسری اجناس کی طرح انسان کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی۔

اہل عرب عہدِ جاہلیت میں اسیرانِ جنگ کو بھی غلام بناتے تھے۔ اور ان کو بھی جنھیں وہ پڑوس کی قوموں سے خریدتے تھے چنانچہ غلاموں کے تاجر حبش وغیرہ کی طرف سے لونڈی غلاموں کی ایک جماعت ہر موسم میں عرب لے جاتے تھے۔ اور وہاں کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔

قریش اس باب میں زیادہ مشہور تھے اور غلاموں کی تجارت وہ اسی طرح کرتے تھے جیسی دوسری چیزوں کی۔ چنانچہ اس قبیلہ کا سردار عبداللہ بن جدعان عہدِ جاہلیت میں نہایت مشہور تاجر غلاموں کا مانا جاتا تھا۔ (المسعودی صفحہ ۲۸۲ جلد ا)

وہاں غلام بطور ہدیہ کے بھی دئے جاتے تھے اور دوسری ملکیت کی طرح وراثت میں بھی منتقل ہوتے تھے۔ جب کوئی شخص غلام خریدتا تھا تو اس کی گردن میں جانور کی طرح رسّی ڈال کر گھر کو لے جاتا تھا۔ (المعارف لابن قتیبہ ص ۱۱۲)

قمار بازی کے سلسلہ میں بھی بعض لوگ غلام بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ابولہب اور عاصی بن ہشام نے آپس میں

جُوا کھیلا اور شرط یہ قرار پائی کہ جو ہارے گا وہ دوسرے کا غلام ہو جائے گا۔ چنانچہ ابو لہب جیتا اور اُس نے عاصی بن ہشام کو غلام بنا کر اونٹ چرانے کی خدمت اس سے لی (الاغانی ص ۱۰۰ ج ۱)

جب اسلام کا آغاز ہوا تو بردہ فروشی کا عرب میں انتہائی عروج تھا۔ اور دنیا کی تمام دوسری قوموں کی طرح یہ بھی پوری طرح اس لعنت میں مبتلا تھے۔ ظاہر ہے کہ کسی قوم کا رسم و رواج جو صدیوں سے چلا آرہا ہے دفعتہً نہیں مٹایا جا سکتا۔ بلکہ آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ اس میں اصلاح ہوتی ہے اس لئے اسلام فوراً اُس کو بند تو نہ کر سکتا تھا، لیکن اس نے بعض اُصول و قوانین ایسے پیش کئے جن پر عمل کرنے سے اس مذموم رواج کا کم ہو جانا اور غلاموں کی حالت میں اصلاح کا رونما ہونا لازم تھا۔ چنانچہ بردہ فروشی کے دائرہ کو تنگ کرنے کے لئے اسلام نے صرف انھیں لوگوں کو غلام بنانے کی اجازت دی جو اسیران جنگ کی حیثیت سے ہاتھ آئیں اور جو نہ مسلمان ہوں، نہ جزیہ ادا کریں۔ ہر چند یہ صورت بردہ فروشی کی وسعت کو کم کرنے والی تھی۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ اس کو وسیع ہونا تھا، اور ہوئی، چنانچہ بعض جنگوں میں ایک ایک سپاہی کو سو سو غلام اور سو سو کنیزیں تقسیم ہوئیں اور امراء و سرداران کو ہزار ہزار۔ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ہزار غلاموں کے مالک تھے۔ اور واقعۂ ارک کے بعد ایک ایک درہم میں لونڈی غلاموں کو فروخت کیا گیا۔ غلاموں کی کثرت کا ایک سبب عہد اسلام میں یہ بھی تھا کہ بربر وغیرہ کے بعض ذمی، جزیہ کے عوض غلاموں ہی کو پیش کرتے تھے۔

اسلام نے ایک طرف غلامی کا دائرہ تنگ کرنے کوشش کی تو دوسری طرف ان کی تعلیم و تہذیب کی ہدایت کر کے سوسائٹی میں ان کے مرتبہ کو بلند کرنا چاہا۔ چنانچہ رسول اللہ کا ارشاد ہے:۔

"من کانت لہا جاریۃ فعلمہا واحسن الیہا و تزوجہا وکان لھا اجران
اجر بالزواج والتعلیم واجر بالعتق"

(یعنی اگر کوئی شخص اپنی کنیز کو تعلیم دے گا، اُس کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا۔ اور شادی کرے گا تو اس کے لئے دو اجر ہیں۔ ایک اجر نکاح و تعلیم کے عوض میں، دوسرا آزاد کرنے کے صلہ میں۔)

چنانچہ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ غلاموں کو بلادِ اسلامیہ میں وہی حقوق حاصل تھے جن سے آزاد لوگ متمتع ہوتے تھے اور معاملات میں اتنی رعایت ملحوظ تھی۔ کہ ایک غلام کو بہ نسبت آزاد کے نصف سزا ملتی تھی۔

لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے اور ان کو آزاد کر دینے کی ہدایت کرنا، اسلام کی بڑی زبردست حکمت تھی۔ اور عربوں کے حالات و افتادِ طبیعت کو دیکھتے ہوئے اس سے بہتر طریقہ اس رسم قبیح کے انسداد کا کوئی اور ہو ہی نہ سکتا تھا، چنانچہ تاریخ اسلام میں کثرت سے ایسے واقعات ملیں گے کہ لونڈیوں سے نکاح کرنے کے بعد ان کی اولاد نے سوسائٹی میں کتنا عظیم مرتبہ حاصل کیا اور لوگوں نے کس قدر کثرت کے ساتھ غلاموں کو آزاد کیا۔

جہاں تک اسلام کی تعلیم کا حق ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اس رسم کے دور کرنے کی پوری کوشش نہیں کی البتہ

سلطنت اسلامی نے اس ہدایت کی غایت کو نظر انداز کر دیا اور بردہ فروشی کا سلسلہ امارت و سیاست کی اور بہت سی ناجایز خواہشات کی طرح، بدستور قایم رہا۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ باوجود اس رسم کے قیام کے اس کی نوعیت بہت کچھ بدل گئی اور کنیز جو عہدِ اسلام سے قبل ایک جنس ناکارہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کی ذہنی دماغی و معاشرتی حالت میں بہت ترقی ہوئی۔

گزشتہ بیان سے معلوم ہوا ہوگا کہ عربوں میں بعد آغازِ اسلام کنیزوں کی کثرت کا سبب فتوحات کی وسعت تھی کہ باوجود ہزاروں کی تعداد میں آزاد کر دینے کے بھی ایک کثیر تعداد ان کے پاس رہتی تھی۔ جب امارت و حکومت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے تمدن و معاشرت عمران و تہذیب، جاہ و حشمت، شوکت و جلال میں ترقی ہوئی تو امراء و خلفاء کے حضور میں کنیزوں کے پیش کئے جانے کا دستور قایم ہوا گویا کہ وہ بھی زر و جواہر کی طرح ایک چیز ہدیہ کے قابل سمجھی جاتی تھی۔ اگر معلوم ہوتا تھا کہ کسی امیر کو صناعت کی طرف توجہ ہے تو اس کے سامنے صناع کنیز پیش کی جاتی تھی اور اگر جمال و غنا کی طرف کوئی خلیفہ مایل ہوتا تھا تو انھیں خصوصیات کی حامل کنیز ڈھونڈھی جاتی۔ رفتہ رفتہ یہ دستور بہت وسیع و عام ہو گیا۔ اور عہد بنی عباس میں تو اس کے تمام جمالیاتی پہلو کھل کر رہ گئے۔ کنیزوں کے ساتھ جب خلفاء عقد نکاح کر لیتے تھے تو انھیں آزاد کر دیتے تھے اور پھر ان کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ متوکل کے پاس ۴۰۰۰ کنیزیں تھیں (المسعودی ص ۲۷۹ ج ۲) اور ہارون الرشید کے پاس ۲۰۰۰، جن میں سے ۳۰۰ ارباب نشاط میں شامل تھیں، اور گانے بجانے کی ماہر تھیں (الاغانی ص ۸۸ ج ۲) محض زینت و آرایش اور نمایش جاہ و جلال کے لئے بھی کنیزوں کو رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ زبیدہ اور اُم جعفر برمکی کے پاس ہزاروں کنیزیں صرف اس لئے تھیں کہ ان سے شان و شوکت کا اظہار ہو۔

جب فتوحات کا سلسلہ محدود ہو گیا اور لڑائیاں بند ہوئیں تو کنیزوں کی فراہمی بھی کم ہونے لگی، لیکن چونکہ لوگ ان کے رکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اس لئے ایک جماعت بردہ فروشوں کی پیدا ہو گئی جو بلادِ ترک و صقالبہ، ہند، آرمینیا، روم اور افریقہ وغیرہ سے نوجوان لڑکیاں کسی نہ کسی طرح لاتے تھے اور یہاں فروخت کرتے تھے۔

اس تجارت کے لئے یہاں بڑے بڑے بازار قایم تھے، جہاں کنیزوں کی خرید و فروخت نہایت کثرت سے ہوتی تھی بغداد کا بازار اس باب میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ بہت کھلے ہوئے میدان میں تھا۔ اور اس کا نام "سوق الرقیق" یا "سوق النخاسین" تھا۔ اس میں متعدد مکان، دوکانیں اور احاطے تھے۔ جہاں مختلف ملکوں کی کنیزیں، عمر و رنگ، زبان و لباس، تہذیب و علم کے لحاظ سے علٰحدہ علٰحدہ رکھی جاتی تھیں۔ یوں تو یہاں سرکیشیا، روم، جارجیا، صقلیہ، ایران، ارمنیا اور حبش وغیرہ تمام اطراف ملک کی کنیزیں آتی تھیں، لیکن سب سے زیادہ قیمتی وہ کنیزیں ہوتی تھیں جو مدینہ، طایف، بصرہ، کوفہ، بغداد و مصر سے حاصل کی جاتی تھیں، کیونکہ یہ نہایت شیریں کلام اور حاضر جواب ہوتی تھیں۔

اس بازار کا ایک حصہ صرف ان کنیزوں کے لئے وقف تھا جو بالکل تازہ وارد ہوتی تھیں اور غیر تربیت یافتہ حالت میں فروخت کر دی جاتی تھیں یہ بالکل عریاں حالت میں لائی جاتی تھیں۔ اس حال میں کہ ان کے بال کھلے ہوتے تھے اور زینت و آرایش کا کہیں نام نہ ہوتا تھا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ان کا طبیعی حسن جو صنعت آرایش سے علٰحدہ ہو۔ ہر شخص کو معلوم ہو سکے، بڑے بڑے

تاجران کی شکل و صورت، رعنائی و دلکشی کا اندازہ کر کے مختلف داموں میں خرید لیتے تھے۔ اور پھر ان کے فطری ذوق کے لحاظ سے انکو تعلیم و تہذیب سے آراستہ کر کے بہت گراں قیمت پر فروخت کرتے تھے۔ چنانچہ عہد اسلام کی بہت سی مشہور ماہر موسیقی، صاحب علم و فضل اور سیاست داں عورتیں انھیں کنیزوں سے تعلق رکھتی تھیں۔

اول اول جب یہ بازار میں آتی تھیں تو اُن کی وحشت و خشونت کا وہی عالم ہوتا تھا جو ایک نو گرفتار ہرنی کے اضطراب کا، لیکن جب تعلیم و تربیت کے بعد مکلف لباس سے آراستہ، اور فن دلربائی کی گھاتوں سے واقف ہو کر، ہاتھ میں رباب، زبان پر نغمۂ شیریں[1]، نگاہوں میں دلربایانہ افسوں اور جسم میں حرکات رقصیہ کا لوچ لئے ہوئے نکلتیں تو طبقۂ امرا میں تہلکہ مچ جاتا اور وہی کنیز جو چند درہموں میں خریدی گئی تھی، لاکھوں میں فروخت ہوتیں۔

اگر نفس بردہ فروشی کی کراہت سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا۔ کہ اہل عرب کنیزوں کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے۔ وہ ان کے قوائے ذہنیہ کو تباہ کرنے والا نہ تھا بلکہ ان کو مہذب و شائستہ بنانے والا تھا۔ اس سلسلہ میں جس قدر وحشی و ناتراشیدہ عورتیں زیور علم و فضل سے آراستہ کی گئیں۔ ان کا شمار مشکل ہے اور انھیں کنیزوں میں جیسی جیسی صاحب علم و فضل عورتیں ہوئیں۔ اور خود ان کے بطن سے جیسے جیسے خلفاء عظام، اور علماء کرام پیدا ہوئے، ان کے حالات سے تاریخ عرب کے صفحات مالامال ہیں۔

ان بازاروں میں کنیزیں علی العموم نیلام کی صورت سے فروخت کی جاتی تھیں۔ یعنی جب کنیزوں کے خریدار خواہ وہ امراء ہوں یا تجار جمع ہو جاتے اور بازار مختلف ممالک کی کنیزوں سے بھر جاتا تو کنیزیں فروخت کرنے والے کھڑے ہو جاتے اور نہایت بلند آواز سے اپنی کنیزوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتے:-

"یاتجار، یا ارباب الاموال! ماکل مدور جوزة، وکل مستطیلة موزة ولاکل حمراء لحمة ولاکل بیضاء شحمة، ولاکل صهباء خمرة ولاکل سمراء تمرة، یاتجار، ہذہ الدرة الیتیمة التی لاتفی الاموال لها بقیمة بکم تفتحون باب الثمن"۔

(اے تاجرو، اے دولتمندو، نہ ہر گول چیز اخروٹ ہوتی ہے نہ ہر مستطیل چیز کیلا ہر وہ چیز جو سُرخ ہے گوشت نہیں کہلاتی اور نہ ہر سپید چیز چربی، اسی طرح نہ ہر صہبا شراب ہوتی ہے اور نہ ہر زرد چیز کھجور۔ اے تاجرو، یہ ایک بے بہا موتی ہے کہ زر خطیر بھی اس کی قیمت نہیں ہو سکتا۔ پھر بتاؤ کہ تم کیا قیمت اس کی لگاتے ہو)۔

اس آواز پر لوگ چاروں طرف سے گھیر لیتے اور بولی شروع ہو جاتی۔ کوئی چار ہزار دینار کہتا تو کوئی پانچ ہزار کسی طرف سے

---

[1] ان کے تغزل و غنا کا صحیح رنگ کیا تھا اس کا اندازہ اس وقت کے گیتوں سے ہو سکتا ہے۔ صاحب آغانی نے جابجا ان گیتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے دو نہایت مشہور و محبوب وہ تھے۔ جن کی ابتدا ان فقروں سے ہوتی ہے۔ "من کان لنا، لنا لہ" (یعنی جو ہمارا ہے ہم اس کے ہیں)۔ "وضع الخد للهوی عز" (فرط محبت سے گال پر گال رکھ دینا کس قدر پیاری بات ہے)

چھ ہزار کی آواز آتی اور کہیں سے ۸ ہزار کی الغرض اخیر میں سب سے زیادہ قیمت لگانے والا۔ وہ قُدِ بے بہا پا جاتا اور اپنے گھر کو چلا جاتا۔

یہ بھی قاعدہ تھا کہ (قدیم اہل رومہ کی طرح) غلاموں اور کنیزوں کو کسی بلند جگہ پر کھڑا کر دیتے اور لوگ آ آ کر انھیں دیکھتے اور ہاتھوں سے چھوتے۔ چونکہ یہ لوگ لونڈی غلاموں کے عیوب کو بالکل اسی طرح چھپاتے تھے۔ جیسے گھوڑوں کے عیوب چھپائے جاتے ہیں، اس لئے خریدار کو یہ حق بھی حاصل ہوتا تھا کہ وہ ان کو بالکل عریاں حالت میں دیکھ سکے۔

اہل عرب نے مختلف ممالک کی کنیزوں کی علٰحدہ علٰحدہ خصوصیات متعین کر کے اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر نجابت کی جستجو ہے تو فارس کی لونڈیاں لی جائیں، اگر خدمت مقصود ہے تو رومہ کی کنیزیں تلاش کی جائیں؛ اسی طرح کھانا پکانے کے لئے حبش کی کنیزیں، اور بچوں کی تربیت و رضاعت کے لئے آرمینیا کی لونڈیاں مخصوص سمجھی جاتی تھیں۔ حُسن ظاہری کے لحاظ سے چہرہ ترکی کا، جسم روم کا، آنکھیں حجاز کی، اور کمر یمن کی پسند کرتے تھے۔

حال ہی کی بات ہے کہ بردہ فروشی کے انسداد سے قبل آستانہ، دمشق، قاہرہ وغیرہ کے بازاروں میں سرکیشیا کی کنیزیں عام طور پر بالکل عریاں حالت میں فروخت کی جاتی تھیں۔ بعد کو جب ایک بین الاقوامی قانون اس تجارت کے خلاف ہر جگہ نافذ ہو گیا تو لوگوں نے خفیہ طور پر اپنے گھروں میں اس تجارت کو جاری رکھا۔

قدیم زمانہ میں بھی کوئی قوم بردہ فروشوں کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی۔ لیکن اسلام نے جس قدر اس پیشہ کی حقارت کی ہے شاید کسی نے نہیں کی۔ رسول اللہ کا ارشاد تھا کہ "التجارۃ فی الرقیق ممحقۃ" (یعنی بردہ فروشی قوم کو تباہ کر دینے والی ہے) کتاب الولید میں بردہ فروش اور شیطان کو ایک مرتبہ میں رکھا ہے۔ اسی لئے عساکر اسلامیہ کے ساتھ ان تاجروں کے رہنے کی سخت ممانعت تھی تاکہ وہ دشمن کے بچوں کو پکڑ کر غلام نہ بنائیں اور ان کی عورتوں کو اہل لشکر کے سامنے پیش نہ کر سکیں جیسا کہ اہل رومہ کا دستور تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، بغداد اس تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا اور جمیل ترین کنیزیں یہیں کے بازار میں آتی تھیں۔ اور نہایت گراں قیمت میں فروخت ہوتی تھیں۔ ان کنیزوں کی تعلیم و تربیت کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ تاجر اور خصوصیت کے ساتھ اس عہد کے مشہور مغنی، کسی کنیز کو اس کا ذہن قیافہ دیکھ کر خرید لیتے، پھر اس کو قرآن حفظ کراتے، ادب و نحو کی تعلیم دیتے، منزلی تہذیب سکھاتے، اشعار یاد کراتے، موسیقی کا ماہر بناتے اور پھر بازار میں لا کر سو کے ہزار وصول کرتے۔ خوبصورت کنیزوں کو موسیقی کی تعلیم دینے کا بہت رواج تھا۔ کیونکہ وہ کنیزیں جن میں ان دونوں کا اجتماع ہوتا بیش بہا چیز سمجھی جاتی تھیں۔ علی الخصوص مولدات (یعنی مکہ و طائف وغیرہ کی کنیزیں) کہ ان کی گرانی کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔

ایک مرتبہ ہارون الرشید نے ایک کنیز کی قیمت ایک لاکھ دینار ادا کی (ابن خلکان ص ۱۰۲ ج ۱) اسی طرح سلیمان بن عبد الملک کے بھائی سعید نے اپنی مشہور کنیز زلفا کی قیمت ستر ہزار دینار ادا کی (الطبری ص ۱۳۲۳ ج ۲)

جعفر برمکی نے ایک کنیز ۴۰ ہزار دینار میں خرید کی (العقد الفرید ص ۳۰۳ - ج ۳) ہارون الرشید نے عنان خلافت ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلا حکم یہ نافذ کیا کہ فلاں کنیز ایک لاکھ دینار میں خرید کرلی جائے۔ اس کے وزیر یحیی بن خالد نے عذر کیا، رشید اس پر برہم ہوا تو یحیی نے بیت المال کی تمام چیزوں کو فروخت کرکے ۱۵ لاکھ درہم کی صورت میں اس کمرہ کے اندر رکھوا دیا جہاں سے خلیفہ گزرا کرتا تھا۔ اس ترکیب سے خلیفہ کو معلوم ہوا کہ اس نے کنیز کے خرید کرنے میں کتنا بیجا صرف کیا تھا۔

ایک بار امین نے جعفر بن ہادی کو حکم دیا کہ ایک کنیز جس کا نام بذل تھا خرید لیا جائے۔ جعفر نے انکار کیا۔ تو امین نے برہم ہوکر دوسرا حکم دیا کہ سونے کے برابر اس کو وزن کرکے قیمت ادا کی جائے۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی۔ اور ۲ کرور درہم ادا کئے گئے۔

عہد بنی امیہ و بنی عباس میں کنیزوں کا مرتبہ اس قدر بلند ہوگیا تھا۔ اور اتنا زبردست اثر ان کا خلفاء پر قایم تھا کہ حکومت و سلطنت گویا انھیں کے ہاتھ میں تھی۔

چنانچہ یزید بن عبدالملک کا عشق حبابہ کے ساتھ اور رشید کا ذات الخال کے ساتھ جیسی تاریخی شہرت رکھتا ہے سب پر ظاہر ہے۔ رشید کی ماں خیرزان خود کنیز تھی، اسی طرح خلیفۂ مقتدر کی ماں سیدۃ الترکیہ لونڈی تھی۔ لیکن جو اثر ان کا سیاسیات وقت پر تھا۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔

الغرض عہد اسلام میں کنیزوں کے اثر و نفوذ اور قوت و اقتدار کا یہ عالم تھا۔ کہ ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ خلفاء کی لونڈیاں تھیں درست نہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ خود خلفاء اُن کے غلام تھے۔

پیغمبروں کے لطایف

دعیان نبوت تین طرح کے ہوئے ہیں، ایک وہ جو واقعی ملک و قوم کی اصلاح کا جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے اور باوجود موانع کے انھوں نے اپنے مشن کی تبلیغ کی اور آخر کار وہ کسی نہ کسی طرح اس میں کامیاب ہو گئے۔

دوسری قسم میں وہ ہیں جنھوں نے صرف اس لئے دعوائے نبوت کیا کہ وہ دنیاوی جاہ و حشم اور دولت و ثروت کے خواہشمند تھے اور اپنی قوم یا قبیلہ میں خاص مرتبہ رکھنے کی وجہ سے انھوں نے کچھ دن نبوت کا بھی مزہ اٹھا لیا، تیسری قسم ان مدعیان نبوت کی تھی جو محض ظرافت و تمسخر کی بنا پر نبی بن بیٹھے اور ان کی نبوت ایک لطیفہ بن کر رہ گئی۔

قسم اول کے انبیار کا ذکر اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے اور نہ اس میں کسی لطایف کا گزر۔ قسم دوم میں طلیحہ اسود عنسی کے علاوہ مسیلمہ اور سجاح بنت حارث نے کافی شہرت حاصل کی، اور اس کا سبب زیادہ تر یہ تھا کہ ان دونوں نے ایک ہی وقت میں نبوت کا دعویٰ کیا اور بالآخر دونوں کی مواصلت پر یہ کھیل ختم ہو گیا۔

مردوں میں تو خیر متعدد نام ایسے گنائے جا سکتے ہیں، جو نبوت کی نسبت سے مشہور ہوئے، لیکن عورتوں میں غالباً ایک سجاح ہی ایسی تھی جس نے نبیہ ہونے کا دعویٰ کیا اور اخیر عمر میں اسلام لائی۔

تیسری قسم انبیار کی بہت پُرلطف تھی اور انھیں کے لطایف آج ہم بیان کرتے ہیں جو مولانا شرر کے ایک مقالہ سے لئے گئے ہیں۔

دورِ عباسیہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اسلامی حکومت کا بڑا عجیب و غریب زمانہ تھا۔ علم و فضل اور تہذیب و شایستگی کا کوئی پہلو اور جاہ و امارت کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جو انتہائی عروج تک نہ پہونچا ہو۔ اور جب کسی قوم کا تمدن اتنا وسیع و بلند ہو جاتا ہے، تو اس میں ڈپچ کی بھی کمی نہیں ہوتی، چنانچہ ایک خاص ڈپچ لوگوں میں یہ بھی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ نبوت کا دعوےٰ کر کے ملک میں مشہور ہو جائیں اور اس طرح دربار عباسیہ تک ان کی رسائی ہو جائے۔

مامون رشید کا زمانہ ہے اور ایک نہ دو، اکٹھے دس مدعیان نبوت شاہی حراست میں قصر شاہی تک جا رہے ہیں، راستہ میں تماشائیوں کا ہجوم ہے اور بہت کم لوگ واقف ہیں کہ یہ اچھے خاصے مہذب و شایستہ پڑھے لکھے انسان شاہی باڈی گارڈ کے ساتھ کہاں اور کیوں جا رہے ہیں۔

انھیں تماشائیوں میں سے ایک شخص یہ سمجھ کر کہ غالباً یہ لوگ کہیں دعوت میں جارہے ہیں خود بھی ان کے غول میں شریک ہوگیا مامون الرشید کے سامنے جب یہ لوگ پیش کئے گئے اور ان کا شمار ہوا تو یہ بجائے دس کے گیارہ نکلے۔ اس پر سب کو حیرت ہوئی لیکن کوئی زیادہ کاوش اس باب میں نہ کی گئی اور ان سب کے قتل کا حکم صادر کیا گیا

اب یہ شخص بہت گھبرایا اور بولا کہ "آپ مجھے کیوں قتل کرتے ہیں"۔ مامون نے پوچھا "کیوں، کیا تم نے نبوت کا دعوےٰ نہیں کیا"۔ وہ بولا "اجی، کہاں کی نبوت، اور کیسی رسالت، میں تو یہ سمجھ کے ان کے ساتھ ہولیا تھا کہ یہ کہیں دعوت میں جارہے ہیں، مجھے دعوائے نبوت سے کیا واسطہ"۔ یہ سن کر مامون ہنستے ہنستے بیتاب ہوگیا

خلیفۂ مہدی عباسی کے زمانہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعوےٰ کیا اور جب گرفتار ہوکر خلیفہ کے سامنے لایا گیا تو پوچھا گیا "تم نبی ہو"۔ بولا:۔ "جی ہاں"۔ پھر سوال کیا گیا کہ:۔ "تم کن لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ہو" بولا کہ:۔ "تم نے کسی کے پاس مجھے جانے ہی نہیں دیا، نام لوں، تو کس کا، اُدھر میں نے دعویٰ کیا اور ادھر تم نے مجھے پکڑ کر قید خانہ بھیج دیا"

ایک بار کسی شخص نے بصرہ میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ یہاں کا حاکم اس وقت سلیمان بن علی تھا۔ جب یہ شخص گرفتار ہوکر حاکم بصرہ کے سامنے لایا گیا تو اس سے سلیمان نے پوچھا:۔ "کیا تم خدا کے بھیجے ہوئے پیمبر ہو؟"۔ اس نے جواب دیا "جی اس وقت تو قیدی ہوں"

سلیمان: "کمبخت تجھے کس نے نبی بنایا"

———: "کیا پیمبروں سے ایسی ہی گفتگو کی جاتی ہے، کیا کروں مجبور ہوں کہ اس وقت قید میں ہوں، ورنہ جبرئیل کو حکم دیتا کہ تم سب کو ہلاک کر ڈالیں"

سلیمان: "کیا قیدی کی دعا قبول نہیں ہوتی"

———: "جی اور کیا، خصوصاً انبیا کی دعا تو قید کی حالت میں اوپر جاتی ہی نہیں"

سلیمان نے ہنس کر کہا: "اچھا میں تمھیں چھوڑے دیتا ہوں، آزاد ہونے کے بعد جبرئیل کو حکم دو اور اگر انھوں نے تمھارا حکم مان لیا تو ہم سب تم پر ایمان لے آئیں گے"۔ وہ یہ سُنکر بولا:۔ خدا سچ فرماتا ہے: "فلا یومنوا حتی یروا العذاب الالیم" (یعنی جب تک عذاب کو دیکھ نہ لیں گے ایمان نہ لائیں گے)

سلیمان یہ جواب سُن کر ہنس پڑا اور اسے چھوڑ دیا

مامون الرشید کے زمانہ میں ایک اور شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا- یہ اپنے آپ کو ابراہیم خلیل اللہ کہتا تھا- جب یہ گرفتار ہو کر سامنے لایا گیا تو ثمامہ بن اشرس نے کہا اگر اجازت ہو تو میں اس شخص سے گفتگو کروں - مامون نے اجازت دی

ثمامہ : "تم اپنے آپ کو ابراہیم خلیل اللہ کہتے ہو، لیکن اُن کے پاس تو نبوت کی دلیلیں تھیں، تمھارے پاس کونسی دلیل ہے"

: "ابراہیم کے پاس کونسی دلیلیں تھیں"

ثمامہ : "وہ آگ میں ڈالے گئے اور آگ انھیں نہ جلاسکی، ہم تمھارے لئے بھی آگ روشن کراتے ہیں اور اس میں تمھیں ڈالتے ہیں اگر تم نہ جلے تو بیشک یہ تمھاری نبوت کی دلیل ہوگی"

یہ سن کر وہ بولا کہ : "یہ تو بہت مشکل ہے، کوئی اور آسان صورت تجویز کرو"

ثمامہ : "اچھا تو پھر کوئی ویسی ہی دلیل پیش کرو جیسی حضرت موسیٰ نے پیش کی تھی"

اس نے پوچھا : "موسیٰ کے دلایل کیا تھے" - ثمامہ نے جواب دیا کہ : "ان کے پاس ایک عصا تھا جو زمین پر ڈالنے سے اژدہا بن جاتا تھا" یہ سنکر بولا کہ "یہ بھی مشکل ہے، اس سے زیادہ کوئی آسان صورت بتاؤ"

ثمامہ : "تو پھر حضرت عیسیٰ کی سی نشانی پیش کرو"

اس نے پوچھا : "ان کی نشانیاں کیا تھیں"

ثمامہ : "وہ اندھوں کوڑھیوں کو اچھا کر دیتے تھے اور مردہ کو زندہ"

یہ سنکر وہ بولا کہ "واہ، یہ تو اور زیادہ مشکل بات ہے، میں آسان صورتیں پوچھتا ہوں اور تم انھیں اور زیادہ مشکل کرتے جاتے ہو" -

ثمامہ : "تو پھر تمھیں کوئی صورت بتاؤ، تم نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، تو کوئی ثبوت دینا ہی پڑے گا"

اس نے کہا : "میرے پاس کوئی ثبوت نہیں، میں نے جبریلؑ سے پہلے ہی کہدیا تھا کہ مجھے شیطانوں کے پاس بھیجتے ہو تو کوئی دلیل بھی دو، لیکن وہ اس پر بگڑ گئے، بہر حال میں مجبور ہوں، اس لئے اگر بغیر کسی دلیل کے مجھے نبی مانتے ہو تو مانو، ورنہ جانے دو، جھگڑا ہی کیا ہے ؟"

خلیفہ مہدی ہنس پڑا اور اسے رہا کر دیا -

خلیفہ مہدی کے پاس ایک اور شخص اسی طرح کا لایا گیا - مہدی نے پوچھا : "تم کب مبعوث ہوئے" بولا - "آپ کو اس سے کیا بحث کہ میں کب مبعوث ہوا - کیا نبوت تاریخ کی پابند ہوتی ہے"

مہدی نے پھر سوال کیا کہ "تمھیں کہاں نبوت ملی" بولا : "خدا کی قسم یہاں تو ایسی باتیں پوچھی جارہی ہیں، جن کا نبوت سے کوئی تعلق ہی نہیں، سنئے، اگر آپ میری نبوت مانتے ہیں، تو مانئے ورنہ اپنے گھر خوش رہئے، لیجئے یہ میں چلا"

ایک دن عبد اللہ بن حازم، دجلہ کے پُل کے پاس اپنے احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ لوگ ایک شخص کو پکڑ کر لائے اور کہا کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔

عبد اللہ نے پوچھا "تم پیغمبر ہو" بولا "جی ہاں" پوچھا "کس قوم پر مبعوث ہوئے ہو" بولا "کسی پر ہوا ہوں تمھیں کیا، میں شیطان پر مبعوث ہوا ہوں"۔ یہ سُنکر عبد اللہ ہنس پڑے اور کہا کہ "اسے چھوڑ دو، شیطان کے پاس جائے"۔

ثمامہ بن اشرس کہتے ہیں کہ میں قید میں تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مہذب و شائستہ انسان قید خانے میں لایا گیا اس وقت میرے ہاتھ میں شربت کا پیالہ تھا، اسے دیکھ کر میں اس قدر متحیر ہوا کہ پیالہ منھ سے لگانا بھول گیا اور اس سے پوچھا:- "آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں، آپ کو کس جرم میں مقید کیا گیا"۔

بولا - "یہ بدمعاش مجھے پکڑ لائے ہیں اور محض اس قصور پر کہ میں نے سچی بات ظاہر کی، میں نبی مُرسل ہوں"۔

یہ سُنکر میں متعجب ہوا اور بولا "کوئی معجزہ بھی آپ کے پاس ہے"۔ اس نے جواب دیا کہ "جی ہاں میرے پاس سب سے بڑا معجزہ ہے"۔ پوچھا "کیا" بولا کہ "کسی حسین عورت کو لاؤ، میری دُعا سے وہ جائے گی اور اس سے ایک بچہ پیدا ہوگا جو میری نبوت کی تصدیق کرے گا"۔

ثمامہ یہ سُنکر مشکل سے ہنسی ضبط کر سکے اور کہا "صلی اللہ علیک" اور پیالہ پیش کر کے کہا: "لیجئے اسے نوش فرمائیے"۔

محمد بن عتاب کا بیان ہے کہ میں نے ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک روز شہر رقہ میں دیکھا کہ لوگ ایک شخص کو گھیرے ہوئے ہیں جو صورت سے بہت مہذب معلوم ہوتا تھا، پوچھا "اسے کیوں گھیرے ہوئے ہو" لوگوں نے کہا "یہ پیغمبری کا دعوےٰ کرتا ہے" میں نے کہا "تم غلط کہتے ہو، ایسے شخص سے ایسا فعل سرزد نہیں ہو سکتا"۔ یہ سُن کر اس نے بگڑ کر مجھ سے کہا: "تمھیں کیونکر معلوم ہوا کہ یہ لوگ غلط کہتے ہیں" میں نے کہا "تو کیا تم نبی ہو" بولا "بیشک" میں نے کہا "اس کی دلیل؟" بولا "دلیل یہ ہے کہ تم ولد الزنا ہو"۔ میں نے ضبط کر کے کہا کہ "بھلا پاکدامن عورتوں پر زنا کا اتہام لگانا پیغمبر ہی کا کام ہے؟"۔ بولا "میں تو اسی غرض سے مبعوث ہوا ہوں"۔ میں نے کہا "تو مجھے تمھاری نبوت سے انکار ہے" بولا "انکار ہے تو اپنے گھر خوش رہو"۔ اتنے میں کسی نے اسے چند سنگریزے کھینچ مارے جن سے وہ زخمی ہو گیا اور بولا "یہ فعل خاص ابن زانیہ کا ہے" اور آسمان کی طرف سر اُٹھا کر کہنے لگا۔ "تم نے اچھا نہ کیا جو ان جاہلوں کے ہاتھ میں مجھے دے دیا"

مامون کے زمانہ میں ایک اور شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ مامون نے قاضی یحییٰ بن اکثم کو بلا بھیجا اور کہا "چلو، اس شخص سے چھیڑ چھاڑ کریں اور دیکھیں کیا کہتا ہے

چنانچہ دونوں بھیس بدل کر اس کے پاس پہونچے اور کہا کہ "ہم دونوں اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ کے ہاتھ پر ایمان لائیں"۔ اس نے کہا "تو آؤ بیٹھو"۔ اجازت پاکر ماموں اس کے داہنے ہاتھ اور قاضی یحییٰ بائیں ہاتھ بیٹھ گئے۔

ماموں نے پوچھا "آپ کن لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ہیں" بولا "ساری دنیا کے لئے"۔ پوچھا: "تو کیا آپ پر وحی نازل ہوتی ہے، یا القا ہوتا ہے، یا فرشتہ آکر آپ سے گفتگو کرتا ہے"۔ بولا۔ "فرشتہ گفتگو کرتا ہے" پوچھا "کون فرشتہ آتا ہے"۔ بولا: "جبرئیل"۔ پوچھا "اس سے پہلے کب آئے تھے"۔ کہا: "ابھی ابھی تمہارے آنے سے پہلے وہ موجود تھے"۔ پوچھا:۔ "تو تم پر اس وقت کیا وحی آئی"۔ بولا:۔ "یہی کہ عنقریب میرے پاس دو شخص آئیں گے ایک میرے داہنے طرف بیٹھے گا، دوسرا بائیں طرف اور جو بائیں ہاتھ بیٹھے گا وہ دنیا کا سب سے بڑا لوطی ہوگا" (قاضی صاحب اس بارے میں بدنام تھے) ماموں یہ سُنکر ہنسی ضبط نہ کرسکا اور کہا "اشہد انک رسول اللہ" (میں تمہاری رسالت پر ایمان لاتا ہوں)

کوفہ کے ایک شخص کا بیان ہے کہ ایک دن میرے ایک دوست آئے اور کہا "تم نے کچھ اور بھی سنا یہاں ایک پیغمبر صاحب پیدا ہوئے ہیں، چلو ذرا ان سے ملکے دیکھیں، وہ کیا کہتے ہیں"۔ میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور ہم دونوں اس نبی کے مکان پر پہونچے۔ یہ ایک نہایت ہی بدصورت خراسانی بڈھا تھا اور بھینگا بھی تھا۔ میرے دوست کانے تھے انھوں نے کہا "تم چپ رہو، میں گفتگو کرتا ہوں"۔ میں نے کہا "بہتر" اب اس سے ان دوست نے پوچھا "جناب کا کیا دعویٰ ہے"۔ بولا:۔ "میں نبی ہوں"۔ پوچھا "دلیل"۔ بولا:۔ "دلیل یہ کہ تم کانے ہو، اگر اپنی دوسری آنکھ نکال کے اندھے ہو جاؤ، تو میں اسی وقت دعا کرکے تمھیں اچھا کردوں گا"۔

میں نے ہنسی روک کر کہا کہ "پیغمبر صاحب آپ نے بات معقول کہی لیکن یہ اس کا نہیں"۔ میرے دوست نے مجھ سے کہا:۔ "تو تم ہی اپنی آنکھیں پھوڑ کے کیوں نہیں امتحان لیتے"۔

اس کے بعد ہم دونوں ہنستے ہوئے گھر چلے آئے۔

ایک بار ماموں کے پاس کسی مدعی نبوت کو پیش کیا گیا، پوچھا "تمھارے پاس کوئی معجزہ بھی ہے"۔ بولا "جی ہاں، میں آپ کے دل کی بات بتا سکتا ہوں"۔ ماموں نے کہا:۔ "اچھا بتاؤ، اس وقت میرے دل میں کیا ہے"۔ بولا "اس وقت آپ کے دل میں یہ ہے کہ یہ شخص بڑا جھوٹا ہے"۔

ماموں نے کہا "یہ تو تم نے سچ بتایا" اور اسے قید خانہ بھجوا دیا۔ چند روز بعد پھر بلوایا اور پوچھا:۔ "اس درمیان میں کوئی وحی تم پر نازل ہوئی یا نہیں"۔ بولا:۔ "نہیں"۔ پوچھا:۔ "کیوں"۔ کہا: "اس لئے کہ قید خانے میں فرشتے نہیں آتے"۔

ماموں ہنس پڑا اور اسے چھوڑ دیا۔

ماموں کے پاس آذربیجان سے ایک مدعی نبوت گرفتار کر کے لایا گیا۔ ماموں نے اپنے محل کے داروغہ ثمامہ کو حکم دیا کہ اس سے باتیں کرے۔

ثمامہ نے پوچھا کہ :- "تمھاری نبوت کی کیا دلیل ہے"۔ بولا :- "تم اپنی جورو کو میرے پاس بھیجدو، اس سے ایک بچہ پیدا ہوگا جو گہوارہ ہی میں میری نبوت کی تصدیق کرے گا"

ثمامہ نے کہا :- "جناب میں بغیر کسی دلیل کے آپ کو نبی مانتا ہوں، اشہدان لاالہ الا اللہ واشہدانک رسول اللہ"

ماموں نے کہا :- "تم تو چھوٹتے ہی ایمان لے آئے"۔ ثمامہ نے عرض کیا "امیرالمومنین کا تو کچھ بگڑے گا نہیں، اور میں بے آبرو ہو جاؤں گا، جسے اپنی بیوی سے دست بردار ہونا ہو، وہ ان کی نبوت میں شک کرے"۔

ماموں ہنس پڑا اور اسے چھوڑ دیا۔

ایک بار ہارون الرشید کے دربار میں ایک مدعی نبوت پیش کیا گیا۔ رشید نے پوچھا تو بولا "جی ہاں، میں نبی کریم ہوں"۔

پوچھا :- "دلیل"۔ بولا :- "آپ جو فرمائیں"

رشید نے کہا :- "میں چاہتا ہوں کہ یہاں جتنے بے ریش و بروت غلام کھڑے ہیں، ان سب کے اسی وقت داڑھیاں نکل آئیں"۔ جواب دیا :- "بھلا، اس میں کیا خوبی ہے کہ ان کے خوبصورت چہرے داڑھی نکال کے خراب کئے جائیں، ہاں یہ معجزہ دکھا سکتا ہوں کہ یہاں جتنے داڑھی والے اس وقت موجود ہیں، ان سب کی داڑھیاں غائب کر دوں"۔

یہ سنکر رشید بہت ہنسا اور اُسے انعام دے کر رخصت کر دیا۔

ایک اور مدعی نبوت کو ماموں کے سامنے لایا گیا اور جب اس سے معجزہ طلب کیا گیا تو کہا "میں سنگریزے پانی میں ڈالتا ہوں، اگر گھل جائیں تو جانئے میں سچا نبی ہوں"۔

ماموں نے کہا :- "منظور"۔ اس نے ایک کٹورے میں پانی بھر کر سب کے سامنے سنگریزے ڈالے تو وہ گھل گئے۔ ماموں نے کہا یہ اصلی سنگریزے نہ تھے، ہم جو سنگریزے دیں، انھیں گھلا دو تو جانیں"۔ بولا :- "نہ تم فرعون سے بڑے ہو اور نہ میں موسیٰ سے۔ فرعون نے موسیٰ سے کب کہا تھا کہ تمھارے عصا کی سند نہیں، ہم جو عصا دیتے ہیں اسے اژدہا بناؤ تو جانیں"۔

ماموں اس لطیفہ پر بہت ہنسا اور اسے انعام دے کر رخصت کر دیا

خلیفہ معتصم باللہ کے پاس ایک مدعی نبوت گرفتار کر کے لایا گیا۔ خلیفہ نے پوچھا:۔ "تم کس کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے ہو"۔ بولا:۔ "آپ کی ہدایت کے لئے"۔ معتصم بولا:۔ "تو میں گواہی دیتا ہوں کہ تم کمینے اور احمق ہو"۔ بولا "جی ہاں، یہ تو قاعدہ ہی ہے کہ جیسے لوگ ہوتے ہیں ویسے ہی پیغمبروں کے پاس بھیجے جاتے ہیں"

یہ جواب سُنکر معتصم ہنس پڑا اور اسے رہا کر دیا

مامون کے پاس ایک مدعی نبوت لایا گیا، تو مامون نے کہا کہ "اگر تم نبی ہو، تو اسی وقت ایک خربزہ لا کر پیش کرو"

اس نے کہا:۔ "تین دن کی مہلت دیجئے"

مامون نے کہا:۔ "مہلت نہ دیجائے گی"۔ بولا:۔ "یہ کونسا انصاف ہے کہ خدا تو کم از کم چھ مہینے میں خربزے پیدا کرتا ہے اور میں اسی وقت پیدا کر دوں"۔

خلیفہ متوکل کے زمانہ میں ایک عورت پکڑ کر لائی گئی، پیغمبر ہونے کی مدعی تھی۔

متوکل نے پوچھا۔ "تو نبیہ ہے" بولی "جی ہاں" پوچھا "تو محمدؐ کو بھی رسول مانتی ہے یا نہیں"۔ بولی "کیوں نہیں" متوکل نے کہا:۔ "جب تو انھیں مانتی ہے، تو اُن کے اس قول کو بھی مانتی ہو گی کہ لا نبی بعدی (میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا)"۔ بولی کہ:۔ "میں ان کے ہر قول کو مانتی ہوں، لیکن انھوں نے یہ تو نہیں فرمایا کہ لا نبیۃ بعدی (میرے بعد کوئی نبیہ نہ ہوگی)

متوکل ہنس پڑا اور اسے چھوڑ دیا

جذباتِ بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲ مادیین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکراتِ نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کر دینا آخر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس [illegible] گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً:۔ مومن غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جن کا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

قیمت حصۂ اول للعہ ـ حصۂ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
انجیلِ انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیت کبریٰ" و اخوتِ عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے ـــــ اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی و نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے ـــــ ضخامت ۲۰۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنہ [illegible] علاوہ محصول

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء	جنوری سنہ ۴۰ء	جنوری سنہ ۴۱ء	جنوری سنہ ۴۲ء	جنوری سنہ ۴۳ء
(مصحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں: حیات مصحفی - اُردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ - مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں، انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ	(تغزل نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں: تغزل کا مسلک، شاعری پر تبصرہ، تغزل اور عوام، انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ	یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے - یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے -	اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے دو شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری سنہ ۴۲ء میں شایع ہوا تھا -	اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی -
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول	قیمت دو روپیہ علاوہ محصول	قیمت تین روپیہ علاوہ محصول	قیمت دو روپیہ علاوہ محصول	قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء — (قرآن نمبر) اس میں نگار نے ان اعتراضات کو پیش کیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے پیش کئے گئے ہیں - حضرت نیاز کے کٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ ——— قیمت دو روپیہ علاوہ محصول -

جنوری - فروری - مارچ سنہ ۴۶ء — یہ سالنامہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے پہلا حصہ جنوری کا ہے [illegible] دوسرے حصہ میں فروری، مارچ دونوں نمبر شامل ہیں - قیمت ہر حصہ کی ایک روپیہ آٹھ آنے

جنوری سنہ ۴۷ء — اس [illegible] جیدولین نمبر ہے جس میں ایک بے مثل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے - ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے - علاوہ محصول -

جنوری - فروری سنہ ۴۸ء — (پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر - جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں اور ان کارناموں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومتوں کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی - تمام مقالات اڈیٹر کے قلم سے ہیں ——— قیمت تین روپیہ — علاوہ محصول -

نرخنامہ اُجرت اشتہار

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	[illegible] روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھا صفحہ	[illegible] روپیہ	۱۰۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ	[illegible] روپیہ	۶۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر چھ روپیہ - ششماہی جاری نہیں ہو سکتا - سالانہ بیرون ہند بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے [illegible] اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا - "مینجر"

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے - مینجر

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت چار روپیہ

علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں، حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

مختارات نیاز

حضرت نیاز فتحپوری کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ اس میں اکثر بیشتر وہ افسانے شامل ہیں جو دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں اور اپنی دلچسپی و افادیت کے لحاظ سے خاص درجہ رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دوسری زبانوں کا افسانہ کیونکر اپنی زبان میں لینا چاہئے کہ وہ ترجمہ معلوم نہ ہو۔ مجلد نہایت عمدہ طباعت و کاغذ اور نفیس گردپوش کے ساتھ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ

مکتوبات نیاز (دو حصوں

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۲ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت ہر حصہ تین روپیہ

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخئیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کہاں اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب

(حصہ ۲ - ۳)

اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بے کار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ

علاوہ محصول

جہانسی کی رانی

نیاز فتحپوری کے قلم سے اس ڈرامہ سے نہ صرف ۱۸۵۷ء کے ان واقعات پر روشنی پڑتی ہے جو ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام کا باعث ہوئے، بلکہ راجاؤں کے ان اندرونی اختلافات کا بھی حال معلوم ہوتا ہے جو ملک کو غیر ملکیوں کے ہاتھ میں دیدینے کا بڑا سبب تھے اس ڈرامہ کے وہ حصے خصوصیت کے ساتھ بہت دلچسپ ہیں جن میں رانی کی زندگی کے آخری لمحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ

اصحاب کہف

یہ ڈرامہ ایک مصری انشاء پرداز "توفیق الحکیم کی کتاب اہل الکہف" کا ترجمہ ہے جس میں فاضل مصنف نے نہایت لطیف انداز سے "اصحاب کہف" کی روایت پر عاقلانہ تبصرہ کیا ہے، اس تمثیل کی جان وہ حصہ ہے جہاں موضوع محبت پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کی ابدیت کو بالکل اچھوتے انداز سے پیش کیا گیا ہے — ترجمہ حضرت نیاز نے کیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

"نگار" کا سالانہ چندہ اب چھ روپیہ علاوہ محصول ہو گیا ہے

سالانہ چندہ: چھ روپیہ ہندوستان کے لئے — بیرون ہند کے لئے بارہ شلنگ

جلد-۵۳	فہرست مضامین مارچ ۱۹۴۸ء	شمار-۳

سالانہ چندہ چھ روپیہ ہندوستان کے لئے ۔ بیرون ہند کے لئے بارہ شلنگ

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۵۳	مارچ سنہ ۴۸ء	شمار ۳

آہ، مہاتما گاندھی

أَرَأَيْتَ مَنْ حَمَلُوا عَلَى الْأَعْوَادِ

أَرَأَيْتَ كَيْفَ خَبَا ضِيَاءُ النَّادِي

(تم نے دیکھا کہ یہ کس کو لکڑیوں پر اٹھا کر لے گئے ۔ اور تم نے یہ بھی دیکھا کہ مجلس کی روشنی کس طرح ٹھنڈی پڑ گئی)

ملاحظات

مہاتما گاندھی کی شخصیت

حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کی تمدنی و سیاسی آزادی حاصل کرنے کے لئے مہاتما نے سب سے پہلے جنوبی افریقہ میں اپنی جدوجہد شروع کی، جہاں برطانوی حکومت و برطانوی آبادی نسلی امتیاز کی بناء پر ہندوستانیوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کرتی تھی اور اس سلسلہ میں ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۳ء کے درمیان مہاتما کو آٹھ بار جیل جانا پڑا اور معمولی مجرموں کے ساتھ انھیں رکھا گیا۔

اس کے بعد جب وہ ہندوستان آئے تو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک انھوں نے برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون کر کے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد شروع کی، لیکن جب انھیں بالکل یقین ہوگیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو اپنی خوشی سے کبھی آزاد نہیں کر سکتی اور ملک کا جہل و افلاس اس حکومت کے ہوتے ہوئے کبھی دور نہیں ہوسکتا تو انھوں نے حکومت کے خلاف عدم تعاون کی پالیسی اختیار کی اور ۱۹۱۹ء اور ۱۹۴۲ء کے درمیان ان کو آٹھ مرتبہ قید و بند کی تکلیفیں اُٹھانا پڑیں۔ آخری مرتبہ جب ۱۹۴۲ء میں انھیں مقید کیا گیا تو ان کی عمر ستر سال سے زیادہ ہوچکی تھی، لیکن انھوں نے ان تمام مصائب کو نہایت صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا، کیونکہ وہ اپنی جگہ فیصلہ کر چکے تھے کہ برطانوی سامراج کی لعنت کو بہرحال دور کرنا ہے اور یہ لعنت محض اخلاقی قوت سے دور ہوسکتی ہے جس کا دوسرا نام اہنسا ہے۔

اُن کے سامنے برطانوی سامراج کی پچھلی سو سال کی تاریخ موجود تھی اور اس میں انھیں کسی ایک جگہ بھی اس قوم کی انسانیت و اخلاق کی کوئی جھلک نظر نہ آتی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریز کی نگاہ میں ہندوستانی جانور سے بدتر ہے اور ایک سفید فام قوم ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتا ہے کہ ہندوستان کی سیاہ فام آبادی کو ہمیشہ اپنا غلام بنائے رکھے، اور ان کے ملک کو لوٹ کر تباہ و برباد کر دے۔ مہاتما کا یہ احساس اس قدر قوی تھا اور اُن کے تاثرات اس درجہ شدید تھے کہ حصولِ مقصود میں جتنے زیادہ موانع پیدا ہوتے جاتے تھے، اتنی ہی زیادہ ان کی جدوجہد بڑھتی جاتی تھی اور یہ ان کی انھیں بے غرض کوششوں کا نتیجہ تھا کہ آخرکار ہندوستان کی تمام آبادی نے بلاقید ملت و مذہب برطانوی سامراج کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور برطانیہ کو اس فیصلہ کے سامنے سر جھکا دینا پڑا۔

مہاتما گاندھی اس میں شک نہیں مذہبا ہندو تھے، لیکن ان کے مذہبی معتقدات کی بنیاد رسم و رواج پر نہیں بلکہ محض اخلاق پر قائم تھی جہاں پہونچکر دُنیا کے تمام مذاہب کی راہیں ایک ہو جاتی ہیں، اس لئے وہ نسل و مذہب کے امتیاز سے بہت بلند تھے اور دُنیا میں وہ محض اخوتِ عامہ اور انسانیت کبریٰ کی حکومت چاہتے تھے، اور اپنے اسی بلند مقصد کی تکمیل میں انھوں نے اپنی جان دی۔

جنھوں نے مہاتما گاندھی کی زندگی اور اُن کے خلوصِ عمل کا مطالعہ کیا ہے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے اندر پیمبرانہ روح کام کر رہی تھی اور ایک پیمبر ہی کی حیثیت سے ان کو اہلِ ملک نے دیکھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اب جبکہ ان کی ذات ہم میں موجود نہیں ہے، ہم کو کیا کرنا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دُنیا سے جب کوئی نبی، پیغمبر یا عظیم المرتبت انسان اُٹھ گیا تو اس کی تعلیمات کی اصل روح بھی کچھ دنوں بعد ختم ہو گئی اور اسکے ماننے والے محض مراسم و عوائد کے پابند ہو کر رہ گئے، اور اگر مہاتما گاندھی کے بعد بھی یہی ہوا تو گو کوئی نئی بات نہ ہوگی، لیکن سخت افسوسناک ہوگی۔

مہاتما گاندھی کی ہستی اس میں شک نہیں ایک رشی منی کی ہستی تھی۔ انکے بُت شوالوں میں رکھے جائیں گے، ان کا نام سمرنوں پر جپا جائے گا، ان کے جے کارے لگائے جائیں گے اور جب کسی صحبت میں ان کا ذکر آئے گا تو لوگوں کے سر جھک جائیں گے، لیکن کیا اس سے مہاتما گاندھی کی روح کو کوئی مسرت حاصل ہو سکتی ہے اور کیا ہم کو کوئی فایدہ اس سے پہونچ سکتا ہے، اگر ہم ان کی تعلیمات کو نظر انداز کر دیں۔ اُنکے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آمر یا غیر فانی ہو گئے، لیکن انسان کا جسم کبھی آمر نہیں ہوتا، بلکہ اس کی روح آمر ہوتی ہے اور ہم مہاتما گاندھی کے آمر ہونے کا ثبوت صرف اسی طرح دے سکتے ہیں کہ ان کی تعلیمات کو سامنے رکھیں اور جس مقصد کو وہ ناتمام چھوڑ گئے ہیں اسے پورا کر کے دکھا دیں۔

مہاتما گاندھی بڑے خوش نصیب انسان تھے کہ ہندوستان کو وہ اپنے سامنے ہی آزاد دیکھ گئے جسکی ان کو انتہائی تمنا تھی، لیکن اس آزادی سے انھیں جو دُکھ پہونچے ان کی تمنا انھوں نے کبھی نہ کی تھی۔ حصولِ آزادی اور تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں جو قیامت کبریٰ برپا ہوئی، اس نے مہاتما گاندھی کے دل کا خون کر دیا تھا اور وہ سفاکی و درندگی، بیرحمی و شقاوت کے واقعات سُن سُنکر اس درجہ ملول رہنے لگے تھے کہ ان کو اپنی زندگی عار نظر آنے لگی تھی اور اسی لئے انھوں نے برت رکھا تھا کہ شاید وہ اس طرح اس لعنت گاہ سے منھ چھپا سکیں گے لیکن ان کی قسمت میں تو اس سے زیادہ شاندار، اس سے زیادہ دلکش موت لکھی تھی، اُن کو تو اکابر شہدائے عالم کی صف میں شامل ہونا تھا، اُن کے مقدس خون کو تو اس ملعون سرزمین کے گناہوں کا کفارہ ہونا تھا، اس لئے ان کی زندگی کا مقصود جو واقعی برت سے پورا نہ ہو سکتا تھا، آخر کار ریوالور کی گولی سے پورا ہوا۔

پھر اس میں شک نہیں کہ مہاتما گاندھی کی یاد قایم رکھنے کے لئے وہ سب کچھ ہوگا، جو اس مادی دُنیا میں کیا جا سکتا ہے، انکے مجسمے قایم ہوں گے، اُن کے بُت پوجے جائیں گے، ان کے نام سے مدرسے اور ادارے قایم ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ ایک جداگانہ مسلک و مذہب ہی گاندھی پنتھی کے نام سے جاری ہو جائے، لیکن اُن کی صحیح یادگار صرف وہی ہو سکتی ہے جو ہمارے دلوں میں، ہماری روحوں میں قایم ہو اور اُنکے سچے معتقد و پیرو وہی ہو سکتے ہیں جو ان کی طرح اپنی زندگی کو صرف درسِ محبت و اخوت کے لئے وقف کر دیں، مذاہب کے موجودہ اختلافات سے کٹ کر صرف "مذہبِ انسانیت" کو اپنا مذہب قرار دیں، صرف اس لئے کہ خود ہماری بقاء و نجات اسی میں ہے، ورنہ جہاں تک مہاتما گاندھی کی شخصیت کا سوال ہے وہ ان تمام یادگاروں سے بے نیاز ہے اور صفحاتِ تاریخ پر اس کا یہ قایم کیا ہوا نقش کبھی نہیں مٹ سکتا کہ

شدیم خاک ولیکن ببوئے تربت ما
تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد

مہاتما گاندھی کی شخصیت ایک ایسے انسان اعلیٰ کی شخصیت تھی، ایک ایسے زبردست مفکر و مصلح کی شخصیت تھی جس میں پہاڑوں کا سا تحمل و استقلال اور دریاؤں کا سا اضطراب حرکت و عمل پایا جاتا تھا۔ ان کا مذہب صرف محبت تھا، جب تک وہ زندہ رہے انھوں نے ہمیشہ یہی درس دیا اور اگر دُنیا کو صحیح امن و سکون نصیب ہو سکتا ہے تو صرف اسی درس کو سامنے رکھکر جسکی تبلیغ میں مہاتما گاندھی نے جان دی۔ سچ ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
چمن میں جب کہیں ہوتا ہے جاکر دیدہ ور پیدا

کانگرس اور کانگرس حکومت کی غلطیاں

اس میں شک نہیں کہ تقسیم ہند کا بنیادی سوال صرف اس خدشہ سے متعلق تھا کہ مسلمان ہندوستان میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے آزادی اور عزت کے ساتھ نہیں رہ سکتے اور رفتہ رفتہ یہ خیال قوی ہو کر پاکستان کے تعمیری منصوبہ میں تبدیل ہو گیا۔ ہر چند اس تحریک کو پیدا کرنے، ترقی دینے اور آخر کار کامیاب بنانے میں برطانوی سامراج کی چالوں کو بڑا دخل تھا، جس نے مسلم لیگ کے ذریعہ سے ہندوستان کے اتحاد کو ختم کیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس تحریک کو قوی بنانے کے ذمہ داری ایک حد تک کانگرس پر بھی عاید ہوتی ہے، جس نے یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے کہ درپردہ اس تحریک کا بانی کون ہے، اس خدشہ کو بڑھ جانے کا موقعہ دیا اور اپنے طرز عمل میں مصلحتاً و ضرورتاً بھی کوئی ایسی تبدیلی پیدا نہیں کی کہ اس خدشہ کا پروپاگنڈا کرنے والوں کا منھ بند کر دیا جاتا۔

یہ تو تھی کانگرس کی پہلی غلطی جس کا احساس ممکن ہے اسے کبھی ہوا ہو لیکن اس کا اعتراف اسنے کبھی نہیں کیا۔ اس کے بعد دوسری بڑی غلطی اس نے یہ کی کہ "تقسیم ہند" کے مسئلہ کو تسلیم کر لیا۔ اس باب میں لارڈ مونٹ بیٹن نے جو کچھ کیا وہ یقیناً ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے اور برطانوی حکومت انکے اس خدمت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ جس بات کی وہ عرصہ سے متمنی تھی اور پوری نہ ہوتی تھی اسے لارڈ مونٹ بیٹن نے اتنی آسانی سے طے کر دیا، لیکن خود کانگرس نے کیوں اس کو تسلیم کر لیا، اس کا کوئی معقول جواب کانگرس کے پاس نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قبل تقسیم ہند عارضی حکومت کے دوران میں جو موانع کانگرس کی راہ میں حایل کئے گئے، اُن سے وہ تنگ آگئی تھی اور آخر کار اسنے پریشان ہو کر تقسیم کے مسئلہ کو تسلیم کر لیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو میں اسے کانگرس کی کمزوری سے تعبیر کروں گا، کیونکہ مجبور ہو کر کسی بات کو مان لینا کسی قوم یا حکومت کا قابلِ فخر کارنامہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ان غلطیوں کا سلسلہ یہیں ختم ہو جاتا تو بھی غنیمت تھا، لیکن افسوس ہے کہ وہ تقسیم کے بعد بھی جاری رہا۔ اگر کانگرس نے اُصولاً پاکستان کے قیام کو تسلیم کر لیا تھا، تو چاہئے تھا کہ مالی، اقتصادی و انتظامی امور میں تقسیم کی جو صورتیں طے پاگئی تھیں ان پر وہ شگفتگی و خندہ روئی کے ساتھ عمل کرتی، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کے ساتھ اسکے تعلقات زیادہ کشیدہ ہو گئے ۔۔۔ اور ۔۔۔ اگر مہاتما گاندھی کا قدم درمیان نہ ہوتا تو ۵۰ کرور کی رقم کے معاملہ میں یہ کشیدگی غالباً نازک صورت اختیار کر لیتی۔ اتفاق سے اسی دوران میں کشمیر کا جھگڑا شروع ہو گیا اور اس سلسلہ میں جو غلطی کانگرس سے ہوئی وہ تمام پچھلی غلطیوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ مہاتما گاندھی اس کے موافق نہ تھے کہ اس مسئلہ کو حفاظتی کونسل کے سامنے پیش کیا جائے، لیکن نہرو حکومت نے رفع شر کی یہی صورت زیادہ مناسب سمجھی، حالانکہ اسے جاننا چاہئے تھا کہ اس طرح مسئلہ کشمیر اور زیادہ اُلجھ جائے گا: پاکستان کی خواہش

بھی یہی تھی کہ یہ مسئلہ حفاظتی کونسل کے سامنے جائے، لیکن وہ خود اپنی طرف سے اس کی ابتدا کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اسکی تحریک ہندوستان کی حکومت کی طرف سے ہو اور پاکستان ایک مدعا علیہ کی حیثیت سے جوابدہی کرے - کیونکہ قاید اعظم ایسا ماہر قانون یہ نکتہ نظر انداز نہ کرسکتا تھا کہ عدالت میں مدعا علیہ جوابدہی کے لئے کس قدر آزاد ہوتا ہے اور شبہات سے فائدہ اُٹھانے کا اس کو کتنا موقعہ حاصل ہوتا ہے، خاصکر ایسی صورت میں جبکہ خود عدالت مدعا علیہ کی حمایت پر آمادہ ہو۔

پھر کیا ہندوستان کی حکومت اس حقیقت سے واقف نہ تھی کہ حفاظتی کونسل برطانیہ و امریکہ کی Power Politics کے سوا کچھ نہیں اور پاکستان کا وجود اور اس کا استحکام، برطانیہ و امریکہ کی مشترک پالیسی کے لحاظ سے کس قدر ضروری ہے - اور اگر وہ اس سے واقف تھی (اور یقیناً واقف ہوگی) تو کیوں اس نے دیدہ و دانستہ ایسی غلطی کی - اس کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جاسکتا۔

کشمیر کا علاقہ اپنے جا رو قوع کے لحاظ سے بڑی اہم چیز ہے، اس کا شمالی علاقہ روس کے جنوبی سرحد سے ملا ہوا ہے اور بحر ہند پر اقتدار قایم کرنے کے لئے (جس کی تمنا روس کو عرصہ سے ہے) روس یہیں سے پیشقدمی کرسکتا ہے، اس لئے وہ چاہتا ہے کہ یا تو کشمیر میں خود اس کے قدم جم جائیں یا پھر ہندوستان کے زیر اثر آجائے جہاں کبھی نہ کبھی کمیونسٹ حکومت ہوجانے کا اسے یقین ہے، برخلاف اسکے برطانیہ و امریکہ، کشمیر پر اپنا اثر قایم رکھنا اسلئے ضروری سمجھتے ہیں کہ خلیج فارس کے پٹرول اور بحر ہند کی حفاظت اسی طرح ممکن ہے کہ کشمیر کسی ایسی حکومت کے سپرد کردیا جائے جو اینگلو امریکن پالیسی کے لحاظ سے زیادہ موزوں ہو اور ظاہر ہے کہ ایسی حکومت پاکستان ہی کی ہوسکتی ہے - جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے بیس سال تک برٹش کامن ولتھ میں شامل رہنے کا مستحکم وعدہ کرلیا ہے، اور جو جنگ کی صورت میں انگریزی اور امریکن فوجوں کا مرکز آسانی سے بن سکتا ہے۔

اسوقت تک حفاظتی کونسل کی جو روئیداد ہمارے سامنے آئی ہے، وہ حکومت ہند کے نقطۂ نظر سے بہت امید شکن ہے اور برطانوی و امریکی مندوبین کا رجحان پاکستان کی طرف اب کوئی راز نہیں رہا، لیکن اس سے قطع نظر ایک گتھی اور بھی ہے، وہ یہ کہ اگر حفاظتی کونسل کوئی فیصلہ کر بھی دے تو اس کا نفاذ کیونکر ہوگا اور اس کے پاس وہ کونسی قوت ہے جو اپنے فیصلہ کو پاکستان و ہندوستان دونوں سے تسلیم کرالیگی اور اگر یہ دونوں مان بھی لیں تو سرحدی قبایل کو کیونکر رام کیا جاسکتا ہے اور روس کی طرف سے اسلحہ کی فراہمی کس طرح بند کی جاسکتی ہے۔

الغرض کشمیر کا مسئلہ بہت اُلجھا ہوا مسئلہ ہے اور ہندوستان کی حکومت نے حفاظتی کونسل میں اسے پیش کرکے اپنے کو اور زیادہ اُلجھن میں ڈالدیا ہے، کیونکہ اس سے نہ صرف ہندوستان و پاکستان کے تعلقات میں اور زیادہ کشیدگی پیدا ہوجائے گی بلکہ حکومت ہند کو اب اپنی خارجہ پالیسی میں بھی تبدیلی کرنا پڑے گی اور اگر اسے برٹش کامن ویلتھ سے علٰحدہ ہونا پڑا، جس کے آثار نمایاں ہیں تو اس کو لامحالہ روس سے تعلقات قایم کرنا پڑیں گے اور بحالات موجودہ جبکہ روس، امریکہ کے درمیان جنگ کا اندیشہ روز بروز قوی ہوتا جارہا ہے، اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندوستان کو بہت جلد لڑائی کی اس آگ میں کودنا پڑے گا جو بہت تیزی سے مشرق وسطی کی طرف بڑھتی آرہی ہے۔

فانیؔ کی المیہ شاعری کے عناصر

شاعرانہ افتادِ طبع اور مزاج کے لحاظ سے اصغر اور فانی زندگی کی دو بالکل مخالف سمتوں کے حدود پر کھڑے نظر آتے ہیں اور غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ حسرت ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیتے ہیں۔ اصغر کے یہاں نشاط ہی نشاط ہے۔ فانی کے یہاں غم ہی غم اور حسرت کے یہاں نشاط و غم کا ایک ایسا حسین امتزاج جس کے سموئے ہوئے نکھار میں عشقیہ شاعری کی روح اپنے حقیقی روپ میں کارفرما نظر آتی ہے۔

اصغر نے تو یہ کہہ کر معاملہ بڑی حد تک صاف کر دیا ہے کہ " جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا"۔ لیکن فانی کے یہاں حزن و یاس کے جو عناصر پائے جاتے ہیں ان کا تجزیہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔ اس شدید، خالص اور غیر مخلوط غم کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جو فانی کی شاعری میں موجیں مارتا ہے یہ امتیاز کرنا تقریباً محال ہے کہ اس میں کہاں "غمِ جاناں" ہے اور کہاں "غمِ روزگار" فانی کا غم اتنا تیکھا اور اتنا پختہ ہے کہ اسے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ہم ایسا کیوں محسوس کرتے ہیں کہ فانی کے غمِ حیات کی فضا میں محدود ہیں اور اس میں آفاقی شان نہیں پائی جاتی۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جس غم پر فانی کی شاعری کی بنائیں قایم ہیں وہ حقیقی اور جذباتی ہونے کے بجائے زیادہ تر تخئیلی اور ذہنی ہے۔ اگرچہ فانی کے کلام پر بھی دوسرے کامیاب شاعروں کی طرح اُن کی شخصیت کی چھاپ پڑی ہوئی ہے لیکن یہ خصوصیت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ فانی کی شخصیت، ماحول اور حادثاتِ زمانہ کے ہاتھوں تشکیل پانے کے بجائے زیادہ تر خود انھیں کی ساختہ پرداختہ ہے۔ فانی اپنے کلام ہی کے نہیں بلکہ بڑی حد تک اپنی شخصیت کے بھی خالق ہیں۔ یہ بات سننے والوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہوگی۔ لیکن فانی کی زندگی کے تفصیلی حالات کی چھان بین کے بعد جس کا فانی کے وطن میں رہ کر حُسنِ اتفاق سے مجھے کافی موقع ملا ہے، یہ نکتہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ فانی کی شدید غم پرستی اور الم پسندی کے اسباب اُن کی زندگی کے واقعات میں نہیں بلکہ خود اُن کی انوکھی افتادِ طبیعت میں تلاش کرنے چاہئیں۔

غور فرمایئے فانی ایک خوش حال گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ یہ گھرانہ بدایوں میں اپنی امارت اور شرافتِ نسبی دونوں کے لئے مشہور تھا۔ فانی نے نوجوانی ہی نہیں ڈھلتی ہوئی جوانی تک کی تمام زندگی دولت اور راحت کی چھاؤں میں بسر کی

ستائیس برس کی عمر تک صاحبِ جائداد اور برسر روزگار باپ کا سایہ سر پر رہا جس نے اُس زمانہ کے بلند ترین معیار کے مطابق، مسلمانوں کی سب سے مشہور درسگاہ علیگڑھ کالج میں رکھ کر انھیں اعلیٰ ترین تعلیم دلوائی۔ کہا جاتا ہے کہ فانی اپنے شہر کے تیسرے مسلم نوجوان تھے جس نے بی، اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر والد کے انتقال پر ایک عالی شان محل نما مکان کے علاوہ ۵-۶ سو روپیہ ماہوار آمدنی کی جائداد ہاتھ آئی۔ یہ اس ٹھوس سرمایہ کے علاوہ تھی جو وکالت کی سند کی شکل میں پہلے سے ان کے پاس موجود تھا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ جیسے فانی کو یہ فراغت کاٹے کھاتی ہو۔ تھوڑے ہی دنوں میں ناقابل اسراف کی بدولت اپنی آبائی جائداد کے وارے نیارے کر دئے۔ وطن سے طبیعت بیزار ہوگئی تو وکالت کے سلسلہ میں اٹاوہ، آگرہ، لکھنؤ اور خدا جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی لیکن عالم یہ تھا کہ اُن کی بیقرار طبیعت انھیں کہیں زیادہ دنوں جم کر بیٹھنے نہ دیتی۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ وکالت کی سرد بازاری انھیں ایک شہر چھوڑ کر دوسرے شہر کیلئے رختِ سفر باندھنے پر مجبور کرتی تھی۔ جی نہیں۔ واقعات شاہد ہیں کہ وہ جہاں جاتے اُن کے کمال کا شہرہ اُن سے پہلے وہاں پہونچ جاتا اور بہت جلد اُن کی شاعری ایسے ہمدردوں کا ایک گروہ پیدا کرلیتی جو اُن کے پیشے کو ہر طرح چمکانے کی سعی بلیغ کرتے۔ فانی کے ایک ہموطن نے جو اُن کے گہرے دوست رہ چکے ہیں اور جنھیں مدتوں سفر و حضر میں فانی کی ہمنشینی کا فخر حاصل رہ چکا ہے مجھ سے خود بیان کیا کہ وہ جس شہر میں بھی جاکر وکالت شروع کرتے وہاں تھوڑے ہی دنوں میں اپنے کمال شاعری کی بدولت افسروں کے منظور نظر بن جاتے اور اُن میں سے بعض وارفتگان ادب کی ہمدردی کا تو یہ عالم تھا کہ اپنی عدالت کے ملزموں کو بہ اصرار فانی کو اپنا وکیل قرار دینے پر آمادہ کرتے۔ پھر یہ بھی نہ تھا کہ فانی کی ذہانت صرف اُن کی شاعری تک محدود ہو۔ جن بزرگوں نے فانی کو مقدمات کی پیروی کرتے دیکھا ہے وہ اُن کی حیرت انگیز قانونی ذکاوت اور غیر معمولی سوجھ بوجھ کے آج تک قصیدہ خواں ہیں۔

بدایوں کے ایک دوسرے فاضل دوست کا فانی کے متعلق بیان ہے کہ "اُن کے نزدیک گھر سے کچہری تک جانا اتنی بڑی مصیبت تھی کہ محنتانے کی کوئی رقم اس کا بدل نہ ہوسکتی تھی چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ کچہری کے قصد سے دروازے تک آئے، دھوپ کی تمازت دیکھ کر العظمت للّٰہ کہا اور پھر گھر میں واپس چلے گئے۔ اٹاوہ میں ایک ڈپٹی کلکٹر اُن کے بڑے قدرشناس تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ فانی کو احتیاج کی صورت نہ دیکھنی پڑے۔ چنانچہ ایک اردلی کی مستقل خدمت یہ تھی کہ فانی کو گھر سے کچہری تک پہونچادے ــــ آگرے میں ایک سب جج فانی کے بڑے مداح تھے یہاں تک کہ وہ ہر مشاعرے میں جہاں فانی کو بُلایا جاتا شرکت کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے۔ اُن کا معمول تھا کہ ہر کمیشن فانی کے سپرد کردیتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک ایک ماہ میں چودہ چودہ سو کے کمیشن فانی کو دئے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم پیشہ وکلا نے افسران بالا کو شکایتیں لکھنا شروع کردیں لیکن نہ حکام کی نوازشیں فانی کے افلاس کا علاج کرسکیں نہ احباب کی فہمائشیں"۔

فانی کے والد کا انتقال سنہ ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ اسوقت فانی کی عمر لگ بھگ ۲۷ سال کی تھی۔ ۲۷ سال کی اس طویل مدت

میں فانی کو جو کچھ بننا یا بگڑنا تھا وہ بن یا بگڑ چکے تھے اور اُن کی طبیعت اور اُن کا شعور پختگی کے تمام منازل طے کر چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں جو اوپر بیان کئے گئے غمِ روزگار کا سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رہا غمِ جاناں سو داخلی اور خارجی شواہد سے صرف ایک آدھ اوچھی سی چوٹ کا پتہ چلتا ہے، محض ایک خراش جو شاعر کی زندگی پر رعنائی اور رنگینی کا ہلکا سا پرتو تو ضرور ڈال سکتی ہے لیکن دل کا خون نہیں کر سکتی۔

پھر یہ تنگ و تار، روح کو گھونٹ دینے والا، سانس کو بند کر دینے والا غم فانی کی شاعری میں کہاں سے آیا۔ جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں اس کے سوتے خود فانی کی ذات میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک کھاتے پیتے خاندان میں ایک نارمل قسم کا ذہین بچّہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کا بچپن، نوجوانی، جوانی سب کے سب خارجی حوادث اور ماحول کے لحاظ سے بالکل نارمل انداز میں گزرتے ہیں۔ فطرتاً وہ رومان پسند اور سیماب صفت ہے۔ اس کی تیز ذہانت نے اس کے احساس کو دھار دار بنا دیا ہے۔ اُس کی بے چین طبیعت اپنی جولانیوں کے لئے ایسے سنگلاخ زمین کی تلاش میں ہے جس کے تصادم سے اس کا شیشۂ دل چور چور ہو جائے، لیکن اُس کی یہ آرزو تخیل کے حدود سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کی زندگی عملی طور پر اس قسم کے المناک واردات سے خالی ہے جو اپنے ساتھ سوز و گداز کا رنگین تحفہ لاتے ہیں۔ وہ اس پُر سکون، مطمئن اور سادہ زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے، کچھ تو اس وجہ سے کہ اس کی بے چین طبیعت ایک گہرے، پائدار داغِ غم کی آرزومند ہے اور کچھ اس لئے بھی کہ وہ جو اُس کی روح میں ایک شاعر بیٹھا ہوا ہے وہ اس نکتہ سے خوب واقف ہے کہ جس شاعری کو آنسوؤں سے نہ سینچا جائے، جس شاعری کی رگوں میں خونِ جگر رواں دواں نہ ہو وہ شاعری سستی اور ادنیٰ درجے کی ہوتی ہے۔ جب باہر کی دُنیا سے وہ حسبِ دلخواہ غم کی جراحتیں حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اپنے ہی ناخن سے اپنے سینے کو زخمی کر کے لہولہان بنا دیتا ہے۔ اپنے ہاتھوں اپنے جگر کو اس طرح خون کر کے اسے بڑی لذت حاصل ہوتی ہے۔ وہ خوش ہے کہ جس نعمت سے وہ اب تک محروم تھا وہ اُسے مل گئی اور بڑی بات یہ کہ اس خود اکتسابی دولتِ غم کے لئے اسے زندگی کا بھی احسان مند نہ ہونا پڑا۔ اس خیال سے اسے بڑی تسکین ہوتی ہے کہ یہ اس کی خالص اپنی ہی مشقت کی گاڑھی کمائی ہے جس کے لئے وہ کسی دوسرے کا مرہونِ منت نہیں۔

سچ پوچھئے تو فانی کی اس نوع کی غم پرستی دراصل لذتیت کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ یہ لذتیت مثبت نہیں بلکہ منفی قسم کی ہے اور ماہرینِ نفسیات اس نکتے سے خوب واقف ہیں کہ جب نفسِ انسانی اس قسم کی معکوس لذتیت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر اس کی ساری دُنیا سمٹ کر لذت کے ایک چھوٹے سے نقطے میں محدود ہو جاتی ہے۔

خراش کو زخم اور زخم کو کھرچ کھرچ کر ناسور بنا دینے میں فانی کو کمال حاصل ہے، زندگی کی جن ہلکی پھلکی اور وقتی ناکامیوں پر سے ہم آپ یہ سمجھ کر سرسری طور پر گزر جاتے ہیں کہ حیات کی اسی دھوپ چھاؤں کا نام دُنیا ہے، فانی کی غم پرست طبیعت چھوٹی چھوٹی گریز پا ناکامیوں اور مایوسیوں کو مصائب کا اٹل پہاڑ بنا دیتی ہے اور ان ذہنی جراحتوں سے

حاصل کیا ہوا غم اُن کے لئے روحانی غذا کا کام بہم پہونچاتا ہے۔

فانی کے نزدیک "قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں" اسی لئے وہ زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ، طرح طرح سے موت کا شاندار خیر مقدم کرتے نظر آتے ہیں۔ موت انھیں دُلھن اور محبوب کی طرح حسین معلوم ہوتی ہے اور لے دے کے موت ہی انھیں اپنی تمام امیدوں اور آرزوؤں کا آخری سہارا نظر آتی ہے، اس رنگ کے چند اشعار سنئے:۔

خدا رکھے یہی رونق ہے اس اُجڑے ہوئے گھر کی — اجل کی آرزو ہو دل میں فانی اور دُنیا ہو

یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی — آتی رہے گی خیر اب اس زندگی کو موت

ڈھونڈھتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا — زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لاکے مجھے

فانی نامراد کو موت کا آسرا دیا — یاس نے درد ہی نہیں، حق تو یہ ہے دوا بھی دی

جینے کی جو ایسی تمنا ہے تو مرحبا — ہے موت ہی اک زندگی دل کا سہارا

آپ نے دیکھا۔ ان اشعار کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر خود اپنی لاش اپنے کاندھے پر اُٹھائے اُٹھائے پھر رہا ہو۔ ایک ہی جذبے کی الٹ پلٹ کر مختلف زاویوں سے نمائش کی گئی ہے۔ اسی طرح فانی کا تقریباً سارا کلام زندگی کے ایک ہی رُخ کو پیش کرتا ہے جسے پڑھ کر صاف ظاہر ہونے لگتا ہے کہ شاعر کی زندگی اصلی اور قدرتی مصائب کے بھرپور غم سے محروم ہے اور وہ اس کمی کو خیالی اور شاعرانہ غم کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش میں اپنے آخری سانس تک کی بازی لگا دیتا ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ مجھے فانی کے خلوص سے انکار ہے۔ فانی اپنے کو مظلوم سمجھتے ہیں اور انھیں اپنی مظلومیت کا گہرا یقین ہے۔ پھر اس یقین کے بعد فانی کی صداقت شعری کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

فانی خود اپنے غم کے تصور میں اتنا کھو رہتے ہیں کہ انھوں نے کبھی نگاہ اُٹھا کر کائنات کے غم پر نظر نہ ڈالی۔ اس لئے فانی کا غم محدود اور ذاتی ہے اور سماجی حیثیت سے بھی اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

فانی کے یہاں غالب کا حُسن بیان اور میر کا حزن و یاس دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک الفاظ میں اظہار غم کے سلیقہ کا تعلق ہے ان کی شاعری کئی جگہ میر سے بھی آگے بڑھ گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں اُن کی شاعری میں وہ جیتا البلاغم، وہ دُکھتا ہوا تڑپتا ہوا سوز و گداز نہیں ملتا جو میر کے کلام کی جان ہے۔

میر کے غم و یاس کے اردگرد ہمیں ایک وسیع ہالہ سا نظر آتا ہے جس میں ناکامی و نامرادی، حسرت و آرزو کی ایک دُنیا آباد ہے لیکن فانی کے غم میں ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے۔ میر کے غم میں زندگی، حرکت اور تازگی ہے۔ فانی کا غم اُداس، تاریک اور بے رس ہے۔ میر جب کہتے ہیں:۔

دل کے ویرانے کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ　　جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

تو ہمارے سامنے ایک پوری کی پوری لٹی ہوئی دُنیا کا از سر نو نقشہ جم جاتا ہے اور خدا جانے کتنی چلتی پھرتی تصویریں جوق در جوق اور قطار در قطار آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوتی ہیں۔ لیکن فانی کے مجرد غم کے پیچھے ہمیں کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی۔ یہاں آرزوؤں، امیدوں اور ناآسودہ حسرتوں تک کا نشان نہیں۔ یاس کی ایک اتھاہ، سمندر کے مانند گہری، اُداس تاریکی ہے جس میں نہ تموج ہے نہ حرکت، جہاں نہ امروز ہے نہ فردا۔ ایک بھیانک، افسردہ اور بے پایاں رات جس کی کوئی صبح نہیں، جب فانی یقین دلانے والے لہجے میں کہتے ہیں:

ہر نفس آہ، اور انفاس پہ جینے کا مدار،　　زندگی آہ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

تو یہ ساری کائنات اور اس کا جیتا جاگتا نظام ایک بے حقیقت فریب نظر آنے لگتا ہے، عالم اور اس کی تمام وسعتیں نگاہ سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے ہم سوچنے لگتے ہیں کہ کیا واقعی دُنیا اتنی ہی بے حقیقت، اتنی ہی محدود اور اتنی ہی چھوٹی سی ہے جیسی کہ شاعر سمجھتا ہے۔

فانی کا جذبۂ غم کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، ہمیں یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ اُن کی جذباتی دُنیا کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ ان کی شاعری میں نہ حسرت کی ہمہ گیر جمال پرستی کی رنگا رنگ دلکشی ہے اور نہ اصغر کی حکیمانہ رعنائی خیال۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اُن کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کی شاعرانہ شخصیت ان دونوں کے مقابلے میں کچھ کھنچی کھنچی سی کچھ سکڑی سی نظر آتی ہے۔ وہ جو شاعر کی ساحرانہ شخصیت میں ایک قسم کی وسعت، ایک طرح کی بڑھنے، پھیلنے اور چھا جانے کی شان نظر آتی ہے وہ ہمیں فانی کے یہاں نہیں ملتی۔

فانی غم کے اس قدر حریص ہیں کہ اُس سے کسی طرح ان کی نیت سیر ہی نہیں ہوتی، جہاں غم نہیں ہوتا وہاں اُنکی اذیت پسند طبیعت خود اسے پیدا کر لیتی ہے اور وہ ہمیشہ نت نئے غم کی آرزو میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

اپنے دیوانے پر اتمام کرم کر یارب　　در و دیوار دئے اب انھیں ویرانی دے

فانی شدید طور پر تقدیر پرست واقع ہوئے ہیں۔ انسانی زندگی ان کے نزدیک جبرِ مشیت کا ایک ہولناک زنداں ہے جہاں کی قید و بند زنجیر کی بھی مرہون منت نہیں۔

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں،　　ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں،

پھر کہتے ہیں:

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو　　جا رہا ہے اک جنازہ دوش پر تقدیر کے

میں جب اس شعر کو پڑھتا ہوں اور فانی کے واقعات زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ ایک طرف فانی کی حد سے بڑھی ہوئی خودداری، دولت سے درویشانہ بے نیازی، پیشہ کی جانب سے شدید بے پروائی اور مالی حالت سدھارنے کی تمام

تدبیروں سے بیزاری کے واقعات ہیں اور دوسری طرف ان کا عقیدے کی حد تک مضبوط یقین کہ مشیت اُن کی تمام تدبیروں کو خاک میں ملا دینے پر تُلی ہوئی ہے اور انھیں ایک قدم بھی اپنی مرضی کے موافق نہیں چلنے دیتی۔

میری تدبیروں کی مشکل اب تو یارب سہل کر کیا یہ ساری عمر منہ تکتی رہیں تقدیر کا

ذرا یہ مشکل سے سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ جہاں تدبیر کے معاملہ میں ایک رہی ہے سناٹا ہی سناٹا ہو وہاں تقدیر کو موردِ الزام بنانا کہاں تک قرینِ انصاف ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ فانی ایک بہت بڑے فن کار تھے۔ زبان کو دل و بیک سے آراستہ کرنے اور الفاظ کو نرم و لطیف ترنم بخشنے میں فانی کو کمال حاصل تھا۔ وہ الفاظ برتنے کے معاملہ میں انتخاب کا ایسا رچا ہوا سلیقہ رکھتے تھے جس کی مثال دوسرے شاعروں کے یہاں کم نظر آتی ہے۔ الفاظ کی دھیمی موسیقی اور سبک شیرینی نے اُن کے کلام کو وہ حُسن کارانہ دلکشی عطا کی ہے، جس سے حقیقی سوز و گداز کے فقدان کی ایک بڑی حد تک تلافی ہو جاتی ہے۔ فانی کے یہاں لفظ اور خیال کی ایسی مربوط ہم آہنگی پائی جاتی ہے کہ اُن کا تقریباً سارا کلام بھرپور شعریت سے معمور نظر آتا ہے۔ اُن کا شعر سُن کر ہمارے سینے سے آہ نکلے یا نہ نکلے، مُنھ سے بے ساختہ "واہ واہ" ضرور نکل جاتی ہے۔ اُن کا کلام تمام تر رواں دواں، چست اور مضبوط ہے۔ انھیں اظہارِ خیال پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے، فانی صحیح اور موزوں الفاظ کے انتخاب میں اس قدر تلاش اور کاوش برتتے ہیں اور اپنے اشعار کو بنا سنوار کر کچھ ایسے سجل روپ میں پیش کرتے ہیں کہ ان کی سج دھج ہمیں بالکل محو کر دیتی ہے اور تھوڑی دیر کے لئے شاعر کی بے مصرف قنوطیت پر کسی نہایت بلند قسم کے حکیمانہ عرفان کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ انداز بیان کی صناعانہ دلکشی، الفاظ کی خوش سلیقہ سجاوٹ اور اظہارِ خیال کے خوبصورت اور مترنم انداز نے فانی کی شاعری میں ایک خاص قسم کی تمکنت اور وقار پیدا کر دیا ہے۔ ان کے کلام کا یہ تجمل خارجی اور سطحی نہیں ہے بلکہ شعریت کا حسن الفاظ کے اندر سے گزر کر خیال کے دھارے کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور جب کبھی بھی فانی نے اپنے اندر سمٹنے کے بجائے غمکدۂ دل سے باہر نکل کر پاکائنات سے ٹکر لیکر کوئی شعر کہا ہے تو اُنکے کلام میں وہی چوکے لگانے والی نشتریت، وہی گہری تاثیر وہی تڑپا دینے والا سوز و گداز پیدا ہو گیا ہے جو بہترین تغزل کا سرمایہ امتیاز ہے۔

ذرا ان اشعار پر نظر ڈالئے۔ ان کی بے پناہ تاثیر سے کون اہل ذوق انکار کر سکتا ہے۔

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات جب مزاجِ یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

اُن کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

روح ازبابِ محبت کی لرز جاتی ہے تو پشیمان نہ ہو اپنی جفا یاد نہ کر

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا

لو تبسم بھی شریکِ نگہِ ناز ہوا آج کچھ اور بڑھا دی گئی قیمت میری

امریکہ و حجاز کا روغنی اتحاد

عہدِ حاضر میں جنگ کی کامیابی کا انحصار صرف پٹرول پر ہے اور اسی لئے دُنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جو پٹرول کی زیادہ سے زیادہ مقدار حاصل کرنے پر جان نہ دیتا ہو، اور اسی لئے جس جس حصۂ زمین میں پٹرولی چشمے پائے جاتے ہیں وہ بڑی دولت سمجھے جاتے ہیں اور ان پر اقتدار قایم کرنے کے لئے بڑی بڑی قوتوں میں آویزش ہوتی رہتی ہے۔ ایران کے باب میں روس اور امریکہ و برطانیہ کے درمیان اسی لئے چشمک رہتی ہے کہ وہاں پٹرولی چشمے بکثرت موجود ہیں، عراق سے برطانوی فوجیں اسی لئے نہیں ہٹتیں کہ وہاں کے پٹرول کو وہ ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا اور سعودی عرب کو دوست بنانے کی کوشش روس اور امریکہ نے اسی لئے کی تھی کہ وہاں پٹرول کے نئے چشمے دریافت ہوئے ہیں، جس میں روس ناکام رہا اور امریکہ کو کامیابی حاصل ہوئی، لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ امریکہ نے ابن سعود کو رام کرنے لئے کیا کیا تدبیریں اختیار کیں۔ اور خود ابن سعود کو کتنا مالی فایدہ اس اتحاد سے پہونچ رہا ہے۔

سرزمین حجاز میں جو امریکہ نے اپنی نئی پٹرولی کمپنی قایم کی ہے، اس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی کمپنی ہے اور حجاز دنیا کا سب سے بڑا ذخیرہ پٹرول کا رکھتا ہے۔

امریکہ نے ابن سعود سے جو مراعات حاصل کی ہیں اور جن تدبیروں سے ٹھیکہ لیا ہے وہ عہدِ حاضر کی سیاسی چالوں کی عجیب و غریب داستان ہے۔ امریکہ نے ابن سعود کو خوش رکھنے اور عرب آبادی کو قابو میں رکھنے کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں ان میں سے ایک ایسے محکمہ کا قیام بھی ہے جس کا کام ہی امریکہ و حجاز کے باہمی تعلقات کو خوشگوار رکھنا ہے۔ اس محکمہ کا وائس پریسیڈنٹ ایک امریکی فلائیڈ اوہلیگر ہے جسے ابن سعود اپنا بیٹا کہتا ہے۔ ابن سعود پر امریکہ و اہل امریکہ کا جتنا اثر ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب امریکہ کے اس درخورِ اقتدار کو روس اور دوسری حکومتوں کی طرف سے "امریکہ کے طوق غلامی" سے تعبیر کیا گیا، تو ابن سعود نے کہا کہ "میں اس کمپنی کی ایسی ہی حفاظت کروں گا جیسی اپنی رعایا کی کرتا ہوں"۔

ابن سعود پر یہ اثر قایم کرنے کے لئے کمپنی نے بڑی بڑی ترکیبوں سے کام لیا ہے، چنانچہ گارڈن گیسکل لکھتا ہے کہ "میں نے وہاں کے دوران قیام میں جو کچھ دیکھا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کوئی امریکہ کی پٹرول کمپنی ہے یا امریکہ اور عرب کے باشندوں کی ملی جلی سوسائٹی ؟"

امریکہ کے سینیر وائس پریسیڈنٹ جیمس میکفرسن نے ایک بار کہا کہ "ہم عربوں کی مدد کر کے خود اپنی مدد کر رہے ہیں - کیونکہ ۲۰۰۵ء میں اس ٹھیکہ کے ختم ہو جانے کے بعد بھی ہم نسلاً بعد نسلٍ اس کی توسیع چاہتے ہیں اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہم عربوں سے دوستوں اور عزیزوں کا سا برتاؤ کریں"۔

امریکہ کی پٹرول کمپنیاں عرصہ سے صحراء عرب میں تیل کے چشموں کی جستجو میں تھیں لیکن کوئی عملی قدم نہیں اُٹھایا۔ آخر کار ۱۹۳۳ء میں ابن سعود نے کیلی فورنیا کی اسٹنڈرڈ آیل کمپنی کو ٹھیکہ دیدیا اور ۱۹۳۸ء میں سب سے پہلا چشمہ دریافت کیا گیا۔

سرزمین حجاز کا پٹرول حاصل کرنے کی کوشش ساری دُنیا کی کمپنیاں کر رہی تھیں لیکن کامیابی امریکہ کو ہوئی اور صرف اس لئے کہ اس نے ابن سعود اور عربوں کو خوش کرنے کے لئے اتنا کچھ کیا ہے کہ مسلمان ہونے کے سوا دونوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔

اس وقت کمپنی کے دو ہزار ملازم ہیں اور اتوار کی جگہ سب کو جمعہ کی تعطیل دیجاتی ہے - ہفتہ کے باقی ایام میں عرب کارکنوں کو دن میں تین بار نماز پڑھنے کی چھٹی دیجاتی ہے - اور ان کے وضو اور مسجدوں کا انتظام بھی کرتی ہے -

کمپنی کے اسکولوں کے لئے امریکہ سے برنجی گھنٹے آئے تھے، لیکن ان کو صرف اس لئے نہیں بجایا جاتا کہ اہلِ عرب ان کو پسند نہیں کرتے اور کلیسہ کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں -

کمپنی نے ان ملازموں کے لئے جو امریکہ سے آئے ہیں، عربی کی تعلیم مُفت اور لازمی کر دی ہے اور اہلِ عرب 'امریکی لوگوں کو عربی بولتے ہوئے سُنتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں - عرب میں تعلیم کا رواج بہت کم ہے لیکن کمپنی نے بہت سے مدارس جاری کر دئے ہیں جن میں ۸ سال سے لیکر ۱۸ سال تک عمر رکھنے والے لڑکوں کو یہاں عربی، انگریزی اور ریاضی وغیرہ کی تعلیم دیجاتی ہے اور جو لڑکے کچھ پڑھ لکھ جاتے ہیں انھیں کام بھی مل جاتا ہے -

کمپنی کے ان ملازم عربوں کو بھی جو جوان ہیں مُفت تعلیم دیجاتی ہے، چنانچہ اس وقت وہاں ۵۰۰ جوان عربوں کو چھ سال کے نصاب کی تعلیم دیجا رہی ہے اور ان کے رہنے اور کھانے پہننے کے تمام مصارف بھی کمپنی برداشت کرتی ہے۔ تعلیم ختم ہونے کے بعد انھیں کمپنی کے تجارتی اسکول میں بھیجا جائے گا اور وہاں وہ جس کام کو پسند کریں گے اسی کی تعلیم انھیں دیجائے گی، اس کے بعد بعض ذہین لوگوں کو امریکہ بھی اونچی تعلیم کے لئے بھیجا جائے گا۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی ایسے مصارف کر کے خسارہ میں رہے گی، لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے، کیونکہ امریکہ کے رہنے والے ملازم کو یہاں لانے کے لئے کمپنی کو تین ہزار ڈالر صرف کرنا پڑتے ہیں اور یہاں ان کو بڑی بڑی تنخواہیں دینا پڑتی ہیں، اس لئے وہ چاہتی ہے کہ عربوں کو ہر کام کے لئے طیار کیا جائے جو بہت معمولی تنخواہ میں خوش ہو جائیں گے اور اس طرح کمپنی کے مصارف بہت کم ہوں گے۔

اس وقت عرب مزدوروں کے رہنے کے لئے کمپنی نے کھجور کے پتوں کے جھونپڑے طیار کرائے ہیں، لیکن اسکیم یہ ہے کہ پانچ سال کے اندر دو کرور ساٹھ لاکھ ڈالر کے لاگت سے ان کے لئے نہایت آرام دہ کوارٹر بنا دئے جائیں، جن میں برقی پنکھے بھی ہوں اور

بجلی کے چولھے بھی، عرب میں سالانہ صرف تین انچ بارش ہوتی ہے اور پانی کی وہاں بہت قلت ہے، لیکن ریت کے نیچے گہرائی میں چھپے ہوئے چشمے وہاں بہت ہیں اور اب کمپنی ریت کی تہوں کو توڑ توڑ کر کنویں طیار کر رہی ہے جن سے مشین کے ذریعہ سے پانی اوپر کھینچا جائے گا اور اس طرح عرب کا خشک ریگستان سبزہ زار ہو جائے گا۔

ریگستان کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا تھا جہاں پانچ دن کی مسافت کے بعد بھی اہل کارواں کو پانی نہ ملتا تھا۔ اس کمپنی نے اب اسی ریگستان کے وسط میں ایک بہت بڑا کنواں طیار کرا دیا ہے جہاں گرمیوں میں پانچ پانچ ہزار اونٹ بیک وقت پانی پینے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔

سعودی عرب کا تنہا ذریعۂ آمدنی صرف حجاج کے قافلے تھے جن سے ابن سعود کو زیادہ سے زیادہ ستر لاکھ ڈالر سالانہ کی آمدنی تھی، لیکن اب پٹرول پر جو رائلٹی اسے ملتی ہے اس کی مقدار دو کرور ڈالر ہے جو چند سال کے بعد دوچند ہو جائے گی۔

اس آمدنی سے ابن سعود نے اپنے پایۂ تخت ریاض کے لئے بجلی مہیا کر لی ہے اور جدہ کی سڑکوں کو پختہ بنایا جا رہا ہے، اسی کے ساتھ یہ تجویز بھی ہے کہ وادی فاطمہ سے جو ۵۰ میل دور ہے یہاں پانی مہیا کیا جائے۔

عرب کو اپنے لئے غذا کا سامان تقریباً کل کا کل باہر سے لانا پڑتا ہے، اور ابن سعود اس آمدنی سے چاول، شکر، چاء، قہوہ، کپڑا، لاریاں اور موٹر وغیرہ فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ اس وقت وہاں ۲۵۰۰ موٹریں نظر آتی ہیں حالانکہ ۱۹۳۸ء میں ان کی تعداد ۲۵۰ سے زیادہ نہ تھی۔

ابن سعود نے الخرج میں ایک فارم بنایا ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا کنواں ہے جس کی گہرائی ۲۰۰ فٹ اور سو فٹ قطر ہے۔ گدھوں کی مدد اور چرخ کے ذریعہ سے ۵۰۰ ایکڑ زمین پہلے بھی اس سے سیراب ہوتی تھی۔ لیکن اب ابن سعود کی فرمائش پر کمپنی نے اس میں چار پمپ لگا دئے ہیں اور فی منٹ سات ہزار گیلن پانی کھینچا جا سکتا ہے۔ کمپنی نے ایک پختہ نہر بھی ۱۰ میل لمبی بنوا دی ہے اور اب تین ہزار ایکڑ زمین کی آبپاشی ہو سکتی ہے۔ ابن سعود نے ایک امریکن شخص کو اس کا مہتمم بنا دیا ہے اور اسوقت الخرج اتنا سرسبز اور زرخیز ٹکڑا ہو گیا ہے کہ وہاں ہر قسم کی ترکاریاں، پھل اور غلّہ بکثرت پیدا ہونے لگا ہے۔

اب یہ تجویز بھی سامنے ہے کہ خلیج فارس سے ریاض پایۂ تخت تک ریل جاری کی جائے، اور اس کے مصارف کا تخمینہ تین کرور ۲۵ لاکھ پونڈ ہے۔ الغرض اس کمپنی کے اثرات رفتہ رفتہ عرب میں بڑھتے جا رہے ہیں اور سرزمین عرب بھی اپنا چولا بدل رہی ہے خیال کیا جاتا ہے کہ ریاض جس کی آبادی صرف سات ہزار ہے۔ بہت جلد ساڑھے تین لاکھ آبادی کا شہر ہو جائے گا۔

خود کمپنی کی وسعت اور اس کے کاروبار کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۶ء تک ۵ لاکھ پیپا پٹرول روزانہ نکالا جائیگا اور تقریباً ڈیڑھ ارب ڈالر کمپنی کا صرف ہوگا۔

الغرض سعودی عرب کا مستقبل زرعی وصنعتی حیثیت سے بہت شاندار معلوم ہوتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یقین ہے کہ عربوں کی روح آزادی سلب ہو جائے گی اور چند سال بعد سرزمین نجد و حجاز امریکہ کی ایک کالونی ہو کر رہ جائیگی اور عرب امریکہ کا غلام ہو جائیگا۔

یادِ رفتگاں

مرزا مظہر جانجاناں

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی فطین (ﺩﺳﺴﻐﻌﻤﻮ) کے کمال پر نظرِ اعتنا نہیں کی جاتی، لیکن جس چیز کو وہ اپنے لئے باعثِ ننگ سمجھتا ہے وہی آخر کار اس کی شہرت اور عزت کا باعث بن جاتی ہے۔ مثلاً غالب کو لیجئے، آج ان کی نقشہائے رنگ رنگ کی فارسی کو کوئی نہیں پوچھتا لیکن ان کے بے رنگ مجموعہ اُردو پر سب ہی سر دھنتے ہیں۔ کچھ اسی سے ملتی جلتی مثال مرزا مظہر جانجاناں کی ہے۔ مرزا موصوف بہت بڑے فقیہ، محدث اور عارف کامل تھے۔ مشہور محدث محمد حیات سندھی کا قول ہے کہ "اگر کوئی حدیث فقہ حنفی کے معمول کے خلاف وارد ہو اور مرزا جانجاناں اس حدیث کی توثیق کریں تو اس کے باوجود بھی اس حدیث پر عمل کر لینا چاہئے۔" لیکن آج مرزا موصوف کا نام صاحبِ کمال درویش ہونے کی وجہ سے زندہ نہیں۔ ممکن ہے ان کا نام ہماری لوحِ یاد سے محو بھی ہو گیا ہوتا اگر وہ شاعر نہ ہوتے۔ مرزا پیشہ ور شاعر نہ تھے اور نہ شاعری کو اپنے شایانِ شان ہی سمجھتے تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ ان کے اُردو کے معدودے چند اشعار جو آج ہمیں ملتے ہیں یہ صرف ان کی جوانی کے کہے ہوئے ہیں اور بعد کو انھوں نے شاعری ترک کر دی تھی۔ ممکن ہے انھوں نے یہ اشعار بھی نہ کہے ہوتے اگر انھیں اپنے نالوں پر ضبط ہوتا یا فریاد کی کوئی دوسری لے مل جاتی جو پابندِ نے نہ ہوتی۔

مرزا مظہر جانجاناں جتنے بڑے صوفی ہیں اتنے بڑے شاعر نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ان کی زندگی یا دوامیت تصوف سے زیادہ ان کی شاعری کی مرہونِ منت ہے۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر دوسرے فنکاروں کی بہ نسبت جلد مشہور ہو جاتا ہے اور اس کی شہرت خواص یا اس فن کے مخصوص ماہرین تک محدود نہیں رہتی بلکہ ہر مرد عورت، بچہ بوڑھے کے دل و دماغ اس کی آواز سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ شاعری ہمارے دل کا راگ ہے۔ یہ دُکھ سکھ میں ہر وقت ہمارے ساتھ رہتی ہے لیکن دیگر علوم و فنون (ادب کی دیگر اصناف بھی) سے ہمیں ایک محدود وقت کے لئے سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے شاعر کی شہرت دیگر فن کاروں کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہی نہیں، زیادہ پائیدار بھی ہوتی ہے۔ اگر ایک ہی شخص بہت اچھا شاعر، سائنسدان، ماہر اقتصادیات یا فلسفی ہے تو اس کے مرنے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی ممکن ہے لوگ اس کی دیگر تمام خصوصیات کو بھلا دیں یا اس کا ذکر کسی محدود طبقہ تک محدود ہو جائے لیکن اس کے برخلاف اس کے نغمے خواص و عوام سب کے دلوں کو

گرماتے رہیں گے۔ خیام شاعر ہی نہیں، ریاضی داں بھی تھا۔ لیکن آج شاعر کی حیثیت سے ایک دُنیا اسے جانتی ہے اور ریاضی داں کی حیثیت سے ممکن ہے بہت سے ریاضی داں بھی اس سے ناواقف ہوں۔

مرزا کا اصل نام جانِ جاں ہے اور تخلص مظہر۔ آپ کے والد مرزا جان، عالمگیر کے دربار میں ایک ممتاز عہدہ پر فائز تھے، "نسب ان کا باپ کی طرف سے محمد بن حنفیہ سے ملتا ہے۔ ماں بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں۔ دادا بھی دربارِ شاہی میں صاحبِ منصب تھے۔ دادی اسد خاں وزیر کی خالہ زاد بہن تھیں۔ پردادا سے اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں۔ ان رشتوں سے تیموری خاندان کے نواسے تھے۔" آبِ حیات میں لکھا ہے کہ ۱۱ رمضان ۱۱۱۱ھ بروز جمعہ (۲۰ فروری ۱۷۰۰ء[1]) کو کالا باغ علاقۂ مالوہ میں مرزا کی پیدایش ہوئی۔ جب عالمگیر کو دکن میں خبر پہونچی تو اس نے نومولود کا نام جانِ جاں تجویز کیا۔ چونکہ والد کا نام مرزا جان تھا اور بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے اس لئے بیٹے کا نام جانِ جاں ہوا جو کثرتِ استعمال سے جانجاناں ہوگیا۔ باپ نے شمس الدین نام رکھا لیکن یہ عالمگیری نام کے مقابلہ میں نہ چمکا۔ مگر آزاد کے اس بیان کی کسی اور تذکرہ سے تائید نہیں ہوتی۔ نکات الشعرا سے پتہ چلتا ہے کہ جانِ جاں ان کے والد کا ہی رکھا ہوا نام ہے۔ میر صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔ "پدر او مرزا جان بجانا نام داشت۔ از فرط شفقت جانِ جاں می گفت، ازیں سبب ہمیں اسم موسوم است۔" مرزا موصوف نے حضرت غلام علی آزاد کو جو اپنے سوانح لکھ کر بھیجے ہیں ان سے بھی آزاد صاحب کے بیان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ وہ لکھتے ہیں: "فقیر جانِ جاں متخلص بہ مظہر، پسر مرزا جان، جانی تخلص، علوی نسب، ہندی مولد، نقشبندی مشرب است۔" پھر یہ شمس الدین کہاں سے آیا۔ ممکن ہے آزاد صاحب ہی کا بیان صحیح ہو اور یہ نام ان کے والد ہی کا رکھا ہوا ہو۔ تذکرۂ "طورِ کلیم" کو پڑھکر یہ شبہ ہوتا ہے کہ چونکہ مرزا بہت صاحبِ کمال درویش تھے اس لئے لوگ القاب و آداب کے ساتھ ان کا نام لکھتے تھے۔ بعد کو انہی القاب و خطابات کو غلطی سے ان کا نام سمجھ لیا گیا۔ تذکرہ "طورِ کلیم" سے شمس الدین نام نہیں، محض لقب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: "مظہر، قطب الاقطاب، شیخ المشائخ، شمس الدین، حبیب اللہ حضرت مرزا جانجاناں خلف الصدق مرزا جان رحمۃ اللہ علیہما۔" اس شبہ کو "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" کے ضمیمہ سے اور تقویت ہوتی ہے۔ اس میں پروفیسر محمد سرور جامعہ ملیہ لکھتے ہیں: "کہ ان کا پورا نام شمس الدین حبیب اللہ ہے۔" لیکن حبیب اللہ کسی اور تذکرہ سے ثابت نہیں ہوتا اور جس طرح پروفیسر موصوف غلطی سے ان کا نام حبیب اللہ سمجھ بیٹھے ہیں، ممکن ہے اسی طرح آزاد صاحب نے شمس الدین کو ان کا نام سمجھ لیا ہو اور چونکہ لطیفہ گوئی اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا ان کی عادت ہے اس لئے شمس الدین کو انھوں نے ان کے باپ کی طرف سے منسوب کر دیا ہو۔ لیکن حیرت تو اس بات پر ہے کہ مولانا عبدالحئی اور رام بابو سکسینہ نے بھی اسے جوں کا توں قبول کر لیا۔

اسی طرح آزاد صاحب نے مرزا کی تاریخ پیدایش ۱۱ رمضان ۱۱۱۱ھ اور جائے پیدایش کالا باغ صوبۂ مالوہ کو قرار دیا ہے۔

---

[1] مطابق تقویم ہجری و عیسوی شایع کردہ انجمن ترقی اُردو۔ لیکن ۲۰ فروری کو منگل کا دن پڑتا ہے نہ کہ جمعہ کا۔

لیکن میر صاحب نکات الشعرا میں لکھتے ہیں کہ "اصلش از اکبر آباد است" اور اس کی تصدیق دوسرے تذکروں سے بھی ہوتی ہے۔ فتح علی گردیزی لکھتے ہیں "ادا فہم، معنی پرور، مرزا جان جاناں مظہر، اصلش از معمورۂ بخارا و مولدش و منشاش اکبر آبادش"۔ گارساں دتاسی انھیں اکبر آبادی لکھتا ہے اور ان کا سن ولادت ۱۱۱۰ھ قرار دیتا ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ اس کی تصدیق خود مرزا کے بیان سے ہوتی ہے:۔

"فقیر جان جاں متخلص بہ مظہر پسر مرزا جان، جانی تخلص، علوی نسب، ہندی مولد، نقشبندی مشرب است و در عشرۂ اولی مائۃ ثانیہ بعد الف ولادتش اتفاق افتاد۔ نشو و نمائے ظاہری در بلدۂ اکبر آباد یافتہ تربیت باطنیش در محروسۂ شاہجہاں آباد از جناب سید نور محمد بدایونی نقشبندی مجددی واقع شد۔ سلسلۂ نسبش بہ بیس و ہشت واسطہ بتوسط محمد بن حنیفہ بہ شیر بیشۂ کبریا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ منتہی می شود۔ جد اعلیٰ او امیر کمال الدین در اوائل مائۃ تاسعہ از خطۂ طائف بہ جذب قسمت بحدود ترکستان رخت اقامت انداخت و بفرمان روائے بعض از آں ممالک عمر گزرانیدہ، اولاد کثیرہ بہم رسانید از آنہا امیر مجنوں و امیر بابا در حین فتح ہندوستان کہ بردست ہمایوں بادشاہ اتفاق افتاد دریں مملکت وارد شدند۔ از آں باز خدمت و رفاقت سلاطین گورگانیہ شعار مردم ایں خاندان بود میرزا جان مذکور کہ در ششم مرتبہ از امیر بابا و در درجۂ دوازدہم از امیر کمال الدین مسطور واقع است بعہد عالمگیر بادشاہ علیہ الرحمۃ بعالی منصب ترک دنیا سرفراز گردید و ایں خاکسار از بدو طفلی ہوائے مال و جاہش زد در سر نہ پیچید۔ بعد تحصیل ضروریات ایں مشت غبار خود را بدامن دولت از خود رفتگاں بستہ باسید آنکہ چشمے در عالم دیگر باز کند۔ چوں نقش قدم بر در ایشاں نشستہ است از بس دماغش ضعف قوی دارد و تاب نیریاسیاب نمی آرد۔ و تجرید و تفرید اختیار کردہ۔ نان بر خوان دونان نخورد۔ و چوں گل عمر خود را بیک خرقہ بسر بردہ بہ تحریک شور عشقے کہ نمک خمیر اوست گاہ بلبے بفریاد رامی کند و چوں نالہ اش موزوں واقع می شود احباب از راہ جوہر شناسی بہ میزان اشعارش می سنجند۔ و گرنہ اورا از غایت انصاف نظر بہ بے سرمایگی خود در کاسۂ بر سخن نچیدہ۔ زیادہ بریں نیست کہ نظر بزرگاں یافتہ حسن قبولے بہم رسانیدہ است۔ او سبحانہ حسن خاتمہ ہم نصیب کند۔"

مرزا کے مذکورۂ بالا سوانح سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ ان کی پیدائش اکبر آباد میں ہوئی۔ لیکن وہ آگرہ میں کب تک رہے اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کس طرح ہوئی، اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس باب میں دوسرے تذکرے بھی خاموش ہیں۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہے کہ انھوں نے شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے حدیث اور مجددی طریقہ سید محمد بدایونی نقشبندی اور امام ربانی کے دوسرے عالی مرتبت پیروؤں سے حاصل کیا۔

سولہ سال کی عمر میں مرزا سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ لیکن ان کی طبیعت فطری طور سے فقر و استغنا کی طرف مائل تھی اس لئے انھوں نے شاہی مناصب کی طرف توجہ بھی نہ کی اور مدرسوں اور خانقاہوں کی جاروب کشی کرتے رہے۔ مولانا عبدالحئی لکھتے ہیں کہ آپ نے تیس برس تک مشائخ نقشبند سے یہ کسب فیض کیا۔ شیخ محسن اپنی کتاب "الیانع الجنی" میں امام ربانی کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں کہ ان کے بعد آنے والے ان کے جلیل القدر اصحاب میں سے ایک شخص شمس الدین المظہر معروف بہ

جانجاناں شہید دہلوی ہیں ...... اتباع سنت اور کشفی قوت میں آپ کا بلند مقام تھا موصوف کے استاد شیخ سیالکوٹی، امام ولی اللہ اور الحاج فاخرالہ آبادی ایسے ائمہ تصوف اور محدثین نے آپ کے علم وفضل اور جلالت شان کی شہادت دی ہے۔" مرزا کے فقر و توکل اور ان کے عارف کامل ہونے پر سب ہی تذکرہ نگار متفق ہیں اور ان کا نام انتہائی عقیدت اور احترام سے لیتے ہیں۔

میر تقی میر لکھتے ہیں :-

" مرزا جان جاں تخلص - مردیست مقدس، مظہر درویش، عالم، صاحب کمال، شہرۂ عالم، بے نظیر، معزز، کرم ... بندہ بخدمت اورفتہ سعادت اندوز گشتہ است - اکثر اوقات در یاد الہی صرف می کند"

فتح علی گردیزی لکھتے ہیں :

" حقا کہ ذاتش مظہر تجلیات الہی است و مظہر انوار فیوضات غیر متناہی"

لچھمی نراین شفیق، غلام علی آزاد کی رائے نقل کرتے ہیں :-

" مرزا مظہر جان جاں سلمہ اللہ تعالی مظہر فیض الہی است و مشرق صبح آگاہی، شاہ مسند فقر و فنا، مقیم آستان توکل و استغنا، نام والداو مرزا جان است - ازیں جا وجہ تسمیہ او توان دریافت - اما نام و تخلص او گویا عنایت ترجمان اسرار قیومی مولانائے رومی است کہ پانصد سال پیش ازیں در دفتر ششم مثنوی ارشاد فرمودہ کرامتے نمایاں بہ حضار انجمن استقبال وانمودہ - یعنی

جانِ اول مظہر درگاہ شد　　　جانِ جان خود مظہر اللہ شد

رام بابو سکسینہ رقم طراز ہیں :

" عالم متبحر، فقیہہ کامل، حنفی المذہب اور نقشبندی طریقت تھے - عالم باعمل، احکام قرآن کے پیرو، اکثر وقت اوراد و دعائیں یا دلچسپ علمی گفتگو اور شعر و شاعری میں گزارتے تھے .... اکثر کرامات بھی آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں"

ان کے فقر و استغناء پر مولانا عبدالحی نے کافی روشنی ڈالی ہے - ہم اس میں سے چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں :

" استغنا اور بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر کسی بادشاہ یا وزیر کے سامنے سر نیاز خم نہیں کیا - ایک بار محمد شاہ نے نواب اعتماد الدولہ قمرالدین خاں کو بھیج کر کہلا بھیجا کہ اتنا بڑا ملک خدا نے مجھ کو دیا ہے، اس میں سے جو کچھ چاہئے قبول فرمائیے ---" ہنس کر فرمایا :- "قل متاع الدنیا قلیل" - خدا نے ہفت اقلیم کو قلیل فرمایا ہے، پھر ایک اقلیم میں سے ایک ولایت آپ کے حصہ میں آئی ہے وہ کتنی ہے، فقیر اس کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

نواب فیروز جنگ نے خانقاہ، مسجد، کنواں، روپیہ اور گاؤں فقراء کے لئے پیشکش کئے، قبول نہ کئے .... نواب آصف جاہ نے ایک بار بیس ہزار روپیہ نذر کیا، آپ نے قبول نہیں فرمایا"

مرزا کا یہ توکل اور استغناء واقعی معجزہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اگر ہمیں اسوقت کی دہلی کی طوائف الملوکی اور بدامنی کی

معاشی تباہ حالی کا پورا پورا اندازہ ہو جائے۔ ۱۷۹۷ء سے ۱۸۶۹ء تک (مرزا کی پیدائش سے ان کی وفات تک) عالمگیر کے بعد اس کے تخت پر نو سلاطین اور رونق افروز ہوئے لیکن انھیں عالمگیر کی سلطنت تو ملی، عالمگیر کی زبردست شخصیت نہ ملی۔ نتیجہ ہوا کہ وہ سلطنت کے لئے اور سلطنت ان کے لئے وبال جان ہو گئی۔ ان تمام سلاطین میں سب سے زیادہ حکومت محمد شاہ نے کی لیکن سلطنت کے ٹکڑے بھی سب سے زیادہ اس کے دورِ حکومت میں ہوئے۔ ۱۷۲۴ء میں حسین قلی خاں نے جو عام طور پر نظام الملک اور آصف جاہ کے نام سے مشہور ہے، حیدر آباد میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ سعادت خاں گورنر اودھ بھی خود مختار بن بیٹھا۔ ادھر الہ وردی خاں گورنر بنگال نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور ادھر روہیلوں نے روہیلکھنڈ میں اپنی آزاد حکومت بنالی۔ مرکزی حکومت کی کمزوری کی وجہ سے نہ صرف مختلف صوبہ جات کے حکمرانوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا بلکہ اس پر ہر سمت سے یورش ہونے لگی۔ مرہٹوں نے جنوب سے حملہ کیا تو افغانوں نے شمال مغرب سے۔ ابھی دہلی کی بربادی میں شاید تھوڑی سی کسر باقی رہ گئی تھی کہ نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں حملہ کیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ محمد شاہ کے بعد احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے عہد اور خود محمد شاہ کے زمانہ میں احمد شاہ ابدالی نے متعدد بار ہندوستان پر چڑھائی کی اور دہلی اور متھرا کو خوب لوٹا۔ اس کے بعد تو ہر کہ ومہ کی بن پڑی۔ گر پر مسکیں کے بھی پر نکل آئے۔ جس نے جو پایا کھایا۔ نہ کوئی داد رس نہ کوئی فریادی۔ جب طوائف الملوکی کا یہ عالم ہو تو لوگوں کی تنگ دستی اور افلاس کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سودا نے اپنے شہر آشوب میں لکھا ہے کہ تجار لوٹ کھسوٹ کے ڈر کے مارے گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ کسی جنس کا کسی قیمت پر خریدار میسر نہ آتا تھا حتی کہ اُدھار لینے والا بھی ملازم پیشہ الگ پریشان حال تھے۔ تمام مہینہ نوکری اور جی حضوری کرنے کے بعد بھی تنخواہ ہاتھ نہ لگتی تھی۔ ملاؤں اور طبیبوں کی بھی حکمت کام نہ آتی تھی۔ فقر و تصوف کا زور ہونا ہی چاہئے لیکن درویشی اختیار کرنا شعرا کا ہدف ملامت بنتا تھا۔ بیچارے شاعروں کو کون پوچھتا ہے۔ وہ لاکھ دلی اور ساکنان دلی کے گیت گائیں، لیکن جب تک "کھائیں گے کیا" کا مسئلہ طے نہ ہو، دہلی میں رہنا ممکن نہیں۔ جب کوئی ذریعہ معاش نظر نہ آیا تو انھیں بھی دہلی کو خیرباد کہنا پڑا۔ مظہر کے معاصرین میں میر، سودا، سوز، میر حسن، منت اور حسرت لکھنؤ چلے آئے، قائم، ٹانڈہ چلے گئے اور فغاں، مرشد آباد۔ جن لوگوں کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی ان میں میر درد اور مظہر جانجاناں خاص طور پر مشہور ہیں۔ ایسے وقت میں جبکہ دہلی میں رہنا خودکشی کے مترادف تھا، مرزا کا دلی میں جمے رہنا، کسی کے آگے دست طمع دراز نہ کرنا بلکہ دوسروں کی پیشکش کو بھی ٹھکرا دینا اور اپنے وقار اور خود داری کو قائم رکھنا واقعی اعجاز سے کم نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا "بہر فراغت شیخ" نہ بنے تھے اور نہ حزن و مایوسی نے ہی درویشی کا لبادہ اوڑھا تھا بلکہ اس کی طرف ان کا فطری میلان تھا۔ والد کی وفات کے بعد اگر وہ چاہتے تو اپنے والد کے منصب کو آسانی سے حاصل کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اقبال کے الفاظ میں سپہ کی تیغ بازی پر نگاہ کی تیغ بازی کو

---

[1] سودا کا شعر ہے :- چاہے جو کوئی شیخ بنے بہر فراغت [illegible] شعر کا مضمون ذیل ہے

ترجیح دی یعنی شاہی منصب کی جگہ فقر پر اکتفا کیا۔ اور یہ شاید اسی نگاہ کی تیغ بازی کا اثر تھا کہ مرزا مظہر کو اپنے دور کے موسیقی کے باکمالوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ محمد شاہی دور یوں تو طاؤس و رباب کا دور ہے لیکن اس کے پاس اتنی دولت نہ تھی کہ وہ اکبر اور جہانگیر کی طرح اعلیٰ فن کاروں کو اپنے دربار میں جمع کر سکے۔ ماہرین موسیقی ایک ایک کر کے سب رخصت ہو چکے تھے اور فن محض پیشہ وروں تک محدود ہو گیا تھا۔ البتہ صوفیوں میں دو باکمال خواجہ میر درد اور مظہر جانجاناں باقی رہ گئے تھے۔۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ "مرزا مظہر جانجاناں اور خواجہ میر درد فن موسیقی کے ایسے ماہر تھے کہ وقت کے بڑے بڑے کلاونت اپنی چیزیں بغرض اصلاح پیش کرتے اور ان کے سر کی ایک ہلکی سی جنبش کو اپنے کمال فن کی سند تصور کرتے"۔

آب حیات میں مرزا کا جو کیرکٹر پیش کیا گیا ہے اس میں عجیب تضاد پایا جاتا ہے کہاں تو یہ نازک مزاجی بلکہ کہنا چاہیے بد دماغی کہ ایک نواب زادہ کے صراحی پر آبخورہ ٹیڑھا رکھنے پر بگڑ بیٹھے اور کہا تجھے کس احمق نے نواب بنا دیا اور کہاں یہ رندی و شاہد بازی کہ وعظ و ارشاد یا شعر و شاعری کا سلسلہ جاری ہے، معتقدین باادب بیٹھے ہیں اور عبدالحی تاباںؔ سے سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ مانا کہ فقرا بالطبع آزاد ہوتے ہیں اور ادب و آداب کو زیادہ ملحوظ نہیں رکھتے لیکن آزادؔ صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے اوضاع واطوار اور ادب آداب نہایت سنجیدہ اور برجستہ تھے کہ جو شخص ان کی صحبت میں بیٹھتا ہوشیار ہو کر بیٹھتا تھا" اگر مرزا صاحب تاباںؔ سے واقعی یہ سرگوشیاں روا رکھتے تو کسی بھی شخص کو ان کے سامنے محتاط یا مودب ہو کر بیٹھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور ۔۔۔ کے نواب صاحب کو اتنی معمولی سی بات پر جھڑکنے کی جرأت ہوتی۔ ہاں وہ نازک مزاج ضرور تھے جیسا کہ انھوں نے اپنے خود نوشتہ حالات میں اعتراف کیا ہے:

"چوں نقش قدم بر در ایشاں نشستہ است از بس دماغش ضعف قوی دارد"

اپنی شاعری میں بھی جابجا انھوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

گر برائے خویش حمامے زگلخن داشتیم — در جنوں ہم میرزائی از دماغ ما نہ رفت

چو مظہر میرزا دیوانۂ نازک طبیعت را — بجائے سنگ طفلاں پارہ ہائے شیشہ باید زد

دیوانہ خوش نہ بود ز وضع گرخت ما — مظہر زما بریدہ و گر یاد ما نہ کرد،

لیکن اس نازک مزاجی نے ان میں وہ گرمی پیدا نہیں کی جس کے لئے غالبؔ نے کہا ہے:۔

کی جس سے بات اسنے شکایت ضرور کی

بلکہ جو شخص ایک بار ان سے مل لیتا تھا، اسے دوبارہ ملنے کی جستجو رہتی تھی۔ ان کی خوش بیانی اور لطافت طبع کی انکے معاصرین نے اکثر تعریف کی ہے۔ مولانا نعیم اللہ لکھتے ہیں: "احوال اجتماع اوضاع آں مشکل پسند باوجود میرزائیت و نازک مزاجی کہ با طوار درویشی موافقت ندارد، بمیزان تقدیر نمی سنجد۔" میر تقی میر فرماتے ہیں: "بندہ بخدمت او رفتہ سعادت اندوز گشتہ است۔۔۔ خوش تقریر، ہو تبیہ است کہ در تحریر نمی گنجد۔"

۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ کا واقعہ ہے ۔ محرم کی ساتویں تاریخ تھی ۔ ایک شخص نے دروازہ پر دستک دی ۔ آپ دروازہ کھول کر باہر نکل آئے ۔ جیسے ہی باہر نکلے اس نے قرابین ماری اور بھاگ گیا ۔ گولی دل کے قریب پڑی، تین دن تک اور جئے اور ۱۰ محرم کو جان آفریں کے سپرد کی ۔ مجروح ہونے کی حالت میں شدت درد سے لوٹتے تھے اور اپنے ہی اشعار پڑھتے تھے ۔

چہ خوش بروئے دل تنگ مادرے واکرد خدا دراز کند عمر زخم کاری ما

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

سیل خوں از سینۂ گرمم رواں کردست عشق نازم اعجازش کہ طوفاں از تنور آوردہ است

زخم دل مظہر مبادا بہ شود آگاہ باشش کایں جراحت یادگار ناوک مژگان اوست

قاتل کون تھا اور ان کے قتل میں کس کس کا ہاتھ تھا ۔ اس کا آج تک صحیح پتہ نہیں ۔ مختلف تذکروں میں مختلف نام ملتے ہیں ۔ شاہ عالم کی طرف سے قاتل کا سراغ لگانے کی کافی کوشش کی گئی جب کچھ پتہ نہ چلا تو مرزا کا اس کا حلیہ دریافت کیا گیا لیکن انھوں نے جواب دیا " میں خود مردۂ متحرک تھا اور مردہ کا مارنا قتل نہیں ۔ قاتل ملے تو آپ اسے سزا نہ دیں "۔

مصحفی نے تاریخ وفات کہی :

پس از ساعتے سر ز جیب تامل برآوردہ گفت آہ مظہر کجائی ۱۱۹۵ھ

سوداؔ وغیرہ نے بھی تاریخ کہی ہے ۔ لیکن سب سے مشہور تاریخ قمرالدین منت کی ہے ۔ جس کا مادہ خاص حدیث کے الفاظ ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ موزوں بھی ہیں ——— عاش حمیداً مات شہیداً

دلی میں چتلی قبر کے قریب مرزا کو دفن کیا گیا ۔ لوح مزار پر ان ہی کا شعر کندہ ہے جو حسب حال ہے :

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریرے کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

جیسا کہ ابتدا میں ذکر ہوا مرزا نے شاعری خود اختیار نہ کی تھی بلکہ خود شاعری نے انھیں منتخب کر لیا تھا ۔ مرزا ان لوگوں میں سے ہیں جن کے متعلق غالبؔ نے کہا ہے :

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

مرزا نے اپنے حالات میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے :

" بہ تحریک شعر نشستہ کہ نمک خمیر اوست گاہ بے بقرید رمای کند وچوں نالہ اش موزوں واقع می شود احباب از راہ جوہر شناسی بہ سرایت اشعارش می سنجند مگر نہ ازراہ از غایت انصاف نظر بہ بے سوادی خود و کالنے بر سخن نچیدہ ۔ زیادہ بریں نیست کہ گاہ گاہ چگاں یافتہ حسن قبولے بہم رسانیدہ است "

ان کے ایک شعر سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے :

مراچہ جرم کہ بر نالہ ام ز موزونی غلط کنند عزیزاں بمصرعۂ استاد

مرزا کے اس بیان کی تصدیق دوسرے تذکروں سے بھی ہوتی ہے۔ میر تقی میر لکھتے ہیں :-

"دیوانِ مختصر شعر فارسی او بہ نظر فقیر مولف آمدہ است۔ از سلیم وکلیم پائے کمی ندارد اگرچہ شعر گفتن دون مرتبۂ اوست لیکن گاہے متوجۂ ایں فن بے حاصل نیز می شود"۔

قیام الدین قائم مخزن نکات میں لکھتے ہیں :-

"در اوائل جوانی کہ مقتضائے آں ظاہر است بہ شعر و شاعری مشغول بود آخر حال خود را ازآں اندیشہ باز داشتہ بر سجادۂ طاعت بہ فقر و قناعت می گزارند"۔

فتح علی گردیزی رقمطراز ہیں :-

"سرش از بلند ہمتی بہ شعر و شاعری فرو نمی آید و ایں مشغلہ را سرمایۂ افتخار نمی انگارد چنانچہ اکثرے از اشعارش از راہ بے پروائی از صفحۂ خاطر محو شدند و برخے از عدم اعتنا و توجہ بایں فن جمہور ابتر گشتند..... شعر فارسی اش بغایت لطافت و نظم ریختہ اش نہایت عذوبت"۔

مرزا نے شعر و شاعری کو سرمایۂ افتخار نہیں سمجھا اور نہ کبھی اس پر کما حقہ توجہ دی لیکن اسے بزرگوں کی نظر کے فیض کے سوا اور کیا کہا جائے کہ اساتذۂ فن میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے۔ میر اور گردیزی کی آرا کا مذکورۂ بالا سطور میں ذکر ہوا اب قدرت اللہ شوق، مصحفی اور محمد حسین آزاد کی بھی رائے ملاحظہ فرمائیے۔

قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں :-

"اول کسیکہ طرز ایہام گویاں ترک نمودہ در ریختہ راندر زبانِ اردوئے معلیٰ شاہ جہاں آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص وقت گردیدہ و مروج ساختہ زبدۃ العارفین، قدوۃ الواصلین، واقف رموز جناب اکبر کاشف کنوز طریقہ پیغمبر مرزا جانجاناں متخلص بمظہر ولیت غرشتہ صفت"۔

مصحفی کہتے ہیں :-

"در ابتدائے شوق شعر کہ ہنوز از میر و میرزا وغیرہ کسے در عرصہ نیامدہ بود۔ در دور ایہام گویاں اول کسے کہ شعر ریختہ بتتبع فارسی گفتہ اوست ...... در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان استاد جلوہ ظہور می دہد۔ فی الحقیقت نقاش اول زبان ریختہ ایں و تیرہ باعتقاد فقیر مرزا است"۔

محمد حسین آزاد بھی مرزا کی تراش خراش اور ان کی آرائش بیان کے مداح ہیں :-

اسی لطافت مزاج اور نزاکت طبع کا نتیجہ ہے کہ زبان کی طرف توجہ کی اور اسے ایسا تراشا کہ جو شعرا پہلے گزرے تھے انھیں پیچھے چھوڑ کر اپنے عہد کا طبقہ الگ کر دیا اور اہل زبان کو نیا نمونہ تراش کر دیا جس سے پرانا ناشائستہ ایہام گوئی کا زمین شعر سے مٹ گیا۔ ان کے کلام میں مضامین عاشقانہ عجب تڑپ دکھاتے ہیں اور یہ مقام تعجب نہیں کیونکہ وہ قدرتی عاشق مزاج تھے اوروں کے کلام میں یہ مضامین خیالی ہیں۔ ان کے اصل حال۔ زبان ان کی نہایت صاف و شستہ و شفاف ہے"۔

کہا جاتا ہے کہ مرزا کا فارسی دیوان بیس ہزار اشعار پر مشتمل تھا جس میں سے انھوں نے ۱۱۷۰ھ میں ایک ہزار شعر منتخب کئے تھے۔

اس کے علاوہ انھوں نے "خریطۂ جواہر" کے نام سے پرانے اساتذۂ فارسی کے اشعار کا انتخاب بھی کیا تھا یہ بھی ان کے دیوان کے ساتھ چھپا تھا۔لیکن افسوس کہ آج یہ دونوں چیزیں نہیں ملتیں ورنہ ان سے مرزا کا مذاق نقد کا کسی نہ کسی حد تک ضرور پتہ چلتا۔ انکے اُردو کے اشعار مختلف تذکروں میں ملتے ہیں۔ انھیں مولانا عبدالحیؒ نے بڑی کوشش سے گلِ رعنا میں فراہم کیا ہے لیکن ان سے بھی بہت سے اشعار چھوٹ گئے ہیں۔

ان اشعار کو پڑھکر مرزا کی شاعری کو دو دوروں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ اولاً ایسے اشعار ہیں جن میں شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون اور محمد شاکر ناجی کے اشعار کی طرح متروک الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔لیکن یہ اشعار بھی آبرو یا ناجی کے ابتذال سے پاک ہیں۔ دوسری قسم کے اشعار وہ ہیں جو زبان کی لطافت اور پاکیزگی کی بنا پر میر و سودا کی زبان کی یاد تازہ کرتے ہیں —— ہم ذیل میں دونوں قسم کے اشعار کا انتخاب پیش کرتے ہیں:

جنوں سوں اس قدر روئیں کہ رسوا ہو گئیں آخر — ڈبویا ہائے ان آنکھوں نے آخر خانماں اپنا
قفس کے بیچ کیا حسرت ستی بلبل یہ کہتی تھی — کہ پھر بھی دیکھنا قسمت ہوئیگا بوستاں اپنا
اری شیریں خدا سوں ڈر خبر لے اپنے عاشق کی — کیا فرہاد نے شیشے سے سر لوہو لہاں اپنا
رات کو یوں گھر بسا مجھ بر میں وہ گل پیرہن — ماہ جس کے باغ میں یک چاندنی کا پھول ہے
کسی کے خون کا پیاسا کسی کے جان کا دشمن، — نہایت منہ لگایا ہے، سجن نے بیڑۂ پان کو
مرتا ہوں میرزائی گل دیکھ ہر سحر، — سورج کے ہاتھ چونری دینگا صبا کے ہاتھ
برگِ حنا اوپر لکھو احوال دل مرا — شاید کبھی تو جا کے لگے دلربا کے ہاتھ،
مظہر چھپا کے رکھ دل نازک کے تئیں مرے — یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ،

اب دوسری قسم کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:

چلی اب گل کے ہاتھوں سے اٹھا کر کارواں اپنا — نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے — اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا
مرا جی جلتا ہے اس بلبلِ بیکس کی غربت پر — کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا
جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے — غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا
کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو رے ظالم — کہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا، جانجاں اپنا
گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا — لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
نہیں کچھ غم کہ کیوں ملتا نہیں بیہاں گسل میرا — کہ میں روتا ہوں دل کی بیکسی پر ہائے دل میرا
اتنی فرصت دے کہ رخصت ہولیں اے صیاد ہم — مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم

مت اختلاط کر اے نوبہار توہم سے　　چمن میں ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں،

اگر یہ سرد مہری تجھ کو آسایش نہ سکھلاتی　　توکیونکر آفتاب حُسن کی گرمی میں نیند آتی

حنا ترے کفِ پا گر نہ اس شوخی سے سہلاتی　　یہ آنکھیں کیوں بھوروتیں انھوں کی نیند کیوں جاتی

الٰہی دردوغم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا　　محبت گر ہماری چشم تر سے مینھ نہ برساتی

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو　　یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے،

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے　　کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

خدا کو اب تجھے سونپا ارے دل　　یہیں تک تھی ہماری زندگانی

کبھی اس دل نے آزادی نہ جانی　　بلبل تھا قفس کا آشیانی،

اگر ملے تو غنیمت ہے وگر دور ہی قیامت ہو　　غرض نازک دماغوں کو محبت سخت آفت ہے

خیال ہوتا ہے کہ مرزا کے صوفی ہونے کی وجہ سے ان کے ہاں متصوفانہ اشعار کی بہتات ہوگی۔ اس کا صحیح اندازہ تو انکے فارسی دیوان سے ہی ہو سکتا ہے، اُردو میں ان کے اشعار ہی کتنے ہیں جو ان کے اس رجحان کی تلاش کی جائے۔ ان کے اُردو کے معدودے چند اشعار میں بھی دو چار اشعار ایسے مل جاتے ہیں جو اس رنگ کی غمازی کرتے ہیں:

خداوندا اُٹھادے ہجر کے درمیاں سوں پردے　　ہمیں صیاد کے اب دام میں ڈالا ہمیں پردے

آزاد ہو رہا ہوں دوعالم کی قید سے،　　مینا لگا ہے جب سے کہ مجھ بے نوا کے ہاتھ

گزر گئے دین اور دُنیا سے تس پر،　　ترا گھر اور کئی منزل رہا ہے

تجلی گر تری پست و بلند ان کو نہ دکھلاتی،　　فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہوجاتی

توفیق دے کہ شور سے اک دم تو چپ رہے　　آخر یہ میرا دل ہے الٰہی جرس نہیں

محمد عظیم

دُنیا کا دائمی امن وسکون

تیسری عالمگیر جنگ کے بعد

(فیچر)

تین شکستہ حال شخص، تار تار لباس میں ایک تباہ شدہ شہر کی
اس سڑک پر بیٹھے ہیں جو کسی وقت بڑی پُر رونق تھی

پہلا: "مصیبت یہ تھی کہ لڑائی ہم لوگوں کے گھر کے اندر تک پہونچ گئی تھی۔ برازیل والے غسل خانہ میں لڑ رہے تھے اور اہلِ سویڈن ہمارے کمرہ کے دروازے توڑکر اندر داخل ہو رہے تھے"

دوسرا: (غصہ کے لہجہ میں) "چھوڑو اس قصّہ کو، تمھارے ان لڑائی جھگڑوں کے افسانوں سے تو ناک میں دم ہوگیا"

دوسرا: "جی ہاں، یہ تو ایسی بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے صرف یہی ایک بچے ہیں، جناب ادھر دیکھئے کیا ہم دونوں نے کوئی مصیبت نہیں جھیلی"

تیسرا: "نہیں، میرا مطلب تو صرف یہ کہنا ہے کہ ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ دُنیا کی ۲۰ ارب آبادی میں سے صرف ہمیں تین آدمیوں کو اس نے بچایا اور باقی سب ہلاک ہوگئے"

دوسرا: "خیر وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہوا، اب ہم کو دیکھنا چاہئے کہ دنیا میں امن وسکون کیونکر قایم ہو سکتا ہے اس کے کوئی معنی نہیں کہ اس میں پھر شعلۂ جنگ بھڑک اُٹھے"

تیسرا: "آپ نے بالکل صحیح کہا"

پہلا: "آپ نے شعلۂ جنگ کا ذکر کیا تو مجھے یاد آگیا کہ میرے پاس دیا سلائی کا ایک بکس رہگیا ہے جس میں صرف آٹھ تیلیاں ہیں"

دوسرا: "لیکن تمنے ادھر اُدھر اچھی طرح ڈھونڈھ بھی لیا تھا یا نہیں، ممکن ہے کوئی اور بکس مل جائے"

پہلا: "مینے دُنیا کے ایک ایک کارخانہ کو جاکر دیکھ لیا ہے۔ سگریٹ کا ذخیرہ تو اتنا ہے کہ شاید دو کرور سال تک ضرورت نہ پڑے لیکن دیا سلائی کا کوئی کارخانہ نہیں بچا، سب کے سب جلکر خاک سیاہ ہوگئے"

تیسرا: "کیا میڈرڈ اب تک جل رہا ہے"

دوسرا: "اور انقرہ؟"

پہلا: "ہاں یہ دونوں اب بھی جل رہے ہیں"

دوسرا: "تو پھر دیا سلائی کی جگہ ہم انھیں کے شعلوں سے کیوں نہ کام لیں"

تیسرا: "لیکن وہ ہمیشہ تو جلتے رہیں گے نہیں۔ نیویارک ایسا شہر دو سال سے زیادہ نہ جل سکا اور آخر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس لئے دیا سلائی کا مسئلہ بہت اہم ہے"

دوسرا: "میری رائے میں پہلے زمین اور پھر ملکوں کی تقسیم کا مسئلہ طے ہونا چاہئے"

پہلا: "بالکل ٹھیک ۔۔ (تیسرے سے مخاطب ہوکر) میں تمھیں اس کانفرنس کا چیرمین نامزد کرتا ہوں"

تیسرا: "میں اس خدمت کو قبول کرتا ہوں اور جو اعتماد تم نے مجھ پر ظاہر کیا ہے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ اچھا اب بحث شروع ہو جانا چاہئے"

پہلا: (کھڑے ہوکر) "حاضرین، تیسری جنگ نے ساری دُنیا کو تباہ کر دیا اور خوش قسمتی سے ہمیں صرف تین آدمی تمام روئے زمین پر بچ رہے ہیں۔ اس لئے دُنیا کے آیندہ امن وسکون کی تمامتر ذمہ داری ہمیں پر عاید ہوتی ہے"

(یہ کہکر بیٹھ جاتا ہے اور باقی دونوں تالیاں بجاتے ہیں)

تیسرا: "اچھا اب اپنے اپنے مطالبات پیش کیجئے۔ (پہلے آدمی سے مخاطب ہوکر) آپ کون کون سے براعظم چاہتے ہیں"

پہلا: "کرۂ زمین کا جنوبی حصہ۔ یعنی افریقہ، آسٹریلیا اور جنوبی امریکہ مجھ کو دیا جائے"

تیسرا: (دوسرے آدمی سے) "اور آپ کیا چاہتے ہیں"

دوسرا: "میں یوروپ و ایشیا چاہتا ہوں"

تیسرا: (ذرا بگڑکر) "تو اس کے معنے یہ ہیں کہ میرے لئے صرف شمالی امریکہ رہ گیا"

پہلا: "خفا نہ ہوجئے، شمالی امریکہ دُنیا کا سب سے زیادہ دولت مند ملک تھا۔ اور اس میں سترہ کروڑ سے زیادہ انسان بستے تھے۔ تو کیا تنہا آپ کے لئے یہ کافی نہیں ہے"

دوسرا: "نہیں نہیں، آپ گرین لینڈ بھی لے لیجئے"

تیسرا: "اگر یہ بات ہے تو آپ ہی کیوں نہیں لے لیتے"

دوسرا: "دیکھئے برہمی کی کوئی بات نہیں۔ امریکہ بہت بڑا ملک ہے اور دو سمندر اس کی حفاظت کے لئے موجود ہیں۔ میں یوروپ چاہتا ہوں اور صرف اس لئے کہ ایشیاء سے اس کے ڈانڈے ملتے ہیں"

تیسرا: (پہلے آدمی سے) "تم شمالی امریکہ کے ساتھ مجھے جنوبی امریکہ کیوں نہیں دیتے"

پہلا: "بیوقوفی کی باتیں نہ کرو۔ یہ تو دیکھو کہ میں نے کتنی قربانیاں کی ہیں"

تیسرا : " اور میں نے تو گویا کچھ کیا ہی نہیں "۔

دوسرا : " میں ایک ترمیم پیش کرتا ہوں ۔ وہ یہ کہ زمین کی تقسیم پر ہم لوگ ابھی متفق نہیں ہیں اس لئے اس مسئلہ میں اور زیادہ چھان بین ہونا چاہئے "

پہلا : " میں اس ترمیم کی تائید کرتا ہوں "

تیسرا : " اچھا تو اب میں سب سے پہلے سوال پر آتا ہوں جو دیا سلائی کی تقسیم سے تعلق رکھتا ہے "

دوسرا : " دیا سلائی کو نوع انسانی کی مشترک ملکیت قرار دینا چاہئے اس لئے میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ جو تیلیاں بچ رہی ہیں وہ تینوں میں برابر برابر تقسیم کردی جائیں "

پہلا : " میں اس تجویز کے ماننے کے لئے آمادہ نہیں ۔ کیونکہ اول تو دیا سلائی کو نوع انسانی کی مشترک ملکیت قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں اور دوسرے یہ کہ آٹھ تیلیاں تین برابر حصوں میں بانٹی بھی نہیں جا سکتیں "۔

دوسرا : " تو پھر کیا ہونا چاہئے "

پہلا : " یہ کہ میں آپ میں سے ہر ایک کو دو دو تیلیاں دوں اور باقی چار مع دیا سلائی کے بکس کے اپنے پاس رکھوں "

تیسرا : " میں صدر کی حیثیت سے اس تجویز کو نامنظور کرتا ہوں "

دوسرا : " ذرا ضبط سے کام لیجئے "

پہلا : " کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنا قیمتی وقت اس فضول بحث میں ضایع کر رہے ہیں اور دنیا کی از سر نو تعمیر کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے ۔ میری رائے میں اس بحث کو ترک کرکے تھوڑی دیر آرام کیجئے ۔ اسکے بعد دیکھا جائے گا "

(یہ کہکر وہ چلا جاتا ہے ۔ دوسرا آدمی، تیسرے سے آہستہ آہستہ گفتگو کرتا ہے)

تیسرا : " بالکل ٹھیک ہے، یہی ہونا چاہئے "۔ (وہ ہاتھ میں ڈنڈا لیکر کھڑا ہو جاتا ہے)

" چلو چلیں " (دونوں پہلے آدمی کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں ۔ تھوڑی دیر بعد مار پیٹ کی آواز آتی ہے اور یہ دونوں واپس آجاتے ہیں)

تیسرا : " میں سمجھتا ہوں کہ نوع انسانی کو ہمارا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ہم نے اس کے دشمن کو فنا کردیا ۔ اچھا تو لاؤ چار تیلیاں مجھے دیدو "

دوسرا : " چار ؟ ، چار کیسی ؟ "

تیسرا : " یعنی آدھی آدھی "

دوسرا : " افسوس ہے کہ تم انصاف سے واقف نہیں، یہ تو سوچو کہ یہ ترکیب کس نے سوچی تھی "

تیسرا : " لیکن سب سے پہلے ڈنڈا کس نے مارا ۔ میں نے یا تم نے ؟ "

دوسرا : " اس سے کیا ہوتا ہے، تاہم تم تین تیلیاں لے سکتے ہو "

(تیسرا غضبناک ہو کر ڈنڈا اٹھاتا ہے اور دوسرا ریوالور نکال کر اس پر فیر کردیتا ہے وہ زمین پر گر جاتا ہے اور وہ دوسرا آدمی دیا سلائی روشن کرکے سگریٹ سلگاتا ہے)

تیسرا : (مرتے ہوئے) " تم نے مجھے مار کے کیا پایا "

دوسرا : " نوع انسانی کے لئے دائمی امن و سکون ! "

M. N. Work

درگا بائی صنم

کے تعلقات بے خبر، غالب اور مہر کے ساتھ

درگا بائی صنم، آگرہ کی مشہور و معروف رقاصہ اور اسد اللہ خاں غالب، خواجہ غلام غوث بے خبر اور مرزا حاتم علی مہر کی جلیس و ہم عصر تھی۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی کا بیان ہے کہ ان تینوں حضرات سے اُن کے خصوصی اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔ انھوں نے مندرجۂ ذیل الفاظ میں اُس کی تصویر کھینچی ہے:

"اتنے میں آگرہ کی مشہور رقاصہ درگا بائی متخلص بہ صنم آگئی۔ نوعمر، خوبصورت پیشانی پر قشقہ لگا ہوا۔ اس بجھج سے آئی اور آداب و کورنش اس انداز سے بجا لائی کہ جس کو دیکھو وہ بت بنا ہوا تھا..... مرزا غالب بے اختیار کہہ اُٹھے: - یہ چوٹی زرافشاں مانگ، سبز اس پر دوشالا ہے ؛ تماشا ہے پرطاؤس میں کالے کو پالا ہے"[1]

یہ ایک خاص ادبی صحبت کا ذکر ہے جو بلدۂ شعر و سخن یعنی اکبر آباد میں ۱۸۶۲ء[2] میں منعقد ہوئی۔ اس صحبت کا انعقاد مفتی افہام اللہ صاحب ساحر کی تحریک پر دیوان سنگھ راجہ کے مکان پر ہوا تھا۔ اور اس میں آگرہ کے مشہور شعرا، شیخ احمد علی شیون، زین العابدین خاں شورش اور خواجہ غلام غوث بے خبر وغیرہ شریک ہوئے تھے۔ غالب آگرہ میں تشریف فرما تھے، انھیں کے اعزاز میں، بے طرح مشاعرہ کیا گیا تھا۔ اس صحبت شعر و سخن کا آغاز[3] درگا بائی صنم نے کیا اور یہ غزل پڑھی:

کچھ دوائے دل و جگر نہ ہوئی، مر گئے ہم انھیں خبر نہ ہوئی
اپنی صورت مٹا ہی دی ہم نے ان کی اس پر بھی کچھ نظر نہ ہوئی
دل پہ تاثیر کر گئی ان کے، شکر ہے آہ بے اثر نہ ہوئی
دل و جاں ہجر میں گئے ایسے ایک کو ایک کی خبر نہ ہوئی
رہیں اب دیر ہی میں چل کے صنم اپنی کعبہ میں تو بسر نہ ہوئی

---

[1] بزم آخر ص ۱۲-۱۳ — [2] مفتی صاحب کو اس تاریخ پر اصرار ہے لیکن میں اس کی پوری تحقیق نہیں کر سکا۔ غالب کا یہ فقرہ "مشاعرہ ہ کونا' میں دلی میں بھی نہیں آتا جاتا۔ کبھی قلعہ معلیٰ میں پکڑ بلایا جاتا ہوں" (بزم آخر ص ۱۱) ثابت کرتا ہے کہ یہ واقعہ اگر صحیح ہے تو ۱۸۵۷ء سے پہلے کا ہونا چاہئے۔

[3] بزم آخر ص ۱۳ - ہماری محرومی ہے کہ مفتی صاحب نے کوئی حوالہ نہیں دیا

اسی مشاعرہ میں شیوؔن نے جو غزل پڑھی تھی، اس کا مقطع یہ تھا،

سُن کر مرے اشعار وہ فرماتے ہیں شیوؔن — بندش ہے یہ کچھ اور، یہ ہے طرز بیاں اور

مفتی انتظام اللہ صاحب کا بیان ہے کہ مرزا غالبؔ، شیوؔن کی اس تعلی پر چیں بہ جبیں ہوئے اور فی البدیہہ یہ مقطع ارشاد فرمایا:

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور[1]

خواجہ غلام غوث بے خبرؔ، مفتی انتظام اللہ صاحب شہابیؔ کے حقیقی پھوپا تھے، موخرالذکر وثوق کے ساتھ فرماتے ہیں کہ بے خبرؔ، صنمؔ سے ارتباط اور اختلاط رکھتے تھے، اور اسی وجہ سے ان کی پھوپی اپنے شوہر سے آزردہ خاطر رہتی تھیں۔

اس ادبی صحبت میں بے خبرؔ نے چند اشعار پڑھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں صنمؔ اور بے خبرؔ میں کچھ شکر رنجی تھی:

کیوں کر خبر کریں گے کسی بے خبر سے ہم — زخمی ہوئے ہیں آپ کے تیر نظر سے ہم

دونوں کی رنجشیں ہیں برابر بڑھی ہوئی — ہم سے خفا وہ شوخ ہے اُس فتنہ گر سے ہم

دل توڑ مت کسی کا خدا کا ہے گھر صنمؔ، — لائیں گے اس طرح کا مکاں پھر کدھر سے ہم

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ بے خبرؔ نے آہ دل سوز میں بھی صنمؔ کا ذکر کیا ہے لیکن مجھے یہ مجموعہ دیکھنے کو نہیں مل سکا۔

مفتی صاحب موصوف حکیم تفضل حسین صاحب اکبر آبادی مرحوم کی روایت سے بیان کرتے ہیں کہ غالبؔ کے بھی صنمؔ سے مراسم تھے۔ یہ مسئلہ بھی تحقیق طلب ہے لیکن مرزا کی آزادروی اور عیش کوشی سے کچھ بعید نہیں کہ اس قسم کے تعلقات ہوں۔ ان کا اکبر آباد کا قیام بالخصوص "شعر و شاہد و شمع و مے و قمار" کا زمانہ تھا۔ آگرہ کی خوش حال ننھیال میں مرزا کو پوری پوری آزادی تھی۔ انھوں نے اکثر جگہ اس "بیہودہ کوشی" پر افسوس کیا ہے اور اُس وقت کے ضایع ہونے پر ندامت کے آنسو بہائے ہیں جو "فرومایگان ہم نشین"[2] اور "اوباشان ہم رنگ" کے ساتھ بسر ہوا۔ ایک فارسی مثنوی میں لکھتے ہیں:

چشم بہ پریشاں نظرے داشتے — جلوہ بہ ہر رہگزرے داشتے

بس کہ بلا بر اثر انداختے، — دیدہ بصد جا سپر انداختے

زاں ہمہ اجزائے زمانیکہ رفت — واں ہمہ خونابہ فشانی کہ رفت

ہرچہ کنوں می رسدم در نظر — شاہد و شعر است و شراب و شکر

چرخ بسا روز بگشت ایں چنیں، — آہ ز عمرے کہ گزشت ایں چنیں،

ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے مرزا کو یہ نصیحت کی تھی کہ:

"ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اُڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو"[3]

---

[1] بزم آخر ص ۱۵-۱۰۔ انیز غالب کے لطیفے ص ۱۶ لیکن یہ غزل غالب نے تپہ کو ۱۸۵۸ء میں لکھ کر بھیجی تھی اس لئے یہ روایت ضعیف معلوم ہوتی ہے، ملاحظہ ہو خطوطِ غالب ص ۲۱۲ ———— [2] مہر نیم روز — [3] خطوط غالب ص ۳۱۶۔

اس نصیحت پر ان کا عمل بھی رہا ہے لیکن اُن کے خطوں میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے مغل جان[1] اور ایک ستم پیشہ ڈومنی[2] کے علاوہ درگاہ بائی صنم کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔

مرزا حاتم علی مہر بڑے رنگین مزاج اور خوبصورت آدمی تھے۔ غالب نے لکھا ہے:

"بھائی تمھاری طرح داری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا"

اسی خط میں انھوں نے مہر کے گندمی رنگ اور کشیدہ قامت ہونے کا ذکر کیا ہے اور ان کی صاف اور گھٹی ہوئی داڑھی پر خونِ جگر کھایا ہے۔

مہر کے تعلقات مغل جان سے تھے جس کا اشارہ اوپر ہو چکا ہے، ایک دوسری طوائف چنا جان سے بھی انکو خصوصی ربط اور انس تھا۔ اُس کا انتقال، مہر کی حیات میں ہوا اور اِس طرح اُن کو مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہوئی، لیکن مہر اپنے خطوں میں برابر غم و اندوہ کے شکوہ گزار ہیں۔ غالب ان کو تعزیت کے خط میں لکھتے ہیں:

"کیسی اشک افشانی، اور کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی، منا جان سہی، میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے، اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی، وہی زمردیں کاخ، اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بد دور، وہی ایک حور، بھائی ہوش میں آؤ، کہیں اور دل لگاؤ"[3]

مرزا حاتم علی مہر نے چنا جان کے انتقال کی گیارہ تاریخیں کہی ہیں اور ہر تاریخ پر ایک قطعہ کہا ہے۔ ہم ان کے مجموعۂ کلام "الماس درخشاں" سے صرف دو تاریخیں نقل کرتے ہیں:

صغرا کی تصدق ہیں، قربان سکینہ کی — گلزار میں زہرا کے ہر گل کی فدائی ہیں
تاریخ وفات ان کی ہاتف نے پڑھی اے مہر — چنا ہیں گل جنت، جنت میں یہ آئی ہیں

شہر ذیقعدہ و تاریخ نہم — مہ نہاں گشت زچشم انجم
دفن گردید شب ادینہ — پر غبارہ آہ شدہ آئینہ
پئے تاریخ وفاتش درگوشش — مطلع مہر ہمیں خواند سروشش
آمد اینک بجناب زہرا — کہ عفا اللہ تعالےٰ عنہا

درگاہ بائی صنم سے بھی مہر کا بے تکلفانہ ربط تھا۔ ان کے کلام میں جا بجا اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ صنم کا ایک شعر ہے:

تری زلف رسا ہے اور میں ہوں، — یہی دام بلا ہے اور میں ہوں،

---

[1] خطوط غالب ص ۳۱۲ [2] ایضاً ص ۳۱۵ - [3] خطوط غالب ص ۳۱۹

قہر نے اسی زمین میں پوری غزل کہی ہے ملاحظہ ہو:

بتوں کا سامنا ہے اور میں ہوں — خدا کا آسرا ہے اور میں ہوں،
یہاں آکر کریں کیا یاس و امید، — دل بے مدعا ہے اور میں ہوں،
ملا جو خاک میں قدموں سے چھٹ کے — وہ تیرا نقش پا ہے اور میں ہوں
خدا جانے بتو ہوتا ہے کیا حال — یہی گر دل مرا ہے اور میں ہوں
ذرا آنے تو دے روز قیامت — صنم تو ہے، خدا ہے اور میں ہوں
ستم ہے ظلم ہے ان کی طرف سے — محبت ہے وفا ہے اور میں ہوں
پسند اے قہر ہے یہ قول استاد — صنم کوچہ تیرا ہے اور میں ہوں[1]

اس کے بعد صنم کی اسی غزل کو تضمین کیا ہے:

بکھیڑا پیچ کا ہے اور میں ہوں، — دل الجھن میں مرا ہے اور میں ہوں
یہ سودا سر پڑا ہے اور میں ہوں، — تری زلف رسا ہے اور میں ہوں
یہی دام بلا ہے اور میں ہوں

مکان آراستہ گھر ہے تو بےکار — ہوا ہے دخمۂ[2] کفار اے یار
میں ہوں مرگ کے صورت اس میں ناچار — نہ کوئی یار ہے اپنا، نہ غم خوار
خدا کا آسرا ہے اور میں ہوں

سیہ بخت اور کوئی دوسرا ہے — مجھی سے نام کلجگ کا ہوا ہے
اندھیرا گھپ ہے کچھ بھی سوجھتا ہے — شب فرقت میں سودا زلف کا ہے
یہی کالی بلا ہے اور میں ہوں

نزاکت ختم ہے اس دل ربا پر — نقاہت مجھ ضعیف و مبتلا پر
دئے ہیں ناتوانی نے لگا پر — اڑا یا ضعف نے مجھ کو ہوا پر
بگولا ہے، صبا ہے اور میں ہوں

میں ہی کرتا ہوں پیار اے جان تم کو — مرے اس چاہنے کی داد تو دو
ادھر دیکھو ابھی کچھ منہ سے بولو — سوال وصل سنکر چپ ہوئے ہو
تمہاری یہ جفا ہے اور میں ہوں

---

[1] الماس درخشاں ص ۱۴۰ مطبوعہ آگرہ ۱۹۱۵ء — [2] قبرستان

غزل تضمین ان کی کر رہا ہوں، زباں سے ہم زبان دل رہا ہوں،
اب اس سے بڑھ کے نعمت کیا میں چاہوں لب جاں بخش جاناں چوستا ہوں،
نصیب آب بقا ہے اور میں ہوں[1]

صنم کے بقیہ اشعار یہ ہیں :

شب فرقت میں ہوں دم بھر کا مہماں قضا کا سامنا ہے اور میں ہوں
رخ و گیسو کا رہتا ہے تصور یہ غم صبح و مسا ہے اور میں ہوں
یہی کہتا ہے اس ابرو کا مائل، دم تیغ جفا ہے اور میں ہوں
وہاں اغیار سے صحبت ہے انکو یہاں آہ و بکا ہے اور میں ہوں
تری رہ میں نہیں ہے حاجت خضر مرا دل رہنما ہے اور میں ہوں
غم ہجراں ہے کافی دل لگی کو، یہی مونس مرا ہے اور میں ہوں
قیامت کا صنم خطرہ نہیں ہے، نبی حامی مرا ہے اور میں ہوں

حاتم علی قہر (شاگرد ناسخ لکھنوی) نے صنم کی اس غزل کو بھی تضمین کیا ہے جو بقول شہابی صاحب کے غالب والے مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی یہ تضمین بھی ملاحظہ ہو:

صحبت اک دم بھی عمر بھر نہ ہوئی کبھی آرام سے بسر نہ ہوئی
کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی کچھ دوائے دل و جگر نہ ہوئی
مر گئے ہم انھیں خبر نہ ہوئی

جو مصیبت پڑی سہی ہم نے کچھ شکایت کبھی نہ کی ہم نے
آخر آخر بری سہی ہم نے اپنی صورت مٹا ہی دی ہم نے
ان کو اس پر بھی کچھ نظر نہ ہوئی

اچھا بندہ پہ لطف فرمایا واہ تا صبح خوب جگوایا،
بے قراری نے مجھ کو تڑپایا صبر آیا نہ یار ہی آیا،
دل کو تسکین رات بھر نہ ہوئی

آگرہ میں فیض نسیم اور جلوۂ گل کی کمی نہیں تھی۔ ہر سال ایک میلہ طوائفاں ہوا کرتا تھا[2]۔ قہر نے اسکے تعین کی تاریخ بھی کہی تھی۔ مفتی صاحب کا خیال ہے کہ یہ قطعہ تاریخ بھی درگا بائی صنم کی فرمائش پر کہا گیا تھا۔ یہ قطعہ الماس درخشاں میں موجود ہے:

مہوشوں نے کیا میلہ ایجاد قہر دل لینے کا ساماں دیکھو
اکبر آباد جو ہے رشک چمن اس میں اک تازہ گلستاں دیکھو
میں بھی اب مصرع تاریخ لکھوں نقشۂ بزم پریستاں دیکھو
۱۲۷۲ھ

[1] الماس درخشاں ص ۱۴۶ – [2] الماس درخشاں ص ۱۴۱ – [3] تیراکی کے موسم میں آرام باغ وغیرہ کے میلے، پنج کنوئیں کے قبرستان اور تاج محل میں عید کی تڑکے میلے

برطانیہ کا اقتصادی بحران

پچھلے سال کے دوران میں برطانیہ کا اقتصادی بحران اور بھی شدید صورت اختیار کر گیا۔ اس اقتصادی بحران سے برطانیہ کی پوری معیشت پر بڑا برا اثر پڑا ہے۔ ایندھن، لوہے اور فولاد کے طیار سامان کی سخت کمی ہے، مالی انتشار پیدا ہو گیا ہے، قیمتیں برابر بڑھتی چلی جا رہی ہیں، ڈالر کی کمی ہے اور محنت کش عوام کا معیار زندگی بد سے بدتر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اخراجات کی مد میں ۴۵ کرور پونڈ کا خسارہ تھا، جو ۱۹۴۸ء میں اور بھی بڑھ گیا اور ۷۰ کرور پونڈ تک پہونچ گیا اور ظاہر ہے کہ موجودہ حالت میں یہ خسارہ اور بھی بڑھتا جائے گا۔ امریکہ سے ۳ ارب ۷۵ کرور ڈالر قرض لئے گئے تھے، اور انھیں پانچ سال کے اخراجات میں صرف کرنا تھا۔ لیکن ایک سال کی مدت ہی میں یہ رقم تقریباً سب کی سب خرچ ہو گئی۔

برطانیہ کے اقتصادی بحران کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ لیبر گورنمنٹ نے ملک کی معیشت کو امریکہ کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ امریکہ کے بڑے بڑے سرمایہ دار، سامراجی اور جمہوریت دشمن لیڈر اس بات کی طیاری کر رہے ہیں کہ تمام دُنیا پر امریکی سرمایہ کا تسلط قایم ہو جائے۔ دورانِ جنگ میں برطانیہ عظمیٰ بہت کمزور ہو گیا اور اب امریکی اجارہ داروں کی رہنمائی میں سامراجیوں کے کیمپ میں امریکہ کا دوسرے درجہ کا شریک کار ہو گیا ہے۔ ایٹلی اور بیون کی حکومت عوام کے مفاد کے سراسر خلاف اپنے ملک کے چرچل جیسے سامراجیوں اور وال اسٹریٹ کے سرمایہ داروں کو شہ دے رہی ہے۔

برطانیہ کی لیبر حکومت نے امریکہ کے ساتھ ملکر سامراجی منصوبوں کو پورا کرنے کی ٹھانی ہے اور نئی عالمگیر جنگ کی دھمکیاں دینی شروع کر دی ہے اور بیرونی ممالک میں بڑی بڑی فوجیں رکھ کر بے انتہا رقم خرچ کر رہی ہے۔ جنگ کی وجہ سے برطانیہ کا بجٹ کمزور تو ہو ہی گیا تھا اب ان مزید اخراجات کی وجہ سے حالت اور بھی خراب ہو گئی ہے۔

اس وقت برطانیہ کی فوج ۱۹۳۹ء کی تعداد کے مقابلہ میں تین گنی ہے۔ اتنی بڑی فوج کو رکھنا نہ تو خود برطانیہ کے مفاد میں ہے اور نہ جنگ کے بعد قیام امن کے مفاد میں۔ ۱۹۴۸ء کے بجٹ کے مطابق فوجی اخراجات ایک پاؤنڈ میں ۸ شلنگ (۴۰ فیصدی) کے برابر تھے اور باقی ۱۲ شلنگ فی پونڈ ملک کی زمانۂ امن کی ضروریات کے لئے خرچ کیا گیا۔

برطانیہ کے عوام مطالبہ کرتے ہیں کہ فوجوں کو گھٹا کر جنگ سے پہلے کی تعداد پر رکھا جائے۔ لیکن پھر بھی لیبر گورنمنٹ نے ملک سے باہر سمندر پار بہت بڑی تعداد میں فوجوں کو بھیج رکھا ہے اور وہاں وہ امریکی سامراجیوں کے ساتھ ملکر مجرمانہ جنگ جاری کئے

ہوئے ہیں جیسے کہ مثال کے طور پر یونان میں مداخلت کی جنگ کر رہے ہیں۔ اس طرح سے لیبر گورنمنٹ برطانیہ کی قومی معیشت پر وہ بوجھ ڈال رہی ہے جسے وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس رقم کو غلط طریقہ سے استعمال کر کے ملک کی قومی صنعت کی بحالی کے لئے ضروری رقم نہیں صرف کر رہی اس لئے عوام کی ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتیں۔

امریکہ سے قرضہ یہ بہانا کر کے لیا گیا تھا کہ اس رقم کو ملک کی دوبارہ تعمیر کے لئے استعمال کیا جائے گا، لیکن اس سے عوام کا معیار زندگی بہتر بنانے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا گیا بلکہ اس رقم کا بہت بڑا حصہ فوجوں کے اخراجات میں صرف ہوا۔ اور سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ اس قرضہ کی کڑی شرطیں امریکہ کے سرمایہ داروں نے اپنی مرضی کے مطابق رکھی تھیں۔ اینگلو امریکی مالیاتی سمجھوتہ کے مطابق امریکی تجارت کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں برتا جا سکتا۔ ڈالر کو پونڈ میں بدلنے کی سہولت کے مراعات لیکر امریکہ نے یہ قرضہ بہت جلد ختم کرا دیا، انفلیشن بڑھ گیا اور برطانیہ "ڈالر کا بھوکا" ہو گیا۔ برطانیہ کی کمزوری سے فایدہ اُٹھا کر امریکہ کے سرمایہ داروں نے اسٹرلنگ بلاک کے علاقوں میں بھی اسی طرح اقتدار جمانا شروع کر دیا ہے، جیسے کہ خود اپنے ہی گھر میں ہوں۔ برطانیہ کی نوآبادیات سے اس کے تعلقات کو توڑنے کی کوشش میں امریکی سرمایہ داروں نے برطانیہ کو مجبور کیا کہ وہ ڈالر سے امریکی سامان خریدے۔ حالانکہ اکثر حالات میں برطانیہ اسٹرلنگ کی صورت میں قیمت ادا کر کے یہی مال دیگر ممالک سے سستا، اچھا اور جلد ہی خرید سکتا تھا۔ پاونڈ کے ڈالر میں جلدی سے تبدیل ہونے کی آسانیاں مہیا ہو جانے کا تباہ کن نتیجہ یہ ہوا کہ لندن کے بنکوں سے ڈالر نکلنا شروع ہو گیا۔ ۱۵ر جولائی ۱۹۴۷ء سے برطانوی حکومت نے پاونڈ کی ڈالر میں تبدیلی شروع کی لیکن ملک کی پوری مالی تباہی کو روکنے کے لئے ۲۰ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہی اس تبادلہ کو رد کر دینا پڑا۔ اس کے نتیجہ کے طور پر امریکہ نے قرضہ کی باقی رقم ۴۰ کرور ڈالر کو روک لیا اور اس طرح مجبور ہو کر برطانیہ کو اپنے خزانہ کے سونے کو خرچ کرنا پڑا۔

پاونڈ کے خلاف ڈالر کا جارحانہ حملہ برابر جاری ہے۔ امریکی سرمایہ دار برطانیہ کی امداد کو مارشل پلان کے مطابق "امداد" تصور کرتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ برطانیہ کو اپنی نوآبادیات میں جو خاص مراعات حاصل ہیں اسے ختم کر دیں اور اس طرح برطانوی نوآبادیات میں گھسنے کی تمام رکاوٹیں دور کر دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ امریکہ یہ بھی کوشش کر رہا ہے کہ برطانیہ کی قومی معیشت کو بھی اپنے زیر اقتدار لے آئے امریکہ کے سرمایہ داروں نے برطانیہ کے سامنے جہاز سازی کی صنعت کو کم کر دینے کی تجویز پیش کر ہی دی ہے۔ امریکہ کے اجارے دار خاص خاص سمندری راستوں پر سمندری تجارت میں کسی قسم کے مقابلہ کو پسند نہیں کرتے۔ ان میں وہ بحری راستے بھی شامل ہیں جو برطانیہ کو اس کی نوآبادیات سے ملاتے ہیں۔

لیکن برطانیہ کے اقتصادی بحران کا گہرا تعلق جنگ کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کے عام اقتصادی بحران سے ہے۔ برطانیہ کی سرمایہ دارانہ قومی معیشت اپنے فرسودہ سرمایہ کو تیزی کے ساتھ تبدیل کرنے اور بڑھانے میں ناکام ثابت ہوئی۔ اگر یہ ممکن ہو جاتا کہ وہ اپنے سرمایہ کو بڑھا لیتا تو پھر دوسرے ممالک سے مقابلہ کر سکتا تھا اور اپنے اخراجات اور آمدنی کے توازن کو باقاعدہ قایم رکھ سکتا تھا۔ آمدنی اور اخراجات میں توازن قایم نہ رہنے اور سالانہ بجٹ میں بڑھتے ہوئے خسارے کا نتیجہ یہ ہے کہ

برطانیہ کو اقتصادی بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ خسارہ کی وجہ یہ ہے کہ برطانیہ اپنی درآمد اور برآمد میں توازن قایم نہ رکھ سکا۔

ان تمام کے علاوہ حالات کو بدتر بنانے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ لیبر گورنمنٹ اب بھی امریکہ کی رہنمائی میں چل رہی ہے اور خارجی پالیسی وہی چرچل کی پرانی جنگجویانہ پالیسی ہے جو یقیناً برطانیہ کے لئے مہلک ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ برطانیہ امن پسند جمہوریتوں سے تعلقات پیدا کرتا جو ڈالر کے پھندے میں نہیں پھنسیں اور جنھوں نے منصوبہ بندی کے ماتحت اپنی قومی معیشت کو بحال کرکے مابعد جنگ کی مشکلات کو حل کیا اور اپنی قومی آزادی اور خود مختاری کو برقرار رکھا۔

لیبر پارٹی کی اندرونی پالیسی بھی اتنی ہی تباہ کن ہے۔ اقتصادی بحران کے چھٹکارا پانے کے لئے لیبر گورنمنٹ نے جو کرپس کی پلان پیش کی ہے وہ حقیقتاً اس بحران کی شدت کو اور بھی زیادہ بڑھا دے گی اور عوام کو وہ مصیبتیں اٹھانی پڑیں گی، جن کا انھیں دوران جنگ کے بدترین زمانہ میں بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس پلان کے اعتبار سے برآمد کے لئے پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا چاہئے اور عوام کے استعمال میں گھر کی بنی ہوئی اشیاء اور باہر سے منگائی ہوئی اشیاء دونوں کا صرف کم کر دینا چاہئے۔ اسکے علاوہ اس پلان میں صنعت میں مزید رقم لگانے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے اور ۱۹۴۵ء میں انتخابات کے دوران میں لیبر پارٹی والوں نے مکانات کی تعمیر اور دیگر سماجی اصلاحات کے جو وعدے کئے تھے وہ بھی اس پلان کی رو سے رد کر دئے گئے ہیں۔ اور پھر اسکے علاوہ مزدور طبقے پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اپنی کارگزاری کو بڑھائیں حالانکہ ان کی حقیقی اجرتوں میں برابر کمی ہوتی چلی جا رہی ہے۔

آج جنگ ختم ہو جانے کے ڈھائی سال کے بعد راشن کی مقدار دوران جنگ کی مقدار سے بھی کم کی جا رہی ہے۔ روٹی اور آلو پر آجکل راشن ہے حالانکہ لڑائی کے دوران میں یہ دونوں اشیاء بغیر راشن کارڈ کے حاصل کی جا سکتی تھیں۔ شکر، گوشت اور چربی کے راشن کی مقدار میں کمی کر دی گئی ہے۔ ۱۹۳۹ء کے مقابلہ میں پاؤنڈ کی قوت خرید ایک تہائی رہ گئی ہے اور یہ قیمت اور بھی گھٹتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ضروریات زندگی کی چیزوں کی پیداوار میں بڑی کمی ہو گئی ہے، بازار کا اصلی کنٹرول بڑے بڑے سرمایہ داروں کے قبضہ میں ہے۔ اور امریکہ سے منگائے ہوئے اور ڈالر کی صورت میں قیمت ادا کئے ہوئے مال کی قیمتیں برابر بڑھتی جا رہی ہیں۔ "ٹائمز" میں جو اعداد و شمار شایع کئے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ سے جو اشیاء مثلاً گیہوں، تمباکو وغیرہ منگائے جاتے ہیں ان کی قیمتیں ۱۹۳۹ء کے مقابلہ میں ۳۰۰ اور ۴۰۰ فیصدی تک بڑھ گئی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پچھلے ایک سال سے ملک میں زبردست (افراط زر کا غذی) انفلیشن ہے اور عوام کی بہت بڑی اکثریت قیمتوں کے بڑھ جانے کی وجہ سے نہایت عسرت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ کرپس پلان اقتصادی بحران کا تمام بوجھ صرف محنت کش عوام کے کندھوں پر لاد دیتی ہے اور بڑے بڑے سرمایہ داروں پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوتی اور وہ حقیقی معنوں میں قیمتوں پر کنٹرول نہ ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے منافعے کما رہے ہیں۔ اور سٹہ بازی کر کے مزدور طبقہ کا استحصال کر رہے ہیں۔ برطانیہ اپنے اس معاشی بحران سے صرف اسی وقت نجات حاصل کر سکتا ہے جبکہ وہ اپنی موجودہ اندرونی اور بیرونی پالیسی کو تبدیل کر دے۔ اسوقت تو برطانیہ کی اندرونی اور بیرونی پالیسیوں سے صرف امریکہ کے مفاد پورے ہوتے ہیں اور جو تجارتی معاہدے ہو رہے ہیں وہ امریکہ کے سرمایہ داروں اور جنگجویانہ پالیسی اختیار کرنے والے امریکی سیاستدانوں کے مفاد میں ہیں۔

"جی - کولاکوف" (ٹائمس - سوویٹ نیوز ایجنسی)

انشاء قصیدہ گوئی کی حیثیت سے

انشاء سے پہلے مرزا محمد رفیع سودا اُردو قصیدہ کو فارسی قصیدہ کا ہم پلہ بنا چکے تھے اور جملہ آشنایان سخن نے سودا کو اُردو زبان کا انوری اور "مدح و قدح کا بادشاہ" تسلیم کر لیا تھا۔

انشاء کی قصیدہ گوئی کا مرتبہ اس سے ظاہر ہے کہ اُردو قصیدہ گوئی کی تاریخ میں سودا کے بعد دوسرا نام انشاء کا ملتا ہے۔

انشاء کی کلیات میں دس قصیدے اُردو کے ہیں جن کا موضوع حمد۔ نعت۔ منقبت اور مدح سلاطین و کبار ہے فارسی قصاید کی تعداد بھی خاصی ہے۔ محمد حسین آزاد نے اُن کے قصاید پر جو تبصرہ کیا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں: "قصاید بڑی دھوم دھام کے ہیں۔ الفاظ کی شکوہ۔ طبیعت کی بلند پروازی کی کوئی حد نہیں۔ مگر سیدھے چلتے چلتے ایک ایسی چال بدلتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ وہ یہی بات ہے کہ اپنی زباندانی کے جوش اور قوت بیانی کے مزے میں آکر کبھی کوئی شوخ مضمون کبھی کوئی خوش آیند ترکیب اور نئی تراش ایسی سوجھ جاتی ہے کہ اُسے باندھے بغیر نہیں رہ سکتے اور وہاں قصیدے کی متانت اور وقار کے اُصول ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں۔ اس میں کبھی تو کلام میں شوخی اور ایک قسم کا بانکپن پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی مبتذل ہو جاتا ہے۔ مگر پھر لطف یہ ہے کہ قدرتی لذت جو زبان میں ہے وہ کلام کو بدمزہ نہیں ہونے دیتی اور اسی واسطے جس دربار یا جلسہ میں قصیدہ پڑھتے تھے سبحان اللہ اور واہ وا کہنے کے سوا سننے والوں کو ہوش نہ ہوتا تھا۔ اس بے اعتدالی کا یہ سبب تھا کہ طبیعت میں طاقت بہت تھی مگر اُس پر قابو نہ تھا۔ ان قصیدوں میں مزہ وہاں آتا ہے جہاں ممدوح کی تعریف کرتے کرتے دفعتہً کہتے ہیں کہ دارائے ایران تجھے ایران میں بیٹھا کہ رہا ہے اور جھٹ چند شعر فارسی کے اس طرح کہہ جاتے ہیں گویا ایک آغائے تازہ ولایت آیا اور اپنی چنیں وچناں کے ساتھ شیرۂ شیراز کے دو دو گھونٹ سب کو پلا گیا۔ اس کے برابر گویا ایک عُرب العرباء جبہ پہنے عبا اور عمامہ سجے سامنے کھڑا ہے۔ پھر شاہ بخارا ترکستان سے ترکی میں آواز دیتا ہے اور ساتھ ہی عالی جاہ کابل اپنی افغانی میں کہتا ہے اور برج کی گوپیاں یوں کہتی ہیں اور پنجاب میں جھنگ سیالے کی جٹیاں یوں کہتی ہیں وغیرہ وغیرہ"

آزاد کے تبصرہ پر اختلاف رائے کی کہیں گنجایش نظر نہیں آتی ہے۔ درحقیقت انشاء کی طبیعت میں زور حد اعتدال سے زیادہ تھا اور اُن کے اسی زور طبع اور دیگر زبانوں میں مہارت تامہ کا نتیجہ تھا کہ وہ اُردو میں اشعار کہتے کہتے عربی۔ فارسی۔ ترکی پشتو اور بھاشا کے بھی اشعار کہہ جاتے تھے۔ قصاید میں بھی اُن کا مخصوص رنگ وہی ہے جو اُن کی غزلیات کا یعنی شوخی و بانکپن۔

انشاؔ کے قصاید کا لفظی حسن وقبح علماء معانی و بیان نے قصیدہ کی زبان کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ اُس کے الفاظ شاندار متین اور باوقار ہوں لیکن اس سے یہ مقصد نہیں ہے کہ قصیدہ گو جزالتِ الفاظ کے شوق میں حدِ اعتدال سے اتنا آگے بڑھ جائے کہ قصیدہ کو ثقیل اور گراں الفاظ۔ مبہم لغات اور غیر معروف علمی اصطلاحات سے بوجھل کردے انشاؔ کے قصاید میں یہ عیب اور صواب دونوں موجود ہیں۔ اُن کے قصاید کے الفاظ اگر ایک طرف متین۔ شاندار اور باوقار ہیں تو دوسری طرف ثقیل اور مبہم بھی لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ خامی محض انشاؔ ہی کے حصہ میں نہیں آئی ہے۔ اُردو زبان کے چند دیگر مشہور شعراء مثلاً ذوقؔ، مومنؔ اور منیرؔ کا کلام بھی اس عیب سے پاک نہیں ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور خاص چیز جس سے پرہیز کرنے کی علمائے معانی نے تاکید کی ہے وہ یہ ہے کہ قصاید میں ایسے الفاظ کے استعمال سے بھی گریز کرنا چاہئے جو بازاری ہلکے اور عوام الناس کی زبانوں پر جاری ہوں۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ خامی بھی انشاؔ کے قصاید میں موجود ہے۔

انشاؔ کے قصاید کے معنوی محاسن و معائب ناقدین قصیدہ نے معنوی محاسن و معائب کا معیار یہ مقرر کیا ہے کہ جس طرح قصیدہ کے لئے شاندار اور باوقار الفاظ کی ضرورت ہے اسی طرح معانی بھی بلند ہونا چاہئے کیونکہ اگر متین الفاظ میں سوقیانہ اور پست خیالات کا اظہار کیا جائے گا تو وہ اشعار معنوی خوبی سے خالی ہونگے۔ یہ خامی بھی انشاؔ کے کثیر اشعار میں پائی جاتی ہے لیکن یہاں بھی انشاؔ اکیلا نہیں ہے۔ یہی عیب "مدح و قدح کے بادشاہ" سوداؔ کے کلام میں بھی موجود ہے۔

فنی در وبست کے اعتبار سے انشاؔ کے قصاید کا پایہ قصیدہ کی تقسیم چار چیزوں پر کی گئی ہے تشبیب یا تمہید اسے نسیب بھی کہتے ہیں۔ دوسری چیز گریز یا تخلص تیسری مدح اور چوتھا خاتمہ و دُعا۔

ان چاروں چیزوں کے جانچنے کے لئے اساتذۂ تنقید نے معیار مقرر کئے ہیں۔ لیکن ان چار چیزوں کے علاوہ ایک اور چیز بھی ایسی ہے جو قصیدہ کے حسن یا قبح کا سبب بن جاتی ہے اور یہ مطلع ہے، مطلع کے کامیاب ہونے کی پہچان یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسی نئی بات بیان کی گئی ہو جو سامعین کو قصیدہ کی طرف متوجہ کرلے اور اُن کو آیندہ اشعار سننے کا مشتاق بنادے۔ انشاؔ کے اکثر مطالع اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ ان کے چند قصاید کے مطالع یہ ہیں:

در مدح دُلہن جاں :۔

سحر بہار کی خوشبو میں آگئی یہ لپٹ ۔۔۔ کہ صاف چاند سے مکھڑوں کے کھل گئے گھونگٹ

در مدح سلیمان شکوہ :۔

صبحدم میں نے جو لی بستر گل پر کروٹ ۔۔۔ جنبش بادِ بہاری سے گئی آنکھ اُچٹ

چناں بجفل در دہی کشاں شدم محق ۔۔۔ کہ بادہ یکدم از مسام جائے عرق

اردی بہشت زد بخیاباں دگر گمند   آمد زمانِ مستی در دی کشش نژند

مطلع کے بعد تشبیب آتی ہے۔ یہ دراصل تمہید ہے اس میں مختلف مضامین مثلاً اخلاق و موعظت۔ جفائے گردوں وغیرہ ہوتے ہیں، یا محض اصل قصیدہ کے موضوع کی تمہید ہوتی ہے۔ انشاؔء کے قصاید کی تمہید میں اصل موضوع کا پس منظر ہی ملتا ہے اور کسی دوسری قسم کے حکیمانہ خیالات نہیں پائے جاتے۔ نواب سعادت علی خاں کی مدح میں ایک قصیدہ ہے اُس کی تشبیب ملاحظہ فرمائیے:۔

نظر آئی مجھے کل باظفر و طبل و علم   صورت فتح مجسم وہ بشکل آدم
سر پہ ایک خود وہرے جسپہ بڑی سی کلغی   ڈھال کاندھے پہ پڑی ہاتھ میں شمشیر دودم
زرۂ حضرت داؤد گلے میں اُس کے   جبروت اُس کا فریدون فر و جمشید شیم
خضر و الیاس جلو اُسکے میں جوں چاؤشاں   بھلا رہے سطوت و فیروزی و اجلال و حشم
لمعۂ نور جبیں اُس کی سے طالع جوں مہر   سب رکاب اُس کی میں موجود صنادید عجم
اُس کے افواج کے گھوڑوں پہ کیا خوب جو صیان   تو وہ بنکارے پڑے پھرتے تھے مثل ضیغم
دیکھ القصہ اُسے چونک گئیں یوں آنکھیں   دفعتہً چونک پڑیں جیسے غزالانِ حرم

ذوقؔ نے ایک قصیدہ اکبر شاہ ثانی کے فرزند شہزادہ سلیم کی شادی کے موقع پر کہا ہے وہ بھی انشاؔء کے متذکرۂ بالا قصیدہ کا ہم قافیہ ہے اس لئے اس کی تشبیب بھی دونوں کے موازنہ کے لئے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

تشبیب قصیدۂ ذوقؔ

افق دل پہ میرے عیش و طرب دونوں بہم   آج یوں آئے سحر جیسے دو پیکر توام
ایک کا ایک سے وہ ربط سخن تھا گویا   دو لب یار ہیں یا حضرتِ عیسیٰ ہمدم
روشِ ناز پہ ہمدوش تھے یوں جیسے کبھی   لام الف لکھتا تھا اسلام کا یاقوت رقم
یا تھے دو مصرع مربوط بہم دست و بغل   یا کہ پیوند تھے دو نخل گلستانِ ارم
دونوں پیچیدہ بہم ایسے سیہ مستی میں   کوئی مشاطہ بھی یوں گوندھے نہ جعد پُر خم
ایک معنی کے وہ لفظ مترادف تھے دو   ایک ہی معنی کے دو فقرے مگر مستحکم
تھے چڑھے دو در شہوار کہ ہرگز بھی نہیں   ابرِ نیساں سے گریں لاکھ اگر قطرۂ یم
ایسے تھے دونوں وہ یکدل کہ دو قالب یکجاں   یکزباں دونوں وہ اس طرح کہ جوں چاک قلم
آئے لپٹے ہوئے یوں عالم سرشاری میں   نالۂ زیر کے ہمراہ ہو جوں نالۂ بم،

امیر مینائی کے اُس قصیدہ کی تشبیب بھی نقل کرنا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے جو خلد آشیاں نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور کی مدح میں ہے۔

تشبیب قصیدۂ امیر مینائی

تخت کاغذ پہ ہوا صدر نشیں شاہِ قلم ۔۔۔ دایرے طبل کی صورت ہیں الف شکل علم

ہیں جو یہ عرصۂ کاغذ پہ حروف و حرکات ۔۔۔ یہی لشکر ہیں یہی فوج یہی خیل و خدم

ہے فصاحت جو مصاحب تو بلاغت ہے ندیم ۔۔۔ وزرا مرتبۂ و دبدبۂ و جاہ و حشم

منتخب ہیں جو مضامین تو معانی ہیں لطیف ۔۔۔ ہیں وہی گنج و خزائن وہی دینار و درم

اہل دفتر نے جو کی کھولے بستوں کو نشست ۔۔۔ گردنِ منشیٔ گردوں ہوئی تسلیم کو خم

کبھی منصب کبھی تقسیم میں دیں جاگیریں ۔۔۔ شقّے لکھے گئے ہونے لگے فرمان رقم

وقتِ دربار ہوا جمع ہوئے مجرائی ۔۔۔ عقل و فہم و خرد ہوش و تدابیر و حکم

سامنے آنے لگے خیرِ طلب بہر سلام ۔۔۔ آدمی تھا جو ادب کا وہ پکارا بہم

روبرو خسرو جم جاہ و ملک فر کے نگاہ ۔۔۔ تا ابد سلطنت پشت و پناہ عالم

ہوئی مجرے سے بخوبی جو فراغت حاصل ۔۔۔ مسندِ حکم ہوئی مطلع انوارِ قدم

روبرو دستخطِ خاص کو لایا کاغذ ۔۔۔ حکمت الدولہ جو تھا منشیٔ یاقوت رقم

عرضیاں گزریں خلائق کی برائے مطلب ۔۔۔ لب ہوئے لعل فشاں کھل گئے ابواب کرم

بعد اخبار کے پرچوں کو جو نوبت آئی ۔۔۔ نئے مضمون کا اک پرچہ ہوا پیش اُسدم

کہ ملازم جو ہیں سرکار کے دو دانش دوہم ۔۔۔ در دولت پہ ہے ہنگامہ لڑتے ہیں باہم

بحث اک بات کی دونوں میں پڑی ہے ایسی ۔۔۔ کہ بہم گتھ گئے ہیں صورت خط توام

حکم عالی یہ ہوا جلد کرو حاضر بزم ۔۔۔ دیکھیں کیا کہتے ہیں خود دونوں میں ہم ہونگے حکم

حاضرِ بزم ہوئے وہ تو ہوا یہ ایما، ۔۔۔ کیوں لڑے کیا سبب جنگ ہے آگاہ ہوں ہم

تشبیب کے بعد گریز آتا ہے اور دراصل یہی قصیدہ میں سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ گریز کا کام یہ ہے کہ مختلف الموضوع تشبیب اور مدح کو آپس میں اس طرح پیوند دے کہ دونوں ایک چیز نظر آنے لگیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہت دشوار ہے۔ اسی لئے یہ قصیدہ گو کو جانچنے اور پرکھنے کی بہترین کسوٹی ہے۔

انشاؔ کے قصائد میں گریز اچھا ہوتا ہے متذکرہ بالا انشاؔ کے قصیدہ کا گریز ملاحظہ فرمائیے:۔

بادب میں نے یہ معروض کیا اسم شریف ۔۔۔ بارے فرمائیے اے مخزن الطاف و ہمم

تو یہ ارشاد ہوا تجھ کو نہیں کیا معلوم | نیرّ طالع فیروز ہیں اُس شخص کے ہم
وہ سعادت علی خاں عالی اعلیٰ جو ہے | معدنِ جود و سخا منبع احسان و کرم
آج صد شکر خدا اُس نے کیا جشنِ جلوس | جس کی توصیف کی انشا میں قلم ہے ابکم

ذوق کے متذکرہ قصیدہ کا گریز

میں نے پوچھا جو سبب اُنکے بہم ہونیکا | تو یہ ہاتف نے کہا غیب سے ہوکر ملہم
آج اُس شاہ کے فرزند کی ہو شادی طوی | کہ شجاعت میں وہ رستم ہے سخا میں حاتم
کون وہ ظلِ خدا شاہ محمد اکبر | جس کے ہمت سے ہوں دریوزہ گر ارباب ہمم

امیر کے متذکرہ قصیدہ کا گریز

عرض دانش نے یہ کی روزِ ابد تک قایم | یہ حکومت یہ ایالت یہ شہامت یہ حشم
بندۂ خاص نے دیکھے ہیں ہزاروں انساں | حکمرانانِ زمانہ رو سائے عالم
ایک حاکم ہے فلک جاہ خرد مند زکی | صاحب علم و ہنر معدنِ اخلاق و کرم
نام ہے کلب علی خاں بہادر جم جاہ | جس کے خدام ہیں ہم مرتبۂ قیصر و جم

گریز کے بعد مدح کا آغاز ہوتا ہے مدح کے سلسلہ میں ہمارے قدیم شعرا نے خوب خوب مبالغہ کیا ہے۔ جس کی مذمت مولانا حالی نے اپنے مشہور "مقدمہ" میں اس طرح کی ہے:۔

"مدح میں زیادہ تر وہی معمولی محامد بیان ہوتے ہیں جو قدیم سے شعرا باندھتے چلے آئے ہیں اور ہر ایک خوبی کے بیان میں ایسا مبالغہ کیا جاتا ہے کہ قصیدہ کا مصداق نفس الامر میں کوئی انسان قرار نہیں پا سکتا۔ ممدوح کی ذات میں جو واقعی خوبیاں ہوتی ہیں اُن سے اصلاً تعارض نہیں کیا جاتا بلکہ بجائے اُن کے ایسی محال باتیں بیان کی جاتی ہیں جو کسی متنفس پر صادق نہ آسکیں ممدوح کی طرف اکثر وہ خوبیاں منسوب کی جاتی ہیں جن کے اضداد اُس کی ذات میں موجود ہیں۔ مثلاً ایک جاہل کو علم و فضل کے ساتھ ایک ظالم کو عدل و انصاف کے ساتھ۔ ایک احمق اور غافل کو دانشمندی اور بیدار مغزی کے ساتھ۔ ایک عاجز و بے دست و پا کو قدرت و تمکنت کے ساتھ وغیرہ۔

یہ عیب تمام فارسی اور اُردو قصیدہ نگاروں کے کلام میں موجود ہے، صرف عربی شعرا ہی ہیں جن کا کلام اس عیب سے پاک ہے کیونکہ انھوں نے کبھی کسی ایسے شخص کی تعریف نہیں کی جس کو انھوں نے قابل تعریف نہ سمجھا ہو

ہمارے قصیدہ گو دربار سے وابستہ تھے اس لئے اُن کو شکم پُری کے لئے جھوٹی تعریف کرنا پڑتی تھی اور زمانہ کے معیار کے مطابق مبالغہ میں تخئیل کی بلند پروازی دکھانا پڑتی تھی۔ اس لئے مدح میں سوائے جھوٹ کے اکثر کچھ نہیں ہوتا تھا۔ انشاء کی مدحیات میں بھی یہ چیز بدرجۂ اتم موجود ہے۔

مدح کے بعد جو قصیدہ کا حصّہ آتا ہے وہ خاتمہ کہلایا جاتا ہے۔ اس میں شاعر ممدوح کو دُعا دیتا ہے اور اپنے لئے کچھ طلب کرتا ہے۔ اس چیز کا معیار حُسنِ طلب ہے یعنی شاعر ممدوح سے اس طرح اپنی حاجت روائی اور کار براری کی التجا کرے کہ ممدوح کی طبیعت پر اس کی درخواست گراں نہ ہونے پائے بلکہ ممدوح کے دل میں محبت اور ترحم کے جذبات برانگیختہ کردے۔ نقادوں نے اس ضمن میں سوداؔ کی خوب خوب تعریف کی ہے مثال کے طور پر یہاں سوداؔ کے دو قصیدوں کے خاتمے نقل کئے جاتے ہیں بسنت خاں خواجہ سرا کی مدح میں جو قصیدہ ہے اُس میں سوداؔ کا حُسنِ طلب ملاحظہ فرمایئے:۔

لیکن نہ سمجھیو تم اس گفت گو سے ہرگز، منظور مجھ کو تیری ہمت کا امتحاں ہو
کس واسطے کہ مجھ کو اتنا ہی چاہیئے ہے، جامہ ہو ایک بر میں کھانے کو نیم ناں ہو
سو تو زیادہ اس سے تیرا کرم ہے مجھ پر کفرانِ نعمت اوپر قادر نہ یہ زباں ہو
اتنی ہی آرزو ہے کچھ عمر ہو جو باقی، صرف جہاں میں اُس کا تیرے قدم کے ہو
کب جا سکے ہے کوئی دروازے تیرے آکر بیٹھے جو تیرے در پر وہ سنگ آستاں ہو

سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں نائب اودھ کے قصیدہ میں مطلب کا اظہار سوداؔ نے اس طرح کیا ہے:۔

غرض کہ اس لئے تیری یہ میں نہیں کی مدح کہ چاہوں تجھسے میں اسکے صلہ میں درہم و دام
عوض میں اس کے صلے کی کروں میں تجھسے غرض قبول ہو جو میرا حرف اے ذوی الاکرام
مجھے تو گوشۂ خاطر میں اپنے دے جاگہ کہ تا بسر کروں لیل و نہار با آرام

قصیدہ میں اسی حُسنِ طلب سے ملحق مقطع بھی ہوتا ہے۔ مقطع کی خوبی یہ ہے کہ اُس کے الفاظ اتنے شاندار اور پُرشوکت ہوں کہ تشبیب کے مقابلہ میں پست نہ معلوم ہوں تاکہ قصیدہ ختم ہونے پر سامع کے دماغ پر اچھا اثر قایم رہے۔ یہ چیز بھی سوداؔ کے قصاید میں بہت بلند پایہ ہے۔ سوداؔ کے دو مقطعے نقل کئے جاتے ہیں:۔

غرض کروں ہوں دعاؤں پہ اپنے ختم سخن ادب کی مرضی ہے طولِ کلام ہو کوتاہ
الٰہی تا ہو جہاں تو ہو اور دنیا ہو جہانِ خوبی ہے تو اسے جہانیوں کی پناہ
کرے ہے ختم دعاؤں پر اب سخن سوداؔ ادب سے دور ہے خدمت میں تری طول کلام
الٰہی باغ جہاں میں ہو جب تلک مانا بشبیہ غنچہ صراحی سے شکل گل ہے جام
مئے بہشت تجھے دے ہر ایک عید کے دن طرف سے ساقی کوثر کے ساغرِ گلفام

اب انشاؔ کے قصاید میں یہی چیز ملاحظہ فرمایئے:۔

در مدح نواب سعادت علی خاں:۔

انشاؔ تری دعا میں ہے مشغول رات دن اپنے کریم و قادر و سبحاں کے سامنے

جب تک نہ ہو کمال درخشندگی نصیب — جرم سہا کو مہر کے عماں کے سامنے
آساں رہیں یہ عقدہ کی غنچہ کشائیاں — تا ناخن نسیم بہاراں کے سامنے
افواج روم و شام و ولایت نہ ہو سکے — ہرگز کبھی ترے صفِ مژگاں کے سامنے
شایاں ہے یہی کہ تیری دستِ جود کا — مذکور کیجے موسمِ باراں کے سامنے
ہر چند ہوں میں بے سر و ساماں ولیک آج — آیا ہوں تجھ سے باسر و ساماں کے سامنے
کلغی مجھے ملے تو تعجب نہیں کہ تھا — ہدہد کے سر پہ تاج سلیماں کے سامنے

در مدح جارج سوم بادشاہ انگلستان:

اب دعا پر یہی انشاؔ کہو انشاء اللہ — مل کے آمین کرو آمین سب اے اہلِ سخن
جب تلک مزرعۂ سبز فلک ہے شاداب — اسپ انجم رہیں جب تک کہ ہے خرمنِ خرمن
جب تلک پھولیں پھلیں سارے یہ اشجار جہاں — جب تلک بادِ بہاری سے ہو زیبِ گلشن
جب تلک ماہ کے گھوڑے کی فلک ہو گبھی — جب تلک شام کے ہو ساتھ شفق کی پلٹن
جب تلک چرخِ کہن شکلِ گورنر میں رہے — صاحبِ شرق میں جب تک کہ ہو نی جرنل کے چلن
شاہ انگلش یہی جارج رہے با عظم و شکوہ — سب کو بخشا کرے نت سیم و طلا لاکھوں من
فتح و فیروزی و شادی رہیں سب اُسکے نصیب — طبع اقدس کے ملالت نہ پھرے پیرامن
کمپنی نور کی جب تک کہ رہے قایم — بادشاہی رہے اُس کی ہی بوجہ احسن
جب تلک کرسئ زرینہ پہ خورشید رہے — رونق افزائے فلک خلعت شالم تہ پہن
ناظم الملک بہادر سے اور انگریزوں سے — رابطے یوں ہی رہیں اور محبت کے چلن،
یہی خواہش ہے میری جبکہ الٰہی سن لے — دولت و حشمت و ثروت پہ کریں وہ قدغن
کہ تجاوز کہیں بے حکم انھیں دونوں کے — کبھی آپس میں کسی ڈھب سے نہ ہوئے ان بن

دونوں سرکاروں کا اقبال رہے روز افزوں
دوست سب شاد ہوں پامال رہیں دشمن

در مدح سعادت علی خاں :-

کنوں برائے دعا جبہ بر زمیں سایم — کہ نیست ناطقہ ام را بوحت تو مجال
بحق اشہد ان لا الٰہ الا اللہ — بحق مرتبۂ عالی اذانِ بلال ،
امام ضامن ثامن ترا نگہدار د — بعیش و صحت و آرام تا صد وسی سال

بنور حضرتِ مشکلکشا درخشاں باد — مہ جمالِ تو و آفتاب جاہ و جلال

امیدوار رسید است سید انشاہم — حضور ہچو تو دستور صاحب اقبال

امید او تو بر آور کہ تا امید تو ہم — بر آورد زکرم زور ایزد متعال

در مدح شہزادہ سلیماں شکوہ :-

ترانہ سنج دعائے میشود ناچار — کہ سینہ ہائے عنادل نمودہ ناطقہ شق

بحیثیت مجموعی قصیدہ نگاری میں انشاء کا پایہ بلند ہے۔

رحمت نبی خاں ایم-اے (علیگ)

مکتوبات نیاز

حضت ۔ ایک زمانہ کے بعد آپ نے یاد بھی کیا تو کس "ادائے تُرکانہ" سے !

اللہ، اللہ !———— "زورِ دگرست ایں کمان را"———— !

یعنی یونتو بظاہر خطاب مجھ سے ہے، لیکن در اصل روئے سخن ہے کسی اور کی طرف ———— اور "وہ اور" بھی کون ————

"نامسلمانے کہ غارت می زند بر عقل و ہوش"

بندہ نواز— طاعت و بندگی کے امتحان میں اس قدر استبداد سے کام نہ لیجئے۔ اسی طرح کے سجدہ سے انکار اسوقت بھی ہوا تھا جب آدم کے سامنے سر جُھکانے کا سوال پیدا ہوا تھا اور آیندہ بھی ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ "دعوائے وارستگی" انسان کا فطری حق ہے اور شاید یہیں سے وہ راہ پھوٹتی ہے جو خداوندی کی منزل تک پہونچتی ہو۔ پھر خدا کا انکار تو آپ کر سکتے ہیں، لیکن خداوندی کا نہیں۔

مجھے آجکل فرصت ضرور ہے، لیکن جرأت نہیں اور اگر ہو بھی تو میں ان سے جاکر کیا پوچھوں اور کیا کہوں— اُن میں روا داری نہیں، تو آپ ہی صبر سے کام لیجئے۔

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

قبلۂ نیاز منداں

گرامی نامہ جس کے ایک ایک لفظ سے آپ کی تشویش ظاہر ہے، کل پہونچا۔ میں نے اس واقعہ کو بالکل دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ ہر چند عمر کی جس منزل سے میں گزر رہا ہوں، اس میں حسرت و یاس کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا لیکن معلوم نہیں کیوں، اس خاص مسئلہ میں، اپنی امیدوں کو از سرِ نو زندہ ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ممکن ہے آیندہ آپ بھی میرے ہمنوا ہو جائیں۔

پاکستان کا عزم مبارک ہو، لیکن جانتا ہوں کہ وطن کی گلیاں آپ کو پھر کھینچ بلائیں گی اور ہو سکتا ہے کہ

آپ جب واپس آئیں تو گھر زیادہ عزیز نظر آئے۔

جناب من

قیامت ہے۔ آپ بھی اسی تنگ نظری کا شکار ہیں، جس سے شبلی تک نہ بچ سکے، خیر بیدل کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے یہاں زبان کا لطف نہیں۔ کیونکہ اس کی شاعری زبان کی شاعری تھی ہی نہیں، لیکن نسبتی کا نام سُنکر ناک بھوں چڑھانا، محض اس بنار پر کہ اسے تھانیسر سے نسبت تھی، بڑا ظلم ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے اس کا کلام دیکھا ہی نہیں، ورنہ آپ ایسا خوش ذوق وخوش فکر انسان ایسا نہ کہتا۔

نسبتی کی شاعری، محض تغزل کی شاعری ہے اور نہ صرف جذبات کی بلندی وپاکیزگی بلکہ زبان کی حلاوت اور طرز بیان کی خوبی وندرت کے لحاظ سے بھی "قدرِ اول" کی چیز ہے۔ وہ عشق ومحبت کے صحیح و پاکیزہ تاثرات کو ایسے لطیف وبیساختہ انداز سے ظاہر کرتا ہے کہ سعدی اور خسرو دونوں بیک وقت ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور ہم ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں کہ نسبتی کی آواز خود ہمارے دل کے اندر سے نکل رہی ہے۔

تذکروں میں اس کا نمونۂ کلام دو چار شعروں سے زیادہ نہیں پایا جاتا، شاید اس لئے کہ اس کا دیوان نایاب ہے، لیکن آپ تو ایسا نہ کہئے اس کا پورا دیوان آپ کی نگاہ سے گزر چکا ہے۔ حیران ہوں کہ آپ نے کس نگاہ سے، کس عالم میں اس کا مطالعہ کیا ہے۔

اگر ناگوار نہ ہو تو اس کے چند اشعار میں بھی حاضر کردوں، ممکن ہے آپ کے نسخہ میں یہ نہ پائے جاتے ہوں:-

زبان کی حلاوت وسادگی اور بیان کی شگفتگی وروانی ملاحظہ ہو:-

بگزار تا دمے ز شکایت تہی کنم ۔۔۔ در سینہ می خلد گلۂ ناتمام ما

اے آنکہ بیگانہ روی از کنارِ ما ۔۔۔ آگاہ نیستی مگر از انتظارِ ما

جوش وخروش

گرد از سر کوئے یار برخاست ۔۔۔ آہے زدم وغبار برخاست

از خونِ دلم شیشۂ مے زہر بجام ست ۔۔۔ برحوصلۂ جامِ جم ایں بادہ حرام ست

ہجرش از آب می برآرد دود ۔۔۔ وصلش از شعلہ می چکاند آب

ما از دل وازکامِ دلِ خویش گزشتیم ۔۔۔ امروز اجابت نتواں داشت دعا را

اشک ریزاں می روم در وادیٔ آوارگی ۔۔۔ تا کجا خواہم فشردن ایں دامنِ نمناک را

محبت کی تلخکامی

توئے جاں در نمی آئی، دل از جا در نمی آید — کسے تا چند بر پا دارد ایں آرام و تسکیں را

نے وعدہ، نے امید، تو خود گو جواب چیست — پرسند گر ز ما سببِ انتظارِ ما

چارہ نتواں کرد دردِ کہنہ و دیرینہ را — دست بر دل می نہادم پارہ کردم سینہ را

در دلِ سنگینِ آں بیرحم تاثیرے نکرد — نسبتی بر گریۂ خود خندہ می آید مرا

ما نسبتی از بزم طرب بخت نداریم — تہمت بہ خم و بادہ و ساغر نتواں بست

پیوندِ دل از ہمہ بریدیم، — دیرے ست کہ خاطرم بجا نیست

نسبتی یک جرم را صد عذر گفت — گرچہ تقصیرے کہ می باید، نداشت

سپردگی عشق

سرِ من گر بُوَدت ورنہ بود رنجش نیست — چہ تواں کرد مرا با تو سرے افتادست

مُردیم و بود در دل حرفے کہ با تو گوئیم — در خاک رفت با ما رازِ نہانیِ ما،

از روز و شبِ نسبتی احوال چہ پُرسی — ہر صبح گرفتارِ تو، ہر شام اسیرست

محاورہ و زبان

بدنامیٔ تازہ برانگیخت دست گرد — طشتے دگر فتادہ ہمانا ز بامِ ما

بزمِ جم آخر شد و وقتِ صبوح ما رسید — طرحِ دیگر می تواں انداخت دورِ جام را

در ہر کہ بنگرد غلطِ یار می خورد — چشمِ خطا نظارہ ندانم چہ دیدہ است

گل ہمہ گوش ست لیکن صوتِ بلبل نارساست — نالہا کوتاہ افتادست، جرمِ گوش نیست

پیوندِ دل از ہمہ بُریدیم، — دیرے ست کہ خاطرم بجا نیست

موقوف بہ خنجرِ دگر شد، — آسایشِ نیم بسملِ ما

شوخی و حُسنِ تعبیر

در نسخۂ نسبتی ست یک نام — عنقا و وفا و کیمیا را

قرباں شوم ابروِ بتاں را — زورِ دگر ست ایں کماں را

ورائے عشوہ و ناز و خرام و رعنائی — دگر ہزار بلا ہمرہ ست بالا را

نمود وعدۂ قتلم دو چشمِ او لیکن — چہ اعتماد تواں کرد قولِ مستاں را

سمجھ میں نہ آنے والے واقعات

ڈین شیفر ولایت کا ایک مشہور شخص ہے، جس کا شوق صرف یہ ہے کہ وہ دنیا کے عجیب و غریب واقعات کی تحقیق کرے اور ان کے وقوع کے صحیح اسباب کا پتہ چلائے۔ جس وقت اس کو کسی ایسے واقعہ کا علم ہوتا ہے تو وہ تحقیق کے لئے خود جاتا ہے یا اپنے ایجنٹوں کو متعین کرتا ہے کہ وہ پوری تفتیش کے بعد واقعہ کی حقیقت معلوم کریں۔ لوگ ملک کے ہر گوشہ سے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہ ان واقعات کی تحقیق میں مصروف ہو جاتا ہے۔

اس کا بیان ہے کہ اسوقت تک ۵۰۰۰ واقعات اس کو ایسے معلوم ہوئے ہیں جن کی باوجود انتہائی کوشش کے وہ کوئی تاویل نہیں کر سکا، منجملہ ان کے چند یہ ہیں:

۱۔ اسٹراڈم کے جوار میں ایک ڈاکٹر وان ڈرہیگ رہتا ہے، اس نے اپنی زندگی کا ایک عجیب و غریب واقعہ لکھ کر بھیجا اس کا بیان ہے کہ "ایک بار آدھی رات کے قریب کسی نے میرا دروازہ کھٹ کھٹایا، میں سو رہا تھا، گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور دروازہ پر پہونچا، دیکھا کہ ایک لڑکا ہاتھ میں ایک خط لئے کھڑا ہے۔ میں نے خط پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ "ایک خاتون سخت بیمار ہے فوراً تکلیف کیجئے" میں فوراً کپڑے پہنکر اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے ایک گھر میں لے گیا جو کسی دولتمند شخص کا معلوم ہوتا تھا۔ ملازم مجھے اندر لے گیا تو دیکھا کہ ایک بہت خوبصورت خاتون بستر پر لیٹی ہوئی ہے، اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا "ڈاکٹر صاحب میں خیال کرتی ہوں کہ میری موت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اگر آپ کچھ کر سکتے ہوں تو کیجئے۔"

مینے اس کو اچھی طرح دیکھا اور نسخہ لکھ کر کہا کہ فوراً یہ دوا منگوا کر پیجئے، امید ہے آپ اچھی ہو جائیں گی اور میں کل آ کر پھر دیکھوں گا ——— دوسرے دن پہونچا تو مینے دیکھا کہ مکان بالکل ویران ہے اور اس کے دروازے اور کھڑکیاں بہت عرصہ سے بند معلوم ہوتی تھیں، کیونکہ ان کی چٹخنیاں اور قبضے وغیرہ علاوہ خاک سے ڈھکے ہونے کے زنگ آلود بھی تھے۔ قریب ہی کی جھاڑی سے ایک ضعیف شخص نے پوچھا "آپ کس کی تلاش میں ہیں" "دس سال ہوئے یہاں ایک خاتون رہتی تھی اور اس کی موت کے بعد یہ مکان خالی ہو گیا اور اسی وقت سے بند ہے۔ میں نے کہا "پاگل ہوا ہے کیا، رات ہی کو تو میں یہاں آیا تھا"

"مکان کی کنجیاں میرے پاس ہیں لیکن میں خود بھی اس کے اندر کبھی نہیں گیا۔ آیئے اندر چل کر دیکھیں۔"

اندر پہونچکر دیکھا کہ ہر چیز خاک آلود ہے، چاروں طرف کڑی کا جالا نظر آتا ہے اور خوابگاہ میں تمام مسہری خاک سے

اٹی ہوئی ہے"۔ اس شخص نے مجھ سے کہا " آپ نے دیکھا، میں غلط تو نہ کہتا تھا"۔ میں مکان کی یہ حالت دیکھ کر حیران رہ گیا، لیکن اتفاق سے میری نگاہ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو بستر کے پاس فرش پر پڑا ہوا تھا، میں نے اسے اُٹھا کر دیکھا تو حیرت کی انتہا نہ رہی، کیونکہ یہ وہ نسخہ تھا جو میں نے رات کو بیمار خاتون کے لئے لکھا تھا۔

۲۔ گرین لینڈ کے سمندر میں وھیل مچھلی کا شکار کرنے والے ایک جہاز کو دور سے ایک جہاز نظر آیا، اس نے سگنل دیا تو اُدھر سے کوئی جواب نہ ملا، کپتان نے خیال کیا کہ شاید یہ پانی کے برفیلے حصہ میں پھنس گیا ہے اور فوراً کچھ آدمی لیکر ایک کشتی کے ذریعہ سے وہاں پہونچا۔ یہاں پہونچکر دیکھا کہ جہاز کے چاروں طرف برف جمی ہوئی ہے اور بادبان بھی منجمد ہے۔ تختۂ جہاز پر پہونچکر دیکھا کہ ایک ملاح جہاز کی رسیوں پر چڑھتے ہوئے اسی حالت میں جم گیا، آگے بڑھے تو اور کئی آدمی مختلف کام کرنے کی حالت میں منجمد پائے گئے۔ کپتان کے کمرے میں پہونچے تو دیکھا کہ وہ کرسی پر سیدھا بیٹھا ہوا ہے اور اس کے ہاتھ میں پر کا قلم ہے، سامنے ایک کاغذ پر وہ کچھ لکھ رہا تھا کہ اسی حالت میں منجمد ہو گیا، کاغذ پر جو تاریخ نظر آئی اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ ۱۲ سال قبل کا ہے۔

۳۔ سان جوآن میں ایک ڈاکٹر تھا جس کا نام پرٹوریکو تھا۔ وہ اسی جزیرہ کے محکمۂ پبلک ہیلتھ میں ملازم تھا اور بیوی بچے سمیت یہیں رہتا تھا۔ ایک رات اس کی بیوی نے کہا کہ میں اپنے عزیزوں سے ملنے جانا چاہتی ہوں۔ وہ یہ کہکر چلی گئی اور ڈاکٹر سو گیا۔ چند گھنٹوں کے بعد اس کی بیوی واپس آئی تو سخت بدحواس تھی اور وہ آتے ہی اپنے شوہر پر برس پڑی کہ تم مجھے تنہا چھوڑ کر کیوں چلے آئے۔ ڈاکٹر یہ سنکر حیران رہگیا اور بولا کہ " یہ تم کیا کر رہی ہو، میں تو کہیں گیا ہی نہیں، اور تمہارے جانے کے بعد ہی سو گیا تھا"۔ لیکن اس نے کہا کہ " تم غلط کہتے ہو، راستہ میں جب میں ریل کی سڑک سے گزری تو دفعتاً ریل آگئی اور تم نے دوڑ کر مجھے بچا لیا، لیکن اس کے بعد ہی تم دفعتاً غائب ہو گئے اور اب تم کہتے ہو کہ یہاں سے باہر کہیں گئے ہی نہیں"

۴۔ خود ڈین شیفر کا ایک تجربہ۔

" میں نبراسکا میں تھا۔ ایک رات موٹر پر ہوٹل جاتے ہوئے ایک کھیت کے قریب سے گزرنا ہوا تو دیکھا کہ کھیت میں ایک جگہ بڑی تیز روشنی ہو رہی ہے، ہم نے موٹر روک دیا تو وہ روشنی ایک روشن گیند کی شکل میں سڑک کے متوازی حرکت میں آئی اور پھر آسمان کی طرف بلند ہو کر غائب ہو گئی۔

۵۔ آسٹریا میں ایک قصبہ ہے گراس وارڈن اس کے پادری جوسف ڈی لائی کو ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

۱۹۱۴ء میں جون ۲۸ کی رات تھی، پادری جب اپنے مطالعہ کے کمرے میں گیا تو اس نے دیکھا کہ ایک خط لیمپ کے پاس رکھا ہے کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ خط آرک ڈیوک فرڈیننڈ کا ہے۔ اس نے یہ خط پڑھ کر وہیں رکھ دیا اور نوکر کو بلانے کے لئے گھنٹی بجانے گیا لیکن جب واپس آیا تو خط غائب تھا۔ اس نے اپنے حافظہ سے کام لیکر خط کی عبارت کو ایک کاغذ پر لکھ لیا اور نوکر کو بلا کر کہا کہ تم گواہ رہو کہ یہ خط میں نے اپنے حافظہ کی مدد سے لکھا ہے۔ خط کی عبارت یہ تھی :-

"میں اور میری بیوی ایک سخت سیاسی تحریک کا شکار ہوئے ہیں، اپنی دعاؤں میں ہمیں یاد رکھئے"

اس کے دس گھنٹے بعد اخبار میں یہ خبر شایع ہوئی کہ پچھلی رات سراجیو میں آرک ڈیوک کو قتل کر دیا گیا اور یہ وہی واقعہ تھا جو ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ کا باعث ہوا۔

---

۵ - وارٹ فورڈ (انگلینڈ) میں ایک خوشحال شخص تھرسٹن کاکرتا تھا۔ ایک رات اس کی بیوی اپنے اعزہ سے ملنے دوسرے گاؤں چلی گئی تو رات کو دو بجے اس کے مکان سے آگ کے شعلے بلند ہوتے ہوئے دکھائی دئے۔ آگ بجھانے والے پہونچے لیکن آگ نہ بجھ سکی اور مکان جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ صبح کو جا کر دیکھا تو وہ کمرہ جس میں تھرسٹن سویا تھا بدستور محفوظ تھا اور اندر سے بند۔ دروازہ توڑ کر اندر گئے تو دیکھا کہ تھرسٹن مردہ ہے، اس کا لباس، بستر اور خوابگاہ کا تمام سامان محفوظ ہے۔ لیکن جب اس کے کپڑے اتارے گئے تو معلوم ہوا کہ سارا جسم جھلسا ہوا تھا۔

مسٹر پلے فیر باشندہ کنٹ صبح ناشتہ کے بعد اپنا اصطبل دیکھنے گئے جس میں ان کے متعدد گھوڑے رہتے تھے۔ ایک گھوڑا انھیں بہت پسند تھا سب سے پہلے اس کے کوٹھری کا دروازہ کھولا جو مقفل تھا لیکن وہ دیکھ کر حیران رہگئے کہ گھوڑا غائب ہے۔ اسی کوٹھری سے ملی ہوئی گھاس رکھنے کی کوٹھری تھی جس کا دروازہ اتنا تنگ تھا کہ آدمی بھی اس کے اندر مشکل سے جا سکتا تھا۔ پلے فیر نے اس کوٹھری کو کھولکر دیکھا تو گھوڑا اس کے اندر موجود تھا اور گھاس کھا رہا تھا۔ آخر کار یہ دروازہ توڑ کر گھوڑے کو باہر نکالا گیا۔

ڈین شیفر جو لندن کے ریڈیو اسٹیشن سے اپنے اس قسم کے تجربات نشر کرتے رہتے ہیں، اخیر میں ظاہر کرتے ہیں کہ سائنس باوجود اتنی ترقی کے اب بھی بہت سی باتوں کے سمجھنے سے عاجز ہے۔

باب المراسلہ

یک گریہ پس از ضبط دو صد گریہ رضا دہ
تا تلخئ آں زہر توانم زگلو بُرد

حضرت قبلہ ــــ ہندوستان کی سرزمین کو چھوڑے ہوئے کئی ماہ ہو چکے ہیں۔ لیکن ہندوستان کی زندگی کے نقوش ہنوز دل و دماغ پر مستولی ہیں۔ ماہ نومبر میں آگرہ کو خیرباد کہکر ماہِ دسمبر کے پہلے ہفتہ میں کراچی پہونچا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس زندگی کو جو ہندوستان میں بسر ہوئی یہاں آکر بالکل بھول جانا چاہئے کیونکہ یہاں فکر و نظر کی وہ رعنائیاں جو میرے نزدیک روح کا سب سے زیادہ متاعِ گرانمایہ کہی جاسکتی ہیں زندگی کی عریاں حقیقتوں کے سامنے ابخرات بن کر اُڑتی جارہی ہیں۔ اس درمیان میں کہہ نہیں سکتا آپ کتنی بار مجھ کو یاد آئے اور کتنے مرتبہ میں نے آپ کے خیال کو فراموش کرنا چاہا۔ کیونکہ آپ کا یاد آنا گویا شعر و ادب اور علم و حکمت کا یاد آنا ہے اور یہ چیز یہاں کے ماحول میں ایک گناہ ہے۔ آپ کو مایوسی تو ہوگی لیکن سچ یہ ہے کہ آجکل مجھے Theophile Gautier کی طرح ادیبوں، نقاشوں اور مفکروں سے ایک نوع کی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی ہے۔ عرصہ تک ان کی تخئیل میں رہ کر زندگی کی حقیقتیں اور زیادہ تلخ ہو جاتی ہیں۔ تخئیل اور حقیقت کی جنگ کو ان لوگوں نے اور زیادہ سنگین بنا دیا ہے۔ تاہم ہنوز آتشِ احساس بالکل سرد نہیں ہو سکی ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی ــــ کچھ دن ہوئے میں نے ایک صبح آپ کو خواب میں دیکھا، میں نے کہا "زہے مراتب خوابے کہ بہ ز بیداری ست" میں نے اُسی دن آپ کو ایک طویل خط لکھا لیکن بعد کو اس خیال سے کہ بیکار آپ کا وقت ضایع ہوگا، اس کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ غالباً پرسوں جب میں شاید Pakistan Central Secretariat کے قریب سے گزر رہا تھا میں نے ایک صاحب کو وکٹوریہ میں جاتے دیکھا ــــ میں کہہ نہیں سکتا، اس سے پہلے آج تک اس نوع کا اتفاق نہیں ہوا، یکایک میرے دل کی حرکت تیز ہوگئی وہ شخص جس کی میں نے صرف ایک جھلک سی دیکھی تھی، آپ سے بے حد مشابہ تھا۔ یہ تو آپ کو علم نہیں ہے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل نہیں ہے، لیکن میں نے آپ کی وہ تصویر دیکھی ہے جو ایک بار ۱۹۲۶ء کے "نگار" میں شایع ہوئی تھی۔ میں کیا عرض کروں وہ شخص آپ کی اس تصویر سے کس درجہ مماثل تھا ــــ مجھے ابھی تک پورے طور پر یقین نہیں ہے کہ وہ "آپ" نہیں تھے۔ بظاہر یہ واقعہ ایسا نہیں تھا جس کے بعد میں زیادہ عرصے تک خاموش رہ سکتا لیکن آج پھر ایک اور تحریک ہوئی۔ پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ اُس میں آپ کے وہ خطوط جو آپ نے ازراہِ لطف و کرم مجھ کو میرے خطوط کے جواب میں تحریر فرمائے تھے، سامنے آگئے ــ اب میں ضبط نہ کر سکتا تھا، اب میں آپ سے دو چار باتیں کرنے کے لئے بیتاب تھا۔

آج ہوا میں قدرے خنکی زیادہ ہے اور آسمان پر بھی ہلکے ہلکے بادل تیر رہے ہیں۔ ساری فضا شراب آلود معلوم ہوتی ہے۔ غالب کی زبان میں "روزِ ابر" شاید ایسے ہی دن کو کہتے ہوں گے۔ خیر، شراب تو قسمت والوں کی چیز ہے، یہ بھی کیا کم ہے کہ میں اس شخص سے اس وقت خطاب کر رہا ہوں جو یکسر شعر و شراب ہے۔

قبلہ! زندگی کی جن کثافتوں سے آجکل گزر رہا ہوں اُن کا خیال بھی ہمت شکن ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب تک جس چیز کو سرمایۂ حیات تصور کرتا رہا اور جس زندگی کی تعمیر اس وقت تک میرا مطمحِ نظر بنی رہی ہے، اس کو اب مجھکو جلد ہی دفن کر دینا ہوگا! ابتک میں انسانی زندگی کو بہت گراں قیمت سمجھتا تھا، اب ظاہر ہو رہا ہے کہ روئے زمین پر اس سے زیادہ ارزاں کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ حالات مجبور کر رہے ہیں کہ میں بھی اپنی زندگی کا سودا انتہائی سستے داموں پر کر دوں۔ ابھی تک خود کو اس پر طیار نہیں پاتا لیکن اگر لیل و نہار یہی ہیں تو ناممکن بھی ممکن ہو جائے گا ــــــ اور پھر اگر کوئی شخص دُنیا کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دے تو بھی دُنیا اس کے ساتھ کیا کرتی ہے۔ دُنیا نے مہاتما گاندھی کے ساتھ کیا کیا؟ ــــ گاندھی کی موت پر برنارڈ شا کا یہ جملہ میرے دل پر نقش ہو کر رہ گیا ہے:- "It shows how dangerous it is to be too good" (دُنیا میں اچھا ہونا واقعی سب سے زیادہ خطرناک چیز ہے) معاف فرمایئے گا میرا عقیدہ ہے کہ دُنیا نے حضرت علی علیہ السلام (فداہ ابی و امی) کے ساتھ بھی یہی ناروا سلوک کیا۔ دُنیا میں کتنے کتنے اور کیسے کیسے لوگ آئے، اُنھوں نے کیا کچھ نہ کہا، کیا کچھ نہ کیا، لیکن افسوس! انسان کو اپنی غلطیوں پر اصرار ہے، دُنیا کی آشوب کاریاں یوں ہی باقی ہیں ــــ اور شاید یونہی باقی رہیں گی!

آج کل ابو طالب کلیم کا یہ شعر بار بار دل میں چبھ رہا ہے!

طبعے بہم رساں کہ بسازی بعالمے ‏ ‏ ‏ ‏ ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گزشت

تاحال اپنے کو دنیا کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے میری فطرت آمادہ نہیں ہوتی، البتہ ذاتی طور پر مجھ میں وہ ہمت ضرور ہے جس کا کلیم نے دوسرے مصرع میں مطالبہ کیا ہے، خدا سے دعا ہے کہ اُن علائق کی گرفت قدرے ڈھیلی ہو جائے جس کے باعث اسکو بروئے کار آنے میں جھجک ہو رہی ہے۔

بہر حال کیا عرض کروں، عجیب کیفیت ہے جس کو صرف disillusionment-mind سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ــــ

دل کہتا ہے "To do or die" !!

میری دُعا ہے ــــ اور اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو بھی اس دُعا میں شریک کر لوں۔ کہ خدا جلد "نجات" دے!

والسلام ‏ ‏ ‏ ‏ نیاز مند: م-ح

آپ کا خط اس وقت طلب میں آپ کے طویل سکوت کا سبب آپ کی ناگزیر "گمشدگی" کو قرار دیکر بالکل مایوس ہو چکا تھا۔

آپ کے پچھلے خط سے (جو کئی مہینے اُدھر آپ نے لکھا تھا) اجمالاً یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ حوادث زندگی کا مقابلہ کرنے کے لئے آپ کس

"ناگوار اقدام" پر مجبور ہیں۔ لیکن اس کی نوعیت کا علم مجھے نہ تھا۔ اب دردِ و درماں دونوں کا حال معلوم ہوا۔

مینے آپ کو پہلے بھی لکھا تھا اور اب پھر لکھتا ہوں کہ انسان محض پرستشِ خیال کے لئے وضع نہیں ہوا۔ اگر فطرت کا مقصد یہ ہوتا کہ انسان صرف سوچتا ہے تو دماغ کے سوا وہ کچھ نہ ہوتا۔ لیکن خدا نے اس کو ہاتھ دئے ہیں تاکہ پھاوڑا لیکر زمین کھودے اور پاؤں دئے ہیں تاکہ وہ ایک جگہ نچلا نہ بیٹھ سکے۔ اس لئے آپ کو شکر ادا کرنا چاہئے کہ آپ وہاں پہونچ گئے جہاں فکر و خیال کی رعنائیاں مفقود ہیں اور زندگی کی حقیقتیں بے نقاب!

اگر آپ ادیبوں، نقاشوں اور مفکروں سے گھبرانے لگے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے اندر ایک عملی انسان پیدا ہو رہا ہے اور اس کیفیت کو دور کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ دنیائے فکر و احساس دنیائے عمل کی ضد نہیں، بلکہ اس کی تمہید ہے۔

عواطف و جذبات (Sentiments) اور عمل غایت کے لحاظ سے دونوں کا ایک مخصوص Ideal ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ صحیح Sentiment وہی ہے جس کی غایت عمل کے Ideal سے ٹکرائے نہیں بلکہ اس میں جذب ہو جائے۔

آپ سرزمینِ تاج کو چھوڑ چکے ہیں، جو واقعی رعنائی خیال کی جولانگاہ ہے اور اب پاکستان میں ہیں، جہاں آپ حقیقتوں کی طرف سے آنکھ بند کر کے زندگی نہیں گزار سکتے۔ خواب میں کافی وقت بسر کیا ہے، اب کچھ دن بیداری میں بھی صرف کیجئے اور اپنے ساتھ اہلِ پاکستان کو بھی درسِ بیداری دیجئے۔

اگر میری یاد آپ کو "مے و رامش و رنگ و بوئے" کی طرف مائل کرتی ہے تو مجھ پر لعنت بھیجئے اور آنکھ بند کر کے اپنے آپ کو حرکت و عمل کے سیلاب میں ڈال دیجئے۔

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرطِ اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی

نیاز

معلومات عامہ

آٹم بم سے زیادہ مہلک ایجاد

ہروشیما اور ناگاساکی پر آٹم بم کے گرائے جانے اور ان دونوں شہروں کے خاک سیاہ ہو جانے کا واقعہ پچھلی جنگ کا خاص واقعہ ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ آٹم بم کے نام سے کانپنے لگے اور امریکہ نے یہ کہہ کہکر کہ آٹم بم کا راز اسی کو معلوم ہے اور کثرت سے اس کے پاس موجود ہے، ساری دنیا کو اپنی طرف سے خوفزدہ بنا دیا، لیکن ذہن انسانی جو کبھی کسی ایک چیز پر قانع نہیں رہ سکتا، اس نے سوچنا شروع کیا کہ کیا آٹم بم کو اس سے زیادہ قوی بنایا جا سکتا ہے، اور آپ یہ سُنکر حیرت کریں گے کہ پچھلے سال ڈیڑھ سال کے اندر آٹم بم اس قدر ہولناک چیز ہو گیا ہو کہ ہروشیما اور ناگاساکی کے بم اس کے سامنے کھلونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آٹم بم کی ایجاد نے دُنیا کی تمام سلطنتوں کو سخت فکر مند بنا دیا ہے اور ہر ملک اپنی جگہ سوچ رہا ہے کہ اس اندیشہ سے کیونکر نجات مل سکتی ہے اور باوجود کوشش کے اس وقت تک اقوام عالم نہ آٹم بم کی ساخت کو ممنوع قرار دے سکیں اور نہ اس کا کوئی توڑ ایجاد کر سکیں، لیکن اگر بفرض محال ایسا ہو بھی جائے اور آٹم بم بنانے کے تمام ذرائع مسدود ہو جائیں، تو بھی سوال یہ ہے کہ کیا انسان اب اس کرہ میں حفاظت سے رہ سکتا ہے؟ - افسوس ہے کہ اس کا جواب آپ کو نفی میں ملے گا۔

اس وقت دنیا کی بعض بڑی قوتوں کے پاس ایسے ایسے کیمیاوی، حیاتیاتی اور فضائی قسم کے آلات پائے جاتے ہیں کہ ان سے نہ صرف روئے زمین کے تمام انسان بلکہ حیوانات و نباتات بھی آن کی آن میں صفحۂ ہستی سے مٹائے جا سکتے ہیں۔ یہ آلات صرف امریکہ کی تنہا ملکیت نہیں ہیں بلکہ بہت سی قومیں ان کو طیار کر رہی ہیں اور زیادہ آسانی کے ساتھ، کیونکہ آٹم بم کے لئے جس سامان کی ضرورت ہوتی ہے وہ بہت قیمتی و کمیاب ہے، مگر اس کو نہایت معمولی اور ارزاں دھاتوں اور چیزوں سے ایک معمولی صنعتی کارخانہ بھی طیار کر سکتا ہے۔ اس دنیا کے مہلک ترین آلۂ حرب کے وجود کا حال کسی قوم نے ظاہر نہیں کیا، لیکن اس دوران میں بعض لوگوں کی تقریروں میں اس کی طرف کھلا ہوا اشارہ پایا گیا ہے۔ سنہ ۴۷ء میں امریکہ کے ایک ذمہ دار شخص نے ظاہر کیا کہ: "امریکہ کے پاس ایک ایسا خفیہ حیاتیاتی (Biological) آلۂ حرب ہے جو آٹم بم سے کہیں زیادہ ہلاکت آفریں ہے۔" اس نے یہ بھی کہا کہ "امریکہ کے سائنس دانوں نے کیلی فورنیا کی یونیورسٹی میں ایک ایسا آلۂ حرب ایجاد کیا ہے کہ بڑے سے بڑے شہر کی تمام آبادی کو چشم زدن میں ختم کر سکتا ہے۔" اس کے ایک ہفتہ بعد ایک مشہور سائنس داں نے ظاہر کیا کہ امریکہ کے پاس اس قسم کے تین خفیہ آلات حرب ہیں اور پھر معلوم ہوا کہ ان کی تعداد پانچ ہے۔

دورانِ جنگ میں اور اس سے پہلے بھی دنیا میں خبر مشہور ہوئی تھی کہ جرمنی نے ایک ایسی شعاع دریافت کر لی ہے جس کے

پڑتے ہی انسان ہلاک ہوجائے گا اور اس کا نام Death Ray ہے۔ اسی کے ساتھ یہ افواہ بھی پھیلی کہ مہلک بیماریوں کے جراثیم پھیلانے والے بم بھی طیار کئے جا رہے ہیں۔ لیکن ان خبروں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ جرمنی، جاپان، امریکہ، برطانیہ اور کناڈا ہر جگہ جراثیم پھیلانے والے بموں کے متعلق تحقیق جاری تھی اور امریکہ کے ایک سائنس داں نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ Botulinus Toxin کی ایک گرین مقدار ستر لاکھ آدمیوں کو آناً فاناً ہلاک کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز Psittacosis Virus ہے جو شہر کے شہر کو دم زدن میں موت کی نیند سلا سکتی ہے اور لطف یہ ہے کہ نہایت معمولی کارخانوں میں معمولی چیز سے طیار ہو سکتی ہے اور اس کے زہر سے نہ صرف انسان بلکہ حیوانات و نباتات بھی تباہ ہو سکتے ہیں ---- ایک طرف امریکہ ان طیاریوں میں مصروف ہے اور دوسری طرف روس فضائی شعاعوں۔ Cosmic Rays کو مسخر کرنے کی فکر میں ہے تاکہ ان کی مدد سے وہ بستیوں کی بستیاں تباہ کر سکے اور اسی کے ساتھ آٹم بم بھی بڑی زبردست قوت کے طیار کر رہا ہے ---- یہی حال برطانیہ اور دوسرے ملکوں کا بھی ہے جن کی تمام علمی کوششیں صرف مہلک آلات کی ساخت میں صرف ہو رہی ہیں ---- آیندہ دُنیا میں ایک اور جنگ کا ہونا بالکل یقینی ہے، اور اسی کے ساتھ یہ بھی اٹل حقیقت ہے کہ اس جنگ کے بعد کرۂ ارض بالکل تباہ ہو جائے گا اور اگر کچھ لوگ بچ رہے تو وہی ہوں گے جو اب بھی عہد وحشت کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

برطانیہ کے موجودہ اخبار

جنگ سے قبل لندن میں تیرہ اخبار (روزانہ) صبح کو شایع ہوتے تھے اور اب ان کی تعداد بارہ ہے شام کے اخبار صرف تین ہیں۔ ٹائمس، ڈیلی ور، ڈیلی ورکر کے علاوہ لندن کے ان اخباروں کا ایک ایڈیشن مانچسٹر سے بھی شایع ہوتا ہے ---- جنگ سے قبل نو ہفتہ وار اخبار (ہر اتوار) کو شایع ہوتے تھے اور یہی تعداد اب بھی ہے۔

صبح کے اخباروں کی مجموعی اشاعت یہ ہے:

صبح کے اخبار :- ۱۵۵۷۴۹۷۸

شام کے اخبار :- ۳۴۹۰۶۰۶

ہفتہ وار :- ۲۳۳۳۴۷۷۷ ---- گویا کُل ملاکر تقریباً دو کروڑ ستر لاکھ

بیرون لندن کے صوبہ جاتی اخباروں کی مجموعی اشاعت یہ ہے:

صبح کے اخبار :- ۳۰ لاکھ

شام کے اخبار :- ۶۰ لاکھ ۵۰ ہزار

اس طرح برطانیہ کے تمام اخباروں کی اشاعت کا اندازہ پانچ کروڑ ۲۰ لاکھ ہوتا ہے ---- ڈیلی ٹیلی گراف کی اشاعت ۱۹۳۰ء میں ۸۴۰۰۰ تھی، سنہ ۱۹۳۹ء میں ۷ لاکھ ہوگئی، جنگ کے دوران میں ساڑھے سات لاکھ ہوگئی اور اب دس لاکھ ۱۵ ہزار نو سو چالیس ہے ... سنہ ۱۹۰۰ء ٹائمس کی اشاعت اس وقت ۲۰۷۵۰ تھی اور آبزرور کی ۲۶۱۳۶۸ ---- ۱۹۳۸ء میں برطانیہ کے تمام اخباروں کے لئے ۱۲ لاکھ ٹن سالانہ کاغذ درکار ہوتا تھا۔

کلامِ دردِ سعیدی ٹونکی :

نگہ میں انجامِ جستجو ہے، قدم بھی آگے بڑھا رہا ہوں
نظر مقدر ہی پر نہیں ہے، خدا کو بھی آزما رہا ہوں

یہ کیوں فضا پر ہے یاس طاری، یہ ہر طرف کیوں اُداسیاں ہیں؟
ابھی تو اپنی تباہیوں پر میں آپ بھی مسکرا رہا ہوں

یہی نظامِ چمن رہا ہے، یہی نظامِ چمن رہے گا
وہیں قفس بھی بنے گا اک دن جہاں نشیمن بنا رہا ہوں

ہر شے پہ ہے اک سکوت طاری،
تخئیل میں ہے ابھی فسانہ !

مٹ جاتے ہیں سیکڑوں حقایق،
بنتا ہے کہیں جب اک فسانہ !

دل کی تباہیوں کا تو کچھ غم نہیں، مگر
شاید پھر آپ کا کوئی ارماں نہ کر سکے

آگیا صبر بیٹھے جی آخر
دل پر اک ایسی چوٹ بھی آئی

موت کی لے میں عشق نے اکثر
داستانِ حیات دُہرائی

قصۂ غم جہاں سے دُہرایا
عمرِ رفتہ وہیں سے لوٹ آئی

اکثر بیانِ غم میں اُلجھتے ہیں اس طرح
جیسے کہ اپنے حال سے ہوں بے خبر سے ہم

نگہ جنوں نے ہزار ہا کئے چاک پردۂ آگہی
کوئی چیز پھر بھی چھپی ہوئی ہے ہنوز پردۂ راز میں

سر ہم نے جہاں جُھکا دیا ہے
بندے کو خدا بنا دیا ہے

چمن میں ہوگی کسے عالمِ بہار کی قدر
قفس میں بیٹھ کے دیکھیں بہار کا عالم

جب تک ترا ستم نہ گوارا ہوا مجھے،
تیرا کرم بھی میرے لئے ناگوار تھا

بیخوابیِ غمِ اجل نہیں ہے،
مشکل ہی سے نیند آسکے گی،

میری ناکامیِ پیہم کی اُڑاؤ نہ ہنسی
دل کا انداز حریفانہ ہوا جاتا ہے

محبت کی تو منزل ہی نہیں ہوتی کوئی، لیکن
بنا لیتی ہے لاکھوں منزلیں درماندگی اپنی

کلامِ سرشار صدیقی :

مرا حال تو نے پوچھا، یہ کرم بھی کم نہیں ہے
تری پرسشوں کے صدقے مجھے کوئی غم نہیں ہے

چشمِ گریاں کی قسم میں نے خزاں میں اکثر
اپنے دامن میں گلستاں کا گلستاں دیکھا

کہو وہ ابھی نہ کروٹیں بدلے نظامِ دہر
میری جبینِ شوق ہے اور پائے یار ہے

مجھے خود ہی خبر نہیں ہے جب دل کو پیامِ خلوت
تو خدا جانے اس عالم میں کہاں ہوتا ہے،

حجابِ دیر و حرم میں اُلجھ گئیں نظریں
کچھ اور بڑھتے تو بس ان کا آستانہ تھا

مہاتما گاندھی

لازوال اک ٹیس ہے سینوں میں غم ہے مستقل
جگمگاتے دیش کی برباد شوبھا ہوگئی
زندگی دیکر وطن کو سب کا پیارا اُٹھ گیا
ہائے یہ کیا ہو رہا ہے ہائے یہ کیا ہوگیا
صبر بھی آجائے گا۔ یہ زخم بھی بھر جائے گا
خواب تک میں بھی خیال اس بات کا آتا نہ تھا
پانی پانی کرگئی سب کو یہ ذلت ناک بات
اک اُجالا تھا کہ جس کے دم سے روشن تھا یہ گھر

بھیگتی جاتی ہیں آنکھیں ڈوبتے جاتے ہیں دل
ناگہاں کوئی سُہاگن جیسے بیوہ ہوگئی
بےکسوں کا نیک لوگوں کا سہارا اُٹھ گیا
ہند کا باپو زمانے کو جگا کر سوگیا،
ہند ایسا دیوتا لیکن کہاں سے لائے گا
شانتی کا دیوتا گولی سے مارا جائے گا
کیوں اُٹھا کس طرح اُٹھا۔ باپ پر بیٹے کا ہاتھ
کیا ملا پاپی کو سارے دیش کا سکھ چھین کر

ظلمتوں کے خوف سے سورج ٹھہر سکتا نہیں
مرگیا پیغام بر۔ پیغام مر سکتا نہیں

ادیب سہارنپوری

آزادی کا خواب

کتنے بے تعبیر ٹھہرے امن و آزادی کے خواب
موت کے طوفان میں کتنے سفینے بہ گئے
کتنے لاشے تھے کہ بے گور و کفن پائے گئے
فطرتِ انسان اس درجہ جنونی ہوگئی،
کتنے دامن چاک ہیں کتنے گریباں بے رفو
نفرت و دہشت کی سالاری میں ہر سو ہیں رواں
نور آزادی کو نفرت کا اندھیرا کھا گیا،

کس قدر نزدیک نکلی آرزوؤں کی سراب
کتنے سورج چھپ گئے اور چاند کتنے گہ گئے
کتنے دل چھیدے گئے اور کتنے سر کاٹے گئے
کتنی مائیں ہیں کہ جن کی گود سونی ہوگئی
بستیوں میں لُٹ گئی انسانیت کی آبرو
تھا نماں بر دوشِ انساں کارواں در کارواں
سانس بھی لینے نہ پائے تھے کہ طوفاں آگیا

ادیب سہارنپوری

کلام عرشی بھوپالی :

وہ ہم سے خفا تو ہیں لیکن آیا نہ خفا ہونا بھی اُنھیں
احباب نے ان کی نظروں کو سو بار پریشاں دیکھا ہے

اب کہئے تو ان سے کیا کہئے کچھ یاد نہیں سب بھول گئے
دامن تو یہ کہہ کر تھاما تھا کچھ آپ سے ہم کو کہنا ہے

تجدید کرم سر آنکھوں پر، یہ دولتِ غم تو مجھ سے نہ لے
کچھ اور سنورنا ہے مجھ کو کچھ اور ابھی مجھ کو جینا ہے

تجدیدِ آرزو کے لئے دل مچل نہ جائے
مدت کے بعد پھر وہ نظر آ گئے ہیں آج

شاید انھیں بھی رنجشِ باہم ہے ناگوار
مجھ سے نگاہ ملتے ہی گھبرا گئے ہیں آج

اب دیکھئے پہونچتی ہیں بربادیاں کہاں
اُن کی حسین آنکھوں میں اشک آ گئے ہیں آج

کلام خزاںؔ پریمی :

کسی کی یہ ادا کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے
نظر اُٹھتی نہیں ۔ اُٹھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے

چھلک پڑا ہے مرا ساغرِ حیات خزاںؔ
بہار آئے نہ آئے ۔ اب انتظار نہیں

وہی آپ کا تصور ۔ وہی اشک کی روانی
یونہی بجھ گئیں امنگیں ۔ یونہی مٹ گئی جوانی

یہ میں نے مانا کہ آج ہر شے پہ زندگی کا نکھار سا ہے
نہ جانے کیوں یہ حسین منظر مری نگاہوں پہ بار سا ہے

رہِ طلب میں جو منزل کو زندگی جانے
خدا کرے کہ وہ منزل کبھی نہ پہچانے

چلو آج جی بھر کے آنسو بہا لیں
یہ تاروں بھری رات آئے نہ آئے

غم ایک امتحان تھا انسان کے لئے
جو لوگ اہلِ ذوق تھے ۔ وہ مسکرا دئے

کلام رساؔ بریلوی :

تکمیلِ ذوق سعیٔ تماشا کریں گے ہم
ان کو نگاہِ شوق سے دیکھا کریں گے ہم

آغاز ہی میں لٹ گیا سرمایۂ نشاط
انجامِ آرزو پہ نظر کیا کریں گے ہم

راحت رساں ہے عشق میں ہر کاوشِ حیات
کیوں تم سے التجائے مداوا کریں گے ہم

مطبوعات موصولہ

ہم وحشی ہیں مجموعہ ہے کرشن چندر کے چھ مختصر افسانوں کا، جو پاکستان و ہندوستان کے موجودہ اختلاف اور ہندو مسلمانوں کی باہمی خونریزی و سفاکی کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔

کرشن چندر بہت مشہور فسانہ نگار ہیں اور اس وقت تک وہ بہت سے فسانے لکھ چکے ہیں، لیکن ان افسانوں کو لکھ کر انھوں نے جو خدمت انجام دی ہے وہ یقیناً غیر فانی ہے۔ انھوں نے ان افسانوں میں ہندو مسلمانوں کے مظالم کی ایسی تصویر پیش کی ہے جس کو دیکھ کر دل ہل جاتا ہے اور ہمارے وہ جذبات حرکت میں آجاتے ہیں جن کا تعلق سچے اعتراف گناہ سے ہے اور غالباً اس مجموعہ کی اشاعت کا مقصود بھی یہی ہے۔

ابتدا میں سردار جعفری کا دیباچہ بھی شامل ہے جو بجائے خود پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے۔ کتابت و طباعت وغیرہ نہایت پاکیزہ۔ حجم ۱۲۰ صفحات۔ قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ: کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی۔

بہار اور اُردو شاعری تذکرہ ہے صوبۂ بہار کے اُردو شاعروں کا جسے پروفیسر محمد معین الدین دردائی نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کی بنیاد وہ مقالہ ہے جو اس موضوع پر ۱۹۳۶ء میں مولف نے دوران تعلیم (مسلم یونیورسٹی) میں مرتب کیا تھا۔ یہ مقالہ پہلے سہیل میں شایع ہوا، پھر معاصر میں اور اب مزید اضافہ و ترمیم کے بعد کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

صوبۂ بہار نے اُردو کے نشو و نما اور شعراء اُردو کی قدر افزائی میں جتنا حصہ لیا وہ اہل علم سے مخفی نہیں اور یہ کہ متقدمین میں بیدلؔ اور متاخرین میں شادؔ اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے، بجائے خود اتنی بڑی نسبت ہے کہ بہار اس پر جتنا ناز کرے کم ہے۔

فاضل مولف نے اس کی ترتیب میں کافی کاوش و محنت سے کام لیا ہے اور علاوہ متداول تذکروں کے مشہور کتب خانوں کی بھی چھان بین کی ہے، چنانچہ اس تذکرہ میں بعض ایسے شعراء متقدمین کے نام بھی نظر آتے ہیں جن سے لوگ واقف نہیں ہیں۔ مختصر حالات کے ساتھ کلام کا انتخاب بھی درج کیا گیا ہے اور بیدلؔ سے لیکر عہد حاضر تک کے تمام مشہور و غیر مشہور شاعروں کا ذکر اس میں موجود ہے۔ ابتدا میں پروفیسر اختر اورینوی کا پیش لفظ ہے اور اسکے بعد مولف کا لکھا ہوا دیباچہ اور دونوں بہت

دلچسپ ہیں۔

طباعت وکتابت اچھی ہے اور کاغذ نفیس۔ حجم ۱۹۶ صفحات۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ اسلامیہ بک ڈپو آرہ۔

ہندوستان کی قومی زبان اور رسم الخط

یہ تصنیف بھی پروفیسر محمد معین الدین دردائی کی ہے جس میں موضوع کے لحاظ سے بڑا دلچسپ اور کارآمد مواد پیش کیا گیا ہے۔ ۴۰ء میں مولف ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے دہلی میں کام کر رہے تھے اور وہیں مولوی عبدالحق صاحب کے ایما سے انھوں نے اُردو ہندی نزاع کی تاریخ سے متعلق معلومات فراہم کرنا شروع کیں، جو اب کتاب کی صورت میں پیش کی گئی ہیں۔

فاضل مصنف نے اس کتاب میں سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں کون سا رسم الخط رائج تھا اور پھر اس کے بعد فارسی رسم خط نے کیونکر رواج پایا، اس کے بعد نفس مسئلہ زبان پر گفتگو کرکے بتایا ہے کہ اُردو کیونکر مقبول ہوئی اور اس نے کتنی وسعت اختیار کی اور پھر اُردو ادب کی ترقی پر مختصر سا تبصرہ کرکے رسم خط کی بحث شروع کی ہے جو واقعی کافی معلومات رکھتی ہے۔

فاضل مصنف نے اس بحث کے سلسلہ میں بتایا ہے کہ اُردو رسم خط کی کیا اصلیت ہے اس میں کیا خوبیاں ہیں اور بین الاقوامی نقطۂ نظر سے اس کی کیا حیثیت ہے۔ دیوناگری رسم خط کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے تمام اعتراضات کا جواب دیا ہے جو اُردو رسم خط پر کئے جاتے ہیں اور اعداد و شمار اور متعدد نقشوں سے اپنے دعوے کے ثبوت پیش کئے ہیں۔ اُردو ہندی نزاع سے دلچسپی لینے والوں کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے اور ہمیں امید ہے کہ ملک مصنف کی محنت وکاوش کی قدر کرے گی۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ: اسلامیہ بک ڈپو آرہ

متفرقات غالب

مجموعہ ہے میرزا نوشہ کے غیر مطبوعہ فارسی مکتوبات و منظومات کا جسے پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی نے مرتب کیا ہے۔ پہلے حصہ میں مکتوبات درج ہیں جن کی تعداد ۱۹ ہے اور جو مولوی سراج الدین احمد، مرزا احمد بیگ خاں، مرزا ابوالقاسم خاں، ناسخ اور ادارۂ جام جہاں نما کے نام غالب نے لکھے تھے۔ دوسرے حصہ میں ایک غزل، تین قطعے، ایک مثنوی اور ایک سلام ہے۔

اس مجموعہ میں سب سے زیادہ اہم وہ مثنوی ہے جس کے متعلق مولانا حالی کو بھی غلط فہمی ہوئی تھی۔ فاضل مرتب نے ابتداً میں ان تمام خطوط اور قطعات وغیرہ پر ایک تبصرہ بھی کیا ہے جو بجائے خود ایک مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اور کتب خانہ ریاست رام پور نے اسے شایع کیا ہے۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات، قیمت عہ

ناول کی تاریخ اور تنقید

تصنیف ہے سید علی عباس حسینی ایم۔ اے کی جسے انڈین بک ڈپو لکھنؤ سے شایع کیا ہے۔ اس موضوع پر اُردو میں یہ بالکل پہلی کتاب ہے، لیکن ابتدائی کوششوں کی طرح تشنہ و ناکام نہیں۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں قصوں کی ابتدا پر بحث کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ ان پر مذہب

فلسفہ اور نفسیات کا کیا اثر پڑا۔ دوسرے باب میں ناول کے اقسام اور اس کے عناصر ترکیبی سے عمومی بحث کی گئی ہے تیسرے باب میں جو کافی طویل ہے انگریزی ناولوں کے نشوو ارتقا کا ذکر ہے، چوتھا باب اُردو کے ابتدائی قصوں سے لیکر حالی اور نذیر احمد کی تصانیف تک حاوی ہے، پانچویں باب میں رتن ناتھ سرشار اور چھٹے باب میں شرر اور محمد علی طبیب، ناولوں کا ذکر ہے۔ ساتویں باب میں سجاد حسین، مرزا عباس حسین ہوش، مرزا رسوا اور مولانا راشد الخیری کی تصانیف پر گفتگو کی گئی ہے، آٹھواں باب پریم چند کے لئے مخصوص ہے، نویں باب میں اور دوسرے ناول نویسوں کا ذکر ہے اور دسویں میں ترقی پسند نظریہ کو سامنے رکھکر اُردو ناول کے مستقبل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ۴۵۰ صفحات کو محیط ہے اور اس میں کلام نہیں کہ فاضل مصنف نے اس کی جمع و ترتیب میں بڑی محنت و کاوش سے کام لیا ہے اور وہ اس موضوع پر اپنے ریسرچ میں بہت کامیاب ہوئے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ایک نقص تو یہ ہے کہ کتابت کی غلطیاں کثرت سے ہیں جو طویل غلط نامہ لگانے کے بعد بھی باقی رہ جاتی ہیں اور دوسرا اس سے بڑا نقص یہ ہے کہ جو زبان مصنف نے اس میں استعمال کی ہے وہ ایک علمی یا تاریخی تصنیف کے لئے ناموزوں ہے، انھوں نے آزاد کے آبِ حیات کا تتبع کیا ہے اور یہ رنگ عہد حاضر میں بالکل نامطبوع خیال کیا جاتا ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ تصنیف اس سبکی و خامی سے پاک ہوتی۔

اس کی قیمت چھ روپیہ ہے، جو تصنیف کی اہمیت کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں ہے۔

ملکۂ مشرق تصنیف ہے محترمہ محمودہ رضویہ کی، جس کو کراچی کی ڈائرکٹری کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس کتاب میں فاضل مصنفہ نے سب سے پہلے سندھ کی تاریخ سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں کی آمد کس طرح ہوئی اور ان کی حکومت کیونکر ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہوتی رہی اس کے بعد انگریزی عہد کو لیا ہے اور پھر قیام پاکستان کا ذکر کرکے کراچی کے موجودہ کوائف و حالات سے بحث کی ہے۔

محمودہ رضویہ بہت مشاق لکھنے والی ہیں اور ان کی متعدد تصانیف اس سے قبل شایع ہو چکی ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب اہل علم میں مقبول ہوگی۔ قیمت ؏ ۔ ملنے کا پتہ: محمودہ رضویہ حافظ شریف حسین ڈی، وٹی چودھری روڈ۔ کراچی۔

اُجالے اندھیرے مجموعہ ہے جناب ساحلی احسانی کی ۶۲ نظموں اور غزلوں کا جن میں چھوٹی سی چھوٹی نظم دو شعر کی ہے اور بڑی سی بڑی بارہ پندرہ اشعار سے زیادہ نہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساحلی صاحب اپنے مقصود کو مختصر الفاظ میں بیان کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ غزلوں کا رنگ بھی زیادہ تر نظم ہی کا سا ہے اور اس لئے غزلوں کی سرخیاں بھی انھوں نے قایم کر دی ہیں۔

ساحلی صاحب ۲۴ سال کے ایک نوجوان شاعر ہیں اور ان کی مشق سخن بھی دو سال سے زیادہ نہیں، لیکن باوجود اس کمسنی اور کم مشقی کے ان کے کلام میں بہت جان پائی جاتی ہے اور ایک اچھے شاعر بننے کی ان میں بڑی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

قیمت ؏ ۔ ملنے کا پتہ: ایوان ادب ۱۳، عبداللہ بلڈنگ ۲، پریل، بمبئی۔

اثر کے تنقیدی مضامین

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے چودہ تنقیدی مضامین جو ملک کے مشہور رسایل و جراید میں اس سے قبل شایع ہو چکے تھے اب اس نام سے کتابی صورت میں شایع کئے گئے ہیں۔

اثر صاحب اول اول ایک شاعر کی حیثیت سے رونما ہوئے تھے، لیکن جب ان کی شاعری پورے عروج و کمال کو پہونچ گئی تو انھوں نے تنقید کی طرف بھی توجہ کی اور چونکہ یہ مشغلہ انھوں نے فن شعر میں پختہ کار ہونے کے بعد اختیار کیا تھا، اس لئے وہ اس فن میں بھی بہت جلد کامیاب ہو گئے۔

اس مجموعہ میں اقبال، جوش، غالب، مومن وغیرہ کے کلام پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے جس سے نقاد کی طبع وقاد کا پورا پتہ چلتا ہے۔ طباعت و کتابت بہت صاف ہے، لیکن اغلاط سے پاک نہیں۔

ضخامت ۲۰۰ صفحات ۔ ملنے کا پتہ: نظامی پریس ۔ بدایوں ۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔

محمل

مجموعہ ہے ہندوستان کی نو مشہور خواتین کے اردو افسانوں کا جن کا انتخاب خود انھیں خواتین نے کیا ہے۔ ان خواتین میں خاص خاص یہ ہیں: عصمت، شاہد لطیف ۔ حجاب امتیاز علی ۔ ڈاکٹر رشید جہاں ۔ خدیجہ مستور ۔

یہ مجموعہ بھی نظامی پریس بدایوں نے شایع کیا ہے ۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات ۔ قیمت تین روپیہ۔

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱ چند مُجُمّلے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲ مادئین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حُسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً:۔ مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوشش، اصغر و غیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جن کا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

قیمت حصۂ اول للعہ۔ حصۂ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

ہندو مُسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی

انجیلِ انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۲۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو اخوتِ کبریٰ و اقوتِ عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے ــــ اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی و نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے ــــــ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنہ (عہ) علاوہ محصول

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری ۳۹ء
(مصحفی نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں۔ حیات مصحفی ۔ اُردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں، انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۴۰ء
(نظیر نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں۔
نظیر کا مسلک
شاعری پر تبصرہ
نظیر اور عوام
انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۴۱ء
یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے ۔ یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے ۔
قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۴۲ء
اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری ۴۱ء میں شایع ہوا تھا ۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۴۳ء
اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی ۔
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۴۵ء
(قرآن نمبر) اس میں ڈاکٹر اسٹڈل کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں ۔ حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ ——— قیمت دو روپیہ علاوہ محصول ۔

جنوری ۔ فروری ۔ مارچ ۴۶ء
یہ سالنامہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے پہلا حصہ جنوری کا ہے اور دوسرے حصہ میں فروری ، مارچ دونوں نمبر شامل ہیں ۔ قیمت ہر حصہ کی ایک روپیہ آٹھ آنے

جنوری ۴۷ء
اس سالنامہ کا نام "ماجد ولین نمبر" ہے جس میں ایک بے مثل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے ۔ ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ۔ علاوہ محصول ۔

جنوری ، فروری ۴۸ء
(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر ۔ جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دورِ زریں اور اُن کارناموں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومتوں کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی ۔ تمام مقالات اڈیٹر کے قلم کے ہیں ——— قیمت تین روپیہ ——— علاوہ محصول ۔

نرخنامہ اُجرت اشتہار

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۵۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھا صفحہ	[illegible] روپیہ	[illegible] روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ	[illegible] روپیہ	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۲ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر چھ روپیہ ۔ ششماہی جاری نہیں ہوسکتا ۔ سالانہ بیرون ہند بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہوسکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا ۔ "منیجر"

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے ۔ "منیجر"

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے